برصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگزشت

تحریک سید احمد شہیدؒ

جلد اول

المعروف بہ "سید احمد شہید" حصہ اول

تالیف

حضرت مولانا غلام رسول مہر رحمۃ اللہ علیہ

حسب ایماء

حضرت مولانا شمس الحق صاحب قاسمی، ممبئی

مکتبہ الحق

ماڈرن ڈیری، جوگیشوری، ممبئی

جملہ حقوق کتابت بحق ناشر محفوظ ہیں

تصریحات

نام کتاب	تحریک سید احمد شہیدؒ جلد اول
مؤلف	مولانا غلام رسول مہر صاحبؒ
تصحیح	مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی
تعداد صفحات	۵۵۸
باہتمام	شمشیر احمد قاسمی (دیوبند)
کتابت	عمران کمپیوٹرس مظفر نگر (PH: 09219417735)
سن اشاعت	جنوری 2008

ملنے کے پتے

❖ دارالکتاب دیوبند ❖ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

❖ سنابل کتاب گھر دیوبند ❖ دارالاشاعت دیوبند

❖ مدینہ بک اسٹال بھنڈی بازار ممبئی ❖ ادارہ اسلامیات محمد علی روڈ ممبئی

❖ دکن ٹریڈرس مغل پورہ حیدرآباد ❖ توحید بک ڈپو پھول پورا اعظم گڑھ

❖ مولانا عبدالسلام خاں قاسمی 179 کتاب مارکیٹ، بھنڈی بازار ممبئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتساب

بنا کردند خوش رسمے بہ خون وخاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

اکتوبر ۱۹۴۴ء کی چھٹی یا ساتویں تاریخ تھی، جب میں نے کابل میں مولانا محمد بشیر شہید سے عہد کیا تھا کہ سید احمد بریلویؒ کے سوانح اور مجاہدین کی تاریخ مرتب کروں گا، میں دو تین دن بعد غزنی اور قندھار ہوتا ہوا چلا آیا، وہ مزید چند روز کابل میں مقیم رہ کر اپنے مرکز چمرکنڈ تشریف لے گئے اور تقریباً دو ماہ بعد رمضان المبارک کی پہلی رات کو شہادت کا خلعت پہن کر فاطر السموٰات والارض کی بارگاہ میں پہنچ گئے:

سرم فدائے سوارے کہ گاہِ عرضِ نیاز
عناں کشیدہ رود تا سخن تمام کنم

اگر وہ زندہ ہوتے تو اپنی محنت وکاوش کی اس ''بضاعتِ مزجات'' کو عقیدت کے سفینے میں لگا کر ان کی خدمت میں پیش کرتا، اب شہید سعید کی روحِ پاک سے مخاطب ہو کر عرض پرداز ہوں:

نذرِ اشکِ بے قرار از من پذیر
گریۂ بے اختیار از من پذیر

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط
یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وقف (سورۂ توبہ)

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے انکی جانیں بھی خرید لیں اور انکے مال بھی،
اور اس قیمت پر خرید لیں کہ ان کیلئے بہشت (کی جاودانی زندگی) ہو، وہ (کسی
دنیوی مقصد کیلئے نہیں، بلکہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس مارتے بھی
ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں۔

تکیہ بر حجت و اعجازِ بیاں نیز کنند ❁ کارِ حق گاہ بہ شمشیر و سناں نیز کنند
گاہ باشد کہ تہِ خرقہ زرہ ے پوشند ❁ عاشقاں بندۂ حال اند و چناں نیز کنند
(اقبالؒ)

فہرست عنوانات

عنوان	صفحہ
انتساب	۳
سطورِ اولین	۱۷
عرضِ ناشر	۲۰
پیش لفظ	۲۲
کتاب کے مآخذ	۳۲
پہلا باب	
اجدادِ کرام	۵۵
نسب	۵۵
سید محمد المہدی	۵۶
محمد المہدی کی شہادت	۵۷
سید ابراہیم	۵۸
سید قطب الدین محمد	۶۰
سید قطب الدین کے اخلاف	۶۱
قاضی سید محمود و قاضی سید احمد	۶۲
سید محمد فضیل	۶۳
دوسرا باب	
حضرت سید علم اللہ	۶۵
ابتدائی حالات	۶۵
ملازمت اور ترک و تجرید	۶۶
بیعت و خلافت	۶۸
رائے بریلی میں قیام	۶۹
سفرِ حج	۷۱
فضائل	۷۲
صحیح اسلامی زندگی	۷۴
شانِ استغناء	۷۶
کمالِ رضا	۷۷
وصال	۷۸
تیسرا باب	
علم اللّٰہی خاندان	۷۹
سید علم اللہ کی اولاد	۷۹
سید محمد آیت اللہ	۸۰
سید محمد حسن اور ان کے بھائی	۸۲
سید ابو سعید	۸۳
سید محمد ہدیٰ	۸۵
سید محمد نور کی اولاد	۸۷
سید محمد عرفان	۸۸
سید شہید کے بھائی اور بہنیں	۸۸
سید شہید کا بیان	۹۰
ذاتی شرف اور خاندانی عظمت	۹۱
چوتھا باب	
پیدائش اور عہدِ طفولیت	۹۲
پیدائش	۹۲

عنوان	صفحہ
تعلیم	۹۳
اُمیت کا افسانہ	۹۴
مردانہ کھیلوں کا شوق	۹۵
جذبۂ جہاد	۹۶
ورزشیں	۹۶
غیر معمولی قوت	۹۷
شناوری	۹۸
کلیجی کھانے کا شوق	۹۸
خدمتِ خلق	۹۹
فرقہ وارانہ کشمکش	۱۰۰
فطری سعادت	۱۰۰
پانچواں باب	
لکھنؤ اور دہلی کا سفر	۱۰۲
سفر لکھنؤ	۱۰۲
قیامِ لکھنؤ کے حالات	۱۰۴
لکھنؤ سے کوچ	۱۰۵
قصدِ دہلی	۱۰۶
سفر کی کیفیت	۱۰۸
بعض عجیب و غریب روایتیں	۱۰۹
چھٹا باب	
دماغی اور روحانی تربیت	۱۱۱
شاہ عبدالعزیز سے ملاقات	۱۱۱
اکبرآبادی مسجد	۱۱۲
سلام مسنون کا معاملہ	۱۱۴
تحصیل علم	۱۱۵
علم کا صحیح مفہوم	۱۱۶
زمانہ طلبِ علم کے بعض واقعات	۱۱۷
بیعتِ تزکیۂ نفس	۱۱۹
ولایتِ انبیاء اور ولایتِ اولیاء	۱۲۰
شب قدر اور سعادتِ حضوری	۱۲۱
دہلی سے رائے بریلی	۱۲۳
شادی	۱۲۴
عبداللہ پہلوان کا واقعہ	۱۲۴
ساتواں باب	
نواب امیر خاں کی رفاقت	۱۲۶
مستقل مشغولیت کا انتظام	۱۲۶
اخفاءِ حال اور مشقِ سپہ گری	۱۲۷
حقیقی مقصد	۱۲۹
ہندوستان کا سیاسی نقشہ	۱۳۰
انگریز	۱۳۲
نواب امیر خاں	۱۳۳
ہلکر سے تعلق	۱۳۳
آخری دور کی سب سے بڑی آزاد قوت	۱۳۵
سید صاحب کا نصب العین	۱۳۶
سید صاحب مختار تھے یا مامور	۱۳۷

عنوان	صفحہ
● کیفیتِ سفر	۱۳۸
آٹھواں باب	
● عسکری زندگی کا دَور	۱۴۰
● دھمکولہ کا محاصرہ	۱۴۰
● جے پور کی جنگ	۱۴۱
● شہر پر حملہ	۱۴۱
● محاصرہ اور صلح	۱۴۲
● سوانح نگارانِ سید کے بیانات	۱۴۳
● مادھوراج پوری کا محاصرہ	۱۴۴
● متفرق واقعات	۱۴۵
● طریق اصلاح وہدایت	۱۴۷
● نواب کے ساتھ تعلق	۱۴۸
● مالی حالت	۱۴۹
● رفیق	۱۵۰
● ریاضتیں	۱۵۱
● لطیفہ	۱۵۲
● ایک عجیب قصہ	۱۵۲
نواں باب	
● نواب امیر خاں سے علیحدگی	۱۵۴
● امیر خاں کی حالت	۱۵۴
● جودھپور کا ایک واقعہ	۱۵۵
● وسطِ ہند کی حالت	۱۵۶
● نواب امیر خاں کی مشکلات	۱۵۷
● عہد نامہ	۱۵۸
● انگریزوں کی عیاری	۱۵۹
● سید صاحب کی طرف سے مخالفت	۱۶۰
● آخری کوشش	۱۶۱
● شاہ عبدالعزیز کو خط	۱۶۲
● اپنوں کی افسانہ طرازیاں	۱۶۲
● انگریزی چالیں	۱۶۴
● تاریخ مراجعت	۱۶۴
دسواں باب	
● دعوتِ اصلاح کا آغاز	۱۶۶
● دہلی میں تشریف آوری	۱۶۶
● شاہ عبدالعزیز کا خواب	۱۶۶
● اصلاح وتجدید کی اسکیم	۱۶۷
● آغازِ بیعت	۱۶۹
● مولانا عبدالحیٔ کی بیعت	۱۷۰
● شاہ اسماعیل کی بیعت	۱۷۱
● شہرتِ عام	۱۷۲
● مقامِ محبوبیت	۱۷۳
● ''توجہ'' کی کیفیت	۱۷۴
● ملائے بخارا کی تربیت	۱۷۵
● مسجد کی چھت کی صفائی	۱۷۶
● بھائی کی تشریف آوری	۱۷۶
● سید اسحاق کا بیان	۱۷۷

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
جماعت اور اس کے مصارف	۱۷۸	فراخیٔ رزق کی دعاء	۱۹۶
گیارہواں باب		عبادات	۱۹۶
دوآبے کا دَورہ اور مراجعت وطن	۱۷۹	مراقبہ لوجہ اللہ	۱۹۷
طلبی کے خطوط	۱۷۹	فرائضِ مصالحت	۱۹۸
دورے کی عام کیفیت	۱۷۹	تعمیر مساجد	۱۹۹
رُفقائے سفر	۱۸۰	اقربا کو تفہیم	۲۰۱
موسم	۱۸۰	گھر پہنچ کر معافی مانگی	۲۰۱
مختلف مقامات میں مدت قیام	۱۸۱	جہاد کے لئے تیاری	۲۰۲
قابلِ ذکر واقعات	۱۸۱	مراقبوں کا صحیح وقت	۲۰۳
بڑھانہ اور پھلت	۱۸۲	اسلامیت کا حقیقی وظیفہ	۲۰۳
باقی مقامات	۱۸۳	باطنی ترقی کا بلند ترین مقام	۲۰۴
دَورے پر تبصرہ	۱۸۵	صراطِ مستقیم	۲۰۵
اصل مدعا	۱۸۶	**تیرہواں باب**	
قصدِ وطن	۱۸۷	نکاحِ بیوگان اور واقعہ نصیر آباد	۲۰۶
سید اسحاق کے انتقال کی خبر	۱۸۷	نکاحِ بیوگان	۲۰۶
طریقۂ محمدیہ	۱۸۸	دنیوی رشتے اور علاقۂ عبودیت	۲۰۷
سکھوں کے ساتھ جہاد کا معاملہ	۱۸۹	ایک خواب	۲۰۸
رائے بریلی میں	۱۹۰	اقربا کے سامنے وعظ	۲۰۹
بارہواں باب		نکاح	۲۱۱
رائے بریلی میں زندگی	۱۹۲	اعلانِ عام اور اثرات ونتائج	۲۱۱
چھبیس مہینے کی سرگرمیاں	۱۹۲	نصیر آباد	۲۱۲
عام کیفیت	۱۹۲	شیعہ سنی اختلاف	۲۱۳
سید محمد علی کا واقعہ	۱۹۴	سنیوں کی امداد طلبی	۲۱۴

عنوان	صفحہ
سید صاحب کے انتظامات	۲۱۵
سعیٔ مصالحت	۲۱۶
کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما	۲۱۶
سید دلدار علی کی سعی	۲۱۷
مصالحت	۲۱۸
واقعے کی اہمیت	۲۱۹
چودھواں باب	
تبلیغی دورے	۲۲۰
اصلاح و دعوت	۲۲۰
شوق و طلبِ عام	۲۲۰
سلون	۲۲۱
الٰہ آباد	۲۲۲
شیخ غلام علی	۲۲۳
بنارس	۲۲۴
سلطان پور	۲۲۶
پہلا دورۂ کان پور	۲۲۶
دوسرا دورہ	۲۲۷
مراجعت	۲۲۸
دعوتِ عزیمت	۲۲۹
پندرہواں باب	
دورۂ لکھنؤ	۲۳۱
نائب السلطنت اودھ کا دعوت نامہ	۲۳۱
دعوت نامہ کیوں بھیجا؟	۲۳۲
سفر	۲۳۳
جائے قیام	۲۳۵
دعوتیں	۲۳۶
اصلاحی کام	۲۳۷
بیعت	۲۳۹
فاسقوں کی اصلاح	۲۴۱
معتمد الدولہ کی روش بدل گئی	۲۴۲
معتمد الدولہ کے ہاں دعوت	۲۴۴
جہاد شانِ ایمان ہے	۲۴۵
مراجعت	۲۴۶
تعمیر مکان	۲۴۷
سولہواں باب	
عزمِ حج	۲۴۹
غیر متوقع فیصلہ	۲۴۹
ارادہ کیوں بدلا؟	۲۵۰
فتوے کا پس منظر	۲۵۱
عبرت ناک بے عزمی	۲۵۲
شاہ عبدالعزیز کا فیصلہ	۲۵۳
وسائل اور عمل	۲۵۴
خطوطِ دعوت	۲۵۵
اقربا کو دعوت	۲۵۶
عازمین کی آمد	۲۵۷
قافلہ	۲۵۸

عنوان	صفحہ
سترہواں باب	
✿ سفرِ حج	۲۶۰
✿ (رائے بریلی سے الٰہ آباد تک)	۲۶۰
✿ روانگی	۲۶۰
✿ قافلے کا نقشہ	۲۶۱
✿ سید صاحب کی ہدایات	۲۶۲
✿ دلموٗ میں قیام	۲۶۳
✿ سید صاحب کا وعظ	۲۶۴
✿ برہانِ ربوبیت	۲۶۴
✿ قادرِ برحق	۲۶۵
✿ شرطِ سفر	۲۶۶
✿ دعائے فتح بابِ حرمین	۲۶۶
✿ دھئی دھمدھمہ	۲۶۷
✿ ڈگڈگی	۲۶۸
✿ کٹنہ	۲۶۹
✿ گیا، اوجھنی اور چپری	۲۶۹
✿ الٰہ آباد	۲۷۰
✿ قیام وطعام	۲۷۱
✿ نذریں	۲۷۱
✿ عازمین حج کی خدمت	۲۷۲
✿ رخصتی نذرانہ	۲۷۳
✿ بقیہ نذرانے	۲۷۳
✿ قیامِ الٰہ آباد کی عام کیفیت	۲۷۴
✿ ایک خراب رسم کا ازالہ	۲۷۵
اٹھارہواں باب	
✿ سفرِ حج	۲۷۶
✿ (الٰہ آباد سے ہوگلی تک)	۲۷۶
✿ بنارس سے روانگی	۲۷۶
✿ مرزاپور میں قیام	۲۷۷
✿ چنار گڑھ	۲۷۸
✿ بنارس میں قیام	۲۷۸
✿ زمانیہ	۲۸۰
✿ غازی پور-چھپرا	۲۸۱
✿ داناپور	۲۸۲
✿ پھلواری شریف	۲۸۴
✿ عظیم آباد	۲۸۵
✿ تبت میں تبلیغ کا انتظام	۲۸۷
✿ متفرق حالات	۲۸۸
✿ اگلی منزلیں	۲۸۹
انیسواں باب	
✿ سفرِ حج	۲۹۱
✿ (قیامِ کلکتہ کے حالات)	۲۹۱
✿ منشی امین الدین احمد	۲۹۱
✿ قیام کا اقرار	۲۹۲
✿ منزلِ مقصود	۲۹۳
✿ منشی صاحب کا اہتمامِ مہمانداری	۲۹۳

عنوان	صفحہ
قافلے کی سادگی اور دیانت	۲۹۴
ہدایتِ خلق	۲۹۵
ٹیپو سلطان کے شہزادے	۲۹۷
متفرق واقعات	۲۹۹
جہازوں کا انتظام	۳۰۱
سامانِ خورونوش	۳۰۲
سید صاحب کی سواری کا جہاز	۳۰۳
کلکتے کے ہدایا	۳۰۴
بیسواں باب	
سفرِ حج	۳۰۶
(حج وزیارت اور مراجعت)	۳۰۶
روانگی	۳۰۶
جہاز پر انتظامات	۳۰۷
سمندر کا سفر	۳۰۹
مخا میں قیام	۳۱۱
جدہ	۳۱۲
مکہ معظمہ میں داخلہ	۳۱۳
قیام گاہ اور عبادات	۳۱۴
مولانا اسماعیل کی والدہ	۳۱۶
ادائے حج	۳۱۷
مکہ معظمہ میں مشغولیتیں	۳۱۷
سید صاحب کی شانِ للّٰہیت	۳۱۸
مدینہ منورہ کا سفر	۳۱۹

عنوان	صفحہ
مدینہ منورہ میں ایک مہینہ	۳۲۱
مراجعت	۳۲۳
کلکتہ سے مونگیر	۳۲۴
عظیم آباد سے الٰہ آباد	۳۲۵
الٰہ آباد سے رائے بریلی	۳۲۷
قصیدہ	۳۲۸
سید صاحب کے ساتھی	۳۲۹
سید صاحب	۳۲۹
کارِ اصلاح	۳۳۰
مولوی عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل	۳۳۰
سید صاحب	۳۳۰
اکیسواں باب	
جہاد کے لئے دعوت و تنظیم	۳۳۱
دعوتِ عام	۳۳۱
جہاد کا مفہوم	۳۳۲
سید صاحب کا اختصاص	۳۳۳
مسلمانوں کی حالت	۳۳۴
تین راستے	۳۳۵
روحِ دعوت	۳۳۵
راہِ مراد	۳۳۶
بائیسواں باب	
سکھ اور انگریز	۳۳۸
جہاد کس کے خلاف؟	۳۳۸

عنوان	صفحہ
سکھ حکومت کی حقیقی حیثیت	۳۳۹
افسانہ طرازیاں	۳۴۱
سید صاحب کا عقیدہ کیا تھا؟	۳۴۲
انگریزوں کے بارے میں سید صاحب کی رائے	۳۴۳
سید صاحب کے نیازمندوں کا یقین	۳۴۵
مبنیٰ کیا تھا؟	۳۴۶
روشن شہادتیں	۳۴۷
مولوی محمد جعفر کی لغزش	۳۴۸
ضمیمہ	
میرزا حیرت	۳۴۹
مولوی جعفر	۳۴۹
اصل ونقل کا فرق	۳۵۱
تیئیسواں باب	
سلطنت یا اعلاءِ کلمۂ حق؟	۳۵۳
ریاست طلبی کا وسوسہ	۳۵۳
صرف اعلاء کلمۃ الحق	۳۵۴
طلبِ دنیا سے کامل براءت	۳۵۵
امامت وسلطنت کا فرق	۳۵۶
صرف احیاءِ دین	۳۵۷
صحیح اسلامی نصب العین	۳۵۸
چوبیسواں باب	
شبہات واعتراضات کی حقیقت	۳۶۰
جہاد فرضِ کفایہ ہے	۳۶۰
جامع الشروط امام کا معاملہ	۳۶۱
دورِ انحطاط کی مصیبتیں	۳۶۲
تحریکِ جہاد کی تضعیف	۳۶۳
امام کے ساتھ قبائح کا انتساب	۳۶۴
قوت میں مماثلت کا مسئلہ	۳۶۴
سید صاحب کی کیفیت	۳۶۵
حصولِ شوکت کا طریقہ	۳۶۶
نمازِ جمعہ کی مثال	۳۶۷
مسلمان کیا تھے کیا ہوگئے	۳۶۷
خلاصۂ مطالب	۳۶۸
پچیسواں باب	
سرحد کو کیوں مرکز بنایا؟	۳۷۰
سید صاحب کا بیان	۳۷۰
ہندوستان کی حالت	۳۷۱
سرحد کی کیفیت	۳۷۲
مولوی محمد جعفر تھانیسری کا بیان	۳۷۳
جدید نظریہ	۳۷۴
چھبیسواں باب	
سفرِ ہجرت (۱)	۳۷۵
از رائے بریلی تا اجمیر	۳۷۵
مالوفات کی قربانی	۳۷۵

عنوان	صفحہ
سید صاحب کی حالت	۳۷۶
زادِراہ	۳۷۷
اہل وعیال	۳۷۸
جذبۂ ایثار وخدمت	۳۷۹
تاریخ ہجرت	۳۸۰
روانگی	۳۸۱
گوالیار	۳۸۲
مہاراجا سے ملاقات	۳۸۳
غازیوں کی جماعتیں	۳۸۴
گوالیار سے ٹونک تک	۳۸۵
قیامِ ٹونک	۳۸۵
رسالدار عبدالحمید خاں	۳۸۸
دادا ابوالحسن اور سید ابومحمد	۳۸۸
مولانا عبدالحئی	۳۸۹
منازل کے بارے میں ایک تحریر	۳۸۹
ستائیسواں باب	
سفرِ ہجرت (۲)	۳۹۱
از اجمیر تا شکارپور	۳۹۱
اجمیر سے پالی	۳۹۱
پالی سے سوراہا	۳۹۲
کھوسا بلوچ	۳۹۳
پاڑیوا سے کٹھیار	۳۹۴
سندھ میں داخلہ	۳۹۵
پریشان کن حالات	۳۹۷
حیدرآباد میں استقبال	۳۹۸
والیٔ بہاولپور کو دعوتِ جہاد	۳۹۹
حیدرآباد کے متعلق تأثرات	۴۰۰
حیدرآباد سے پیرکوٹ	۴۰۱
سید صبغۃ اللہ شاہ	۴۰۳
سید حمیدالدین کی شہادت	۴۰۴
پیرکوٹ میں قیام	۴۰۵
پیرکوٹ سے شکارپور	۴۰۷
شکارپور میں قیام	۴۰۸
میرزا عطا محمد خاں کا بیان	۴۰۹
ضمیمہ	
اٹھائیسواں باب	
سفرِ ہجرت (۳)	۴۱۴
از شکارپور تا کوئٹہ	۴۱۴
شکارپور سے جاگن	۴۱۴
سید انور شاہ امرتسری	۴۱۵
خان گڑھ سے بھاگ	۴۱۷
بھاگ سے ڈھاڈر	۴۱۸
درۂ بولان کا سفر	۴۱۹
درۂ بولان کی منزلیں	۴۲۰
درے کی اہمیت	۴۲۱
کوئٹہ	۴۲۲

عنوان	صفحہ
بلوچستان کی سرگزشت	۴۲۳
اخوند فتح محمد	۴۲۴
انتیسواں باب	
سفرِ ہجرت (۴)	۴۲۶
از کوئٹہ تا پشاور	۴۲۶
کوئٹے سے روانگی	۴۲۶
افغانستان کی سیاسی کیفیت	۴۲۷
بارک زئیوں کی حکومت	۴۲۹
قندھار میں قیام	۴۳۰
قندھار سے غزنی	۴۳۱
خوانین غلزئی	۴۳۱
حکامِ کابل و غزنی کے نام خطوط	۴۳۳
کابل میں قیام	۴۳۵
منزلِ مقصود	۴۳۶
ھٰذِہٖ تَذْکِرَۃٌ	٤٣٧
تیسواں باب	
پنجاب و سرحد کا دورِ مصائب	۴۳۸
مغلوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب	۴۳۸
بندا بیراگی	۴۳۹
جان میلکم کا بیان	۴۳۹
بادشاہ کی آمد	۴۴۰
عبدالصمد خاں دلیر جنگ	۴۴۱
مرکزی حکومت کی ابتری اور پنجاب کی حالت	۴۴۲
رنجیت سنگھ	۴۴۳
صوبہ سرحد کی حالت	۴۴۴
سکھ راج کی کیفیت	۴۴۵
مزید بیانات	۴۴۷
اکتیسواں باب	
چارسدہ میں قیام	۴۴۹
چارسدہ کا قصد	۴۴۹
لشکر کی معیشت و معاشرت	۴۵۰
نماز و دعاء	۴۵۲
بیعت اور دعوتیں	۴۵۳
حسنِ تربیت کا ایک واقعہ	۴۵۳
ایک مشتبہ آدمی کی گرفتاری	۴۵۵
بدھ سنگھ سے جنگ کا فیصلہ	۴۵۶
نوشہرہ کا قصد	۴۵۷
بتیسواں باب	
جنگِ اکوڑہ	۴۵۹
طریقِ جنگ کا فیصلہ	۴۵۹
اعلام و انتباہ	۴۶۰
شبخون کیلئے مجاہدین کا انتخاب	۴۶۱
ترتیبات و ہدایات	۴۶۲

عنوان	صفحہ
لشکرگاہ کی کیفیت	۴۶۳
شبخون	۴۶۵
غازیوں کے کارنامے	۴۶۶
واپسی	۴۶۸
شہدا کے نام	۴۶۹
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۴۷۱
سید صاحب کا مکتوب	۴۷۲
جنگ اکوڑہ کے نتائج	۴۷۴
تینتیسواں باب	
واقعہ حضرو اور جنگ بازار	۴۷۵
خوانین وعوام کا رجوع عام	۴۷۵
سید صاحب ہنڈ میں	۴۷۶
خادے خاں	۴۷۷
حضرو پر چھاپے کی تجویز	۴۷۷
چھاپا	۴۷۹
سکھ سواروں کی یورش	۴۸۰
غازیوں کی پامردی	۴۸۰
مال غنیمت کی تقسیم پر جھگڑا	۴۸۱
سکھوں کی دوسری یورش	۴۸۲
چوتیسواں باب	
بیعت امامت جہاد	۴۸۴
ضرورت نظم ومرکزیت	۴۸۴
فتح خاں پنجتاری کی بیعت	۴۸۵
فیصلہ امامت جہاد	۴۸۶

عنوان	صفحہ
بیعت کی حیثیت	۴۸۶
دعوت عام	۴۸۷
امامت اور بورڈ	۴۸۸
حقیقت حال	۴۹۰
مسئلہ تربیت	۴۹۱
غیر ضروری اضطراب	۴۹۲
پینتیسواں باب	
اجتماع جیوش اسلامیہ	۴۹۳
اہل سرحد کا جوش وخروش	۴۹۴
سرداران پشاور کی عرضیاں	۴۹۴
سرداروں کے خصائل	۴۹۵
مختلف مؤرخوں کے بیانات	۴۹۵
سید صاحب کا طرز عمل	۴۹۶
گدڑی شہزادہ	۴۹۷
سید صاحب کے لشکر کی معیشت	۴۹۸
بدھ سنگھ کا خط	۴۹۹
سید صاحب کا جواب	۵۰۰
شان عزیمت	۵۰۱
لشکروں کی فراہمی	۵۰۱
چھتیسواں باب	
جنگ شیدو	۵۰۳
مقام جنگ	۵۰۳
نوشہرہ میں انتظامات	۵۰۴
لشکر ولشکر گاہ کی کیفیت	۵۰۴

عنوان	صفحہ
سید صاحب کی علالت	۵۰۶
لشکر کی صف آرائی	۵۰۷
لڑائی کا آغاز	۵۰۷
یار محمد خاں کی حرکت	۵۰۸
گوڈڑی شہزادے کی شہادت	۵۰۹
جنگ کی تاریخ	۵۱۰
سید صاحب کو زہر دینے کا معاملہ	۵۱۱
''عمدۃ التواریخ'' کی شہادت	۵۱۲
انگریزوں کے بیانات	۵۱۳
غداری کے اسباب	۵۱۵
سکھ دربار کا جشن	۵۱۶
غازیوں کا نقصان	۵۱۷
سینتیسواں باب	
سفر چنگلئی	۵۱۸
شاہ اسماعیل کا انہماک	۵۱۸
شاہ صاحب کی شانِ ایثار	۵۱۸
سید صاحب کا سفر	۵۲۰
باقی منزلیں	۵۲۱
سید صاحب کے رفقاء	۵۲۲
قیامِ چنگلئی	۵۲۴
بارگاہِ الٰہی میں دعاء	۵۲۵
مقامِ رضا میں عزیمت کا نقشہ	۵۲۵
ابتلا پر ابتلا	۵۲۶
رضا بہ قضا	۵۲۷

عنوان	صفحہ
اہلِ صادق پور کی شانِ ایثار	۵۲۸
عبداللہ بسم اللہ	۵۲۹
ضمیمہ	۵۳۰
اڑتیسواں باب	
بونیر وسوات کا دورہ	۵۳۶
دورے کا آغاز	۵۳۶
تختہ بند	۵۳۷
الئی، تورسک اور جوڑ	۵۳۸
بری کوٹ، تھانہ اور چکدرہ	۵۳۹
نمازِ عید	۵۴۰
مولوی محمد یوسف کی وفات	۵۴۱
قطب لشکرِ اسلام	۵۴۳
برسوات کا دورہ	۵۴۴
سفر مراجعت	۵۴۷
والیٔ چترال کا جواب	۵۵۰
اُنتالیسواں باب	
دعوتِ جہاد	۵۵۱
مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوششیں	۵۵۱
سلاطین وفرماں روا	۵۵۱
اُمراو خوانین	۵۵۳
داعیانِ دین کا تقرر	۵۵۵
غازیوں کی حالت	۵۵۶
عیدِ اضحیٰ	۵۵۷
اسلامی سادگی اور محنت	۵۵۷

سطورِ اولین

بسم اللّٰہ وحدہٗ والصلوٰۃ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ الیٰ یوم القیامۃ۔

مجاہدِ کبیر حضرت مولانا ومقتدانا سید احمد شہید رحمہ اللہ ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا وہ آفتابِ نیم روز اور مینارۂ نور ہیں جن کی مثال گذشتہ کئی صدیوں میں نہیں ملتی۔ اسلامی ہند کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی اور پرچم اسلام کی بلندی کے لئے آپ کی خدمات روزِ روشن کی طرح عیاں اور مشعلِ راہ ہیں۔

مجھے آپ کی زندگی کے قیمتی لمحات اور مجاہدات پر روشنی ڈالنا مقصد نہیں، کہ یہ کام ضخیم مجلدات کا متقاضی ہے اور الحمد للہ اب تک ہزاروں صفحات اس حکایتِ لذیذ اور روح پرور داستان میں مرقوم ہوکر تاریخ کا روشن باب بن چکے ہیں۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی مرتب کردہ دو ضخیم جلدیں ''سیرت سید احمد شہید'' گذشتہ تقریباً نصف صدی سے اہل علم وفدا کارانِ اسلامیت سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''سید احمد شہید'' حضرت مولانا غلام رسول مہرؔ کے اعجاز رقم قلم کا شاہکار ہے۔ یہ دراصل مولانا مہر کے اس ''زریں سلسلہ'' کی پہلی کڑی ہے جو انھوں نے حضرت سید احمد شہید، ان کی تحریک اور ان کے رفقاء کے حالات ومجاہدانہ کارناموں کے بیان میں مرتب کی ہے۔

حضرت مولانا غلام رسول مہر کی تحریر فرمودہ کتابوں (سید احمد شہید اول-دوم، جماعتِ مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین) تقریباً ایک صدی کی تاریخ ہے جو مجاہد کبیر، ان کی تحریک اور ان کے جانباز رفقاء کے حالات ومجاہدات اور خدمات کو منظرِ عام پر لانے میں نمایاں اور منفرد مقام رکھتی ہیں۔ یہ ایسی تاریخ ہے جس میں تاریخ نویس خود اس تاریخ کا ایک حصہ اور مشاہد محسوس

ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مولانا مہرؔ نے ان کتابوں کو صرف داستان برائے داستان اور حکایات وروایات اور کتابوں کی مدد سے مرتب نہیں کیا بلکہ بذاتِ خود ان تمام مواضعات، متعلقہ منازل، مقاماتِ جنگ و جہاد، مشاہد اور رہ گذروں کا مشاہدہ کیا، برسوں ان علاقوں کی دشت نوردی اور پیا سرائی کی جہاں ان مبارک نفوس کے قدم پڑے، جہاں انھوں نے اس بلند مقصد کے لئے لیل ونہار گزارے، جہاں انھوں نے جہادِ آزادی اور سربلندیٔ اسلام کے لئے اپنی ذہنی، روحانی اور جسمانی تمام صلاحیتیں صرف کیں اور حد یہ ہے کہ بیشتر نے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی، یعنی جامِ شہادت نوش کر کے اُس حیاتِ جاودانی سے سرفراز ہوئے جو عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ کے پروانۂ خاص کا حقدار بناتی ہے۔

مولانا مہرؔ کا اسلوب وبیان ادبیت ودلکشی اور جاذبیت ومحویت سے ایسا پُر ہے جس سے مطالعہ کنندہ نہ صرف اپنے آپ کو ان مقامات میں موجود محسوس کرتا ہے بلکہ اپنے اندر اعلائے کلمۃ اللہ اور سربلندیٔ اسلام کیلئے ایک جذبہ جوش مارتا ہوا پاتا ہے۔ انھوں نے اس تاریخ کو برسہا برس کی محنت سے لکھا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ سید احمد شہید کے اس مشن اور تحریک میں خود ڈوب کر اور اس میں خود کو محو کر کے لکھا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ وہ ان فدایانِ اسلام کی خدماتِ عالیہ اور جذبۂ مقدس کو سلامِ عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں۔

یہ کتابیں (سید احمد شہید، جماعتِ مجاہدین، سرگزشتِ مجاہدین) پچھلے کافی عرصہ سے ہندوستان میں نایاب ہو چکی تھیں، میری ایک عرصہ سے خواہش تھی یہ سیریز شائع ہو کر اہل علم اور شائقین حضرات کے لئے دستیاب ہونی چاہئے۔ کیونکہ بقول مولانا غلام رسول مہر، اگر اس عظیم تحریک کو تاریخ ہند سے نکال دیا جائے تو پھر اسلامی جدوجہد کے حوالہ سے باقی ہی کیا رہ جاتا ہے؟ ہمیں اپنے اسلافِ کرام کے ان مجاہدانہ کارناموں کی سرگزشت کو ہمیشہ اپنے سینوں سے لگا کر رکھنے اور مواقع وحالات کے مطابق ان کی تحریک کو آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ عزیز محترم مولانا شمشیر احمد قاسمی نے میری خواہش واصرار پر اس کام کا

بیڑا اٹھایا۔ پرانے ایڈیشنوں میں اغلاط بھی تھیں، ساتھ ہی کتابت میں یکسانیت اور جاذبیت بھی نہ تھی، اس لیے بہتر یہ معلوم ہوا کہ از سرِ نو کتابت کرا کر اس سیریز کو نئی آب وتاب کے ساتھ ہدیۂ قارئین کیا جائے۔

یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ اب اس سیریز کو ایک نیا نام دیا گیا ہے یعنی ''تحریکِ سید احمد شہیدؒ '' جو چار جلدوں پر مشتمل ہوگی، ٹائٹل اور اندر صفحات کے بالائی حصہ پر اس نئے نام کے ساتھ ساتھ پرانے ناموں کو بھی باقی رکھا گیا ہے۔

میں جناب مولانا شمشیر احمد قاسمی کو مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ میں مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی کی تصحیح کی خدمت کو سراہتے ہوئے دعا گو ہوں کہ رب کریم ہمیں بھی ان پاک نفوس کے جذبۂ اسلامیت اور عشقِ الٰہی کا کوئی حبہ اور حصہ نصیب عطا کر کے اپنی راہِ رضا پر چلنے توفیق ارزانی کرے اور اس فرشتہ صفت جماعت کی معیت نصیب فرمائے، آمین

الراقم
شمس الحق قاسمی
مکتبہ الحق (ممبئی)

عرضِ ناشر

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ الطیبین الطاہرین وصحبہ اجمعین.

مقامِ مسرت ہے کہ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے حالات وخدمات، ان کی تحریک اور ان کے رفقاء کی سرگزشت پر مشتمل یہ عظیم سیریز کتب (سید احمد شہید ہر دو جلد، جماعتِ مجاہدین، سرگزشتِ مجاہدین) جدید عنوان ''تحریک سید احمد شہید'' کے ساتھ شائع کرنے کی مجھے ایسے موقع پر سعادت حاصل ہو رہی ہے جب کہ ملک میں جدوجہد آزادیٔ ہند کی ڈیڑھ سو سالہ سالگرہ حکومتی سطح پر بڑے جوش وخروش سے منائی جارہی ہے۔ لیکن اس میں ہمارے اسلافِ کرام کی قربانیوں کو جس طرح نظر انداز کیا جارہا ہے وہ نہ صرف افسوسناک اور قابل مذمت ہے بلکہ ملت کے رہنماؤں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے لئے ایک تازیانہ بھی ہے۔ جو زمانہ کے جدید تقاضوں کی تفہیم، ان سے حصولِ مقصد کے امکانات اور مقابل ومخالف طاقتوں کے خلاف صف آرا اور متحد ہونے کی دعوت دے رہا ہے۔ یہ انھیں بتا رہا ہے ۔

اٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے

حقیقت تو یہ ہے ہمیں پیش قدمی کرتے ہوئے خود اپنے اسلافِ کرام کی خدمات اور قربانیوں کو منظر عام لانے کیلئے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں اور اپنے اسٹیج سے ان لوگوں کو اپنے بزرگوں کی مدح سرائی کے لئے مجبور کرنا چاہئے تھا، جن کے تغافل کا ہم آج رونا رو رہے ہیں۔

آزادیٔ ملک وملت اور سربلندیٔ اسلام کے لئے سرفروشانہ جدوجہد اور اہالیانِ اسلام کی عظمتِ رفتہ کی بازیابی کی کوشش میں حضرت سید احمد شہید اور ان کے جانباز رفقاء کا جو حصہ ہے، ان کی جو روشن خدمات ہیں، یہی اس سیریز کا موضوع ہے۔

اس سیریز کی چار ضخیم جلدیں جو تقریباً ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، ان کی کمپیوٹر

کتابت میں ایک اہم مسئلہ تصحیح کا تھا، چونکہ کمپیوٹر کتابت میں اغلاط رہ جاتی ہیں اور بعض مرتبہ وہ عجیب وغریب شکل اور الفاظ کا جامہ پہن لیتی ہیں۔

اس مشکل کا حل رب کریم نے اس طرح نکالا کہ جناب مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی نے اس اہم اور تاریخی سلسلہ کی کتابت وتصحیح کی ذمہ داری لے کر ایک طرح سے ہمارے لئے اس اہم مرحلہ کو آسان بنادیا۔ مولانا موصوف تصنیف تالیف اور تصحیح وترجمہ میں اپنی ایک شناخت قائم کرچکے ہیں، فرید بک ڈپو دہلی سے ان کی تصحیح کردہ وترتیب دادہ متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ گذشتہ سال حکیم الاسلام عالمی سیمینار کے موقع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی تالیفات ومضامین کا حسین مرقع سات جلدوں میں ان کا مرتب کردہ شائع ہوکر اہل علم وقدرداں حضرات سے خراجِ تحسین حاصل کرچکا ہے، ان کتابوں کا اجراء مقتدر علمائے کرام کے ہاتھوں مذکورہ سیمینار میں ہوا تھا۔

ایک قابل لحاظ کام یہ کیا گیا ہے کہ سابق ایڈیشنوں میں فہرست نامکمل تھی، صرف ابواب کے صفحات کی نشاندہی کی گئی تھی، موجودہ ایڈیشن میں تفصیلی فہرست مرتب کی گئی ہے، یہ یقیناً بڑی محنت کا کام ہے۔ جس سے ایک ہی نظر میں کتاب کے تمام مندرجات پوری طرح سامنے آجاتے ہیں۔

بہرحال مولانا محمد عمران قاسمی بگیانوی نے اس سلسلہ کتب کی کتابت وتصحیح کی خدمت انجام دے کر ہمارے لئے اس سلسلہ کی اشاعت کو کافی حد تک آسان بنادیا۔

اس کتاب کو مولانا غلام رسول مہر نے جس جانفشانی سے مرتب کیا تصنیف وتالیف کی دنیا میں وہ کسی عجوبہ سے کم نہیں۔ اللہ رب العزت کا شکر واحسان ہے کہ اس نے ہمیں ایسی اہم کتابوں کی سیریز کی اشاعت کی توفیق سے نوازا۔ وماتوفیقی الاباللہ

شمشیر احمد قاسمی
سنابل کتاب گھر دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حکایت از قدِ آں یارِ دل نواز کنیم
بہ ایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنیم

میں نے اکتوبر ۱۹۳۴ء میں سید صاحب اور جماعت مجاہدین کے احوال و وقائع کی ترتیب کے متعلق مولانا محمد بشیر شہید کے ساتھ وعدہ کیا تھا تو یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ اس وعدے کے ایفاء کی صرف پہلی منزل طے کرنے میں اٹھارہ برس گذر جائیں گے اور یہ مدت اتنی طویل ہے کہ نومولود شیر خوارگی اور طفلی کے مدارج طے کرتا ہوا ذمہ دارانہ زندگی کے شہرستان میں پہنچ جاتا ہے۔ میں نے یہ بارِ گراں اس اعتماد پر بے تکلف اٹھالیا تھا کہ وقائع سرحد کے متعلق ضروری معلومات مولانا فراہم کردیں گے، نیز ان کی وساطت سے میں ان مآخذ تک پہنچ سکوں گا جنہیں عام طور پر دسترس سے باہر سمجھا جاتا تھا۔ باقی حالات میں خود جمع کرلوں گا۔

میں کابل سے چلا اور غزنی، قندھار، کوئٹہ ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ مولانا میری روانگی سے دس پندرہ دن بعد چمرکنڈ چلے گئے، جو اُن کا مرکز تھا، اصل وعدے پر صرف دو ماہ کی مدت گذری تھی کہ دفعۃً ان کی شہادت کا سانحۂ جانگزا پیش آگیا اور وہ روشنی بجھ گئی جس کی رہنمائی کے بھروسے پر میں اپنے سفینۂ شکستہ کو شب تاریک میں طوفانی سمندر کی موجوں کے حوالے کردینے پر آمادہ ہوگیا تھا۔

پنہاں تھا سخت دام قریب آشیانے کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مولانائے موصوف نے کابل میں تین بند لفافے مجھے دیے تھے، جنہیں یہ سمجھ کر ویسے کا ویسا محفوظ کر لیا تھا کہ جماعت مجاہدین کے حالات کی یہ پہلی قسط ہوگی، ان کی شہادت کے بعد لفافوں کو کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ چند کاغذوں پر متفرق نوٹ لکھ رکھے ہیں، اور ان میں زیادہ تر یہ ذکر ہے کہ مجاہدین نے مختلف اوقات میں کہاں کہاں مرکز بنائے، دو تین صفحوں پر کسی معترض کے اعتراضات کا نامکمل جواب ہے، چند اوراق پر ایک مقدمہ کی روداد درج ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ روداد ۱۹۲۱ء میں "سول" نے چھاپی تھی، مولانا نے اس کا اردو ترجمہ کرالیا تھا، ان معلومات کو سامنے رکھ کر ایک صدی کے سرفروشانہ مجاہدات کی کہانی کیونکر تیار ہوسکتی تھی؟ میرے دل پر مایوسی کی تیرگی چھا گئی، جن ولولوں کو اڑھائی مہینے تک اپنے لئے خدا داد سرمایۂ سعادت سمجھتا رہا تھا، وہ افسردگی کی خاک میں سو گئے، چند مہینے میں مولانا کے ساتھ عہد کا نقش بھی صفحۂ قلب سے محو ہو گیا۔

چار پانچ برس گذر گئے اور میں پوری دلجمعی سے اپنے سیاسی مشاغل میں ڈوبا رہا۔ ۱۹۳۹ء کی برسات میں مجھ پر بخار کا حملہ ہوا، دو تین روز کے بعد کمر اکڑ کر تختہ بن گئی۔ کئی روز تک یہ حالت رہی کہ دو آدمیوں کی مدد کے بغیر اٹھنا بیٹھنا محال تھا، بے چارگی کے اس دور میں ایک روز مولانا شہید یاد آ گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ جس تکلیف میں اب مبتلا ہوں، یہ دراصل اس شہید سے نقضِ عہد کے جرم کی سزا ہے، لیٹے لیٹے عجز والحاح سے دعاء کی کہ خدایا اگر مجھ میں اس عہد کو پورا کرنے کی کچھ بھی صلاحیت موجود ہے تو صحت عطا فرما، تھوڑی سی مہلت دے اور اپنے فضل و رحمت سے تکمیل کار کے اسباب فراہم کر دے، دیر تک حضرت علامہ اقبالؒ کا یہ شعر زبان پر جاری رہا:

حرفِ ناگفتہ مجالِ نفسے مے خواہد
ورنہ مارا بہ جہانِ تو سروکارِ کجاست

سراپا جرم وخطا کی دعاء کیا اور اس کا قبول کیا! خدا کے لطف وکرم سے دوسرے ہی دن صحت ہوگئی۔ بس اس وقت سے میں نے کمر ہمت باندھ لی اور فرصت کے بیشتر اوقات اسی کام کے لئے وقف کردیے۔ اپنے علم کی فرومائیگی اور وسائل کی قلت کا پورا اندازہ تھا، دل میں فیصلہ کرلیا کہ روزانہ دو نفل پڑھ کر دعاء کرتا رہوں گا، کہ یہ کٹھن منزل میرے لئے آسان ہوجائے۔ چودہ برس گذر چکے ہیں، میں سفر میں رہا یا حضر میں، لیکن اس عہد کی پابندی کو خدا نے ہر اختلال سے محفوظ رکھا۔

متعارف معلومات کو نئی عبارت کے آئینے میں سجا کر پیش کردینا چنداں مشکل نہ تھا، سید صاحب کے متعلق دو کتابیں پہلے چھپ چکی تھیں۔ ۱۹۳۹ء میں سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب بھی شائع ہوچکی تھی، مجاہدین کے مختلف جنگوں کے حالات متعدد انگریزی کتابوں سے اخذ کئے جاسکتے تھے، ان معلومات کو سمیٹ کر دو یا تین جلدیں لکھ دینا غیر معمولی کاوش کا محتاج نہ تھا، لیکن میرے سامنے ابتدا ہی سے اس کام کے سرانجام کا ایک خاص معیار اور ایک خاص پیمانہ تھا، اگرچہ اس کی تکمیل بظاہر بہت دشوار نظر آتی تھی، تاہم طبیعت اس معیار کے ترک یا اس کے درجے میں تنزل پر کبھی راضی نہ ہوئی۔

دنیا کو دعوتِ تماشا دینا اسی صورت میں مناسب ہے کہ انسان کوئی ایسی چیز منظرِ عام پر لاسکے جس سے نگاہیں عام طور پر آشنا نہ ہوں، معلوم عام وقائع کو نئے اسلوب اور نئے انداز میں دہرا دینا ہرگز اس امر کا مستحق نہیں کہ اس میں وقت صرف کیا جائے یا اسے قابلِ ذکر کام سمجھا جائے۔

کبرِ نفس سے ہزار بار پناہ مانگتا ہوا صرف تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ خدائے رحیم وکریم کے فضل ورحمت سے مجھے وہ کتابیں ملتی رہیں، جن کے وجود کا بھی ابتداء میں علم نہ تھا اور زیادہ تر گھر بیٹھے بیٹھے ان بیش بہا ذخیروں سے استفادہ کرسکا، جو میرے خواب وخیال میں بھی نہ آئے تھے۔ پھر جو معلومات مہیا ہوئیں، انہیں دلخواہ

ترتیب کی توفیق عطا ہوئی، بے محل نہ ہوگا اگر بطریق سپاس وشکرانہ اس اجمال کی تھوڑی سی تفصیل عرض کر دوں۔

(۱) سب سے پہلے مجھے ''منظورۃ السعداء'' کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی سے ملا، یہ نسخہ سید صاحب کے متعلق مفصل معلومات کا پہلا خزانہ تھا اور اسی کو سامنے رکھ کر میں نے سید شہید کی سیرت کا ابتدائی خاکہ تیار کیا۔

(۲) حسنِ اتفاق سے صدیق مکرم امتیاز علی خاں صاحب عرشی رام پوری لاہور آئے، برادرم مولانا ظفر اقبال ایم، اے نے میری مشغولیت کا ذکر ان سے کیا تو انہوں نے ''وقائع احمدی'' کا نام لیا اور رام پور پہنچ کر یکے بعد دیگرے ''وقائع'' کی دو جلدیں میرے پاس بھیج دیں، یہ جلدیں جنگِ مردان تک کے حالات پر مشتمل تھیں۔

موصوف نے بعد میں میری درخواست پر مومن خاں کے فارسی دیوان سے وہ قطعات وقصائد نقل کر کے بھیجے جو سید صاحب اور مجاہدین سے متعلق تھے۔

(۳) مولانا ظفر اقبال ہی کی وساطت سے مجھے مکاتیب کا وہ نسخہ مولانا ثناء اللہ مرحوم امرتسری کے کتب خانے سے ملا، جسکے حوالے کتاب میں ''مکاتیب شاہ اسماعیل'' کے نام سے آئے ہیں، اس ناقص نسخے کو مولانا محمد شفیع پرنسپل اورینٹل کالج کے نسخے سے مکمل کیا، اس کتاب کا ایک ناقص لیکن نہایت خوش خط نسخہ مرحوم پروفیسر سراج الدین آزر نے دیا۔

(۴) ''وقائع'' کے باقی متفرق اجزاء مجھے محترم سید ابوالحسن علی نے مرحمت فرمائے، نیز ''سیرۃ علمیہ تذکرۃ الابرار'' ''نتائج الحرمین'' سید موصوف ہی کی مہربانی سے میں نے دیکھیں۔ سید صاحب کے خاندانی حالات کے متعلق مجھے وقتاً فوقتاً استفسارات کی ضرورت پڑتی رہی، سید ابوالحسن علی نے ہر موقع پر اپنی معلومات سے مستفید فرمایا، متعدد مکاتیب کی نقلیں انہیں سے ملیں، ''منظورۃ السعداء'' کا جو نسخہ پنجاب یونیورسٹی میں ہے،

اسکے بعض اجزاء غائب تھے، یہ اجزاء بھی سید ممدوح ہی کی عنایت سے میں نے دیکھے۔

(۵) احوالِ سرحد کے متعلق زیادہ تر معلومات میں نے بزرگ محترم سید عبد الجبار شاہ صاحب ستھانوی (سابق بادشاہ سوات وسابق وزیر ریاست امب) کی مرتبہ کتابوں سے حاصل کیں، جو ابھی تک شائع نہیں ہوئیں۔ اسی بزرگ اور ان کے بھتیجے برادرم سید مبارک شاہ مرحوم گندفی کی معیت میں مجھے اکثر مقاماتِ جنگ دیکھنے کا موقع ملا، تین مرتبہ انہیں کے ساتھ میں بالاکوٹ گیا، ''درمقال'' کی نقل بھی سید عبد الجبار شاہ صاحب ہی نے عنایت فرمائی۔

(۶) سید صاحب کے مکاتیب کی پہلی جلد اور ''الدر المنثور'' یا ''تذکرۂ صادقہ'' مجاہدین کے مرکز ''اسمست'' سے میرے پاس آئیں۔

(۷) شہزادہ برکت اللہ مدار المہام جماعت مجاہدین کی عنایت سے چملہ، بونیر، سوات اور خدوخیل کے وہ مقامات دیکھے جن کا ذکر سید صاحب کے تبلیغی دوروں یا جنگوں میں آیا ہے، تین دن ''اسمست'' میں گزارے جو پچاس برس سے مجاہدین کا مرکز چلا آتا ہے۔ بعض پرانی تحریرات بھی دیکھیں، نیز مولانا رحمت اللہ مرحوم امیر جماعت مجاہدین سے امیر عبد اللہ مرحوم اور امیر عبد الکریم مرحوم کے عہد کی بعض جنگوں کے حالات سنے۔

(۸) بعض قلمی کتابیں کتب خانہ ٹونک میں تھیں، تقسیم ملک کے بعد ٹونک پہنچنا سہل نہیں رہا تھا، حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ وزیر تعلیمات ہند نے میری درخواست پر وہ کتابیں ٹونک سے دہلی منگوالیں اور میں نے دو مرتبہ حضرت مولانا کی خدمت میں پہنچ کر ان سے استفادہ کیا۔ کتاب کی ترتیب کے بارے میں بھی حضرت ممدوح سے نہایت قیمتی مشورے ملے، اگرچہ افسوس ہے کہ ان کی گراں بہا مشغولیتوں کے پیش نظر میں مسودہ انہیں نہ دکھا سکا۔

(۹) مولانا سید نور احمد (ابن سید اسحاق، ابن سید اسماعیل برادر زادہ و داماد سید

صاحب) نے مجھے ''وقائع'' کا ایک نہایت عمدہ نسخہ مرحمت فرمایا، جو اگرچہ مکمل نہ تھا، لیکن میرے لئے بہرحال ایک بیش بہا عطیہ تھا، نیز علم اللّٰہی خاندان کے مفصل نسب نامے کا ایک فارسی نسخہ اور ایک اردو نسخہ سید نور احمد ہی سے مجھے ملا۔

(۱۰) سید صاحب کے خاندان کے متعلق کئی ضروری باتیں مجھے سید طلحہ اور سید زبیر سے معلوم ہوئیں، جو اسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیز ''وقائع'' کا ایک نامکمل نسخہ انہیں کی مہربانی سے ہاتھ آیا جس سے سید صاحب کے حالات کے متعلق بعض مشکل عقدے حل ہوئے۔

(۱۱) مولانا مسعود عالم صاحب ندوی اور خان محمد اجمل خاں صاحب پرائیویٹ سیکریٹری حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے بھی بعض قیمتی چیزیں ملیں، خاں صاحب موصوف کے جد امجد خان اللہ داد خاں خود مجاہدین میں شریک رہے تھے۔

(۱۲) نواب فرید خاں صاحب والیٔ امب، جناب عبدالودود میاں گل والیٔ سوات (جواَب فرمانروائی سے دست کش ہو چکے ہیں) اور شہزادہ جہاں زیب (حال والیٔ سوات) نے اپنے علاقوں کے وہ مقامات دیکھنے میں میری امداد فرمائی جن کا ذکر سید صاحب کے مجاہدات میں آیا ہے۔ والیٔ امب سے ان کے خاندان کے متعلق بیشتر معلومات حاصل ہوئیں، یہ معلومات سید صاحب کی سیرت کے سلسلے میں ضروری تھیں۔

ان تمام حضرات کا دلی شکریہ مجھ پر واجب ہے، اور اس کارِ خیر کے انجام میں ثواب کے بیشتر حصے کے حقدار بھی وہی ہیں۔ ان کے سوا جن حضرات نے میری مدد فرمائی، ان کے نام درج کروں تو ایک دفتر تیار ہو جائے، ان سب کا بھی تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

کتاب کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں، لیکن یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ یہ ایک شخصیت کی سیرت نہیں بلکہ ایک نہایت اہم دینی تحریک کی مفصل سرگزشت ہے، جو اس عاجز کے محدود علم کے مطابق پاک و ہند کی اسلامی تاریخ میں اپنی نوعیت کی

یگانہ تحریک تھی۔ یہ جن حالات میں شروع ہوئی تھی وہ ہمارے عہد کے حالات سے بہت مشابہ تھے، لہٰذا اس سرگزشت میں ہمارے لئے عبرت وموعظت کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ موجود تھا، اس کے باب میں بیگانوں کی غلط فہمیاں اور مغالطہ انگیزیاں چنداں تعجب انگیز نہ تھیں، لیکن جن یگانوں نے اس پر قلم اٹھایا، وہ بھی اس کی عظمت یا صاحب دعوت کی بلند نگہی اور عزیمت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے، یا ٹھوکریں کھا کھا کر اس کی آبرو مٹاتے رہے، یا قلتِ معلومات کی بناء پر تذبذب میں پڑ کر کوئی واضح راہِ فیصلہ پیدا نہ کر سکے۔

میں نے اپنی ناچیز بساط کے مطابق کوشش کی ہے کہ اس تحریک احیائے دین کے تمام پہلو روشن ومبرہن ہو کر سامنے آجائیں۔ یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا کہ جو کچھ چاہتا تھا، وہ پورا ہو گیا لیکن اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا بہ صمیم قلب اعتراف کرتا ہوا کہہ سکتا ہوں کہ یہ کتاب پڑھ لینے کے بعد سید صاحب اور ان کی تحریک سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو مختلف احوال ووقائع کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کرنے میں ایک حد تک سہولت ہوگی۔ تاریخ پاک وہند میں جس عہد کو مسلمانوں کا دورِ زوال کہا جاتا ہے، یہ اُسی کا ایک باب ہے، لیکن کیا کوئی حق پسند اور حق شناس انسان اس اعتراف میں تامل کرے گا کہ مسلمانوں کے عہدِ عروج واقبال کا بھی کوئی حصہ اصولاً اس سے زیادہ شاندار یا زیادہ قابلِ فخر نہیں ہو سکتا؟

حکم وفیصلہ کا انحصار نتائج پر نہیں بلکہ عزمِ جہاد، ہمتِ عمل اور راہِ حق میں کمالِ استقامت پر ہوتا ہے، کیا کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ کمالِ عزیمت اور کمالِ ہمت واستقامت کی ایسی مثالیں ہمارے عہدِ عروج کی داستانوں میں مل سکتی ہیں، جن میں مقصود ونصب العین دین اور صرف دین رہا ہو؟

سید صاحب نے زندگی کی چالیس بہاریں وطن مالوف میں گزاریں، حیاتِ مستعار کے باقی اوقات سرحد کے میدانوں اور کوہستانوں میں بسر کئے۔ جن حضرات

نے ان کے متعلق تحریر فرمایا وہ نہ یہاں کے مفصل حالات سے آگاہ تھے، نہ سرحد کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کا ان کے پاس کوئی ذریعہ تھا، نہ وہ سید صاحب کو ایک مخصوص تحریک کے داعی اور ناظم کی حیثیت میں دیکھ سکے۔ اس وجہ سے کسی واقعے کے پس منظر کی کھوج لگانے کی بھی انہوں نے ضرورت محسوس نہ کی، خصوصاً سرحدی جنگوں یا رئیسوں کے حالات پر پہنچ کر تو ان کی کیفیت یہ ہو جاتی رہی، گویا چلتے چلتے ایک تنگ و تاریک سرنگ میں داخل ہو گئے، جس کے گرد و پیش کی ہر شئے سے وہ کاملاً نا آشنا تھے۔ میں نے اپنے محدود علم کے مطابق ان کوتاہیوں کی تلافی کر کے سید صاحب کے پورے حالات کو روشنی میں لانے اور انہیں حقیقی معنوں میں تاریخی واقعات کا درجہ دینے کی سعی کی ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ میں کس حد تک کامیاب ہوا۔

ابتدا میں خیال تھا کہ سید صاحبؒ اور جماعت مجاہدین کی سرگزشت زیادہ سے زیادہ دو جلدوں میں پوری ہو جائے گی، لکھنے بیٹھا تو محض سید صاحبؒ ہی کے احوال و وقائع کم و بیش ایک ہزار صفحات پر پھیل گئے:

ہمیں عشق است بر خود چیدہ چندیں داستاں ورنہ
کسے از معنی یک حرف صد دفتر نمی سازد

میں نے پہلی مرتبہ اس کا مسودہ ۱۹۴۶ء میں مکمل کر لیا تھا، پھر اس میں قطع و برید کرتا رہا کہ مطالب کو نقصان پہنچائے بغیر اسے جتنا گھٹایا جا سکتا ہے، گھٹا دیا جائے۔ اس موقع پر پورے موضوع کو چار جلدوں میں تقسیم کیا: دو جلدیں سید صاحبؒ کے متعلق جو ملاحظہ گرامی میں پیش ہیں، تیسری جلد ان مجاہدین کے لئے وقف کی جو سید صاحب کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے یا واقعۂ بالاکوٹ کے بعد لوٹ آئے، پھر مجاہدات میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اسی جلد میں جماعتی تنظیم کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں۔

یہ جلد اس وجہ سے بھی ضروری تھی کہ ان مجاہدین کے حالات مرتب ہو جائیں

جنھوں نے اپنی جانیں تحریک احیائے دین کیلئے بے دریغ وقف کیں، اس وجہ سے بھی ضروری تھی کہ اس کے بغیر سید صاحب کی شانِ تربیت اور بے مثال صلاحیتِ مردم گری کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا، باقی دو جلدوں میں ۱۸۳۱ء سے ۱۹۴۷ء تک جماعت مجاہدین کی سرگزشت ہوگی، ان حصوں کا اتمام خدا کے ہاتھ ہے، میرے پاس پورا سامان موجود ہے، کچھ اجزا مرتب بھی کر چکا ہوں، لیکن سید صاحب کی سیرت کو مطبع کے حوالے کئے بغیر دوسری طرف دلجمعی سے متوجہ نہ ہوسکتا تھا۔

سید صاحب کے متعلق اردو، فارسی، انگریزی اور عربی میں جس مکتوب یا مطبوع ذخیرے کا مجھے علم ہوسکا اور اس تک پہنچنا نصیب ہوا، وہ میں دیکھ چکا ہوں۔ ایک ایک واقعے کی صحیح کیفیت معلوم کرنے کیلئے میں نے کٹھن وادیاں طے کی ہیں اور نہایت دشوار گزار گھاٹیوں میں مدتوں چکر لگائے ہیں، جہاں قدم قدم پر خستگی و شکستگی کو قبول کئے بغیر چارہ نہ تھا۔ ایک ایسے کام میں، جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے والے بھی خیرہ ذوقی کے اس عہد تاریک میں بہت کم اصحاب نظر آتے ہیں، میں نے زندگی کے بہترین اوقات بے تامل صرف کئے، نہ ہمت نے ساتھ چھوڑا، نہ صبر کی پیشانی پر کوئی شکن نمودار ہوئی، نہ طلب و جستجو کی آنچ مدھم ہونے پائی، نہ محنت وکاوش کے حوصلوں پر افسردگی چھائی۔

ہزاروں صفحات کی ایک ایک سطر کے پیچ وخم میں میری نظریں بارہا دوڑی ہیں، مختلف عقدوں کی کشایش میں میرے دماغ کی صلاحیتِ غور وفکر برسوں جولانیوں میں سرگرم رہی ہے۔ میں نے سید صاحبؒ کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھا، اس کا نقشہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں اور سازِ وجود اس ترانے کے لئے وقف ہے:

باایں ہمہ بے حاصلی وہیچ کسی ❁ درماندہ بہ نارسائی وبوالہوسی
دادیم نشاں ز گنج مقصود ترا ❁ گرما نہ رسیدیم تو شاید برسی

میں اپنے علم و عمل کی بے بضاعتی کے پیش نظر اس اہم کام کی تکمیل کا اہل نہ تھا، جو کچھ ہوا یہ محض خدائے لایزال کا فضل تھا۔ ایک قرن کے لیل و نہاران پاک نفس ہستیوں کے ذکر و فکر میں گزار چکا ہوں، جن کا اُٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، جاگنا سونا، جینا مرنا صرف خدا کی رضا سے وابستہ رہا۔ شاید مجھ آلودہ داماں اور سراپا جرم و عصیاں کیلئے یہی مشغولیت وسیلۂ مغفرت بن جائے۔

امید ہست کہ بیگانگی عرفیؔ را
بہ درستیٔ سخن ہائے آشنا بخشند

مہرؔ

مسلم ٹاؤن، لاہور
۲۲ر ستمبر ۱۹۵۲ء

کتاب کے مآخذ

سید صاحبؒ کی سیرت اور جماعتِ مجاہدین کے حالات جن کتابوں سے اخذ کئے، ان میں سے چند اہم کتابوں پر مفصل بحث کا ارادہ تھا، لیکن اب دیکھتا ہوں کہ کتاب کی ضخامت بہت بڑھ گئی ہے اور مآخذ کے باب میں رشتۂ بیان کو ابتدائی پروگرام کے مطابق کھلنے دیا جائے تو اس کتاب کو دو کے بجائے تین جلدوں میں بانٹنا پڑے گا۔ لہٰذا اس کے سوا چارہ نہیں کہ چند مآخذ کی سرسری کیفیت بیان کر کے باقی کتابوں کے صرف نام درج کر دیے جائیں۔

کتابوں کی جو فہرست درج کر رہا ہوں اس میں وہ ساری نہیں آئیں جو میں نے اس سلسلے میں پڑھیں، ممکن ہے بعض پہلی نظر میں اصل موضوع سے بے تعلق نظر آئیں لیکن سفر ہجرت اور بعض دوسرے سفروں کے راستے معلوم کرنے کیلئے مجھے خدا جانے کہاں کہاں دستک دینی پڑی۔ بعض اوقات ایک غیر معروف شخص کے متعلق ضروری حالات معلوم کرنے کے سلسلے میں چار چار سو صفحات کی کتابوں کی ایک ایک سطر چھاننی پڑی۔ گیا۔ فہرست پیش کرنے سے خدانخواستہ یہ مقصود نہیں کہ اپنی مشقت کی اہمیت بڑھاؤں، یا اسمائے کتب کی طویل صف بندی سے اپنی کم علمی کو وقیع بناؤں، مقصود محض یہ ہے کہ جو اصحابِ علم اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اگر بطور خود تحقیق کرنا چاہیں، تو یہ فہرست ان کے لئے مفید زادِ راہ کا کام دے سکے۔

(۱) منظورۃ السعداء فی احوال الغزاۃ والشہداء

مرتبہ سید جعفر علی نقوی ساکن مجھ امیر ضلع گورکھپور۔ سید جعفر علی نقوی واقعہ بالاکوٹ

سے تقریباً سوا برس پہلے جہاد کی نیت سے سرحد پہنچے تھے، چونکہ اچھے عالم اور مشاق محرر تھے، اس لئے منشی خانے سے وابستہ ہو گئے۔ شاہ اسماعیل کے کاتب خاص تھے، سید صاحب کی شہادت کے بعد وطن لوٹ آئے۔ ۱۲۱۰ھ (۹۶-۱۷۹۵ء) میں پیدا ہوئے، رمضان المبارک ۱۲۸۸ھ (اواخر نومبر یا اوائل دسمبر ۱۸۷۱ء) میں وفات پائی۔

کتاب کا تاریخی نام ''تاریخ احمدیہ'' ہے، جس سے تاریخ تالیف ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) نکلتی ہے۔ فاضل مؤلف نے اس کارِ خیر کی تحریک نواب محمد علی خاں سے منسوب کی ہے، جو نواب وزیر الدولہ کے صاحبزادے تھے اور ۱۸۶۵ء میں فرمانروائے ٹونک بنے۔ میرا خیال ہے کہ نواب وزیر الدولہ نے نواب محمد علی خاں کو یہ سارا کام سونپ دیا تھا۔ سید جعفر علی لکھتے ہیں:

> ''نواب موصوف کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر ثقہ راویوں کی وفات سے پیشتر سید صاحب کے پورے حالات مرتب نہ ہوئے تو ممکن ہے بعد کے لوگ غلط باتیں شامل کر دیں، اس لئے مختلف اصحاب کو جگہ جگہ سے بلا کر صحیح حالات مرتب کر دینے کی تاکید فرمائی۔''

معلوم ہوتا ہے کہ نواب وزیر الدولہ نے سید صاحب کے حالات جاننے والے تمام اصحاب کو اس غرض سے ٹونک بلایا تھا کہ جو کچھ کسی کو یاد ہو وہ روایات کی شکل میں لکھوا دے۔ نواب محمد علی خاں اس کام کے مہتمم تھے، سید جعفر علی بھی اسی سلسلے میں بلائے گئے، انہوں نے روایتوں میں جو حصہ لیا ہو اس کے متعلق علم نہیں، مگر یہ معلوم ہے کہ سید صاحب کے حالات میں ضخیم کتاب بہ زبانِ فارسی لکھ دی۔

اس کا جو نسخہ میرے مطالعے میں آیا وہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری کا ہے، اور اس مجموعۂ کتب کا ایک بیش قیمت نسخہ ہے، جو حافظ محمود شیرانی مرحوم سے خریدا گیا تھا، اس کے صفحات ۱۳۰۷ ہیں، لیکن بعض اجزاء غائب ہیں، بعض اوراق کو بیچ میں سے کیڑا

کھا گیا۔ غائب اجزاء میں سے بعض کی نقلیں سید ابوالحسن علی ندوی نے کہیں سے منگوالی تھیں، میں بھی ان سے مستفید ہوا۔

اس میں سید صاحب کے ابتدائی حالات ''مخزنِ احمدی'' سے لے لئے، جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ نواب امیر خاں کی معیت اور سفر حج کے حالات مختلف لوگوں سے سن کر لکھے، سفر ہجرت کے حالات کی جگہ سید حمید الدین کے مکاتیب نقل کر دیے، جن سے بہتر اور مفصل تر حالات کا دوسرا مرقع نہیں مل سکتا۔ ابتدائی مجاہدات کے حالات خود ان مجاہدین سے سنے جو ان میں شریک رہے، یا منشی خانے کے کاغذات میں دیکھے۔ رمضان ۱۲۴۵ھ سے سید جعفر علی خود سارے حالات کے ناظر تھے۔

واقعۂ بالاکوٹ کے بعد جماعت کے حالات اس وقت تک لکھے ہیں، جب تک صاحبِ تالیف خود سرحد میں رہے۔ پھر چند صفحوں میں میر نثار علی عرف تیتو میاں کے جہاد کا ذکر ہے، آخر میں اپنے سفر ہجرت اور سفر مراجعت کی پوری تفصیلات درج کر دی ہیں۔ بہر حال یہ بڑی جامع اور مستند کتاب ہے، اگر چہ ''وقائع'' جتنی مفصل نہیں۔ سید جعفر علی کے مفصل حالات اس کتاب کے تیسرے حصے میں درج ہوں گے۔

(۲) وقائع احمدی

قلمی مآخذ میں سب سے بڑا ذخیرۂ معلومات یہی کتاب ہے، اس کا نام بعض اصحاب نے ''تاریخ احمدی'' لکھا ہے، بعض نے ''تاریخ کبیر''، میری معلومات کے مطابق اس کا نام ''وقائع احمدی'' ہے۔ اس کے کئی نسخے میری نظر سے گذرے۔

(الف) دو جلدیں امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتب خانہ رام پور کی عنایت سے دیکھیں، پہلی ۶۳۶ صفحے کی اور دوسری ۶۱۸ صفحے کی، ہر صفحے میں پندرہ سطریں اور ہر سطر میں کم از کم پندرہ اور زیادہ سے زیادہ بیس اکیس لفظ۔ پہلی جلد حج کے سلسلے میں سید

صاحب کے کلکتہ پہنچنے پر ختم ہوگئی، دوسری جلد میں جنگِ مردان تک کے حالات تھے۔

(ب) سید ابوالحسن علی ندوی نے اس کا تیسرا حصہ مرحمت فرمایا، ضخامت ۸۶۱ صفحات، صفحہ ۳۲ تک فی صفحہ ۱۷ سطریں، بعد میں فی صفحہ ۱۵ سطریں، اس میں بالاکوٹ کے بعد تک بھی جماعت کے کچھ حالات تھے، اور بیان غیر مختتم تھا۔

(ج) کچھ مدت بعد سید ابوالحسن علی نے متفرق غیر مرتب اجزا میرے پاس بھیجے، انہیں محنت سے مرتب کیا تو دو جلدیں بنیں، پہلی جلد میں جنگِ مردان سے بالاکوٹ تک کے حالات آ گئے۔ دوسری جلد جماعت کے حالات پر مشتمل تھی، لیکن اس کے صرف ابتدائی اجزا مسلسل تھے، پھر جگہ جگہ سے کئی اجزاء غائب تھے۔ آخری روایت میں منارہ پر مجاہدین کی یورش کے ابتدائی حالات درج ہیں، باقی اجزاء اب تک میسر نہ آ سکے۔

(د) حضرت مولانا ابوالکلام نے ٹونک سے جو کتابیں منگائی تھیں، ان میں بھی ''وقائع'' کی ایک ضخیم جلد آ گئی تھی، لیکن وہ ابتدا سے جنگِ مردان تک کے حالات پر مشتمل تھی۔

(ہ) جنگِ مردان تک وقائع کا ایک نسخہ مجھے سید نور احمد نے مرحمت فرمایا تھا۔

(و) اسی کتاب کا ایک مکمل نسخہ سید طلحہ کی مہربانی سے ملا۔

سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی کا بیان ہے کہ میں طلبِ علم کے زمانے میں بنارس گیا تھا تو وہاں اس قسم کی ایک ضخیم کتاب جس کی چار جلدیں تھیں دیکھی تھی، سید ابوالحسن علی کو اس کا ایک مکمل نسخہ ٹونک سے مل گیا تھا، لیکن وہ فرماتے تھے کہ آخری حصہ اس کا بھی ناقص معلوم ہوتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ جب نواب وزیر الدولہ نے سید صاحب کے نیاز مندوں کو جمع کر لیا تو کتاب کی ترتیب کا طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ سب لوگ محلّہ قافلہ (جس میں سید صاحب کے اقربا اور مجاہدین آباد تھے) کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور جو واقعہ کسی کو یاد ہوتا، بیان کرتا،

دوسرے اصحاب سنتے رہتے۔ اگر کسی کو بیان کے کسی حصے سے اختلاف ہوتا تو اس کی تصریح کر دیتا، کاتب ہر بیان کو راوی کے الفاظ میں لکھتے جاتے، ہر بیان کے ساتھ راوی یا راویوں کے نام درج ہوتے۔ بعض اوقات خود نواب صاحب ان مجالس میں شریک ہو جاتے اس طرح کئی جلدیں مرتب ہو گئیں۔

کتاب کی ترتیب ۱۲۷۴ھ سے شروع ہوئی تھی اور پہلی جلد ۱۲۷۶ھ میں مکمل ہوئی۔ اس سے ظاہر ہے کہ پوری کتاب میں کئی برس لگ گئے، اس کے صفحات تین پونے تین ہزار سے کم نہ ہوں گے، میری نظر سے اس کے تقریباً اڑھائی ہزار صفحے گذر چکے ہیں۔

(۳) نورِ احمدی

اس کے مولف مولوی نور احمد نگرامی تھے، جو جماعتِ مجاہدین میں ''مؤرخِ اسلام'' کے لقب سے مشہور تھے۔ سید صاحب کے مخلص مرید تھے، شروع ہی سے آپ کے ساتھ رہے، ابتدا ہی میں آپکے حالات لکھنے کا التزام کر لیا تھا، اور جو کچھ لکھا وہ یا تو سید صاحب سے سن کر لکھا یا ان سے تصدیق کرا لینے کے بعد لکھا۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

> ''ہمہ حکایات ایں کتب را بہ سماعت شریف حضرت امیر المومنین، امام المسلمین رسانیدہ فراغت از تخمین ممتاز ساختہ بودند۔''

تاہم اس کتاب کا محض نام باقی رہ گیا، آج تک کہیں سراغ نہ مل سکا، کوئی ایسی تحریر بھی مجھے نہیں مل سکی، جس سے ظاہر ہو کہ کسی نے اس کتاب کا مسودہ دیکھا تھا، لیکن اس کے لکھے جانے میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا مسودہ مولوی نور احمد کے ساتھ تھا، وہ جنگ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے، یہ کتاب اور سید صاحب کے متعلق دوسری سیکڑوں بیش بہا تحریرات جنہیں منشی محمدی انصاری نے بڑے اہتمام سے مرتب کرایا تھا اور محفوظ رکھا تھا، بالاکوٹ میں نذرِ آتش ہو گئیں۔

(۴) مخزنِ احمدی

یہ کتاب سید صاحب کے بڑے بھانجے سید محمد علی نے مرتب کی تھی اور اس میں سید صاحب کی پیدائش سے لے کر راہِ ہجرت میں قدم رکھنے تک کے حالات جمع کر دیے تھے۔ سید محمد علی صاحب سید صاحب سے عمر میں بڑے تھے اور ہجرت سے پیشتر کی زندگی ان کے سامنے گذری تھی، لیکن تفصیلات کے طلب گار کو یہ کتاب دیکھ کر مایوسی ہوگی، اس لئے کہ یہ حالات کا ایک سرسری مرقع ہے۔ ۱۲۸۳ھ (۱۸۶۵ء) میں یہ مکمل ہوئی، حضرت مؤلف خود فرماتے ہیں:

گر بجوید سالِ تحریرش کسے از ذکر و انث
چشم دارد برہزار و دو صدو ہشتاد و ثلث

اس کا ایک قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں ہے، اور حضرات کے پاس بھی اس کی نقلوں کا علم ہوا۔ ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں نواب محمد علی خاں مرحوم نے اسے مطبع مفید عام آگرہ میں چھپوا بھی دیا تھا، مطبوعہ نسخہ آج کل بہت کمیاب ہے، میرے پاس موجود ہے، ضخامت ایک سو بیس صفحے، کاغذ اتنا ناقص ہے کہ ورق گردانی میں خاص احتیاط سے بھی کام لیا جائے، تو ورق پھٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ تصحیح کا بھی چنداں اہتمام نہ کیا گیا۔

(۵) سیرۃ علمیہ اور تذکرۃ الابرار

سیرت علمیہ سید صاحب کے عم محترم سید نعمان نے شاہ علم اللہ کے حالات میں لکھی تھی، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، آخر میں ان کے اخلاف وخلفاء کے حالات شامل کر دیے تھے، پھر سید محمد نعمان حج کیلئے چلے گئے۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہوتے ہوئے فلسطین

تشریف لے گئے، اور وہیں زیارتِ حضرت موسیٰ کے پاس فوت ہو گئے، جو قدس شریف کے مشرق میں بحیرۂ لوط سے قریب ہے۔ پھر اسی خاندان کے ایک فرد سید فخر الدین نے سیرت علمیہ کی تبییض کی، بعد کے حالات بڑھا کر کتاب کو اپنے عہد تک خاندانی حالات کا ایک جامع مرقع بنا دیا اور اس کا نام ''تذکرۃ الابرار'' رکھا۔ میں نے اس کا قلمی نسخہ سید ابوالحسن علی کی عنایت سے دیکھا۔

(٦) مکاتیب

میرے پاس سید صاحب کے مکاتیب کے پانچ مختلف مجموعے فراہم ہو گئے تین بڑے اور دو چھوٹے، ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے۔

ا۔ مکاتیب سید صاحبؒ

یہ ۱۷۵ صفحے کی کتاب ہے، اس میں بیشتر مکاتیب سید صاحب کے ہیں۔ بعض شاہ اسماعیل کے اور دو مکتوب شاہ عبدالعزیز کے ہیں، کتاب کے آخر میں مرقوم ہے: ''تم المجلد الاول من مکتوبات الشریف'' اس کی دوسری جلد آج تک نہ مل سکی۔ میں نے کابل میں سنا تھا کہ مولانا منصور الرحمٰن مرحوم کے پاس دونوں جلدیں موجود ہیں، میں نے ان سے نقل مانگی تو وہ ٹال گئے۔ غالباً اس وجہ سے کہ ان مکاتیب میں موجودہ حکمراں کے جد امجد سردار سلطان محمد خاں اور ان کے بھائیوں کا ذکر کچھ اچھے انداز میں نہیں ہوا۔ مولانا چونکہ اس وقت کابل میں تھے، انہوں نے مکاتیب کی نقل دینے کو قرین احتیاط نہ سمجھا کہ ممکن ہے یہ امر برسر کار اصحاب پر گراں گذرے، حالانکہ جس حد تک مجھے علم ہے حکمراں خاندان کا ایک فرد بھی ایسا نہیں جو حق وصداقت کو خونی رشتے کے تابع رکھے اور ''لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى'' کا قرآنی اصول ہمارے اور انکے سامنے ہے۔ معلوم نہیں اب وہ مکاتیب کہاں ہیں۔

۲- مکتوباتِ شاہ اسماعیلؒ

یہ مجموعہ ۲؍ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ (۲۸؍اپریل ۱۸۷۹ء) کو بھوپال میں مرتب ہوا اور مجھے مولانا ثناء اللہ مرحوم امرتسری سے ملا تھا۔ اس کے ۳۳۹ صفحے ہیں اور مضمون ختم نہیں ہوا، اس میں بیشتر مکاتیب وہی ہیں جو نمبر (۱) میں ہیں۔ نئے مکاتیب بھی ہیں مثلاً ڈمگلہ اور شنکیاری کے معرکوں سے پیشتر شاہ اسماعیل کے مراسلے، شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے نام سید صاحب اور شاہ اسماعیل کے عربی مکاتیب۔ میں نے اس کتاب کا نام مکتوباتِ شاہ اسماعیل صرف اس وجہ سے لکھا کہ مرتب کرنے والے نے یہی نام تجویز کیا۔ اس کا ایک مکمل نسخہ مولانا محمد شفیع صاحب سابق پرنسپل اورینٹل کالج، صدر شعبہ دائرۂ معارفِ اسلامیہ کے پاس تھا، میں نے اسی سے اپنا ناقص نسخہ مکمل کیا۔

۳- محولہ بالا کا ایک نہایت خوش خط نسخہ مجھے پروفیسر سراج الدین آزر نے عنایت فرمایا تھا، اس کے اوراق منتشر تھے، میں نے بڑی محنت سے اسے مرتب کیا، اس کا خط قابل دید ہے، لیکن غلطیاں بہت زیادہ ہیں، اور آخر کے چند اوراق غائب ہیں۔

۴- مجموعہ مکاتیب بریلی

یہ فل اسکیپ سائز کے بتیس صفحوں کا ایک مجموعہ ہے، جو سید ابوالحسن علی نے بریلی سے نقل کرا کے مجھے بھجوایا، اس میں زیادہ تر وہ مکاتیب ہیں جو سید صاحب نے اپنی ازواج اور متعلقین کو تحریر فرمائے، اس کا نام میں نے ''مجموعہ مکاتیب بریلی'' رکھا۔

۵- مکاتیب سید حمید الدین

یہ مکاتیب میں نے منظورۃ السعداء سے نقل کرائے، دو مکتوب بریلی سے نقل ہو کر آئے، ایک مکتوب مولانا عبدالحیٔ کا ہے جو انہوں نے سرحد پہنچ کر وہاں کے حالات

اور سفر کی تفصیلات کے متعلق تحریر فرمایا۔ سید حمید الدین کے مکاتیب، سفر ہجرت کے متعلق مستند معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہیں۔ افسوس کہ ان کا پہلا مکتوب کہیں سے نہ مل سکا، ورنہ سفرِ ہجرت کے متعلق کسی دوسرے ماخذ کی احتیاج نہ رہتی۔

(۷) کتاب العمرۃ

مرتبہ مولانا سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی سابق بادشاہ سوات وسابق وزیر اعظم امب۔ سید مرحوم ممدوح خاندانِ سادات ستھانہ کے ایک جلیل القدر رکن تھے، یہ کتاب انہوں نے اپنے خاندان کے حالات میں لکھنی شروع کی تھی، اور سلسلۂ بیان کا آغاز سید علی ترمذی غوث بونیر سے ہوا ہے، جو سلاطین مغلیہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ پانی پت کی پہلی جنگ میں شریک رہے، پھر امارت کا سروسامان ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی، وقت کے بعض بزرگوں سے کسبِ فیض کے بعد اپنی پوری زندگی اہل سرحد کی تعلیم وتزکیہ میں گزاری۔ بونیر آپ کا مرکز تھا، وہیں وفات پائی، ان کا مزار مرجع عام ہے۔

اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ سید علی ہی کی برکت سے سرحد میں دین کا احیاء ہوا اور آپ کے فیض کی موجیں کابل سے کشمیر تک پورے یاغستانی علاقے میں پھیل گئیں۔ ستھانہ بھی آپ ہی کے اخلاف نے آباد کیا، جہاں سے سید اکبر شاہ اٹھے اور وہ سید صاحب کے معتمد علیہ رفیق ومشیر تھے۔ اسی خاندان کے ایک رکن سید عمر شہید تھے، جنہوں نے جماعتِ مجاہدین کی خاطر انگریزوں سے جنگ کی اور اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ اسی خاندان کے جلیل القدر فرزند شہزادہ مبارک شاہ (ابن سید اکبر شاہ) اور شہزادہ محمود شاہ (والد ماجد سید عبدالجبار شاہ) تھے جو امبیلے کی جنگ میں مجاہدین کے ساتھ ہو کر انگریزوں کے خلاف لڑے، اسی خاندان کی ایک شاخ کنڑ (افغانستان) میں جا بسی تھی، جس سے سید جمال الدین افغانی اٹھے۔

سید عبد الجبار شاہ نے کتاب خاندانی حالات میں لکھی تھی، لیکن چونکہ اس خاندان کا تعلق سرحد کے ہر حصے سے تھا، اس لئے مغلوں کے عہد حکومت سے آج تک یہ سرحد کی نہایت مفصل تاریخ بن گئی، نیز سادات ستھانہ سید صاحب اور مجاہدین کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے، اس لئے اس موضوع پر بھی خاصی معلومات فراہم ہو گئیں۔

بعض روایتیں ایسی ہیں جو کسی دوسری جگہ نہیں مل سکتیں، مثلاً بابا بہرام خاں تنولی کی روایات جو سید صاحب کے مجاہدات میں شریک رہے تھے، اور لمبی عمر پا کر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے، ان کی صاحبزادی کی شادی سادات ستھانہ کی اس شاخ کے ایک فرد سے ہوئی تھی جو گندف میں مقیم ہو گئی تھی، برادرم سید مبارک شاہ گندفی مرحوم (برادر زادہ سید عبد الجبار شاہ) بابا بہرام خاں مرحوم کے نواسے تھے، اس گہری رشتہ داری کی وجہ سے سید عبد الجبار شاہ کو تمام حالات سننے کے خاص مواقع حاصل ہوئے۔

کتاب العبرۃ کئی جلدوں میں ہے، یہ چھپے گی تو تاریخ و تمدن سرحد کے متعلق مستند معلومات کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہو گی۔ اس کی تمام جلدیں مہینوں میرے پاس رہیں اور میں نے سرحد کے بارے میں تمام معلومات انہیں سے حاصل کیں۔

(۸) روزنامچہ میرزا عطا محمد خاں شکارپوری

میرزا عطا محمد خاں کا خالو، شیر محمد خاں امیران سندھ کا وکیل تھا، اور ایک مرتبہ سید اسماعیل شاہ وزیر سندھ کے ہمراہ فتح خاں بارک زئی کے پاس سفیر بن کر گیا تھا۔ میرزا صاحب موصوف کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا، اپنے خالو سے سارے حالات سن کر مرتب کر لئے وہ خود بھی ہرات، کابل، قندھار اور پشاور کے سفر کر چکا تھا، ان سفروں میں جو کچھ دیکھا اور سنا اُسے بھی ضبط تحریر میں لے آیا۔

اس روزنامچے کی چار جلدیں ہیں:

جلد اول	۹۰ صفحات	جلد دوم	۹۵ صفحات
جلد سوم	۳۴۴ صفحات	جلد چہارم	۱۵۵ صفحات

بیان کا آغاز نادر شاہ افشار کے قتل اور احمد شاہ درانی کی تخت نشینی سے ہوتا ہے۔ پھر تیمور شاہ اور زمان شاہ کے حالات اختصاراً بیان کرنے کے بعد پاینده خاں بارک زئی کے قتل پر پہنچ جاتا ہے، جسکے باعث سدوزئیوں اور بارک زئیوں کے درمیان رزم و پیکار کا لامتناہی سلسلہ جاری ہوا، اور افغانستان کی مملکت ان خانہ جنگیوں میں تباہ ہوتی رہی۔

میرزا عطا محمد خاں کی زندگی میں سید صاحب سندھ کے راستے سرحد گئے اور وہاں مرکز قائم کر کے بحالیٔ حکومتِ اسلامیہ کے لئے مجاہدات شروع کئے۔ میرزا نے ان کے حالات تیسری جلد میں لکھے ہیں جو زیادہ تر سید صاحب کے مکاتیب سے ماخوذ ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہو جاتا ہے کہ سندھ میں سے کس کس نے اور کس حد تک سید صاحب کی تحریک کا خیر مقدم کیا، کون کون ادائے فرض کی طرف متوجہ ہوا اور کس کس سے غفلت سرزد ہوئی۔ سید صاحب کے حالات کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> زبدۃ السادات عظام، خلاصہ خاندانِ کرام، رافع روایاتِ اسلام، قامع بنیادِ کفر وظلام، پیر احمد شاہ غازی بہ مقتضائے حصول سادات سرمدی و بہ امید حیات ابدی بر طبق مضمون آیۂ کریمہ: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ٥'' جہاد کے لئے اُٹھے اور سب کو اس کارِ خیر کی دعوت دی۔

میرزا عطا محمد خاں بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو زیادہ سے زیادہ عقیدت رکھنے کے باوجود سید صاحب کی شہادت کے قائل تھے اور غیبت کے افسانے کو انہوں نے کبھی قبول نہ کیا۔ یہ روزنامچہ مجھے سید علی محمد راشدی ایڈیٹر ''سندھ آبزوور'' اور سید حسام الدین راشدی سے ملا اور مہینوں میرے پاس رہا۔

(۹) رسالہ دراحوال مولوی نصیر الدین

مولوی نصیر الدین دہلوی سید صاحبؒ کے خلفائے خاص میں سے تھے، واقعۂ بالاکوٹ سے کئی برس بعد مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر جہاد کیلئے روانہ ہوئے، سندھ بلوچستان کی سرحد پر کچھ مدت گزاری۔ جب انگریزوں نے شاہ شجاع کو لے کر افغانستان پر حملہ کیا تو مولوی صاحب امیر دوست محمد خاں کی طرف سے غزنی کی حفاظت میں انگریزوں کے خلاف لڑے۔ شیخ ولی محمد پھلتی ہندوستان چلے آئے تو مولوی صاحب نے ستھانہ پہنچ کر مجاہدین کی زمامِ قیادت سنبھال لی اور وہیں وفات پائی۔ ان کے مفصل حالات کتاب کی چوتھی جلد میں بیان ہوں گے، لیکن اتنا عرض کر دینا چاہئے کہ یہ مولوی نصیر الدین اس نام کے دوسرے صاحب سے مختلف تھے جو عام طور پر ''منگلوری'' کہلاتے ہیں۔

زیرِ غور رسالہ مولوی صاحب موصوف کے ایک ارادت مند ابو احمد علی بن احمد نے مرتب فرمایا تھا، اس کے مقدمے اور پہلے باب میں سید صاحب کے حالات اختصاراً بیان ہوئے ہیں، میں نے اس کا جو نسخہ پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں دیکھا، وہ ناقص ہے، سنا ہے کہ اس کا مکمل نسخہ ٹونک کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس رسالے سے معلوم ہوا کہ سید صاحب کے حالات میں دو کتابیں (تاریخ کبیر اور جامع محیط) آپ کے چھوٹے بھانجے سید عبد الرحمٰن کے زیرِ اہتمام مرتب ہو چکی تھیں، میرے علم کے مطابق ''وقائع احمدی'' ہی کا دوسرا نام ''تاریخ کبیر'' تھا، ''جامع محیط'' کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

(۱۰) ظفر نامہ رنجیت سنگھ

اس نام کی دو کتابیں ہیں، ایک منظوم جو کنہیالال ہندی نے شاہنامے کی بحر میں لکھی تھی، اس میں سید صاحب کے حالات بہت کم ہیں۔ دوسری کتاب نثر میں دیوان

امر ناتھ نے مرتب کی تھی، ۱۸۳۶ء پر پہنچ کر تحریر ختم ہوگئی، اس کا اندازِ تحریر صاف اور سلجھا ہوا نہیں، پروفیسر سیتارام کوہلی نے اسے ایڈٹ کیا اور ۱۹۲۸ء میں پنجاب یونیورسٹی نے اسے چھاپا۔ اس میں سید صاحب کے متعلق بعض نادر معلومات ہیں، مثلاً یہ کہ شہادت کے بعد شیر سنگھ نے سید صاحب کی تصویر تیار کرائی تھی جو لاہور بھیجی گئی، دیوان امر ناتھ نے بھی وہ تصویر دیکھی تھی۔

(۱۱) تواریخ عجیبہ یا سوانح احمدی

مرتبہ مولوی محمد جعفر تھانیسری۔ اردو زبان میں سید صاحب کے متعلق یہ پہلی کتاب ہے، اس کا پہلا ایڈیشن دہلی کے مطبع فاروقی میں چھپا تھا دوسرا ایڈیشن مالک رسالہ ''صوفی'' (پنڈی بہاؤالدین) نے بلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ ضلع انبالہ میں چھپوایا، تیسرا ایڈیشن اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور میں طبع ہوا۔ اس کتاب نے سید صاحبؒ کے متعلق دو نہایت افسوسناک غلط بیانیوں کو عام کیا: اول یہ کہ سید صاحبؒ انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے، صرف سکھوں سے لڑائی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اس غلط بیانی کو مستند بنانے کے لئے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی گئی۔ دوسرے مولوی سید جعفر علی نقوی کی کتاب کے ایک فقرے کو متن سے الگ کر کے سید صاحب کی غیبت کے عقیدے کو تقویت پہنچائی گئی، حالاں کہ اس فقرے کو مسئلہ غیبت سے کوئی تعلق نہ تھا اور سید جعفر علی نقوی کی کتاب میں ایک دو نہیں بلکہ بہت سے ثبوت شہادت کے موجود تھے۔ ان امور پر مفصل بحثیں میری کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۲) حیاتِ طیبہ

مؤلفہ میرزا حیرت دہلوی۔ یہ اصل میں شاہ اسماعیل شہید کی سیرت ہے، جس میں سید صاحب کی جنگوں کے حالات آ گئے ہیں۔ آخر میں سید صاحب کے حالات بھی

اختصاراً بیان کر دیے ہیں۔ یہ کتاب تاریخ نہیں بلکہ افسانہ ہے، کئی واقعات وحالات بداہۃً ایسے ہیں، جو میرزا صاحب نے خود تیار کر لئے، مثلاً شاہ اسماعیل کے وعظ یا جہاد کی نیت سے ان کی ورزشیں یا پنجاب کا دورہ۔

جن جنگوں میں شاہ اسماعیل سرے سے شریک ہی نہ تھے، میرزا صاحب نے ان میں بھی شاہ صاحب ہی کو مرکزی شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ سید صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بڑی کوشش سے نواب امیر خاں کو انگریزوں سے مصالحت پر آمادہ کیا تھا، حالانکہ سید صاحب نے نواب صاحب کا ساتھ صرف اس بنا پر چھوڑا تھا کہ وہ انگریزوں سے مل گئے تھے۔

میرزا صاحب کی رائے شاید یہ ہو کہ رنگ آمیزی سے واقعات زیادہ پُرتاثیر بن جائیں گے، لیکن جو واقعہ اثر پیدا کرنے کیلئے رنگ آمیزی کا محتاج ہو وہ اس قابل ہی نہیں ہوتا کہ دواوین تاریخ وسیر میں جگہ پائے۔ بہر حال یہ کتاب سراسر نا قابل اعتماد ہے اور اس کے متفرق واقعات پر میری کتاب میں جا بجا تبصرے ملیں گے، مفصل تبصرے کتاب کی تیسری جلد میں بہ سلسلہ حالات شاہ اسماعیل آئیں گے۔

(۱۳) تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار

مصنفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم۔ نواب مرحوم نے سید صاحب کا ذکر مختلف کتابوں میں کیا ہے، زیرِ غور کتاب میں ان کے حالات مستقل عنوان کے ماتحت لکھے ہیں۔ مرحوم کے والد سید اولاد حسن قنوجی، سید صاحب کے خاص ارادت مند تھے۔ پھر نواب صاحب کا تعلق فرمانروایانِ ٹونک اور اعزۂ سید صاحبؒ سے بھی برابر قائم رہا، اس لئے انہیں سید صاحب کے خاصے حالات معلوم ہوں گے۔ "تقصار" میں جو کچھ لکھا اگرچہ بہت مختصر ہے لیکن چند باتیں خاص توجہ کی محتاج ہیں، مثلاً:

ا: سید صاحب نے علم باطن میں درجۂ کمال حاصل کرلیا تھا اور ہدایتِ خلق میں آپ اللہ تعالیٰ کا ایک نشان تھے۔

ب: ان کے خلفاء کے مواعظ کی برکت سے ہندوستان کی سرزمین شرک و بدعت سے پاک ہوکر کتاب وسنت کے اتباع پر قائم ہوگئی۔

ج: سید صاحب سلوکِ ظاہر و باطن میں بے مثال تھے۔

د: ان کے غائب ہوجانے کی حکایت محض افترا ہے اور عقل و نقل سے اسے کوئی مناسبت نہیں۔

ہ: ماضی قریب میں کسی ایسے صاحبِ کمال کا نشان دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتا۔

و: سید صاحب کو شیخ محمد بن عبدالوہاب سے ظاہراً یا باطناً کوئی علاقہ نہ تھا۔

آخر میں لکھا ہے کہ کتاب وسنت میں جہاد کے شروط وقیود ہیں، اسی لئے سید صاحب نے ہندوستان میں جہاد نہ کیا اور حکومتِ برطانیہ کے خلاف محاذ قائم نہ فرمایا، بلکہ باہر جاکر سکھوں اور افغانوں کے خلاف لڑے۔

مبادا اس بیان سے غلط فہمی پیدا ہو اِس لئے یہ عرض کردینا ضروری ہے کہ سید صاحب انگریزوں کو مسلمانوں کے لئے سکھوں سے بدرجہا زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ مختلف مصالح کی بنا پر سرحد کو مرکز بنایا اور اس میں سکھ سامنے آگئے، افغانوں کے خلاف لڑائیاں سید صاحب کے مقاصد میں داخل نہ تھیں، نہ سید صاحب انھیں پسند کرتے تھے، لیکن جن افغانوں نے مسلمانوں کے خلاف سکھوں کا ساتھ دیا اور بار بار کی تفہیم کے باوجود باطل کا راستہ نہ چھوڑا، ان سے مجبوراً لڑنا پڑا۔

(۱۴) ترجمانِ وہابیہ

مصنفہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم۔ یہ رسالہ ۱۸۸۳ء میں مرتب ہوا۔ جب

ہندوستان میں ''وہابیت'' کو بہت بڑا جرم سمجھا جاتا تھا۔ خود نواب صاحب بھی ''وہابیت'' اور تبلیغ جہاد کی بناء پر انگریزوں کے معتوب ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا خطاب ضبط ہوا، توپوں کی سلامی روک دی گئی اور ریاست بھوپال کے معاملات سے انہیں الگ ہونا پڑا۔ رسالے میں نواب نے اپنی بعض سابقہ کتابوں کے ان حصوں کا مضمون اردو میں بیان کیا ہے جن میں شیخ محمد بن عبد الوہاب کا ذکر تھا، اس طرح ثابت کیا ہے کہ وہ ''وہابیت'' کے الزام سے کاملاً بری ہیں۔ اس کتاب میں بھی سید صاحب اور شاہ اسماعیل کا ذکر ضمناً آیا ہے۔

(۱۵) اسلام کی دسویں کتاب

مصنفہ مولوی رحیم بخش۔ مولوی صاحب مرحوم سید صاحب کے ایک ارادت مند مولوی حیدر علی کے شاگرد تھے، جو ملووال ضلع فیروز پور میں مقیم ہو گئے تھے۔ انہیں کے فرزند اکبر مولانا عبد الرحیم تھے، جو ہجرت کر کے سرحد پہنچے تو محمد بشیر نام رکھا، اسی نام سے مشہور ہوئے، انہیں سے یہ کتاب منسوب ہے۔

اس کتاب میں سید صاحب کے حالات تقریباً سولہ صفحوں میں آئے ہیں، حالانکہ مغل سلاطین کے پورے خاندان کے احوال وسوانح کے لئے اتنے صفحے وقف نہیں ہوئے۔ چونکہ یہ بچوں اور بچیوں کے لئے لکھی گئی تھی اس لئے زیادہ تحقیق وکاوش سے کام نہیں لیا گیا۔

(۱۶) ارواحِ ثلاثہ

یہ تین کتابوں کا مجموعہ ہے: اول ''امیر الروایات'' جس میں مولوی امیر شاہ خاں سے سنی ہوئی روایات جمع کر دی گئیں۔ دوسری ''روایات الطیّب'' جو مولانا محمد طیب دیوبندی کی سنی ہوئی روایات کا مجموعہ ہے۔ تیسری ''اشرف التنبیہ'' جس میں مولانا

اشرف علی مرحوم نے مختلف روایات کے بعض نکات کی شرح فرمادی، تینوں کو یکجا چھاپ کر ''ارواحِ ثلاثہ'' نام رکھا۔

اس میں سید صاحب، شاہ اسماعیل اور بعض دوسرے بزرگوں کے متعلق حکایات ہیں، لیکن بعض حکایات بداہۃً غلط ہیں، مثلاً ۵۴، ۵۵، ۹۱، ۱۱۰، ۱۲۱۔ ان پر بحث کا یہ موقع نہیں۔

(۱۷) مجموعہ تسعہ رسائل

یہ مجموعہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری نے چھپوایا تھا جو مجاہدین کی مالی اعانت کے سلسلے میں ماخوذ ہوئے، اور اٹھارہ برس انڈمان میں قید رہے۔ اس میں سات رسالے مولانا ولایت علی مرحوم کے ہیں، یعنی ردِ شرک، عمل بالحدیث، اربعین فی المہدیین (مہدی کی آمد کے متعلق چالیس حدیثیں) دعوت، تیسیر الصلوٰۃ، تبیان الشرک۔ ایک رسالہ ''بت شکن'' مولانا عنایت علی کا ہے اور ایک رسالہ ''فیض الفیوض'' مولانا فیض علی کا۔

ان میں سے رسالہ دعوت میں مولانا ولایت علی نے سید صاحب کی غیبت کا عقیدہ پیش کیا ہے۔ اس پر مفصل بحث کتاب میں ہو چکی ہے اور یہاں اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

(۱۸) الدرالمنثور فی تراجم اھل الصادق فور

مرتبہ مولانا عبدالرحیم صادق پوری۔ اس کا دوسرا نام ''تذکرۂ صادقہ'' ہے۔ اس کتاب میں صادق پور کے دو بزرگ منزلت خاندانوں کا تذکرہ ہے، جن کے افراد ابتدا ہی سے سید صاحب کے ساتھ وابستہ ہوئے اور جانی و مالی قربانیوں میں سرزمین پاک و ہند کا کوئی دوسرا گھرانا ان کے برابر نہ پہنچ سکا۔ اس میں سرحدی جنگوں کا ذکر بہت مجمل ہے، لیکن جماعتِ مجاہدین کے متعلق اس سے بعض قیمتی معلومات حاصل ہوئیں۔

(۱۹) وصایا الوزیر علیٰ طریقة البشیر و النّذیر

مرتبہ نواب وزیر الدولہ امیر الملک محمد وزیر خاں بہادر نصرت جنگ والیٔ ٹونک۔ یہ کتاب چالیس وصیتوں پر مشتمل ہے، بڑے سائز کی دو جلدوں میں چھپی تھی، پہلی جلد کے صفحے ۳۶۰ ہیں اور دوسری کے ۲۱۴۔ اس میں جابجا سید صاحب، شاہ اسماعیل اور جماعت کے دوسرے افراد کے متعلق حکایات ہیں۔

(۲۰) تنبیہ الضالّین عن طریق سید المرسلین

مرتبہ مولانا محمد خان عالم مدارسی۔ میرے پاس اس کا قلمی نسخہ ہے، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ شائع ہوئی یا نہ ہوئی۔ محمد خاں عالم مدراس کے بہت بڑے رئیس اور نواب ارکاٹ کے خسر تھے۔ جب سید صاحب نے مولانا محمد علی رام پوری کو حیدر آباد سے بہ سلسلۂ دعوت مدراس بھیجا تو محمد خان عالم مولانا ہی کے ارشادات کی برکت سے راہِ حق پر قائم ہوئے اور زندگی بھر مدراس میں ہدایت کا مینار بنے رہے۔ زیرِ غور کتاب میں انہوں نے اہل بدعت کی تہمت طرازیوں کا جواب دیا ہے، کتاب سے مولانا محمد علی کی دعوت کے متعلق قیمتی معلومات ملیں۔

(۲۱) درّ مقال

مصنفہ مولوی عبد الحق آروی (بہار)۔ مولوی صاحب مرحوم مہاجر و مجاہد تھے، ہندوستان پر انگریز چھا گئے تو مولوی صاحب ترکِ وطن کر کے سندھ پہنچے۔ سندھ بھی انگریزوں کے قبضے میں آ گیا تو سرحد چلے گئے۔ سید اکبر شاہ ستھانوی سوات کے بادشاہ بنے تو انہوں نے مولوی عبد الحق کو وزیر اعظم بنالیا تھا، امبیلے کی جنگ میں بھی مولوی صاحب شریک رہے۔ آخر عمر میں الاڈنڈ ڈھیری (سوات) میں مقیم ہوگئے تھے، وہیں

وفات پائی۔

''درّ مقال'' شاہنامے کی بحر میں ایک طویل مثنوی ہے، جس میں جنگِ امبیلہ کے حالات بیان کرنے منظور تھے۔ بہت سی دوسری باتیں بھی آگئیں، شعر معمولی ہیں، لیکن مضمون بڑا قیمتی ہے۔ اس کا اصل نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا سید عبدالجبار شاہ ستھانوی کے پاس ہے، اس کی ایک نقل سید ممدوح نے مجھے مرحمت فرمائی۔ اس کتاب کے اور کسی نسخے کا مجھے علم نہیں۔

(۲۲) رسالہ

اس کا نام معلوم نہ ہو سکا، مصنفہ ابوالغضنفر مولوی نجف علی ابن محمد عظیم الدین ابن محمد خیر الدین۔ مولوی نجف علی صاحب جھجر کے باشندے تھے، ٹونک گئے اور وہاں سید صاحبؒ کے حالات سے رئیس کا شغف دیکھا تو عربی زبان میں سید صاحبؒ، شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئیؒ اور شاہ محمد اسحاق کے حالات لکھ دیے۔ میں نے اسے ان کتابوں میں دیکھا جو حضرت مولانا ابوالکلام نے میری درخواست پر عاریۃً ٹونک سے منگائی تھیں، اس کے ۱۷۶ صفحے ہیں فی صفحہ ۱۵ سطر اور فی سطر دس یا بارہ الفاظ۔

(۲۳) اخبار جناب سید احمد

اس نام کے دو مجموعے میں نے ان کتابوں میں دیکھے جو حضرت مولانا ابوالکلام نے ٹونک سے منگائی تھیں۔ ایک کا نمبر کتب خانے میں ۲۰۶ ہے، دوسری کا ۲۰۹۔ ان دونوں میں سید صاحب کے مختلف خطوط جمع کر دیے گئے ہیں۔ نمبر ۲۰۹ میں شاہ اسماعیل شہید کے دو قصیدے اور ایک مثنوی بھی ہے، قصیدوں میں سے ایک نعت میں ہے دوسرا سید صاحب کی مدح میں۔ مثنوی کا نام سلکِ نور ہے۔

(۲۴) مثنوی شہر آشوب

مولفہ حکیم عبد الحمید صاحب صادق پوری۔ اس مثنوی میں حکیم صاحب نے اپنے خاندان کی تباہی کا حال لکھا ہے، جب کہ ان کے والد مولانا احمد اللہ کو ایک الگ مقدمے میں کالے پانی کی سزا دی گئی۔ ان کے چچا مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبد الرحیم کو الگ انبالہ والے مقدمے میں کالے پانی بھیجا گیا اور جائداد ضبط کر لی گئی۔

ان کے علاوہ ''نتائج الحرمین'' ''ارمغانِ احباب'' اور متعدد دوسری کتابوں کی کیفیت بیان کرنا چاہتا تھا، لیکن خوفِ اطناب قدم قدم پر عناں گیر ہے، لہٰذا ان کے صرف نام درج کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ یہ نام جلد دوم کے آخر میں ملاحظہ فرمائیے۔

برِصغیر ہند میں تحریک احیائے دین اور سرفروشانہ جدوجہد کی مکمل سرگذشت

سید احمد شہیدؒ

حصہ اول

مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ کے مفصل سوانح حیات اور ان کی
تحریکِ احیائے دین کی مکمل سرگزشت

مولانا غلام رسول مہرؔ

پہلا باب:

اجدادِ کرام

تا گوہر آدم نسبم باز بہ استد
ز آبائے خود ار بشرم اصحابِ کرم را

نسب

سید صاحب کا سلسلۂ نسب یہ ہے:

(۱) سید احمد، بن (۲) سید محمد عرفان، بن (۳) سید محمد نور، بن (۴) سید محمد ہدیٰ، بن (۵) سید علم اللہ، بن (۶) سید محمد فضیل، بن (۷) سید محمد معظم، بن (۸) قاضی سید احمد، بن (۹) قاضی سید محمود، بن (۱۰) سید علاء الدین، بن (۱۱) سید قطب الدین ثانی، بن (۱۲) سید صدر الدین ثانی، بن (۱۳) سید زین الدین، بن (۱۴) سید احمد، بن (۱۵) سید علی، بن (۱۶) سید قیام الدین بن (۱۷) سید صدر الدین، بن (۱۸) قاضی سید رکن الدین، بن (۱۹) امیر سید نظام الدین، بن (۲۰) امیر سید قطب الدین محمد الغزنوی الکردی، بن (۲۱) سید رشید الدین، بن (۲۲) سید یوسف، بن (۲۳) سید عیسیٰ، بن (۲۴) سید حسن، بن (۲۵) سید ابوالحسن، بن (۲۶) سید ابوجعفر، بن (۲۷) سید قاسم، بن (۲۸) سید ابو محمد عبداللہ، بن (۲۹) سید حسن الاعوری الجواد، بن (۳۰) سید محمد ثانی، بن (۳۱) سید ابو محمد عبداللہ الاشتر، بن (۳۲) سید محمد المہدی ذوالنفس الزکیہ، بن (۳۳) سید عبداللہ المحض، بن (۳۴) سید حسن مثنیٰ، بن (۳۵) حضرت امام حسن علیہ السلام، ابن (۳۶) امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام۔

امام حسن علیہ السلام کے فرزند سید حسن مثنیٰ کی شادی امام حسین علیہ السلام کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ صغریٰ سے ہوئی تھی۔ اس طرح سید عبداللہ المحض دونوں اماموں کی نجابت کے وارث بنے، وہ خود اور ان کی اولاد اس امتیاز کی وجہ سے ''الحسنی الحسینی'' کہلائی۔

یہ شرفِ نجابت گوشت پوست اور خون تک محدود نہ تھا بلکہ طہارتِ اخلاق اور پاکیزگیٔ عمل سے بھی حظِ وافر ملا تھا۔

سید محمد المہدی

اس سلکِ نور میں ایسی مقدس ہستیاں بھی ہیں جن کے حالات روزِ روشن کی طرح زمانے پر آشکارا ہیں، مثلاً امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ اور امام حسن علیہما السلام۔ بعض کے متعلق اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ عمر بھر گوشہ نشین رہے، ذکر وفکر میں زندگی گزاری اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ جن بزرگواروں کے کارناموں سے تاریخ کے صفحات مزین ہوئے ان میں سب سے پہلے سید محمد المہدی ذو النفس الزکیہ آتے ہیں۔

اموی خاندان کی حکومت امیر معاویہؓ سے شروع ہو کر مروانِ ثانی پر ختم ہوئی، بیچ میں صرف ایک مرتبہ اس میں خطرناک خلل پیدا ہوا تھا جب معاویہ ثانی بن یزید کی دست برداری پر حضرت عبداللہ ابن زبیر کا سلسلۂ حکومت خاصا مستحکم ہو گیا تھا۔ حضرت ابن زبیرؓ کی شہادت پر بالفعل مقابلہ باقی نہ رہا، لیکن ساداتِ کرام اور علویوں کی جانب سے امویوں کو سخت خطرہ تھا، اس لئے کہ وہ بلندیٔ نسب اور حسنِ روش وعمل کی وجہ سے مرجع عوام تھے، عباسی بھی قرابتِ نسب کی بناء پر انہیں کے حامی تھے۔

بیچ میں عباسیوں نے اپنی حکمرانی کے لئے کوششیں شروع کر دیں اور ان کے داعی حلقوں میں پھیل گئے۔ ان داعیوں میں سب سے زیادہ شہرت ابو مسلم نے پائی، جس کا

مرکزِ دعوت خراسان تھا، تاہم عباسیوں کو یقین نہ تھا کہ عام لوگ سادات کو چھوڑ کر خود ان کی حمایت کیلئے تیار ہو جائیں گے۔ مروانِ ثانی کے زمانے میں اموی حکومت کا شیرازہ درہم برہم ہونے لگا تو ساداتِ کرام میں سید محمد المہدی طہارتِ نفس اور فضائل ومحاسن میں بہت ممتاز تھے، ایک موقع پر مختلف اصحاب نے خفیہ خفیہ ان کو بیعتِ خلافت کے لئے منتخب کیا، بیعت کرنے والوں میں ابوجعفر منصور عباسی بھی شامل تھا۔

ابتری زیادہ پھیلی تو اچانک عباسی میدانِ عمل میں آگئے، کوفہ میں ابوالعباس سفاح عباسی کی بیعت ہوئی۔ پھر جنگ زاب پیش آئی، جس میں مروانِ ثانی نے شکست کھائی، وہ جان بچا کر بھاگا، چھپتا چھپاتا کسی محفوظ مقام کی طرف جا رہا تھا کہ ایک جگہ بحالتِ خواب مارا گیا۔ ابوالعباس نے عنانِ خلافت سنبھالی تو تمام سادات اور علویوں کو حسنِ سلوک سے مطمئن رکھنے کی کوشش کی، تین چار برس کے بعد وہ فوت ہوا اور اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ بن گیا۔

محمد المہدی کی شہادت

منصور کے دل سے یہ واقعہ محو نہ ہوسکتا تھا کہ ایک موقع پر خود اس۔ نے سید محمد المہدی کی بیعت کی تھی۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر سید موصوف نے علمِ مخالفت بلند کیا تو مقابلہ مشکل ہوگا، لہٰذا اس نے سید محمد المہدی اور ان کے بھائی سید ابراہیم کو بہ لطائف الحیل اپنے قابو میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں، لیکن یہ دونوں ہاتھ نہ آئے۔ پریشان ہو کر منصور نے ان کے والد ماجد سید عبداللہ المحض اور حسنی خاندان کے تمام دوسرے افراد ومتوسلین کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ ان مظلوم اسیروں میں سید عبداللہ کے ماں جائے بھائی محمد بن عمرو بن حضرت عثمانؓ بھی شامل تھے، ان کے املاک واموال ضبط کر لئے گئے، پہلے یہ مدینہ منورہ میں قید رہے، پھر انہیں پابجولاں عراق بلا کر ہاشمیہ(۱) کے محبس میں ڈال

(۱) ہاشمیہ عراق میں دریائے فرات کے کنارے انبار کے پاس تھا، یہ عباسیوں کا پہلا دارالحکومت تھا۔

دیا گیا، ان پر جو تعدیاں ہوئیں ان کا ذکر پڑھ کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سید محمد المہدی نے اپنے بھائی سید ابراہیم کو بصرہ بھیج دیا۔ تجویز یہ تھی کہ دونوں بیک وقت دو مختلف حصوں سے منصور کے مقابلے کیلئے اٹھیں، چنانچہ سید محمد نے مدینہ منورہ کو مرکز بنا کر بالاعلان بیعت کا سلسلہ شروع کیا، سید ابراہیم نے بصرہ میں رفیقوں کی خاصی بڑی جماعت پیدا کر لی۔ مدینہ منورہ میں امام مالکؒ نے سید محمد کی حمایت میں فتویٰ دیا، بصرہ میں امام ابوحنیفہؒ نے سید ابراہیم کی تائید فرمائی اور چار ہزار درہم کی رقم بھی ان کے پاس بھیج دی۔

منصور نے اپنے ایک سپہ سالار عیسیٰ بن موسیٰ کو دس ہزار فوج دے کر مدینہ منورہ بھیجا، سید محمد نے شہر میں بیٹھ کر مقابلے کا فیصلہ کیا، خندق بھی تیار کر لی۔ مدینہ منورہ کے شمال میں جبل سلع کے قریب مقابلہ ہوا، سید محمد بڑی مردانگی سے لڑے، اچانک ایک دشمن نے ان کی پشت میں نیزہ مارا، وہ جھکے تو دوسرے نے سینے پر نیزے کا وار کیا۔ دو نیزے کھا کر سید ممدوح گر گئے، ان کا سر مبارک قلم کر کے منصور کے پاس بھیج دیا گیا۔ میت کو تین روز تک سولی پر لٹکائے رکھا، ان کی بہن زینب نے تیسرے دن اجازت لے کر میت جنت البقیع میں دفن کی۔ یہ حادثہ فاجعہ ۱۵ر رمضان المبارک ۱۴۵ھ (۲ر جنوری ۷۶۲ء) کو عصر اور مغرب کے درمیان پیش آیا۔ (۱)

سید ابراہیم

سید ابراہیم بصرہ میں فوج جمع کر رہے تھے، انہوں نے اپنے داعی اہواز میں بھی بھیج دیے تھے۔ ذی قعدہ ۱۴۵ھ میں ایک لاکھ آدمی لے کر کوفہ پر بڑھے، کوفہ سے سولہ فرسنگ پر ایک مقام ''باخمریٰ'' ہے، یہاں منصور کی فوج سے مقابلہ ہوا، ابتدا میں عباسی فوج

(۱) قبر کا کوئی نشان نہیں ملتا، شہادت کی جگہ قبہ بن گیا تھا جو ۱۹۲۶ء تک موجود تھا۔

شکست کھا کر بھاگ نکلی، دوبارہ جمع ہو کر مقابلہ کیا، اتفاق سے ایک تیر سید ابراہیم کے حلق میں لگا اور وہ شہادت پا گئے، ساتھ ہی ان کی فوج بکھر گئی۔ یہ ۲۵/ ذی قعدہ ۱۴۵ھ (۱۴/ فروری ۷۶۳ء) کا واقعہ ہے۔

منصور نے سید ابراہیم کا سر سید عبداللہ المحض کے پاس جیل خانے میں بھجوا دیا تھا، انہوں نے یہ دل گداز و جانکاہ ''تحفہ'' دیکھ کر پیغام بھیجا کہ ہماری مصیبت کے دن تیرے عروج کے دنوں کی طرح جلد جلد گذر جائیں گے، پھر عنقریب ہم سب اس ابدی عادل کے سامنے حاضر ہونے والے ہیں جو ہمارے اور تیرے درمیان انصاف کرے گا۔

سید ابراہیم نے اپنے بھتیجے سید عبداللہ الاشتر (ابن سید محمد المہدی) کو سندھ بھیج دیا تھا، جہاں کا گورنر عمر بن حفص سادات کا عقیدت مند تھا۔ جب سید ابراہیم کی شہادت کی خبر سندھ پہنچی تو عمر بن حفص نے سید عبداللہ کو ایک مقامی سردار کے پاس بھیج دیا۔ منصور نے تعاقب نہ چھوڑا اور اس سردار پر چڑھائی کا حکم دے دیا۔ سید عبداللہ ایک روز دس سواروں کے ہمراہ دریا کے کنارے سیر کر رہے تھے، اچانک سامنے سے دشمن کی جمعیت آ گئی، سید نے نہ بھاگنا مناسب سمجھا، نہ قدم پیچھے ہٹایا اور وہیں لڑ کر شہادت پائی۔ ان کی اہلیہ اور بچہ گرفتار ہو کر منصور کے پاس پہنچے، انہیں مدینہ منورہ بھیج دیا گیا۔

سید عبداللہ المحض اور باقی اسیر قید کی حالت میں واصل بہ حق ہوئے۔

گویا سید احمد بریلوی کے اسلافِ کرام میں سے امیر المومنین حضرت علیؓ اور امام حسن کے بعد سید عبداللہ المحض، سید محمد المہدی، سید ابراہیم اور سید عبداللہ الاشتر یکے بعد دیگرے خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے:

ایں راہ بہ پائے تن بہ پایاں نہ رسد ❁ تا جاں نہ زند قدم بہ جاناں نہ رسد

سید قطب الدین محمد

جس حد تک میں سراغ لگا سکا ہوں، سید صاحب کے اجدادِ کرام میں سے پہلے پہل سید رشید الدین (شجرے میں ۲۱) نے مدینہ منورہ چھوڑا اور بغداد میں مقیم ہوئے۔ معلوم نہ ہو سکا کہ حرمِ نبوی کا جوار ترک کرنے کی وجہ کیا ہوئی؟ آیا جہاد و غزا کا ارادہ تھا یا کوئی اور خدمت پیش نظر تھی؟ قیاس یہ ہے کہ اہل وعیال کے ساتھ آئے ہوں گے، اس لئے کہ مدینہ منورہ واپس جانے کی کوئی روایت نہیں ملتی۔ انہوں نے بغداد ہی میں وفات پائی اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے حظیرے میں دفن ہوئے۔

ان کے فرزند سید قطب الدین محمد بغداد سے اٹھ کر غزنی پہنچے، معلوم نہیں کتنی مدت وہاں ٹھہرے۔ ٦٠٧ھ (۱۲۱۰-۱۱ء) میں وہ اقربا و مریدین کی ایک جماعت کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ قلب ہند میں اسلامی سلطنت قائم ہوئے صرف سترہ اٹھارہ برس گذرے تھے اور سلطان التمش کی فرماں روائی کا سکہ رواں تھا۔ سلطان نے سید قطب الدین کے اعزاز و اکرام میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، لیکن انہوں نے دہلی میں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا، پورب کی سمت روانہ ہو گئے، نواح کڑا میں ایک بڑا علاقہ فتح کر کے وہیں سکونت اختیار فرمالی۔ خاندانی شجروں میں انہیں ''امیر کبیر'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ کڑا میں قیام کے باعث ''الکروی'' کی نسبت کا اضافہ ہوا۔ سید احمد کے اجداد میں سے یہ پہلے بزرگ ہیں جو ہندوستان آئے اور یہاں توطن اختیار کیا۔

میرا خیال ہے کہ سلطان دہلی نے سید قطب الدین محمد کو کڑا سے بلا کر دہلی میں شیخ الاسلام کا عہدہ دے دیا تھا، تاریخ فیروز شاہی میں مرقوم ہے:

> از سادات کہ بزرگ ترین بزرگانِ امت اند قطب الدین شیخ الاسلام شہر جد بزرگوار قاضیانِ بدایوں۔ (۱)

---

(۱) تاریخ فیروز شاہی ص: ۱۱۱

ترجمہ: سادات میں سے جوامت کے بزرگوں میں بھی بزرگی کا امتیاز رکھتے ہیں قطب الدین ہیں، جنہیں شہر میں شیخ الاسلام کا منصب حاصل ہے اور وہ قاضیانِ بدایوں کے جدِ بزرگوار ہیں۔

آئینہ اودھ میں بحوالہ بحر الانساب مرقوم ہے کہ سید قطب الدین ۵۸۱ھ (۱۱۵۸ء) میں پیدا ہوئے اور ۶۶۷ھ (۱۲۶۷ء) میں وفات پائی۔

سید قطب الدین کے اخلاف

سید موصوف کے تین فرزند تھے، بڑے سید نظام الدین، منجھلے سید قوام الدین اور چھوٹے سید تاج الدین۔ ان میں سے سید نظام الدین کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا، سید قوام الدین کے حالات میں ''تذکرۃ الابرار'' کا بیان ہے کہ وہ علم و عمل میں ممتاز اور اپنے عہد میں سادات کے سرتاج تھے۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنی ایک صاحبزادی ''فتیحہ'' ان کے نکاح میں دے دی تھی، یہ امر بجائے خود ان سادات کی برتری و بلند پائیگی کا ایک روشن ثبوت ہے۔(۱)

سید تاج الدین کو ''تذکرۃ الابرار'' میں ''مشہور بہ سراج شہید'' لکھا گیا ہے، مجھے اس شہرت کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی، تاریخ فیروز شاہی کا بیان ہے:

> سید السادات سید تاج الدین، پسر شیخ الاسلام سید قطب الدین بودہ است و سید تاج الدین مذکورہ پدر سید قطب الدین و جد سید اعز الدین قاضیانِ بدایوں بودند و سالہا قضائے اودھ حوالت او بود۔ سلطان علاؤ الدین اورا از اودھ معزول کردہ قضائے بدایوں داد و سید تاج الدین علیہ الرحمۃ والغفر ان بزرگوار سیدے بودہ است۔(۲)

ترجمہ: سید تاج الدین، شیخ الاسلام سید قطب الدین کے فرزند

(۱) تذکرۃ الابرار ص: ۱۶۱ (۲) تاریخ فیروز شاہی ص: ۳۴۸ و ۳۴۹

تھے، ان کے بیٹے سید قطب الدین اور پوتے سید اعزالدین بدایوں میں منصب قضاء پر فائز رہے، سید تاج الدین کئی برس تک اودھ میں قاضی تھے، سلطان علاء الدین خلجی نے انہیں اودھ کی قضا سے ہٹا کر بدایوں کا قاضی مقرر کردیا۔ مرحوم ومغفور بڑے بلند مرتبہ سید تھے۔

سید قطب الدین کے بڑے بیٹے سید نظام الدین کے فرزند سید رکن الدین کے متعلق ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے۔

سید رکن الدین برادر زادہ سید تاج الدین مذکور قاضی کڑا بودہ است وباری تعالیٰ سید رکن الدین را جامع فضائل آفریدہ بود وبہ کشف وکرامات آراستہ ...... روزگار بزرگی اودر ترک وتجرید ودر اعطا وایثار کرانہ شدہ است مولف وتاریخ فیروز شاہی سعادت ملاقات سید تاج الدین وسید رکن الدین رحمہما اللہ دریافتہ است وشرائط پابوس ایشاں بجا آوردہ ومن مثل آں سادات بزرگوار واوصاف سنیہ وحشمتے کہ دادۂ خدا، ایشاں داشتند کمتر دیدہ۔(۱)

ترجمہ : سید تاج الدین کے بھتیجے سید رکن الدین کڑا میں قاضی تھے، خدا نے آپ کو جامع فضائل پیدا کیا، کشف وکرامت سے آراستہ تھے...... ان کی عمر ترک وتجرید اور اعطا وایثار میں بسر ہوئی۔ مؤلف تاریخ فیروز شاہی نے سید تاج الدین اور سید رکن الدین دونوں کی ملاقات کی سعادت پائی اور ان کی پابوسی کے آداب بجا لایا۔ میں نے ان جیسے بلند مرتبہ سید بہت کم دیکھے اور خدا نے ان جیسے روشن اوصاف یا ان جیسی حشمت بہت کم لوگوں کو عطا کی۔

قاضی سید محمود و قاضی سید احمد

قاضی سید رکن الدین کے بعد چھ پشتوں کے حالات معلوم نہ ہوسکے، سید قطب

(۱) تاریخ فیروز شاہی ص:۳۴۹

الدین ثانی (شجرے میں ۱۱) کے متعلق صرف یہ معلوم ہوسکا ہے کہ کڑا سے اٹھ کر جائس میں مقیم ہوگئے تھے، وہیں انہوں نے اور ان کی اہلیہ نے وفات پائی۔ دونوں کی قبریں انصاریوں کے محلے میں ہیں، ان قبروں کے غربی جانب جو مسجد ہے، یہ سید صاحب قطب الدین ثانی ہی نے بنوائی تھی۔ ان کے فرزند سید علاء الدین کی سکونت جائس ہی میں رہی، لیکن پوتے سید محمود کو نصیر آباد میں قضا کا عہدہ مل گیا تو وہ نصیر آباد میں منتقل ہوگئے۔ وہاں کا محلّہ قضیانہ انہیں کا آباد کیا ہوا ہے، ابتدا میں اس کا نام محلہ قاضی محمود تھا، وہ فوت ہوئے تو ان کے فرزند سید احمد قاضی بنے۔

یہ بڑے غیور و دیندار تھے، ایک مرتبہ ایک قریبی رشتہ دار کا مقدمہ ان کے سامنے پیش ہوا، شریعت کے مطابق اس کا فیصلہ فرمادیا، جو رشتہ دار کے خلاف تھا، اس کم سواد نے ناکامی کے رنج میں ایسے الفاظ کہہ دیے جن سے حکم شرعی کے خلاف بیزاری کا پہلو نکلتا تھا۔ قاضی سید احمد نے یہ الفاظ سنتے ہی منصبِ قضا سے استعفیٰ دے دیا اور نصیر آباد سے اہل وعیال کے ساتھ نکل کر رائے بریلی چلے گئے، پھر جیتے جی نصیر آباد میں قدم نہ رکھا۔ فرماتے تھے، جس آبادی میں حکم شریعت سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہو وہاں مومن کے لئے ٹھہرنا زیبا نہیں۔

قاضی سید احمد کے بعد نصیر آباد میں قضا کا منصب سید فتح عالم بن سید محمد بن سید محمود نے سنبھال لیا، خاندان میں غالباً وہی پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغل دربار سے علاقۂ خاص پیدا کیا۔ ان کے فرزند سید ابو محمد، شہزادہ مراد بخش ابن شاہ جہاں کے ہاں دیوانی کی خدمت پر مامور تھے۔

سید محمد فضیل

قاضی سید احمد نے اپنی زندگی کے دن رائے بریلی میں پورے کئے، ان کے فرزند سید محمد معظم پھر اپنے خاندان والوں کے پاس نصیر آباد چلے گئے، ان کے دو بیٹے تھے، سید

محمد فضیل اور سید محمد اسحاق، دونوں بڑے عابد و زاہد تھے، خصوصاً سید محمد فضیل کو علوم ظاہری و باطنی دونوں میں بلند مرتبہ حاصل تھا۔ اپنے اوقات گراں مایہ کا بیشتر حصہ عزیزوں، ہمسایوں اور ضعیفوں کی خدمت میں بسر کرتے تھے، روزانہ ایک ایک دروازے پر جا کر پوچھتے کہ کوئی کام ہو تو بتا دیا جائے، یہاں تک کہ کسی کو ایندھن کی ضرورت ہوتی تو بازار سے خرید کر اپنے سر پر اٹھا لاتے۔ ان خدمات سے فراغت پاتے تو طلبہ کو پڑھانے میں مشغول ہو جاتے یا درویشوں اور عقیدت مندوں کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔

ایک موقع پر برادری کے آدمیوں نے بعض خاندانی نزاعات کے تصفیے کے لئے اجتماع منعقد کیا، سید محمد فضیل بھی اس میں شریک تھے، مختلف افراد کی تجویزیں سن کر موصوف نے کہا:

''بھائیو! ہر فیصلہ شریعتِ حقہ کے مطابق ہونا چاہئے اور قانونِ الٰہی کو معیارِ تحکیم بنانا چاہئے۔''

بعض اصحاب نے اس تجویز کی مخالفت کی، سید محمد فضیل اسی وقت مجلس سے اٹھ گئے، گھر پہنچتے ہی رختِ سفر باندھا اور شام سے پہلے پہلے نصیر آباد سے نکل گئے۔ فرماتے تھے جہاں شریعتِ حقہ کا احترام محفوظ نہ رہے، وہاں مسلمانوں کیلئے بود و باش حرام ہے۔ ان کے دادا قاضی سید احمد نے تو نصیر آباد چھوڑ کر دس میل پر رائے بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، سید محمد فضیل ہندوستان چھوڑ کر حجاز چلے گئے، ادائے حج کے بعد مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے۔ اواخر ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ (ستمبر ۱۶۲۳ء) میں وہیں آخری نیند سوئے۔

ان کی شادی قاضی سید فتح عالم کی صاحبزادی صاحب النساء سے ہوئی تھی، بڑے فرزند سید داؤد دو تین برس کے ہوں گے، چھوٹے فرزند سید علم اللہ ان کی وفات سے دو مہینے چودہ دن بعد پیدا ہوئے۔ یہی سید علم اللہ سید احمد شہید کے جد امجد تھے، عہد عالمگیری کے اہل حق میں ان کا مثیل و نظیر کوئی نہ تھا۔

دوسرا باب:

حضرت سید علم اللہ

ابتدائی حالات

شاہ علم اللہ ۱۲؍ربیع الاول ۱۰۳۳ھ (۲۴؍دسمبر ۱۶۲۳ء) کو نصیر آباد کے محلّہ قضیانہ میں بوقت صبح پیدا ہوئے، والد ان کی وفات سے پہلے فوت ہو چکے تھے، والدہ نے کچھ مدت بعد وفات پائی۔ دیوان سید ابو محمد نے، جو اُن کے حقیقی ماموں تھے، انہیں اور ان کے بڑے بھائی سید داؤد کو یگانہ محبت وشفقت سے پالا، یہاں تک کہ ہر معاملے میں انہیں اپنے بچوں پر مقدم رکھتے تھے۔ اس احسان کے اعتراف میں شاہ علم اللہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میری اولاد پر لازم ہے کہ سید ابو محمد کے ساتھ تعظیم وتکریم اور حسنِ سلوک کو اپنا شیوۂ خاص بنائیں، یہ امر میرے لئے دلی خوشنودی کا باعث ہوگا۔

ایک خاندانی روایت ہے، سید محمد فضیل نے شاہ علم اللہ کی پیدائش سے پہلے خواب دیکھا تھا کہ گھر میں مٹی کے ایک طشت کے نیچے ایک آفتاب چھپا ہوا ہے اور کرنیں پھوٹ پھوٹ کر باہر نکل رہی ہیں۔ آخر آفتاب آہستہ آہستہ طشت سے باہر نکل آیا اور بلند ہوا، گھر کے درو دیوار اور اطراف وجوانب اس کی ضیا گستری سے بقعۂ نور بن گئے۔

شاہ علم اللہ پیدا ہوئے تو خواب کی تعبیر یہ سمجھی گئی کہ ان کی برکت سے سنن سنیہ کی تجدید ہوگی، بلاشبہ شاہ علم اللہ اتباعِ سنت کا درخشاں سورج تھے، جس کی برکت سے اسلامیت کی روشنی پھیلی، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ بشارت شاہ علم اللہ سے بھی بڑھ کر سید احمد شہید پر چسپاں ہوتی ہے، جن کی سعی وہمت سے ہندوستان وخراسان میں دین حق اور

سنن رسول پاک کا احیاء ہوا، اور جن کی وجہ سے خاندان علم اللہ کے ایک ایک فرد کے احوال وسوانح کی ہمیں جستجو ہے۔

عہد طفلی کا ایک واقعہ ہے کہ شاہ علم اللہ ہم سن بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے، اس اثناء میں شیخ بندگی جعفر امیٹھوی کا گذر ہوا، جو بندگی نظام الدین کے فرزند ارجمند تھے، اور اپنے شیخ الشیوخ مخدوم حسام الحق والدین کے مزار پر فاتحہ خوانی کے لئے مانک پور جا رہے تھے، شیخ کی نظر شاہ علم اللہ پر پڑی تو ٹھہر گئے اور دیر تک انہیں دیکھتے رہے، عقیدت مندوں نے اس توجہ کا سبب پوچھا تو شیخ نے فرمایا:

''اس بچے کی پیشانی سے تجلیٔ اعظم کے نور کی موجیں اٹھ رہی ہیں، امید ہے کہ اس کے فیوض سے ایک جہان منور ہوگا۔''

شیخ جعفر بندگی ١٠٤٠ھ میں فوت ہوئے لہٰذا یہ واقعہ اس زمانے کا ہونا چاہئے جب شاہ علم اللہ کی عمر پانچ چھ برس کی تھی۔

ملازمت اور ترک وتجرید

شاہ علم اللہ سن بلوغ کو پہنچے تو ان کی شادی شیخ ہاشم جائسی کی صاحبزادی بی بی صالحہ سے ہوگئی۔ پھر ان کے ماموں سید ابو محمد نے انہیں ملازمت کی غرض سے لاہور بلوالیا۔ ''تذکرۃ الابرار'' کا بیان ہے کہ سید ابو محمد دو تین مرتبہ انہیں دربارِ شاہی میں لے گئے، لیکن ملازمت کی نوبت نہ آئی، ہر ذہاب وایاب میں شاہ علم اللہ کا دل دنیوی عزوجاہ کی جانب سے افسردہ ہوتا رہا۔ ایک روز خیال آیا کہ دنیوی سلاطین کی بارگاہوں میں حاجب ودربان مقرر ہیں، کبھی بار ملتا ہے کبھی نہیں ملتا۔ ان سے کنارہ کش ہوکر کیوں نہ اس مالک حقیقی کی چوکھٹ پکڑ لی جائے جسکا دربار ہر وقت ہر شاہ وگدا کیلئے کھلا رہتا ہے، اس پر گیر ودار اور حاجب ودربان کا کوئی انتظام نہیں اور وہی بندوں کی پہلی اور آخری پناہ گاہ

ہے۔

چنانچہ آپ سب کچھ چھوڑ کر ننگے پاؤں اور ننگے سر باہر نکل آئے اور صلائے عام دیدی کہ میرا سامان جو شخص چاہے لے جائے۔

''وقائع احمدی'' کی روایت ہے کہ سواروں میں ملازم ہو چکے تھے، ایک مرتبہ مرکب شاہی موسم سرما(۱) میں لاہور پہنچا، رات کے وقت شدید بارش ہوگئی، بادشاہ نے اپنے ایک معتمد کو بھیجا کہ جا کر دیکھو، کون کون اس وقت پہرے پر موجود ہے۔ معتمد نے جگہ جگہ پھر کر دیکھا صرف ایک مقام پر ایک پہرے دار گھوڑے پر سوار موسلا دھار بارش میں کھڑا تھا، نیزہ ہاتھ میں تھا اور قرآن پڑھ رہا تھا، نام پوچھا تو بتایا: علم اللہ۔

دوسرے روز بادشاہ نے علم اللہ کو بلایا اور مستعدی و فرض شناسی پر خوشنودی کا اظہار فرمایا۔ جب سید موصوف کو معلوم ہوا کہ یہ اظہارِ خوشنودی موسلا دھار بارش میں پہرے پر حاضر رہنے کا نتیجہ ہے، تو معاً خیال آیا کہ دنیوی بادشاہ فرائض منصبی کی بجا آوری پر خوش ہوتا ہے، اگر مالک حقیقی کی خدمت گزاری کو شعارِ خاص بنالیا جائے تو یہ امر ہزار درجہ بڑھ کر ثواب و انعام کا مستحق ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی ملازمت چھوڑ دی، مال و اسباب لٹا دیا اور فقیر بن کر بیٹھ گئے۔

ان میں سے کسی روایت کو درست مان لیجئے، اس واقعے میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ علم اللہ نے اوائل شباب ہی میں دنیوی ترفع کے بہترین وسائل سے کنارہ کش ہو کر اپنی زندگی فقر و انزوا کے لئے وقف کر دی تھی، دیوان سید ابو محمد بڑے پریشان ہوئے، اس وجہ

(۱) یہاں یہ بتا دینا چاہئے کہ میری تحقیق کے مطابق شاہ جہاں سردیوں کے موسم میں تین مرتبہ لاہور آیا، پہلی مرتبہ رجب ۱۰۴۸ھ (نومبر ۱۶۳۸ء) میں، دوسری مرتبہ شوال ۱۰۴۹ھ (جنوری ۱۶۴۰ء) میں، تیسری مرتبہ رمضان ۱۰۵۰ھ (دسمبر ۱۶۴۰ء) میں۔ اگر ''وقائع احمدی'' کے بیان کو درست مانا جائے تو یہ واقعہ ۱۰۴۸ھ میں پیش آیا ہوگا، اس لئے کہ شاہ علم اللہ اختیارِ فقر کے بعد کچھ دیر نفس کشی کی مشق کرتے رہے، پھر حضرت آدم بنوری کے پاس پہنچے خرقۂ خلافت لیا، وطن گئے اور ۱۰۵۰ھ میں رائے بریلی میں آباد ہو گئے۔

سے بھی کہ بھانجا بچوں سے بڑھ کر عزیز تھا، اور اسے فقیری کے رنگ میں دیکھنا گوارا نہ تھا۔ اس وجہ سے بھی کہ خود دربار شاہی کے امرا میں شمار ہوتے تھے، اور ایک قریبی عزیز کا یوں درویش بن جانا، عام تصور کے مطابق انہیں گوارا نہ ہوسکتا تھا۔ فوراً بھانجے کے پاس پہنچے، سمجھایا، منت سماجت کی، آخر اپنا سر پیٹ لیا اور گریبان پھاڑ ڈالا، لیکن شاہ علم اللہ نے اپنے دل میں قطعی فیصلہ کر کے جو قدم اٹھایا تھا، اسے واپس لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ شفیق ماموں سے بہ ادب عرض کیا کہ آپ نے بڑی شفقت فرمائی اور اب میری تغیر احوال پر یقیناً آپ کو بڑا رنج ہوگا، لیکن میں کیا کروں ہر انسان کے پہلو میں صرف ایک دل ہوتا ہے اور میں اس سے بیک وقت دو متضاد کام نہیں لے سکتا:

از دل بروں کنم غمِ دنیا و آخرت
یا خانہ جائے رخت بود یا سرائے دوست

''سوچ سمجھ کر فیصلہ کر چکا ہوں، اسے بدل نہیں سکتا''۔ ماموں کے علاوہ دوستوں نے بھی سمجھایا، لیکن شاہ علم اللہ اپنے عزم پر چٹان کی طرح جمے رہے۔

بیعت وخلافت

اختیارِ فقر کے بعد خاصی مدت تک نفس کشی کی مشق کرتے رہے جو راہِ حق میں وصولِ کمال کی پہلی منزل تھی۔ روزانہ صبح کے وقت باہر نکل جاتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور لشکر میں فروخت کرتے، جتنے پیسے ملتے، ان میں سے چند پیسے اپنے کھانے پر صرف کرتے باقی محتاجوں میں بانٹ دیتے۔ پھر پیرِ طریقت کی تلاش شروع ہوئی، لاہور میں ایک درویش کی خانقاہ بن رہی تھی اور اس کے لئے مٹی جمع ہو رہی تھی، نیاز کے طور پر چند ٹوکریاں وہاں ڈالیں پھر شیخ آدم بنوریؒ (۱) کی خدمت میں پہنچ گئے، چند ہی روز میں

(۱) شیخ آدم بنوریؒ حضرت شیخ احمد مجدد الف ثانی سرہندی کے اکابر خلفا میں تھے۔ باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر......

طریقت کی منزلیں طے کر لیں اور ''ولایت خاصہ واخص وخاص الخاص'' کا منصب پایا۔

شیخ نے خلافت دیکر وطن جانے کا حکم دیا اور فرمایا: اس جانب ولایت کے چراغوں میں تمہاری حیثیت شمع کی سی ہوگی، بلکہ ستاروں کے درمیان آفتاب کا درجہ پاؤ گے۔

شاہ علم اللہ اپنے والد ماجد کی برادری کے تنازعات سے بہت مکدر تھے، فیصلہ کئے بیٹھے تھے کہ جاتے ہی بیوی کو ساتھ لیں اور حرمین شریفین چلے جائیں۔ شیخ کو اس ارادہ کا علم ہوا تو فرمایا: بہتر ہے لیکن اہل اللہ میں سے اگر کوئی راستے میں روک لے تو رک جانا اور وہیں اقامت اختیار کر لینا۔

رائے بریلی میں قیام

بہر حال شاہ علم اللہ شیخ سے رخصت ہو کر وطن پہنچے اور باہر ہی سے اہلیہ کو پیغام بھیج دیا کہ میں ترک و تجرید کی راہ اختیار کر چکا ہوں، اگر اس مسلک سے بہ دل و جان اتفاق ہے

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... رسمی علوم کی تحصیل کا زیادہ موقع نہیں ملا تھا، لیکن باطنی کمالات نے انہیں کتابی علوم سے بے نیاز کر دیا تھا۔ ''تذکرۃ الابرار'' میں مرقوم ہے کہ جس زمانے میں شاہ علم اللہ اپنے چچیرے بھائی دیوان خواجہ احمد سے پڑھ رہے تھے، گاہے گاہے خواجہ احمد کو شیخ آدمؒ کی بیعت کی ترغیب دیتے رہتے تھے، ایک روز خواجہ احمد نے کہا کہ شیخ کو ظاہری علوم سے بہرہ نہیں، میں ان کی بیعت پر کیوں کر راضی ہو جاؤں؟ شاہ علم اللہ بولے: تمہارے جیسے عالم اگر شیخ کے پاس جائیں تو بات نہ کر سکیں۔ امتحاناً خواجہ احمد نے شیخ کے پاس جانا منظور کر لیا اور جاتے ہی علم کلام کا ایک مشکل مسئلہ پوچھا۔ شیخ نے کہا کہ آپ عالم ہیں، میں عامی ہوں، آپ بیان فرمائیں۔ اصرار پر شیخ نے اس انداز میں مسئلے کی توضیح فرمائی کہ خواجہ احمد خود بھی اس سے زیادہ نہیں جانتے تھے۔ دوسرے روز تفسیر کا ایک مشکل مسئلہ پیش کر دیا، شیخ نے اسے بھی بے تکلف حل کر دیا، تیسرے روز بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ آخر خواجہ احمد نے بیعت کے لئے درخواست پیش کر دی۔ شاہ ولی اللہؒ نے بھی انفاس العارفین میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ (طبع جدید صفحہ ۱۱)

شیخ آدمؒ کے ساتھ ہر وقت پٹھانوں کی ایک بڑی جماعت رہتی تھی، بعض درباریوں نے اس معیت کو سیاسی رنگ دے کر بادشاہ سے حکم لے لیا کہ شیخ حج کو چلے جائیں وہ گوالیار ہوتے ہوئے حجاز چلے گئے۔ ۱۰۵۲ھ کے حج میں شریک تھے (فروری ۱۶۴۳ء)، پھر مدینہ منورہ پہنچے، وہاں ۱۳ شوال ۱۰۵۳ھ (۲۴ ر دسمبر ۱۶۴۴ء) کو فوت ہوئے اور حضرت عثمانؓ کے مقبرے کے قریب انہیں دفن کیا گیا۔

تو گھر کا سارا مال واسباب محتاجوں میں بانٹ دو۔ سیدہ نے بے تامل یہ حکم پورا کر دیا۔ اقربا نے اپنے اموال واملاک میں سے ایک ایک حصہ نکال کر شاہ علم اللہ کی خدمت میں پیش کر دیا انہوں نے یہ عطیہ بھی مساکین میں تقسیم کر دیا۔ کہتے ہیں کہ چار مرتبہ یہی صورت پیش آئی آخر اقربا نے سمجھ لیا کہ ان کی خدمت میں کوئی چیز پیش کرنا بے سود ہے، یہ خود اس سے فائدہ نہ اٹھائیں گے۔

نصیر آباد سے نکلے تو پہلی منزل رائے بریلی میں ہوئی، وہاں کچھ دن اپنے خالہ زاد بھائی کے ہاں ٹھہرے رہے، لیکن یہ قیام عارضی تھا، اسی مقام پر شاہ عبدالشکور مجذوب جائسی سے ملاقات ہوئی۔ شاہ علم اللہ بہت تڑکے اٹھ کر سئی ندی پر چلے جاتے، وہیں تنہائی میں تہجد ادا فرماتے، ایک روز شاہ عبدالشکور مل گئے، جب انہیں معلوم ہوا کہ علم اللہ ہجرت کے ارادے سے نکلے ہیں تو باصرار روک لیا۔ اس وقت سید علم اللہ کو اپنے شیخ کا فرمان یاد آیا، چنانچہ رائے بریلی میں ٹھہرنے پر راضی ہو گئے۔ یہ مقام اجنبی نہ تھا، ان کے جد امجد نے بھی عمر یہاں گزاری اور عزیز بھی رہتے تھے، ایک مقامی زمیندار کو ان کے ارادۂ قیام کا علم ہوا تو آبادی سے باہر سئی ندی کے کنارے دس بیگھے زمین بہ طیب خاطر ہبہ کر دی، یہی مقام آگے چل کر دائرہ علم اللہ یا تکیہ علم اللہ کے نام سے مشہور ہوا، اسی جگہ سید احمد شہید پیدا ہوئے، اور اسی جگہ انہوں نے زندگی کے ابتدائی چالیس برس گزارے۔ (۱)

(۱) روایتوں میں ہے کہ شاہ عبدالشکور پہلے ننگے پھرتے رہتے تھے، علم اللہ رائے بریلی پہنچے تو شاہ صاحب نے چٹائی لپیٹ کر ستر عورت کا بندوبست کر لیا۔ لوگوں نے اس فجائی تغیر کا سبب پوچھا تو شاہ صاحب نے کہا کہ "منئی آوت ہے" یعنی آدمی آرہا ہے۔ شاہ عبدالشکور ہی نے تکیہ کی جگہ تجویز کی اور سید علم اللہ کے مکان و مسجد کے مقامات متعین فرمائے۔ رائے بریلی کے ایک محلے کا نام لوہانی پور ہے، یہیں کے زمیندار دولت خاں نے دس بیگھے زمین دی تھی، علم اللہ نے چھپر ڈال کر رہنے کی جگہ بنائی اور ایک کچی مسجد تعمیر کر لی۔

سفرِ حج

جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں، شاہ علم اللہ نے ۱۰۵۰ھ (۱۶۴۰ء) میں دائرے کی بنیاد رکھی تھی، خاصی دیر گذر جانے کے بعد حج کا ارادہ کیا۔ اس سفر کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ ''نتائج الحرمین'' کے مصنف نے ۱۰۷۵ھ (۶۵-۱۶۶۴ء) میں انہیں مکہ معظمہ میں دیکھا تھا۔ ''تذکرۃ الابرار'' میں مرقوم ہے کہ شاہ علم اللہ حج کیلئے گئے تھے تو آپ کے تیسرے فرزند سید ابو حنیفہ بھی ساتھ تھے، جو اس وقت بارہ برس کے تھے۔ سید ابو حنیفہ بتیس برس کی عمر پا کر ربیع الاول ۱۰۸۸ھ میں فوت ہوئے، اس بناء پر سفر حج ۶۹-۱۰۶۸ھ میں ہونا چاہئے، دونوں روایتوں میں توافق کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ شاہ علم اللہ ۶۵-۱۰۶۴ء میں گئے، پھر کئی برس حرمین میں مقیم رہے، ورنہ دونوں میں سے ایک کو غلط ماننے بغیر چارہ نہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ بائیس آدمی ساتھ تھے، رائے بریلی سے سمندر تک (غالباً بندرگاہ سورت) سارا فاصلہ پیدل اور ننگے پاؤں طے کیا۔ عقیدت مندوں نے سواریاں پیش کیں، علم اللہ نے کوئی سواری قبول نہ فرمائی اور اپنی ضرورت کا سامان (مثلاً بستر، مصلّٰی وضو کا لوٹا اور قرآن پاک) بھی کسی سے اٹھوانا گوارا نہ کیا۔ ان کی نیکی، للّٰہیت اور کمال اتباعِ سنت کو دیکھ کر مالکانِ جہاز اس درجہ گرویدہ ہو گئے کہ سارے قافلے کو مفت لے جانا چاہا، شاہ صاحب نے انکار کر دیا اور بائیس روپے فی کس کے حساب سے پورے قافلے کا کرایہ ادا فرمایا۔

مناسک حج ادا کرنے کے بعد مدینہ منورہ گئے، ہندوستان کے سفر میں اس خیال سے جوتا نہ پہنا کہ بیت اللہ کی زیارت کے لئے جا رہے ہیں، اور جزوِ ادب کے ظاہری تقاضوں کو بھی حتی الامکان کمال پر پہنچانا چاہئے۔ حجاز مقدس پہنچ کر اس وجہ سے جوتا نہ پہنا

کہ یہ پاک سرزمین خواجۂ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی خرام گاہ رہی ہے، اس پر ننگے پاؤں ہی پھرنا مناسب ہے۔ قیامِ مدینہ کے دوران میں نماز کے بعد جنگل میں چلے جاتے لکڑیاں کاٹ کر لاتے، انہیں فروخت کر کے جتنے پیسے ملتے، ان سے خرچ چلاتے۔ مشائخ حرمین نے انہیں ''مثیل ابوذرؓ'' کالقب دے دیا تھا۔

۱۰۸۰ھ میں دوبارہ حج کیا، اس مرتبہ حرم پاک کا نقشہ بہ تعین طول وعرض کاغذ پر کھینچ کر ساتھ لائے اور اسی کے مطابق تکیے میں مسجد بنوائی۔ بہ خیالِ احترامِ حرم طول وعرض میں چند انگشت کی کمی کر دی، اس کی بنیاد میں آب زمزم ڈالا، ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ء) میں یہ مکمل ہوئی، ''قبلۂ ثانی'' سے تاریخ تکمیل نکلتی ہے۔

فضائل

شاہ علم اللہ کے فضائل ومحاسن کا حصر مشکل ہے۔ صاحب ''نتائج الحرمین'' نے لکھا ہے کہ شریعت وطریقت پر استقامت اور اتباعِ سنت میں ان جیسے آدمی شاید ہی ہوں۔ اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے، چلنے پھرنے میں اتباع سنت کے سوا کچھ پیش نظر نہ تھا، ہمیشہ عزیمت کی باتوں پر عمل کرتے، رخصتوں سے کبھی فائدہ نہ اٹھاتے، اپنے عزیزوں اور ارادت مندوں کو بھی اسی مسلک کی تاکید فرماتے۔ بے حد متواضع اور سادگی پسند تھے، ہر چھوٹے بڑے کو سلام میں سبقت کرتے اس بارے میں بھی مسنون طریقہ کے پابند تھے، گردن جھکا کر یا ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کو مکروہ جانتے تھے، روئی والا چغہ کبھی نہ پہنا، اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ خطاب میں سب کا نام بڑی تعظیم سے لیتے، یعنی ''میاں فلاں'' ''بی بی فلاں'' الحبُّ لِلّٰہ والبغضُ لِلّٰہ پر مضبوطی سے کاربند تھے۔ اگر کسی سے کوئی فعل خلافِ سنت سرزد ہوتا تو جب تک توبہ نہ کر لیتا اس سے ملنا چھوڑ دیتے، خواہ وہ کتنا ہی عزیز اور قرابت دار ہوتا۔ اہل بدعت کے

سلام کا جواب نہ دیتے، اور نہ ان کے ہدایا قبول کرتے، گھر کے تمام کاموں میں شریک ہوتے، مثلاً جھاڑو دیتے، پانی پلاتے، کھانا پکانے میں مدد دیتے، جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے، کبھی کسی کو کسی کام کا حکم نہ دیا، جو کام پیش نظر ہوتا خود شروع کر دیتے، عزیز یا ارادت مند خود اس میں شریک ہو جاتے تو انہیں منع نہ کرتے۔

ایک مرتبہ چھپر بنانا منظور تھا، خود اس کام کا آغاز کر دیا، مسجد کے لئے چونا درکار تھا تو اٹھے اور خود زمین کھود کر روڑی نکالنے لگے، بازار سے چیزیں خریدنے جاتے تو ساری چیزیں اپنے سر پر اٹھا کر لاتے۔

کھانا ہمیشہ یکجا پکواتے، پھر سارا کھانا گھر والوں، عزیزوں اور ارادت مندوں میں بہ حصہ مُساوی تقسیم فرما دیتے۔ ایک مرتبہ کسی نے چار یا چھ سنترے نذر کئے، شاہ علم اللہ نے ان کا عرق نکلوا کر کھانے میں ڈلوا دیا، تاکہ اس حقیر شئے کی تقسیم میں بھی مساوات قائم رہے۔ متوسلین میں سے ہمیشہ شیر خوار بچوں کی ماؤں کو خشک رسد دے دیتے تاکہ اپنی ضرورت کے مطابق پکا کر کھا سکیں، مقروضوں اور غریبوں سے کبھی ہدیہ نہ لیا، جن دولت مند لوگوں کے اقربا غریب تھے، وہ بھی کوئی چیز نذر کے لئے لاتے تو لوٹا دیتے، فرماتے قرض کی ادائیگی اور ذوی الارحام کی پرورش فرائض میں داخل ہے، اور ہمیں دینا زیادہ سے زیادہ نفل ہے۔ جو لوگ فرائض میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کی نفلی عبادت کیوں کر مقبول ہو سکتی ہے؟

ایک مرتبہ سئی ندی میں طغیانی آئی اور آپ کا مکان پانی میں ڈوب کر ڈھے گیا۔ ایک مخلص ارادت مند نے تعمیر جدید کے لئے پانسو روپے کی رقم بطور ہدیہ پیش کی، آپ نے تمام رفیقوں کو جمع کر کے فرمایا کہ اگر اپنے ہاتھ سے مکان بنانے کے لئے تیار ہو جاؤ تو یہ روپیہ تمہاری عام ضرورتوں پر خرچ ہوگا، ورنہ مزدوروں کو دے دیا جائیگا۔ رفیقوں نے بہ طیب خاطر سارا کام اپنے ذمہ لے لیا، شاہ علم اللہ خود سب کے برابر کام کرتے رہے، مٹی

کھودتے، کھگل بناتے اور ٹوکریاں اٹھاتے۔

صحیح اسلامی زندگی

اپنے تمام فرزندوں کے نکاحؒ میں تیمن کے طور پر وہی مہر باندھا جو رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت تھا۔ اسی طرح اپنی بیٹیوں کے نکاح میں حضرت فاطمۃ الزہرا کے مہر اور جہیز کو معیار بنایا اور نکاح کے بعد انہیں سیدۃ النساءؓ کی طرح پیادہ رخصت کیا۔ ایک بیٹی آپ کے عم زاد بھائی سید ہدایت اللہ کے فرزند سید عبدالرحیم سے منسوب تھی، وہ نصیر آباد میں رہتے تھے، شاہ علم اللہ نے جب بیٹی کے نکاح ورخصت کا فیصلہ کیا تو خود نصیر آباد گئے، رشتہ داروں سے ملے، پھر سید عبدالرحیم سے کہا: میاں وضو کر کے آیئے تا کہ نکاح کر دیا جائے، رشتہ داروں نے اس طریقہ سے اختلاف کیا اور کہا کہ نکاح کے لئے باقاعدہ تاریخ مقرر کر کے برادری کو جمع کرنا چاہئے اور جوڑے جامے تیار ہونے چاہئیں، شاہ علم اللہ نے چپ چاپ نکاح پڑھوایا اور بیٹی کو پیدل رخصت کر دیا۔

سماع ومزامیر کو بہت برا جانتے تھے۔ ایک مرتبہ شیخ محمد سلون والے رائے بریلی آئے، ان کی مجلس میں سماع کا سلسلہ اکثر جاری رہتا تھا۔ شاہ علم اللہ سے ملاقات کا وقت مانگا، آپ نے کہلا بھیجا کہ آپ باہر سے آئے ہیں اور ملاقات کے لئے مجھے حاضر ہونا چاہئے، لیکن چونکہ آپ کے ہاں سماع ومزامیر کا سلسلہ موجود ہے اس لئے میں معذور ہوں، نہیں آسکتا۔ ایک مرتبہ ملا جیون امیٹھوی نے سماع کے متعلق مناظرہ چھیڑ دیا، شاہ علم اللہ نے اعتراضات کیے تو ملا صاحب کچھ جواب نہ دے سکے۔

پہلے یا دوسرے سفرِ حج میں ایک مقام پر ٹھہرے اور نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لئے مسجد میں گئے، وہاں ایک پیر چلہ کشی میں مشغول تھا اور اردگرد کے لوگوں میں اس کی خدا رسیدگی کی بہت شہرت تھی۔ شاہ علم اللہ بھی اس سے ملنے کے آرزومند تھے، سمجھتے تھے کہ نماز کے

بعد مسجد میں ضرور ملاقات ہو جائے گی لیکن پیر صاحب جمعہ کی نماز میں شامل نہ ہوئے، شاہ علم اللہ بعد نماز اپنی قیام گاہ پر چلے آئے اور اس پیر کے مریدوں سے کہا:

جو شخص نماز کے لئے باہر نہ نکلا اور اس نے کسی شرعی عذر کے بغیر قطعی فرض ترک کر دیا، اس کا منہ دیکھنا ہرگز روا نہیں اور اس سے ملاقات سراسر خطا ہے۔

محلّہ لوہانی پور کا ایک زمیندار پیر خاں، شاہ علم اللہ کا خاص عقیدت مند تھا، ایک مرتبہ وہ آم بطور نذر لایا، شاہ صاحب نے فرمایا کہ یہ آپ کے بھائیوں کا مشترکہ مال ہے، اگر آپ اپنا حصہ تقسیم کرا کے لاتے تو میں اسے ضرور لے لیتا، اب نہیں لے سکتا۔ پیر خاں نے عرض کیا کہ بھائیوں کے حصے کا میں ذمہ دار ہوں، وہ آم چھوڑ کر تھوڑی دور گیا ہوگا کہ شاہ علم اللہ نے آدمی بھیج کر اسے واپس بلایا اور کہا:

میں نے جب سے فقر کی راہ اختیار کی ہے، بارگاہِ باری تعالیٰ میں ہمیشہ دعاء مانگتا رہا ہوں کہ مجھے حرام اور مشتبہ مال سے محفوظ رکھا جائے۔ آپ کا ہدیہ مشتبہ مال ہے، میں اسے قبول نہیں کر سکتا۔

حافظ محمد حسین مراد آبادی، صاحب انوار العارفین کی روایت ہے کہ حکیم مغیث الدین سہارنپوری نے جن کا ایک پاؤں خشک اور مفلوج تھا، سید احمد شہید کو دعوتِ طعام دی، اس موقع پر سید صاحب نے خود فرمایا، میرے جدامجد نے بارگاہِ الٰہی میں دعاء کی تھی کہ میری اولاد کو دنیا کا چین نصیب نہ ہو، مبادا وہ یادِ خدا سے غافل ہو جائیں۔ میں ایک روز مراقبے میں تھا کہ گھر سے بلاوا آیا۔ مجھے خیال ہوا کہ شاید روزانہ کے مصارف کے لئے بلایا ہو، دل میں خیال گذرا کہ جدامجد کی دعاء منظور ہو چکی ہے، لہٰذا افلاس سے رہائی ممکن نہیں، اس حالت میں عبادت کی فرصت بھی میسر نہیں آسکتی۔ میں گھر نہ گیا اور جدامجد کے مزار پر پہنچ کر مراقبہ کیا۔ جدامجد کے جسم کا نصف حصہ قبر سے باہر نکل آیا، قبلہ رو ہو کر ہاتھ اٹھائے اور میرے حق میں دعاء کی، اس روز سے تنگ دستی ختم ہو گئی۔ (۱)

(۱) انوار العارفین ص: ۵۱۹

''مخزن احمدی'' کا بیان ہے کہ آپ نے اپنی اولاد کے لئے بارہا فقر و تنگ دستی کی دعاء کی تا کہ وہ لوگ زخارفِ دنیوی کی محبت میں الجھ کر دین وتقویٰ کی راہ نہ بھلا دیں۔(۱) چنانچہ اس مقدس خاندان میں اگر کسی کے ہاں ضرورت کی چیزیں نہ ہوتیں اور فقر واحتیاج کی نوبت آجاتی تو اس حالت میں ضیق کی تعبیر کا ایک طریقہ یہ ٹھہر گیا تھا کہ فلاں گھر میں شاہ علم اللہ تشریف فرما ہیں۔

حضرت شیخ میا میر لاہوریؒ کے ایک خلیفہ شیخ عبد الحمید ابدال تھے، ان کے ایک مرید نے شاہ علم اللہ کے متعلق پوچھا تو ابدال صاحب نے فرمایا:

> اے عزیز! حضرت سید اتباعِ سنت اور پیرویٔ رسالت میں اس عہد کے یگانہ فرد ہیں، اسلاف میں بھی ان جیسے آدمی بہت کم گذرے ہیں۔ ان کو سید ہونے کے باعث فرزندی کا رتبہ حاصل تھا، پھر محبوبیت کا منصب مل گیا، یہ بلند درجے بہت کم آدمیوں کو نصیب ہوئے۔

شانِ استغناء

شیخ آدم بنوریؒ سے جن بزرگوں نے فیض حاصل کیا، ان میں شاہ علم اللہ کے علاوہ شیخ محمد سلطان ساکن بلیا اور شیخ عثمان ساکن شاہ جہاں پور بھی تھے۔ شیخ عثمان کو شاہنشاہ عالمگیر کے ہاں اعتماد کا خاص درجہ حاصل تھا۔ ایک موقع پر انہوں نے اپنے دونوں رفیقوں کے گزارے کی تنگی کے بارے میں عالمگیر کو رقعہ لکھا، بادشاہ نے فوراً شیخ سلطان کی خانقاہ کے لئے روزینہ مقرر کر دیا، لیکن اسے معلوم تھا کہ شاہ علم اللہ روزینہ قبول نہیں کریں گے، اس لئے حکم دیدیا کہ جس مال سے خود میرے لئے کھانے کا انتظام ہوتا ہے، اس میں سے دو سو روپے بطور نذر شاہ صاحب کے ہاں پہنچا دیے جائیں۔

---

(۱) مخزن احمدی ص: ۴۲۰

شاہ صاحب کو اگرچہ معلوم تھا کہ کہ نذر وجہ حلال سے آئی ہے اور نذر پیش کرنے والا وہ سلطان ہے جس سے بڑھ کر صاحبِ تقویٰ سلطان کم از کم ہندوستان کے تخت پر نہیں بیٹھا، بایں ہمہ نذر لوٹا دی یہ ان کی شانِ استغناء تھی۔

صاحب ''نتائج الحرمین'' نے لکھا ہے، زیادہ تر مشائخ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ ابتداء میں سخت ریاضتیں کیں، آخر میں فراغت شعار بن گئے۔ شاہ علم اللہ کی حالت یہ تھی کہ ابتدا سے حیاتِ مستعار کے آخری دور تک فقر کی سختی و تنگی کو راحت جان کر قبول کرلیا، یہ سب کچھ سنت کی پیروی میں اختیار فرمایا۔ اس پر پورے اہتمام سے عمل پیرا رہے اور لذاتِ دنیوی کو اپنے پاس تک نہ آنے دیا۔

صاحب ''بحر ذخار'' فرماتے ہیں کہ طریق نبویؐ کی پیروی میں دنیا سے نفرت کے متعلق جو ریاضتیں اور مجاہدے شاہ علم اللہ نے کیے ان کی مثالیں صحابہ کرامؓ کے بعد اولیاء میں بھی بہت کم ملیں گی۔

کمالِ رضا

آپ کے فرزند سید ابوحنیفہ نے بتیس برس کی عمر پائی وہ خدا پرستی اور دینداری کی وجہ سے آپ کو بیحد محبوب تھے۔ رات کے وقت ان کا انتقال ہوا، آپ نے گھر کے تمام لوگوں کو قضا کے سامنے بہ طیب خاطر سر جھکا دینے کی تلقین فرمائی اور رونا تو رہا ایک طرف، کسی نے ایسی آہٹ بھی نہ سنی، جس سے اس حادثہ محزونہ کا علم ہوتا۔ صبح ہوئی تو آپ نے اطمینان سے باجماعت نماز پڑھی، پھر اٹھے اور ایک صاحب سے کہا کہ رات میاں ابوحنیفہ فوت ہوگئے، ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام ہونا چاہیے۔

محبوبِ جگر بند کو آغوشِ لحد میں سلا چکنے کے بعد فرمایا: الحمدللہ، میاں ابوحنیفہ اس دنیا سے دولتِ ایمان کے ساتھ گئے۔

گھر میں ایک ضعیفہ روزانہ چرخہ چلایا کرتی تھی، سوت کاتنے کے سوا اس کا کوئی کام نہ تھا۔ سید ابوحنیفہ کی وفات کے دن اس نے سوگ میں اپنا کام بند رکھا۔ شاہ علم اللہ گھر گئے تو پوچھا: چرخہ کیوں بند کیا؟ ضعیفہ نے عرض کیا کہ ایسا لائق اور جوان بیٹا دنیا سے اٹھ گیا، کیا ہمیں چرخے کا ہوش رہ سکتا ہے؟ فرمایا یہ سب قضا وقدر کے حکم ہیں، اللہ کے فرمان میں کون دم مار سکتا ہے؟ زندگی بہرحال چند روزہ ہے، ہمیں راضی بہ رضا رہنا چاہئے، اپنا کام بند نہ کرو۔ رضا بہ قضا کی ایسی پاکیزہ مثالیں کہاں ملتی ہیں؟

وصال

آخری عمر میں غذا بہت کم کردی تھی، یہاں تک کہ چنے کی دال کا تھوڑا سا پانی اور چند دانے چاول کے کھا لینے پر اکتفا فرماتے۔ کمال حبِ اتباع میں برابر دعاء فرماتے رہتے کہ عمر بھی رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم جتنی ہو۔ ۸/ ذی الحجہ ۱۰۹۶ھ (۲۶/ اکتوبر ۱۶۸۵ء) کو دوشنبہ کے دن واصل بحق ہوئے۔ باسٹھ برس، آٹھ مہینے اور چھبیس دن کی عمر پائی ''دوست بفردوس رسید'' آپ کی تاریخ وفات ہے۔

عالمگیر کو شاہ علم اللہ سے بڑی عقیدت تھی، انہیں دنوں میں خواب دیکھا کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے رحلت فرمائی اور ملائکہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازۂ مبارک کو آسمان پر لے گئے۔ اس خواب پر عالمگیر سخت پریشان ہوا، ملا جیون سے ذکر کیا تو انہوں کہا کہ غالباً شاہ علم اللہ فوت ہو گئے۔ چنانچہ خواب کی تاریخ لکھ لی گئی، پھر وقائع نویس کی رپورٹ سے تصدیق ہوگئی کہ واقعی سید علم اللہ اسی روز فوت ہوئے۔ بادشاہ نے ملا جیون سے پوچھا کہ آپ نے تعبیر کس دلیل کی بنا پر کی تھی؟ کہا صرف اس بناء پر کہ کمال اتباعِ سنت کا جیسا نمونہ شاہ علم اللہ تھے، اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی وفات کا مطلب یہ تھا کہ سنت کا ایک نہایت پاکیزہ نمونہ دنیا سے اٹھ گیا۔ (۱)

(۱) دُرالمعارف (شاہ غلام علی کے ملفوظات)

تیسرا باب:

علم اللّٰہی خاندان

این سلسلہ از طلائے ناب است
این خانہ تمام آفتاب است

سید علم اللہ کی اولاد

شاہ علم اللہ کی شادی سید ہاشم جائسی کی صاحبزادی بی بی صالحہ سے ہوئی تھی۔ اس بی بی سے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہوئیں، بیٹیوں میں سے ایک، سیدہ حنیفہ کی شادی سید عبدالرحیم بن سید ہدایت اللہ (بن سید اسحاق برادر سید فضیل) سے ہوئی۔ دوسری سیدہ حلیمہ، سید محمد جعفر بن سید قطب عالم سے بیاہی گئیں۔

بیٹوں میں سے بڑے سید آیت اللہ تھے، دوسرے سید محمد ہدیٰ تیسرے سید ابوحنیفہ اور چوتھے سید محمد۔ پہلے دو کے حالات ہم ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔ ان میں سے ایک ننھیالی رشتے میں سید احمد شہید کے جد امجد تھے، اور دوسرے ددھیالی رشتے میں۔ سید ابوحنیفہ، سید علم اللہ کی زندگی ہی میں ۱۰۸۸ھ میں فوت ہوئے، سید محمد دائرے کی سکونت چھوڑ کر شہر رائے بریلی کے اس حصے میں جا بسے تھے، جو قلعے کے نام سے موسوم تھا۔ والدہ کو بھی ساتھ لے گئے تھے، وہیں ایک دائرہ بنالیا تھا اور ایک مسجد تعمیر کرلی تھی، ان کی والدہ سیدہ صالحہ اپنے بلند منزلت شوہر سے بارہ برس بعد ۱۱/صفر ۱۱۰۸ھ (۳۰/اگست ۱۶۹۶ء) کو عازمِ فردوس ہوئیں، خود سید محمد نے ۲۴/ربیع الثانی ۱۱۵۵ھ (۱۷/جون ۱۷۴۲ء) کو

وفات پائی۔

سید علم اللہ نے ایک وصیت یہ فرمائی تھی کہ میرے بعد کسی فرزند کی دستار بندی نہ کی جائے یعنی کسی کو جانشین نہ بنایا جائے، اس لئے کہ سجادہ آرائی کا جو سلسلہ عام طور پر رائج تھا، اس سے سخت متنفر تھے اور چاہتے تھے کہ یہ سلسلہ ان کے خاندان میں جاری نہ ہو۔ چنانچہ اسی پر عمل ہوا، اس گھرانے کے کسی فرد نے اپنے حلقے سے باہر جا کر بھی کسبِ فیض میں کبھی تامل نہ کیا۔ اگر کوئی شخص خود ان سے استفادہ کا خواہاں ہوا تو اس کی آرزو بھی پوری کردی، لیکن باقاعدہ گدی بنا کر کوئی نہ بیٹھا۔ اسی طرح دنیوی دولت کی طلب میں سرگردانی کو بھی کسی نے شیوہ و شعار نہ بنایا، اگر دولت ملی تو اسے غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ دینے ہی کو ایک ایک فرد سعادت سمجھتا رہا۔

سید محمد آیت اللہ

فرزند اکبر سید آیت اللہ بڑے شجاع اور جوانمرد تھے، علومِ دینیہ کی تکمیل کے ساتھ ساتھ قرآن پاک حفظ کیا۔ ایک مرتبہ نصیر آباد گئے ہوئے تھے کہ ہلالِ رمضان طلوع ہوا۔ والد نے پیغام بھیجا کہ رائے بریلی آجائیں اور نمازِ تراویح میں قرآن سنائیں۔ نصیر آباد میں ان کے عم محترم دیوان سید احمد نے اصرار کیا کہ جب تک ہمیں پورا قرآن نہ سناؤ گے، جانے نہ دیں گے۔ سید آیت اللہ نے پہلی رات تراویح کی دو رکعتوں میں انتیس پارے ختم کردیے اور باقی رکعتوں میں تیسواں پارہ تمام کردیا، اس طرح عم محترم کی خواہش پوری کر کے یکم رمضان کو رائے بریلی پہنچ گئے۔

آغازِ شباب میں انہیں جہاد و غزا کا بڑا شوق تھا، اسی شوق میں چند اقربا کو لے کر ناظم گورکھپور کے پاس ملازم ہوگئے تھے۔ ایک دفعہ ایک جاگیردار سرکش ہوگیا اور اس نے گورکھپور پر دھاوا بول دیا۔ جمعہ کا دن تھا، سید آیت اللہ نماز کے لئے مسجد جارہے تھے کہ

ناظم فوج لے کر سرکش کے مقابلے کے لئے نکل پڑا، سید آیت اللہ نے فرمایا کہ پہلے جمعہ ادا کر لینا چاہئے، پھر لڑیں گے۔ ناظم بولا کہ جب تک آپ جمعہ سے فارغ ہوں گے، دشمن اپنا کام ختم کر کے چلتا بنے گا۔ آپ پیرزادے ہیں، نماز ادا کریں اور دعاء فرمائیں، ہم تو سب سے پہلے دشمن کا قلع قمع کریں گے۔

سید صاحب نے یہ سنا تو کچھ جواب نہ دیا، مسجد میں جا کر اطمینان سے جمعہ پڑھا، پھر اپنے ساتھیوں کو لے کر لڑائی کے لئے نکلے تو دیکھا کہ ناظم کے آدمی باغیوں کے مقابلے میں شکست کھا کر پسپا ہوتے ہوئے شہر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ سید آیت اللہ نے انہیں روکا، جب دیکھا کہ وہ سب ہمت ہار چکے ہیں تو اپنی جماعت کو ساتھ لیا، تلوار کھینچ کر بجلی کی طرح دشمن کی صفوں پر جا گرے، اور انہیں سراسیمہ وار بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی میں آپ کے بہنوئی سید عبدالرحیم (۱) اور دو بھائی بھی شریک تھے، سید عبدالرحیم نے اسی معرکے میں شہادت پائی۔

آخری عمر میں ملازمت چھوڑ دی تھی۔ ایک مرتبہ بعض خاندانی جھگڑوں کے فیصلے کے لئے آپ کو عالمگیر کے دربار میں دکن جانا پڑا، ایک بھائی دو صاحبزادے اور خادم ساتھ تھے، تمام امور کا فیصلہ کرا کے واپس ہوئے تو راستے میں بیمار پڑ گئے، یکا یک حالت غیر ہو گئی، استحضار کا وقت آیا تو سورۂ زلزال پڑھی اور چادر اوڑھ کر سو گئے۔ سمجھا گیا کہ آپ آرام فرما رہے ہیں۔ ایک امیر، جو شاہ علم اللہ کا ارادت مند تھا، مزاج پرسی کے لئے آیا کیفیت سنی تو بولا کہ وہ ابدی نیند سو گئے۔ کپڑا منہ سے ہٹا کر دیکھا تو واقعی جاں بحق ہو چکے تھے، یہ ۱۲؍رجب ۱۱۱۶ھ (۲۰؍اکتوبر ۱۷۰۴ء) کا واقعہ ہے۔ غسل و تکفین کے بعد میت کو

(۱) سید علم اللہ کے خاندان سے سید عبدالرحیم کا تعلق شجرے سے واضح ہو سکتا ہے، یہی سید عبدالرحیم شہید مولانا حکیم سید عبدالحئی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کے بزرگوں میں تھے۔ شجرۂ نسب یوں ہے: سید عبدالحئی بن سید فخر الدین، بن سید عبد العلی، بن سید علی محمد، بن سید اکبر شاہ، بن سید محمد تقی، بن سید عبدالرحیم۔ مولانا سید عبدالحئی کے فرزند اکبر ڈاکٹر سید عبدالعلی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء اور دوسرے فرزند مولانا سید ابوالحسن علی مصنف ''سیرۃ سید احمد شہید'' ہیں۔

تابوت میں ڈال کر بریلی پہنچایا گیا اور وہیں والد بزرگوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔

سید محمد حسن اور ان کے بھائی

سید آیت اللہ کی شادی سید قطب عالم کی صاحبزادی سیدہ سلمیٰ سے ہوئی تھی، پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں یادگار چھوڑیں۔ بیٹوں کے نام یہ ہیں: سید محمد حسن، سید محمد ضیاء، سید عظیم الدین شہید، سید محمد فیاض، سید محمد صابر، بیٹیوں میں سے سیدہ نجیہ کی شادی سید محمد سعید بن سید فیض اللہ بن سید داؤد (برادر شاہ علم اللہ) سے ہوئی اور دوسری سیدہ صبیحہ، سید آیت اللہ کے بھانجے سید محمد اشرف بن سید محمد جعفر سے بیاہی گئی۔

سید عظیم الدین کو شاہی دربار سے رائے بریلی کی حکومت کا پروانہ بھی مل گیا تھا۔ یہ حکومت پہلے شیرانی افغانوں کے قبضے میں تھی، انہوں نے قبضہ چھوڑنے سے انکار کر دیا اور مقابلے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس اثناء میں عید آ گئی، افغانوں نے باہم ساز باز کر لی کہ جونہی سید عظیم الدین نماز کے لئے عیدگاہ میں آئیں اچانک حملہ کر کے انہیں شہید کر ڈالا جائے۔ سید موصوف اس سازش سے بالکل بے خبر تھے، وہ چند آدمیوں کے ساتھ عیدگاہ میں پہنچے تو لوگ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، شیرانیوں نے دفعۃً حملہ کر دیا، سید عظیم الدین نے یہ حالت دیکھی تو ساتھیوں سے بہ آواز بلند کہہ دیا کہ جو بچ کر نکل سکے، نکل جائے، خود انہیں نکالنے کی کوشش کی گئی تو فرمایا:

ایں مراد از خدامی خواستم چوں پیش آمدہ است روئے ازاں نہ گردانم۔

ترجمہ: میں خدا سے شہادت کا آرزومند تھا، اب یہ مراد پوری ہونے کا موقع سامنے آ گیا تو اس سے روگرداں نہیں ہوسکتا۔

غرض وہ خود اور ان کے چند ساتھی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ خبر دائرے میں پہنچی تو سید محمد ضیاء خطبہ پڑھ رہے تھے، آپ نے کمالِ صبر و استقامت سے خطبہ پورا کیا، دعاء فرمائی، پھر سید محمد حسن آدمی لے کر گئے اور شہید بھائی کی میت اٹھا لائے، انہیں دفن کر کے

قلعے پر حملہ کیا، شیرانیوں نے عاجز آ کر صلح کی درخواست کی، سید محمد حسن نے صلح کر لی، لیکن شیرانیوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔

سید محمد حسن نے خود حکومت سنبھال لی دو برس کے بعد ان کی معزولی کا فرمان صادر ہو گیا۔ عالمگیر کا انتقال ہو چکا تھا، شاہ عالم بہادر شاہ دکن میں تھا، سید محمد حسن نے دکن کا قصد کیا تا کہ بادشاہ سے مل کر اپنی جاگیریں بحال کرائیں، برہان پور میں صحیح بخاری کی سند لی اور وہیں فوت ہوئے۔

ان کی شادی سیدہ مہتاب بنت سید عبدالرحیم سے ہوئی تھی، دو بیٹے ہوئے: سید محمد جامع اور سید محمد مختار، یہ دونوں لاولد رہے۔ بھائیوں میں سے سید عظیم الدین شہید اور سید محمد فیاض کے بھی اولاد نہ تھی، صرف سید محمد صابر اور سید محمد ضیاء سے خاندان کا سلسلہ چلا۔

سید محمد صابر نے خواجہ محمد معصوم سرہندیؒ کے فرزند خواجہ محمد صدیقؒ کی صحبت میں سلوک کی منزلیں طے کی تھیں، شوال ۱۱۹۲ھ (اکتوبر ۱۷۷۹ء) میں فوت ہوئے، جود وسخا کا بہتا دریا تھے، جو کچھ پاس ہوتا ضرورت مندوں کو دے دیتے۔

ایک دفعہ ایک سائل آیا تو بالکل خالی ہاتھ تھے، اپنی نئی دستار اتار کر اسے دے دی کہ بازار میں بیچ کر جو کچھ ملے اسے اپنے مصرف میں لاؤ۔

سید محمد ضیاء بیس برس تک اصلاح وتزکیہ میں مشغول رہے۔ ۱۲ رمضان ۱۱۶۶ھ (۱۳ جولائی ۱۷۵۳ء) کو فوت ہوئے، ان کے دو بیٹے تھے، سید محمد معین اور سید ابوسعید۔ سید ابوسعید، سید احمد شہید کے حقیقی نانا اور سید محمد معین سید شہید کی بڑی ہمشیر سیدہ نجیبہ کے جدِ مادری تھے۔

سید ابوسعید

سید ابوسعید نے عالم شباب میں اپنے عم مکرم سید محمد صابر سے بیعت کی تھی، پھر اپنے

والد کے خلیفہ محمد یونس سے آبائے کرام کی نسبت حاصل کی، بعد ازاں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی سے تعلق پیدا کر لیا اور تکمیل سلوک کے بعد خلافت کا منصب پایا۔

شاہ ولی اللہ، شاہ اہل اللہ (برادر شاہ ولی اللہ) شیخ محمد عاشق پھلتی (ابن خال شاہ ولی اللہ) اور شاہ عبد العزیز کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا، بعض مکاتیب ''کلمات طیبات'' میں چھپ چکے ہیں، سید ابو سعید کے موسومہ مکاتیب کا ایک مجموعہ ''مکتوب المعارف'' کے نام سے سید ابو القاسم ہسوی نے مرتب کر دیا تھا، شاہ ولی اللہ نے سید ابو سعید کو مختلف خطوں میں جن الفاظ سے مخاطب فرمایا وہ مکتوب الیہ کی جلالتِ منصب کا ایک روشن وثیقہ ہیں مثلاً:

۱۔ سیادت و نجابت مآب، حقائق و معارف آگاہ، میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

۲۔ ....خلاصۂ دودمانِ نجابت، میر ابو سعید سلمہ اللہ تعالیٰ۔

۳۔ حقائق و معارف آگاہ، سیادت و نجابت دستگاہ، سلالۃ الاکابر میر ابو سعید۔(۱)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ۳۰ر محرم ۱۱۷۶ھ (۲۱ر اگست ۱۷۶۲ء) کو فوت ہوئے، اس وقت خاندان علم اللٰہی میں سے سید نعمان آپ کے پاس تھے، انہوں نے سید ابو سعید کی یہ رنج افزا خبر مندرجہ ذیل الفاظ میں پہنچائی۔

> ''حضرت صاحب قدس سرہ' (شاہ صاحب) آپ سے (سید ابو سعید سے) بہت خوشنود تھے، اور آپ کے حال پر ان کی توجہاتِ عالیات بیان میں نہیں آسکتیں، اکثر اوقات آپ کے حالات دریافت فرماتے تھے، شاید آپ سے آخری ملاقات کی آرزو تھی۔ ایک مرتبہ فرمایا: سید ابو سعید آنے کا ارادہ کئے بیٹھے تھے، جلد پہنچ جائیں تو بہت اچھا ہو۔''

سید ابو سعید بڑے سخی، مہمان نواز اور غریب پرور تھے۔ ایک مرتبہ ایک لاکھ روپیہ

(۱) یہ مجموعہ مکاتیب اب ''الفرقان'' (لکھنؤ) اور ''الرحیم'' (حیدر آباد سندھ) میں بالاقساط چھپ گیا ہے۔

کہیں سے آیا، جب تک پورے کا پورا مستحقوں میں بانٹ نہ لیا، گھر میں قدم نہ رکھا۔ اطراف مدراس میں ارادت مندوں کا وسیع حلقہ موجود تھا، ان کے خلفائے خاص میں سے مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں:

میر عبدالسلام بدخشانی، شیخ محمد مراد، مولانا جمال الدین، مولانا عبداللہ آفندی، حاجی امین الدین کاکوروی اور شاہ عبدالقادر خالص پوری۔

سید ابوسعید ۹ر رمضان المبارک ۱۱۹۳ھ (۲۰ر ستمبر ۱۷۷۹ء) کو فوت ہوئے، ان کے دو بیٹے تھے اور چار بیٹیاں، بیٹیوں میں سے ایک کا نام ناجہ یا عافیہ تھا(۱) یہ سید احمد شہید کی والدہ تھیں، بیٹوں میں سے سید ابواللیث سید شہید کے حقیقی ماموں تھے، حج سے واپسی پر ۱۲۰۹ھ میں کوڑیال بندر پہنچے تو بیمار ہو کر وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے۔

سید محمد ہدیٰ

سید علم اللہ کے دوسرے فرزند سید محمد ہدیٰ بھی بڑے عالی ہمت اور تقویٰ شعار تھے۔ سخاوت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کا سوال رد نہ کیا، یہاں تک کہ ایک مرتبہ پاس کچھ نہ تھا تو اہلیہ کا زیور اتروا کر سائل کے حوالے کر دیا۔ ان کے پاس کئی جاگیریں تھیں، صرف نصیر آباد کی جاگیر سے اپنے گھر کا خرچ پورا کرتے، باقی جتنی آمدنی تھی وہ لوگوں کو دے دیتے، دو تین گاؤں برادری والوں کے لئے الگ کر رکھے تھے۔ ایک روز کہیں سے بارہ ہزار عالمگیری دینار آئے، آپ نے ایک ہی مجلس میں سب بانٹ دیے اور خود رات فاقے میں گزاری۔

اگرچہ امیر اور جاگیر دار تھے، لیکن اپنے لئے کوئی پختہ مکان نہ بنوایا، اگر اس طرف توجہ دلائی جاتی تو کہتے: چند سانس گزارنے کے لئے چھپر اور اونچی عمارتیں یکساں ہیں،

(۱) خاندانی روایتوں میں دونوں نام آئے ہیں یقینی طور پر کوئی صاحب نہ بتا سکے کہ کس نام کو ترجیح حاصل ہے۔

چھپروں میں بھی کبھی عمدہ لکڑی استعمال نہ کی، شاہ عالم اول سے ملنے کے لئے نکلے، وہ دکن کی طرف جارہا تھا، برہان پور پہنچے تو وہاں ربیع الاول ۱۱۲۰ھ (مئی یا جون ۱۷۰۸ء) میں فوت ہوئے۔ اقربا نے میت کو بطورِ امانت برہان پور کی خانقاہ نقشبندیہ میں دفن کیا، ایک برس کے بعد اسے تابوت میں رکھ کر رائے بریلی لائے۔

آپ کے دو فرزند تھے، بڑے سید محمد نور، چھوٹے سید محمد سنا۔ سید محمد نور زہد و تقویٰ کے پیکر تھے ابتدائی تربیت شاہ علم اللہ کی نگرانی میں ہوئی۔ دادے کو اس پوتے سے بڑی محبت تھی، سید محمد ہدیٰ اکثر فرمایا کرتے تھے، امید ہے اس بچے کی تربیت سے میری مغفرت ہوگی۔

سید محمد نور جوان ہوئے تو شاہی ملازمت کے لئے دکن گئے۔ شاہ علم اللہ کے ارادت مندوں میں سے ایک امیر نے واسطہ بن کر انہیں شہزادۂ اعظم جاہ کی سرکار میں ملازم کرادیا، اور خاص ان کیلئے دربار کے عام طریق تسلیم و بندگی کی جگہ صرف سلام مسنون کی اجازت حاصل کی۔ چودہ برس کی ملازمت کے بعد ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ ایک وسیع میدان میں نہایت خوب صورت مسجد ہے، اس میں نورانی شکل کے ایک بزرگ بیٹھے ہیں، سامنے ایک دستار رکھی ہے، انہوں نے دستار پھاڑ کر رکھ دی، سید محمد نور نے پوچھا یہ کیا ہوا؟ بزرگ نے فرمایا کہ یہ اعظم جاہ کی سلطنت تھی، جسکی دستاویز پارہ پارہ کردی گئی۔

خواب سے بیدار ہوتے ہی طبیعت ملازمت سے بیزار ہوگئی، دو برس کی رخصت لے کر گھر چلے آئے، پھر استعفاء دے دیا۔ اپنے جد بزرگوار شاہ علم اللہ کی طرح اہل بدعت کے ہدایا قبول نہیں کرتے تھے، اکل حلال کا خاص اہتمام تھا، عزیزوں ہمسایوں اور غریبوں کی خدمت کو ذریعۂ سعادت سمجھتے تھے۔ اوقاتِ گرامی کا بیشتر حصہ انہیں خدمات میں بسر ہوتا تھا۔ ۱۲؍جمادی الاخریٰ ۱۱۴۸ھ (۱۹؍اکتوبر ۱۷۳۵ء) کو دوشنبہ کے دن نصیر آباد میں وفات پائی اور اپنے نانا سید داؤد (برادر حقیقی شاہ علم اللہ) کے قریب دفن ہوئے۔

سید محمد نور کی اولاد

ان کی دو شادیاں ہوئیں، ایک بی بی سے صرف ایک فرزند تھے، سید محمد عمران۔ دوسری بی بی سے تین بیٹے تھے، سید محمد عثمان، سید محمد نعمان، سید محمد عرفان اور دو بیٹیاں: صانعہ اور ناطقہ۔

سید محمد عمران نے چھیاسٹھ برس کی عمر پا کر ۴ر شعبان ۱۱۸۵ھ (۱۲ر نومبر ۱۷۷۲ء) کو رائے بریلی میں انتقال کیا، ان کا صرف ایک فرزند تھا، سید محمد غفران وہ لاولد فوت ہوا۔

سید محمد نعمان کو ذکر و فکر اور سلوک سے گہری دلچسپی تھی، پہلے خیال ہوا کہ والد سے جدی نسبت حاصل کریں، وہ بیمار ہو گئے تو اس فیض کو صحت پر موقوف رکھا، لیکن اسی مرض میں والد فوت ہو گئے۔ سید محمد نعمان کو اس دولتِ سرمدی سے محروم رہنے کا قلق مدت العمر رہا، پھر گھر سے نکل پڑے اور دہلی پہنچ کر شاہ ولی اللہ محدث سے کسبِ فیض کیا، بعد ازاں حرمین شریفین پہنچ گئے۔

حج کے بعد مدینہ منورہ ہوتے ہوئے بیت المقدس چلے گئے، وہاں سے چند میل مشرق میں دریائے اردن کے قریب ایک قبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے منسوب ہے، اس کی زیارت کیلئے گئے تو وہیں ذات الجنب کا عارضہ لاحق ہوا، ۵ر جمادی الثانی ۱۱۹۳ھ (۲۰ر جون ۱۷۷۹ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوئے۔ اسی قبے کے پاس انہیں دفن کیا گیا۔ انہوں نے اپنے جدِ امجد کے حالات میں ایک کتاب ''اعلام الہدیٰ'' کے نام سے مرتب کی تھی، خاندانی حالات کے آخری اضافے کے بعد اس کا نام ''تذکرۃ الابرار'' رکھا گیا۔

سید محمد عثمان کے حالات معلوم نہ ہو سکے، ان کی شادی میر گجراتی کی صاحبزادی سیدہ عالمہ سے ہوئی تھی، صرف ایک بیٹا یادگار چھوڑا: سید عبد السبحان۔ یہ سید عبد السبحان، سید احمد شہید کے بہنوئی اور سید محمد علی، صاحبِ ''مخزنِ احمدی'' سید احمد علی شہید پھولڑہ، سید حمید الدین اور سید عبد الرحمٰن کے والد تھے۔ غالباً لکھنؤ میں ملازم ہو گئے تھے، وہیں

شوال ۱۲۱۲ھ (فروری یا مارچ ۱۷۹۸ء) میں عبدالقادر خاں جائسی کے مکان واقع اسماعیل گنج میں فوت ہوئے اور عبداللہ شاہ کے تکیے میں انہیں دفن کیا گیا، تاریخ وفات یہ ہے:

زرضوان چو جستیم تاریخِ فوت　　به گفتا که خوش آمدی مرحبا

سید محمد عرفان

سید محمد عرفان، سید احمد شہید کے والد ماجد تھے، ان کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں کہ متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے اور لکھنؤ میں رہتے تھے۔ شاید ملازمت کا علاقہ تھا، ۱۲۱۴ھ (۱۸۰۰ء) میں غالباً بیمار ہو کر لکھنؤ سے رائے بریلی جا رہے تھے، وطن کے قریب پہنچ کر راستے ہی میں فوت ہوئے، میت رائے بریلی میں دفن کی گئی، اس وقت سید احمد شہید تیرہ برس کے تھے۔

سید محمد عرفان کا پہلا نکاح سید محمد معین ابن سید محمد ضیاء بن سید آیت اللہ کی صاحبزادی سیدہ نقیہ سے ہوا تھا۔ ان سے صرف ایک بیٹی ہوئی: سیدہ نجیہ، زوجہ سید عبدالسبحان۔ یہ بی بی فوت ہوگئیں تو سید محمد عرفان نے مدت تک دوسری شادی نہ کی، سیدہ نجیہ بالغ ہوئیں، بلکہ ان کی شادی بھی ہوگئی تو انہوں نے خود والد کی شادی اپنے نانا کے حقیقی بھائی سید ابوسعید کی صاحبزادی سے کرائی، جن کا نام سیدہ نجیہ عرف ناجہ تھا۔ بعض نے عافیہ لکھا ہے، جو صحیح نہیں۔ یہی سیدہ، سید احمد شہید نیز ان کے دو بھائیوں اور تین حقیقی بہنوں کی والدہ ماجدہ ہیں، ان کی وفات ۱۲۲۹ھ (۱۸۱۴ء) میں ہوئی، جب سید صاحب، نواب امیر خاں کے پاس تھے۔

سید شہید کے بھائی اور بہنیں

سید شہید کے بڑے بھائی سید ابراہیم نے تحصیل علوم پر زیادہ توجہ نہ کی، ملازمت کا

خیال آیا تو نواب امیر خاں کی بڑی شہرت تھی، راجپوتانہ جا کر نواب ہی کے لشکر میں ملازم ہو گئے۔ میرا خیال ہے کہ ابتدا میں غالباً سپاہی تھے، پھر ان کا زہد و تقویٰ دیکھ کر امامت کی خدمت سونپ دی گئی، لشکر ہی میں ۴ رشوال ۱۲۲۴ھ (۱۲ رنومبر ۱۸۱۰ء) کو فوت ہوئے۔ ان کی شادی حقیقی ماموں سید ابواللیث کی بڑی صاحبزادی سیدہ فاطمہ سے ہوئی تھی، اولاد میں ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی، بیٹی کا نکاح سید شہید کے چھوٹے بھانجے سید عبدالرحمٰن سے ہوا، بیٹے سید محمد یعقوب کے حالات موقع پر بیان ہوں گے۔

دوسرے بھائی سید اسحاق نے کسبِ علوم میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ دہلی پہنچ کر شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر سے حدیث و تفسیر کی کتابیں پڑھیں، کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور فن تفسیر سے خاص شغف رکھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ صرف اس مضمون کی دو سو کتابیں ان کے پاس تھیں، فارسی اور عربی میں شعر بھی کہتے تھے، مثلاً دو سو شعر کا ایک قصیدہ میراث میں لکھا اور اس کی شرح کی، پھر نحوی مسائل نظم کیے، فارسی کے ایک قصیدے میں اہلِ بدر کے اسمائے گرامی جمع کر دیے۔ ۶ رجمادی الاخریٰ ۱۲۳۴ھ (۲ راپریل ۱۸۱۹ء) کو رائے بریلی میں فوت ہوئے۔ ان کی شادی حقیقی ماموں کی صاحبزادی سیدہ ولیہ سے ہوئی تھی، صرف ایک بیٹا سید اسماعیل یادگار چھوڑا، سیدہ ولیہ کا نکاح ثانی سید احمد شہید سے ہوا، ان کے مزید حالات آگے چل کر بیان ہوں گے۔

سید شہید کی بہنوں میں سے سیدہ حنیفہ اور سیدہ صاحب النساء کی شادی یکے بعد دیگرے سید معصوم احمد سے ہوئی، سیدہ صالحہ سید محمد مصطفیٰ سے بیاہی گئیں، یہ قلعے میں رہتی تھیں، انہیں سے ملنے کیلئے سید شہید روزانہ تکیہ شاہ علم اللہ سے قلعے جایا کرتے تھے۔(۱)

---

(۱) سید معصوم احمد کا نسب یہ ہے: سید معصوم احمد بن سید محمد واضح بن سید محمد صابر بن سید آیت اللہ بن سید علم اللہ اور سید محمد مصطفیٰ سید علم اللہ کے چوتھے فرزند سید محمد کی اولاد میں سے تھے، سید محمد مصطفیٰ بن سید محمد ثانی بن سید محمد حکم بن سید محمد بن سید علم اللہ۔

سید احمد شہید کی والدہ ماجدہ کی تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی، لیکن یہ معلوم ہے کہ جب سید صاحب تعلیم و تکمیل سلوک کے بعد دہلی سے رائے بریلی پہنچے تو وہ زندہ تھیں۔

سید شہید کا بیان

سید شہید نے شاہ بخارا کے نام جو مکتوب بھیجا تھا، اس میں اپنے خاندان کے متعلق تحریر فرمایا تھا:

> یہ خاکسار ساداتِ عظام کے خاندان سے ہے۔ اس مسکین کے اسلافِ کرام صدیوں سے بلادِ ہند میں ارشاد و تلقین کی مسندوں پر متمکن رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی عمریں رب العالمین کے احکام کی اطاعت اور حضرت سید المرسلینؐ کے اوامر کی پیروی میں بسر کر دیں، جو لوگ ان سے استفادے کی غرض لے کر آئے، ان کے دامن فیض کی دولت سے بھرے۔ چنانچہ اس ضعیف کے ممتاز بزرگوں میں سے بارگاہِ الٰہی کے مقرب سید علم اللہ، حضرت سید آدم بنوریؒ کے خلفائے کبار میں سے تھے، وہ سنتِ محمدیہ کے احیاء اور طریقہ محمدیہؐ کی اشاعت میں اپنے عہد کے تمام بزرگوں سے آگے تھے۔

یہ سخن گستری نہ تھی بلکہ ایک حقیقت کا اظہار تھا، اور ہم سید شہید کے اسلافِ کرام کی نسبت اجمالاً جو کچھ اوپر لکھ چکے ہیں وہ اس حقیقت کی شہادت دے رہا ہے۔ صرف شاہ علم اللہ سے سید احمد شہید تک چار پشتوں میں بیسیوں افراد ہوئے، جن کے مآثر بہ زبانِ حال اس دعوے کے مصدق ہیں۔ جہاد و غزا، جود و سخا، زہد و تقویٰ، ریاضت و صفا، صبر و توکل، فقر و مسکنت یا دوسرے انسانی فضائل و محاسن کا کونسا گوشہ ہے جس میں اس خاندانِ عالیہ کے افراد کا جمگھٹا نظر نہیں آتا۔ اخلاص و للٰہیت کے اسی حلقۂ صافیہ سے سید شہید کا مایۂ خیر اٹھایا گیا تھا اور انہیں مآثر حسنہ کی آغوشِ مقدس میں تربیت پا کر وہ مملکت عزیمت کے یگانۂ تاجدار بنے۔

ذاتی شرف اور خاندانی عظمت

محض خاندانی فضائل کی داستان سرائی کسی کیلئے بھی وجہِ شرف نہیں ہوسکتی، اور اسلافِ کرام کی استخواں فروشی سے عظمت و برتری کے بازار میں گرمیٔ ہنگامہ پیدا کرنا قطعاً زیبا نہیں، اصل شئے حسنِ عمل اور فضیلتِ کردار ہے۔ سید شہید اس وجہ سے بڑے نہیں بنے تھے کہ ان کے بزرگوں میں سے سیکڑوں افراد نے اپنی زندگیوں کا ایک ایک لمحہ دین حق کی خدمت کیلئے وقف رکھا تھا، اس وجہ سے عظمت و برتری کا درجہ حاصل کیا کہ ان کی شانِ اخلاص اور عزیمتِ عمل کے کرشمے نہ محض ان کے عہد میں بلکہ پیشتر کے اکثر عہود واعصار میں بھی یگانہ حیثیت رکھتے تھے۔ وہ پورے خاندان کے گل سرسبد تھے، درخشاں ستاروں کی انجمن میں مہتاب عالم تاب تھے، حسنِ کرامت کی یہ عزت بہت کم افراد کو ملتی ہے کہ اول میراث ہر لحاظ سے قابلِ فخر ہو، پھر وہ اپنے حسنِ عمل سے جلادے کر اس میراث کو عوام کی ہدایت کا سرچشمہ نور بنادے۔ سید صاحب کو خدا نے دونوں نعمتوں سے سرفرازی بخشی۔ خاندان وہ ملا جس کے افراد پشتوں سے خدامستی اور اسلام دوستی میں امتیازِ خاص کے مالک تھے، پھر ہمت و عزیمت کی وہ دولت عطا ہوئی کہ نہ محض خاندان بلکہ پوری ملت میں قرون ودہور تک ان کے پایے کا مردِ مجاہد نظر نہیں آتا۔

چوتھا باب:

پیدائش اور عہدِ طفولیت

پیدائش

سید احمد شہید ۶ رصفر ۱۲۰۱ھ (۲۹ رنومبر ۱۷۸۶ء) کو پیر کے دن رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ ''مخزنِ احمدی'' سید صاحب کے ابتدائی حالات کے متعلق مستند ترین ماخذ ہے، اس میں بتایا گیا ہے:

> ولادتِ باسعادت حضرت سید المجاہدین در شہر صفر بعد گزشتن یک ہزار دو صد سال در سن اول قرن ثالث عشر از ہجرت خیر البشر نبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم در قصبہ رائے بریلی سرکار مانک پور مضافات صوبہ الہ آباد واقع گردیدہ۔(۱)

---

(۱) ''مخزنِ احمدی'' مطبوعہ ص: ۱۲۔ صفر کا مہینہ ۲۳ نومبر ۱۷۸۶ء کو شروع ہو کر ۹ ردسمبر ۱۷۸۶ء کو ختم ہوا۔ صاحبِ ''مخزنِ احمدی'' نے معین تاریخ نہیں لکھی، صرف مہینہ تحریر فرما دینے پر اکتفا کی۔ اغلب ہے کہ انہیں صحیح تاریخ یاد نہ ہو، ۶ رصفر کی تاریخ مجھے سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کی والدہ کے ایک بیان سے معلوم ہوئی، وہ فرماتی ہیں:
''سید صاحب جب والدہ کے پیٹ میں تھے تو اس محترمہ نے ایک روز خواب دیکھا کہ میرے خون سے ایک کاغذ لکھا گیا ہے، جو تمام عالم میں اڑتا پھرتا ہے۔ اس پر مشوش ہوئیں، یہ خواب ان کے داماد سید عبد السبحان نے سنا تو کہا کہ تشویش کی ضرورت نہیں، اس کی تعبیر یہ ہے کہ جو بچہ آپ کے پیٹ میں ہے وہ دنیا میں بہت نامور ہوگا۔ ایامِ حمل تکمیل کے قریب پہنچے تو یکا یک حمل کے ظاہری آثار میں کمی آ گئی، ایسا معلوم ہونے لگا کہ وضع کا زمانہ ابھی دور ہے، تھوڑے دن بعد وہ سو کر اٹھیں تو پھر پورے آثار نمودار ہو گئے۔ صفر کی چھٹی تاریخ کو سید صاحب پیدا ہوئے۔
اس روایت کے معلوم ہونے کا قصہ بڑا عجیب ہے، سید صاحب کے خاندان کے جن افراد سے ملاقات کا شرف مجھے حاصل ہوا، ان میں سے کسی کو بھی صحیح تاریخ کا علم نہ تھا۔ میں نے کتاب کی آخری تبییض شروع کر رکھی تھی، کہ ٹونک سے ''وقائع احمدی'' کا ایک ناقص و نامکمل نسخہ میرے پاس آیا، اس کے آغاز میں ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

ترجمہ : ہجرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر بارہ صدیاں گذر چکی تھیں، تیرھویں صدی کا پہلا سال شروع ہو چکا تھا، اسی سال حضرت سید المجاہدین کی ولادت باسعادت صفر کے مہینے میں قصبہ رائے بریلی میں ہوئی، جو سرکار مانک پور اور صوبہ الہ آباد میں شامل تھا۔

تعلیم

جب عمر چار برس، چار مہینے اور چار دن کی ہوئی تو شرفائے ہند کے معمول کے مطابق آپ کو مکتب میں بٹھایا گیا۔ اگر وہ ۶ر صفر کو پیدا ہوئے تو سمجھنا چاہئے کہ مکتب میں بیٹھنے کی تاریخ ۱۰ر جمادی الاخریٰ ۱۲۰۵ھ (۱۵ر فروری ۱۷۹۱ء) ہوگی۔ خاندان کا سب سے بڑا سرمایہ یا علم دین تھا یا ذکر و سلوک، اس لئے یقین ہے کہ تعلیم کے اہتمام میں کوئی دقیقۂ سعی فروگزاشت نہ ہوا ہوگا۔ لیکن کوششوں کے باوجود سید صاحب کی طبیعت تحصیل علم کی طرف مائل نہ ہوئی۔ ''مخزنِ احمدی'' کا بیان ہے کہ تین برس تک برابر مکتب جاتے رہے، لیکن اس مدت میں قرآن پاک کی چند سورتیں حفظ کر سکے اور مفرد حروف کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ آپ کے بڑے بھائی، سید ابراہیم اور سید اسحاق بار بار لکھنے پڑھنے کی

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... دو تین ورق لگے ہوئے تھے، اور ان پر بعض روایتیں مرقوم تھیں، ان میں سے ایک روایت یہ بھی تھی۔

مؤلف ''تواریخ عجیبہ'' (معروف بہ سوانح احمدی) نے خدا جانے کس بنا پر لکھ دیا کہ سید صاحب یکم محرم ۱۲۰۱ھ کو پیدا ہوئے۔ تمام ارادت مندوں نے اسی تاریخ کو درست مان لیا اور تیرھویں صدی کے پہلے دن پیدا ہونے کو بھی سید صاحب کی مجددیت کے دلائل میں سے ایک اہم دلیل بنا لیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ سید صاحب کی عظمت و فضیلت کی بناء یہ نہیں کہ وہ ایک خاص تاریخ کو پیدا ہوئے، بلکہ ان کی فضیلت مخصوص و ممتاز کارناموں پر مبنی ہے۔ یکم محرم الحرام ۱۲۰۱ھ کو خدا جانے اس دنیا میں کتنے بچے پیدا ہوئے، لیکن ان میں سے کتنے ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ سید صاحب کی طرح خدمتِ حق میں گذرا؟ عظمت کی بنیاد حسنِ عمل ہے نہ کہ خاص یوم پیدائش یا تاریخ و وقتِ پیدائش۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ سید صاحب یکم محرم کو نہیں بلکہ ۶ر صفر کو پیدا ہوئے۔

تاکید کرتے رہتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ والد بزرگوار اس تاکید کو بالکل بے سود سمجھ چکے تھے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں: اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو، جو کچھ اس کیلئے مستحسن اور اولیٰ ہوگا، ظہور میں آجائے گا۔ ظاہراً تاکید مفید نظر نہیں آتی۔(۱)

اُمیت کا افسانہ

یہ بتانا مشکل ہے کہ ابتدا میں سید صاحب کو کیوں تعلیم سے چنداں دلچسپی نہ تھی لیکن انہیں رسمی علوم سے بیگانہ محض ظاہر کرنے کی سعی حد درجہ تعجب انگیز ہے۔ یقیناً انہوں نے ظاہری علوم میں درجۂ اختصاص حاصل نہ کیا، تاہم فارسی بخوبی جانتے تھے اور اس میں بے تکلف بات چیت کرتے تھے۔ عربی میں اتنی مہارت پیدا کر لی تھی کہ مشکوٰۃ المصابیح کا مطالعہ بطور خود کر لیتے تھے، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ حافظؔ، بیدلؔ اور بعض دوسرے شعرا کے اشعار بھی انہیں یاد تھے۔

میرا خیال ہے کہ انہوں نے بعض شعراء کے دواوین یا منتخب اشعار کے مجموعے ضرور دیکھے ہوں گے۔ ''امیر الروایات'' میں خان صاحب امیر شاہ خاں نے اپنے استاذ میانجی محمدی کی یہ روایت بیان کی ہے کہ میں شاہ محمد اسحاق سے کافیہ پڑھتا تھا، سید صاحب تشریف لائے تو انہوں نے میزان شروع کی اور اتنی جلدی ترقی کی کہ نصف سے آگے مجھے کافیہ میں پکڑ لیا، کافیہ ہی پڑھتے ہوئے انہوں نے شاہ صاحب سے مشکوٰۃ بھی شروع کر دی اور کوئی کتاب شاہ اسماعیل سے بھی پڑھتے تھے۔(۲)

مولوی عبدالقیوم کا بیان ہے کہ اثناءِ تحصیل علم میں سید صاحب کی یہ کیفیت ہوئی کہ جب کتاب کو دیکھتے تو حروف ان کی نظروں سے غائب ہو جاتے۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی بیماری ہوگئی ہے۔ طبیبوں سے رجوع کیا گیا، مگر یہ کیفیت زائل نہ ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز

(۱) مخزن احمدی مطبوعہ ص:۱۲ (۲) ارواحِ ثلاثہ ص:۹۸

تک یہ بات پہنچی تو انہوں نے فرمایا: جالی وغیرہ باریک چیزوں پر نظر جماؤ اور دیکھو کہ وہ بھی نظروں سے غائب ہوتی ہیں یا نہیں؟ کوئی باریک سے باریک چیز غائب نہ ہوئی تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ جب کسی نیاز مند نے اس حکم کا سبب پوچھا تو فرمایا: اگر اور باریک چیزیں غائب نہیں ہوتیں تو معلوم ہوا کہ یہ مرض نہیں، ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم ظاہری ان کی قسمت میں نہیں، ان کو تعلّم سے پڑھنا نہ آئے گا، بلکہ علم لدنی حاصل ہوگا۔(۱)

مجھے اس روایت کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن معلوم ہے کہ سید صاحب علم سے کورے نہ تھے، بے شک انہیں کتابی علوم میں وہ درجہ حاصل نہ ہوا جو مثلاً شاہ عبدالعزیز یا شاہ اسماعیل شہید کا تھا، تاہم وہ خاصے پڑھے لکھے تھے، شرعی اوامر ونواہی سے بخوبی واقف تھے۔ عربی اور فارسی بے تکلف سمجھتے تھے، آیات واحادیث کے معارف بیان فرماتے تھے، اور انہیں ''امّی'' ظاہر کرنا سراسر عجائب پسندی کا ایک کرشمہ ہے۔

مردانہ کھیلوں کا شوق

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی خاندانی بزرگوں کی زبان سے بیان فرماتے ہیں:

آپ کو بچپن سے کھیلوں کا بڑا شوق تھا، خصوصاً مردانہ اور سپاہیانہ کھیلوں کا، کبڈی بڑے شوق سے کھیلتے، اکثر لڑکوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے قلعے پر حملہ کرتا۔(۲)

''تواریخ عجیبہ'' میں ہے:

بستی کے ہم سن لڑکوں سے ایک ''لشکر اسلام'' جمع کرتے، بطور جہاد بہ آواز بلند تکبیریں کہتے ہوئے ایک فرضی ''لشکر کفار'' پر حملے کیا کرتے تھے، اور ''وہ مارا'' ''یہ فتح ہوا'' یہی صدائیں ''لشکر اسلام'' سے بلند ہوتی تھیں۔(۳)

(۱) ارواح ثلاثہ ص:۹۸ (۲) سیرۃ سید احمد شہید طبع ثانی ص:۴۶ (۳) تواریخ عجیبہ ص:۴

جذبۂ جہاد

سید صاحب خود فرماتے ہیں کہ عہد طفلی ہی سے یہ بات میرے دل میں جم گئی تھی کہ میں کافروں سے جہاد کروں گا اور اکثر اس کا اظہار ہوتا رہتا۔ تمام اقربا میرے ان الفاظ پر متعجب ہوتے بعض سمجھتے کہ یہ بچپن کی اٹکھیلیاں ہیں، بعض نے بار بار یہی سنا تو خیال ہوا کہ ممکن ہے یہ سچ کہتا ہو، صرف والدۂ ماجدہ میرے اس دعوے کو حرفاً حرفاً درست سمجھتی تھیں۔ آخر ایک روز بعض اقربا جمع تھے، عام دستور کے مطابق انہوں نے دیوان حافظ سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

تیغے کہ آسمانش از فیضِ خود دہد آب
تنہا جہاں بگیرد بے منتِ سپاہی

ایک بڑھیا پاس بیٹھی تھی، اس نے شعر کا ترجمہ سنا تو بولی کہ انہیں کو (یعنی سید صاحب کو) واقعی سپاہ کی حاجت نہ ہوگی۔

عجب امر یہ ہے کہ جب سید صاحب ہندوستان سے ہجرت کر کے بعزمِ جہاد سرحد جا رہے تھے، تو کابل میں بعض اصحاب کو ان کے رفقاء اور اسبابِ حرب وضرب کی قلت پر سخت تعجب ہوا تھا، انہوں نے بھی دیوان حافظ سے فال نکالی تو یہی شعر نکلا، اس کا ذکر موقع پر آئے گا۔

ورزشیں

غرض سید صاحب کو ابتدائے عمر میں تعلیم سے کہیں زیادہ سپہ سالاری اور تہیہ غزا و جہاد سے دلچسپی تھی، اس وجہ سے انہوں نے سخت ورزشیں کر کر کے اپنے جسم کو انتہائی شدائد کا عادی بنالیا تھا۔ آپ کے بھانجے سید عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ سورج نکل آنے

سے گھنٹوں بعد تک ورزش اور کشتی میں مشغول رہتے۔ میں بچہ تھا اور ورزش کے دوران میں آپ کے بدن پر مٹی ملا کرتا تھا، مجھے اپنے پیروں پر کھڑا کر کے پانسو ڈنڈ پیلتے۔ پھر تھوڑی دیر کے لئے ستاتے، بعد ازاں اسی طرح ڈنڈ پیلنے میں مشغول ہو جاتے، بیس سیر، تیس سیر اور من بھر کے مگدر بنا رکھے تھے، دو دو چار چار گھنٹے برابر انہیں ہلاتے رہتے۔

غیر معمولی قوت

جسم میں قوت خلقاً بھی غیر معمولی تھی، ورزشوں کی کثرت نے اس میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ یہی زمانہ ہے جس میں سید صاحب نے عام آلات مثلاً تلوار، تیر، کمان، بندوق کا استعمال سیکھا اور ان میں بھی غیر معمولی مشق بہم پہنچائی۔

تکیے کے قریب، سئی ندی کے کنارے معین خاں کا مقبرہ ایک مشہور مقام ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں یہ مقام شہ زروں کی ورزش گاہ تھا۔ مقبرے کے پاس پتھر کا ایک بھاری چراغ دان پڑا تھا، جس کی وضع ایک ستون کی سی تھی، لمبائی میں چھ فٹ سے کم نہ ہوگا، اسے اٹھانا بھی زور وقوت کی نمائش کا ایک بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ عام طریقہ یہ تھا کہ پہلے اسے کھڑا کر لیا جاتا پھر پورا زور لگا کر اٹھایا جاتا۔ عام پہلوان صرف زانو تک اٹھا سکتے، بعض کمر تک لے جاتے۔ سید عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ چاندنی رات میں سید صاحب چند رفیقوں کے ساتھ اُدھر سے گذرے اور چراغ دان کو دیکھ کر فرمایا کہ اسے اٹھانا چاہئے، پھر اپنا کرتا اُتار کر گدی سی بنائی اور کندھے پر رکھ لی، اس کے بعد جھکے، پتھر کو بے تکلف کندھے پر رکھ کر بیس قدم چلے اور اسے زمین پر پھینک دیا۔ جس مقام پر یہ گرا، وہاں ڈیڑھ فٹ گڑھا پڑ گیا، دوسرے روز لوگوں نے پتھر کو اصل جگہ سے بیس قدم کے فاصلے پر دیکھا تو حیران رہ گئے، اور سمجھے کہ یہ کسی جن یا دیو کا کام ہوگا۔

شناوری

شناوری میں کمال پیدا کرلیا تھا، دہلی میں مولوی سلیم اللہ پیراکی کے مشہور استاد تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ پانی کے تیز بہاؤ کے خلاف بے تکلف تیرنے کا وصف میں نے سید صاحب میں دیکھا، اپنی عمر مشاقی میں گزار دینے کے باوجود میں اس کمال کو نہ پہنچ سکا۔ دم اتنا بڑھالیا کہ غوطہ لگا کر دریا کی تہہ میں بیٹھ جاتے اور اتنی دیر تک بیٹھے رہتے کی نمازی اس اثناء میں دو رکعت نماز ادا کرلے۔

غرض قوت وطاقت اور مشاقی وچابک دستی کے جتنے مردانہ فنون اس زمانے میں رائج تھے، سید صاحب نے ان سب میں اعلیٰ درجہ حاصل کرلیا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ شوقِ جہاد کی وجہ سے ان فنون کی طرف توجہ مبذول ہوئی یا ویسے ہی طبیعت کو کتابوں کے مطالعے کے بجائے ان امور سے زیادہ لگاؤ تھا۔

کلیجی کھانے کا شوق

سید صاحب نے ماکولات وملبوسات میں سے کبھی کسی چیز کی عادت نہ ڈالی، جو کچھ مل جاتا کھالیتے اور جو کچھ میسر آجاتا پہن لیتے۔ طبیعت میں ایثار کا مادہ اتنا زیادہ تھا کہ دوسروں کو ہمیشہ اپنے اوپر ترجیح دیتے۔ ایسی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں کہ خود معمولی غذا کھا کر گزارہ کرلیا اور دوسروں کو بہترین چیزیں کھلائیں، کبھی آپ فاقہ کرتے اور پوری غذا دوسروں کے حوالہ کردیتے، لیکن ماکولات میں سے کلیجی آپ کو بہت پسند تھی، اسے بڑے شوق سے کھاتے تھے۔

ایک مرتبہ نصیر آباد گئے ہوئے تھے، وہاں اتنی کلیجی کھائی کہ پیٹ میں گرانی محسوس ہونے لگی۔ واپسی کے وقت راستے میں اپنے ساتھی سے گرانی کا ذکر کیا، اس نے کہا کہ کوئی چورن کھالیجئے۔ فرمایا: چورن کی ضرورت نہیں، ابھی اس کا علاج کرتا ہوں۔ چلتے

چلتے جب دھانوں کے کھیتوں میں پہنچے تو کرتا اتار لیا اور دوڑنے لگے، اتنی دور نکل گئے کہ ساتھی کی نظروں سے اوجھل ہو گئے، پھر راستے سے ہٹ کر ایک سایے میں چادر بچھائی اور لیٹ گئے۔ ساتھی آپ کے پاس پہنچا تو فرمایا کہ اب گرانی باقی نہیں رہی، گویا دوا بھی پسند نہ تھی، حتی المقدور طبعی علاج ہی کو کافی سمجھتے تھے۔

خدمتِ خلق

صاحبِ ''مخزنِ احمدی'' نے لکھا ہے کہ جب سنِ تمیز کو پہنچے تو خدمتِ خلق کو اپنا شعارِ خاص بنالیا۔ ضعیفوں، بچوں اور یتیموں کے حال پر بے حد شفقت فرماتے، اس میں اونچ نیچ یا امیر غریب کی کوئی قید نہ تھی۔ ہر شام اور ہر صبح غریبوں خصوصاً بیوہ عورتوں کے گھروں پر جاتے اور ان کا حال پوچھتے۔ ایندھن، پانی یا آگ جس چیز کی انہیں ضرورت ہوتی، فوراً لا دیتے۔ اہل محلہ اور ہمسایے سب کے سب علم اللّٰہی خاندان کے مرید تھے۔ اس وجہ سے سید صاحب کا داعیہ خدمت دیکھ کر بہت پریشان ہوتے، بار بار عرض کرتے کہ حضرت! ہم آپ کے آبائے کرام اور خاندانِ عالی شان کے خادم ہیں، ہمارا کام خدمت کرنا ہے، نہ کہ خدمت لینا۔ آپ ضعیفوں، مسکینوں اور محتاجوں کی خدمت گزاری کے فضائل اتنے پُرتاثیر انداز میں بیان فرماتے کہ جو سنتا اس پر گریہ طاری ہو جاتا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ عزیزوں اور ہمسایوں کے گھروں میں پہنچ کر پانی کے جس برتن کو خالی پاتے اٹھا کر بھر لاتے، کبھی کسی کو ایندھن کی ضرورت پڑتی تو فوراً جنگل میں نکل جاتے، لکڑیاں کاٹتے، پھر اپنی چادر میں باندھ کر حاجت مند کے گھر میں پہنچا دیتے۔ برادری کے لوگ یہ دیکھ کر آپ کو اس شدت سے ملامت کرتے کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے، لیکن آپ نے کسی روک ٹوک کا کبھی خیال نہ کیا اور اپنے ڈھنگ کے مطابق خدمتِ عوام کا یہ سلسلہ برابر جاری رکھا۔(۱)

(۱) مخزنِ احمدی ص:۱۲

فرقہ وارانہ کشمکش

ایک مرتبہ رائے بریلی کے بعض ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشمکش پیدا ہوگئی اور اس نے باہم لڑائی کی شکل اختیار کرلی۔ مسلمان مقابلے کیلئے نکلے تو سید صاحب بھی گھر پہنچے تلوار سنبھالی اور والدۂ ماجدہ سے اجازت کے انتظار میں کھڑے ہوگئے، جو نماز پڑھ رہی تھیں۔ جس خاتون نے سید صاحب کو بچپن میں کھلایا اور پالا پوسا تھا وہ روک رہی تھیں، والدہ نے سلام پھیر کر واقعہ دریافت کیا، سب کچھ سن کر ان سے کہا:

> ''بوا بے شک تمہیں احمد سے محبت ہے، مگر میرے برابر نہیں ہوسکتی۔ میرا حق تمہارے حق پر فائق ہے، یہ روکنے کا کونسا موقع ہے؟ انہیں جانے دو۔ پھر جگر بند سے مخاطب ہو کر فرمایا: ''جلد جاؤ، لیکن دیکھنا مقابلے میں پیٹھ نہ پھیرنا ورنہ عمر بھر تمہاری صورت نہ دیکھوں گی۔''(۱)

سید صاحب چلے گئے، لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی دونوں فریقوں نے بات چیت ہی سے سارے جھگڑے طے کرلئے۔ کہا جاتا ہے کہ جب فریق مخالف نے کہا ہمیں جانے دو، نہ آپ سے ہمارا کوئی مطلب ہے اور نہ آپ کو ہم سے کوئی جھگڑا ہے، تو سید صاحب نے اپنے فریق والوں سے فرمایا کہ انہیں جانے دو۔ اس واقعہ سے سید صاحب کی والدۂ ماجدہ کی طبیعت اور شانِ تربیت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے۔ یہ فضا تھی جس کی آغوش میں پرورش پاکر وہ جوہر قابل زمانے بھر کے لئے نورِ ہدایت کا سرچشمہ بنا۔

فطری سعادت

مختلف ارادت مندوں نے لکھا ہے کہ سید صاحب اسلام پر مجبول تھے۔ ہمارے عہد

(۱) ایک روایت کے مطابق والدہ نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر فریق مخالف نکل جانے کے لئے راستہ مانگے اور کہے ہم کو جانے دیجئے تو راستہ دیدینا۔

میں اسلامیت کا تصور اس قدر بدل چکا ہے کہ شاید ہر شخص اس بیان کی اہمیت کا اندازہ نہ کر سکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں فطرت اتنی سعید، پاکیزہ اور مزکّٰی ملی تھی کہ مرضیاتِ الٰہی سے خفیف سا اختلاف بھی گوارا نہ تھا اور اتباعِ سنت کا ذوق طبیعت پر اس قدر غالب تھا گویا ان کی تمام حرکات وسکنات کی عنان شریعتِ حقہ کے قبضے میں تھی۔ زمانہ طفلی کا بھی کوئی ایک واقعہ ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا قدم کبھی جادۂ حق سے اِدھر اُدھر پڑا ہو یا انہوں نے عزیمتِ عمل کے مقابلے میں رخصت کو ترجیح دی ہو۔ یہ فطری سعادت بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آئی، ان خوش نصیبوں میں ایک سید احمد شہید بھی تھے۔

پانچواں باب:

لکھنؤ اور دہلی کا سفر

سفر لکھنؤ

سید صاحب غالباً سترہ اٹھارہ برس کے تھے، جب احباب واقربا کی ایک جماعت کے ساتھ لکھنؤ گئے، یہ جماعت آٹھ افراد پر مشتمل تھی (۱)، ان میں سے سید صاحب کے

(۱) ''مخزنِ احمدی''، ص: ۱۳۔ رائے بریلی سے روانگی کی صحیح تاریخ کسی نے نہیں لکھی اور اس بارے میں قیاس وتخمین کا معاملہ بھی پیچیدہ ہے، مثلاً:

۱- مخزنِ احمدی کے بیان کے مطابق سید صاحب نے سات مہینے مملکت اودھ میں گزارے، چار مہینے وہ شہر لکھنؤ میں رہے (ص: ۱۴)۔ پھر والی لکھنؤ صید وشکار کے لئے کہسار کی جانب نکل پڑا تو تین مہینے اس کے لشکر کے ساتھ پھرتے رہے (ص: ۱۵)۔ بعد ازاں دہلی گئے۔

۲- ''تواریخ عجیبہ'' میں ہے کہ شاہ عبدالعزیز سے بیعت کے وقت سید صاحب پورے بائیس برس کے تھے (ص: ۸)، لیکن وہ صفر ۱۲۲۳ھ میں پورے بائیس برس کے ہوئے ۱۲۲۲ھ میں نہیں۔ جیسا کہ صاحبِ ''تواریخ عجیبہ'' نے لکھا ہے۔

۳- ان دونوں روایتوں کو درست مانا جائے تو سمجھنا چاہئے کہ سید صاحب ۱۲۲۲ھ میں رائے بریلی سے نکلے، سات مہینے لکھنؤ میں گزار کر اسی سال یا ۱۲۲۳ھ کے اوائل میں دہلی پہنچے اور شاہ صاحب سے بیعت کی۔

۴- لیکن اس واقعہ کو درست سمجھنا اس وجہ سے مشکل ہے کہ سید صاحب گھر سے چلے تھے تو داڑھی نہ نکلی تھی جب تعلیم وسلوک سے فارغ ہو کر وطن پہنچے تو داڑھی اتنی لمبی ہو چکی تھی کہ بعض اقربا بھی اول نظر میں انہیں پہچان نہ سکے۔ یہ نہیں مانا جا سکتا کہ اکیس یا بائیس برس تک ان کے داڑھی نہ نکلی تھی۔

۵- مرزا حیرت نے 'حیات طیبہ' میں لکھا ہے کہ رائے بریلی سے نکلتے وقت سید صاحب اٹھارہ انیس برس کے ہوں گے (ص: ۲۷۳)۔ ربیع الاول ۱۲۲۱ھ (مئی ۱۸۰۶ء) میں دہلی پہنچے اور محرم الحرام ۱۲۲۳ھ (فروری ۱۸۸۸ء) میں تعلیم وسلوک سے فارغ ہو کر وطن واپس ہو گئے (ص: ۲۸۵)۔ ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

بڑے بھانجے سید محمد علی مؤلف ''مخزنِ احمدی'' کے سوا کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ تمام رفیقوں کی غرض یہ تھی کہ روزگار کی کوئی صورت پیدا ہو جائے، لیکن سید صاحب کے سامنے دوسرا ہی مقصد تھا، جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہو گا۔

ان سب کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا، اسی پر باری باری ایک ایک دو دو کوس سواری کرتے تھے۔ سید صاحب نے ابتدائے سفر ہی میں اپنی باری رفیقوں کے لئے چھوڑ دی تھی اور رائے بریلی سے لکھنؤ تک انچاس میل کا پورا سفر پیدل طے کیا۔

ہر شخص کے پاس جو بھی سامان تھا، اسے وہ خود اٹھاتا۔ چونکہ ان میں سے کوئی بھی مشقت کا عادی نہ تھا، اس لئے آدھا راستہ طے کرنے کے بعد سب تکان سے چور ہو گئے، اور سامان اٹھوانے کیلئے مزدور کی تلاش شروع کر دی۔ مطلب کا مزدور نہ مل سکا تو سب حیران ہو کر ایک جگہ بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ لکھنؤ پہنچنے کی تدبیر کیا ہو۔ یہ حالت دیکھ کر سید صاحب نے کہا: ''بھائیو! میری ایک عرض ہے، قبول فرماؤ تو کہوں؟ سب نے کہا: ''بہ سر وچشم'' آپ نے ہر ایک سے عہد مؤکد لیا کہ عرض سن کر اسے ٹھکرایا نہ جائے گا۔ جب اقرار بہ ہمہ وجوہ پختہ ہو گیا تو اپنی چادر زمین پر بچھا دی اور فرمایا کہ مزدور کی تلاش چھوڑ دو، پورا سامان اس چادر میں باندھ کر میرے سر پر رکھ دو میں اسے منزلِ مقصود پر پہنچا دوں گا۔''

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... اس صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ آپ ۱۲۱۹ھ یا ۱۲۲۰ھ میں رائے بریلی سے نکلے۔

۶- ''وقائع احمدی'' میں بھی وطن سے روانگی کے وقت عمر سترہ اٹھارہ برس ہی کی بتائی گئی ہے۔ (ص:۵)

۷- ''منظورہ'' میں ایک جگہ ہے کہ آپ نے ''چند سال'' دہلی میں گزارے، دوسری جگہ ہے ''سہ چہار سال۔''
تمام بیانات کو سامنے رکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ آپ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں گھر سے روانہ ہوئے۔ ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۱۹ھ میں۔ سات مہینے اودھ میں گزار کر دہلی پہنچے، پہلے تعلیم حاصل کرتے رہے، پھر بیعت کی، ۱۷ر رمضان ۱۲۲۲ھ (۲۸ر نومبر ۱۸۰۷ء) کو شب قدر کا واقعہ دہلی میں پیش آیا۔ اغلب ہے کہ ۱۲۲۳ھ کے اوائل میں وطن لوٹے ہوں اس طرح چار پانچ برس باہر رہے۔

کسی کے دل میں وہم بھی نہیں گذرا تھا کہ سید صاحب ایسی درخواست پیش کریں گے، لیکن حتمی اور قطعی وعدہ ہو چکا تھا، اس لئے سب نے بادلِ ناخواستہ سامان آپ کے حوالے کر دیا، آپ نے پشتارہ بنا کر پورا سامان اٹھالیا اور خوشی خوشی چل پڑے۔ صاحبِ ''مخزنِ احمدی'' کے بیان کے مطابق فرماتے جا رہے تھے:

یاران و برادران ہر چہ کہ احسان امروز بر من کردید بقیۃ العمر از ادائے شکر آں بروں نخواہم آمد۔ (۱)

ترجمہ : دوستو اور بھائیو! جو احسان آپ نے آج مجھ پر فرمایا ہے اس کی شکر گزاری کا حق عمر بھر ادا نہ کرسکوں گا۔

غرض خدمتِ خلق کا جو جذبہ اوائل شباب میں اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ اقربا کے طعن وملامت سے بھی اس پر کوئی اثر نہ پڑ سکا، وہ سفر لکھنؤ میں بھی برابر نمایاں رہا۔

قیامِ لکھنؤ کے حالات

لکھنؤ پہنچتے ہی سید صاحب کے لئے ایک امیر کے ہاں سے کھانا مقرر ہو گیا جو آپ کے والد ماجد اور دوسرے اقربا کا نیاز مند تھا۔ اگر چہ اس کا کارخانۂ ملازمت بگڑ چکا تھا اور شاہی دربار میں کسی خدمت کا علاقہ بھی باقی نہ رہا تھا، لیکن مخدوم زادے کی خدمت کو وہ اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ (۲) سید صاحب کے ساتھیوں کیلئے باوجود سعی وتلاش معاش کی کوئی شکل پیدا نہ ہوئی اور جو زاد گھر سے لیکر چلے تھے، وہ ختم ہوگئی۔ ان میں سے جو کتابت جانتے تھے وہ روزانہ ''کریما'' اور ''مامقیماں'' کے ایک دو جز لکھ کر شام کو بازار میں فروخت کر آتے، جنہیں یہ فن نہیں آتا تھا وہ بازار سے کپڑا خرید کر ٹوپیاں سیتے یا تھیلیاں

(۱) مخزنِ احمدی ص:۱۴

(۲) ''مخزنِ احمدی'' میں ہے کہ اگر چہ نہایت تنگ دست بود، اما محبت سادات نوعے داشت کہ ہمتائے او دیدہ نہ شد، یک بخش برائے حضرت طعام روزمرہ مقرر کردہ بود۔ (ص:۱۴)

بناتے، اس طرح جتنے پیسے مل جاتے ان سے بہ مشکل دال روٹی کا خرچ پورا ہوتا۔

سید صاحب دونوں وقت اپنا کھانا رفیقوں کے دسترخوان پر رکھ دیتے، ہر ممکن کوشش کرتے کہ پرتکلف کھانا ساتھی کھالیں، خود معمولی خوراک کے چند نوالے کھا کر گزارا کر لیتے۔ اگر رفیقوں کے لئے دال روٹی کا سروسامان بھی نہ ہوتا تو اپنا پورا کھانا انہیں دے دیتے، خود ناسازیٔ طبع کا عذر پیش کر کے فاقہ کر لیتے۔

چار مہینے اسی حالت میں گذر گئے، پھر سید صاحب کے میزبان رئیس کو صرف ایک سو سواروں کی بھرتی کا حکم ملا۔

اس زمانے میں بے روزگاری کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ہزار سوار ساز وسامان سے لیس ہو کر ملازمت کے لئے حاضر ہو گئے۔ رئیس نے دس آدمیوں کی ہر ٹولی میں سے ایک سوار چن لیا دو آسامیاں سید صاحب کے حوالے کر دیں، آپ نے یہ دونوں اسامیاں اپنے رفیقوں میں سے ان لوگوں کے حوالے کر دیں، جن سے برادری یا عزیز داری کا کوئی علاقہ نہ تھا، اور اپنے عزیزوں سے فرمایا کہ خدا کے فضل پر بھروسا رکھو، آپ لوگوں کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ رئیس سید صاحب کے ایثار سے بے حد متاثر ہوا اور کہا کہ آپ حضرات کی مشغولیت کا بندوبست بھی ضرور کروں گا، بالکل بے فکر رہیں۔

لکھنؤ سے کوچ

اس طرح چار مہینے گذر گئے، پھر والیٔ لکھنؤ سیر وشکار کے لئے نکل پڑا اور اس رئیس کو بھی معیت کا حکم دے دیا جو سید صاحب کا میزبان تھا۔ اس نے سید صاحب اور ان کے عزیزوں کو بھی ساتھ لے لیا کہ ممکن ہے سیر وشکار ہی میں مزید اسامیاں نکل آئیں۔ اس سفر میں بھی سید صاحب اپنے تمام ساتھیوں کا سامان خود اٹھائے پھرتے رہے، تین مہینے انتظار میں گذر گئے، لیکن کسی کے لئے ملازمت کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ صاحبِ ''مخزنِ

احمدی'' کے قول کے مطابق ''صحرا پیمائی، فاقہ کشی اور سرما وگرما کی صعوبتوں'' کے باوجود مراد پوری نہ ہوئی۔ رئیس مذکور یہی کہتا رہا کہ بس آج کل میں انتظام ہو جائے گا۔

سید صاحب ابتدائے سفر ہی سے اپنے عزیزوں کو بار بار نصیحتیں فرماتے کہ بھائیو! ملازمت کا خیال چھوڑ دو اور چلو دہلی جا کر سید المحدثین شاہ عبدالعزیز سے کسبِ فیض کریں وہ آج اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا نشان ہیں، ہر موقع پر خواجہ حافظ کا یہ شعر پڑھتے۔

مصلحتِ دیدِ من آنست کہ یاراں ہمہ کار بگزارند و خم طرۂ یارے گیرند

جب کسی رفیق پر ان نصائح کا اثر نہ ہوا تو ایک رات اپنے بھانجے سید محمد علی کو الگ لے گئے اور فرمایا کہ میں تو کل یا پرسوں دہلی روانہ ہو جاؤں گا، چاہتا ہوں کہ تم بھی ساتھ چلو۔ سید محمد علی نے عرض کیا سامانِ سفر تو رہا ایک طرف، میرے پاس تو تن کے کپڑوں کے سوا پہننے کی بھی کوئی چیز نہیں، پھر اس تہی دستی اور بے مائیگی کی حالت میں دہلی کیسے جاسکتا ہوں؟ آپ تحمل و بردباری کے پہاڑ ہیں اور ہر تکلیف کو صابرانہ برداشت کر سکتے ہیں، مجھ ضعیف میں اتنی ہمت وطاقت کہاں ہے؟(۱)

قصدِ دہلی

اس واقعہ پر دو تین دن گذر گئے، لشکر کوچ میں تھا، دوپہر کے وقت منزل ہوئی اور تمام ساتھی ڈیرے پر پہنچے تو دیکھا کہ سید صاحب غائب ہیں۔ شام تک جگہ جگہ تلاش کرتے پھرے، لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا۔ ان دنوں لشکر محمدی کے جنگل میں پھر رہا تھا، جہاں جنگلی جانوروں کی کثرت تھی، خصوصاً شیر، چیتے، بھیڑیے، ریچھ اور ہاتھی بہت زیادہ تھے، ہر روز ایک دو لشکری ان کا طعمہ بن جاتے تھے۔ ساتھیوں کو خیال ہی نہیں یقین ہو گیا

(۱) یہ تمام حالات سید محمد علی کی ''مخزنِ احمدی'' سے ماخوذ ہیں، وہ خود اس سفر میں ساتھ تھے اور جو کچھ لکھا ہے چشم دید لکھا ہے۔

کہ سید صاحب کو بھی کسی درندے نے پھاڑ کھایا۔ دو دن اور تین راتیں اسی رنج والم میں گذر گئیں، جو شخص کسی سمت سے آتا، اسے سید صاحب کا حلیہ بتا کر پوچھتے کہ کہیں اس وضع کا آدمی تو نہیں دیکھا؟

چوتھے دن ایک آدمی گھنے جنگل کی طرف سے آیا، اس نے بتایا کہ میں نے ایسا جوان دیکھا ہے جو راب کا مٹکا اٹھائے لئے جا رہا تھا، اور ایک سپاہی اس کے ساتھ تھا۔ وہ جوان ظاہراً مزدور معلوم نہیں ہوتا تھا، اس کے بشرے سے شرافت ونجابت کے آثار نمایاں تھے۔ میں نے سپاہی سے بات چیت کی تو اس نے عجیب ماجرا سنایا، کہنے لگا: ''جب مجھے مٹکا اٹھانے کے لئے مزدور کی ضرورت پڑی تو ایک نحیف وکمزور آدمی کے سوا کوئی نہ ملا، مجھے اندیشہ تھا کے مٹکا اٹھا کر تیز چلنا اس کے لئے مشکل ہوگا، لیکن اس نے اصرار کیا اور میں نے مزدوری مقرر کر کے اسے ساتھ لے لیا۔ تھوڑی دور جا کر وہ ہانپنے لگا، اس اثناء میں یہ جوان آ گیا۔

مزدور کی حالتِ زار دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور مجھ سے اس نے کہا کہ بھائی! اس غریب کو جبراً بیگار میں پکڑے پھرتے ہو، خدا سے نہیں ڈرتے؟ میں نے حقیقت حال بیان کی تو جوان نے مزدور کی طرف توجہ کی۔ اس نے رو کر بیان کیا کہ رات فاقے میں گذری تھی، آج مجبور ہو کر یہ بوجھ اٹھالیا کہ پیسے ملیں گے تو پیٹ بھر لوں گا، اب چلا نہیں جاتا۔ یہ سن کر جوان نے مجھ سے کہا کہ اس کے پورے پیسے ابھی دے دیجئے، آپ کا مٹکا میں اٹھا کر منزلِ مقصود پر پہنچا دوں گا۔ چنانچہ مزدور کی مزدوری دلا کر اسے واپس کر دیا اور خود مٹکا اٹھا کر چل پڑا۔

داستان سن کر سب کو یقین ہو گیا کہ یہ خود سید صاحب تھے، اس لئے کہ اول حلیہ انہیں کا تھا دوم وہی دہلی جانے کا ارادہ کر رہے تھے، اور یہ واقعہ دہلی کے راستے کا تھا۔ سوم عام خلقِ خدا کے ساتھ عموماً اور ضعفا ومساکین کے ساتھ خصوصاً رحم ومروت کا سلوک آپ

ہی کا شیوۂ خاص تھا۔

سفر کی کیفیت

جہاں سے سید صاحب نے رفیقوں کو چھوڑا تھا وہاں سے شہر دہلی چودہ منزل پر تھا اور آپ کی جیب میں صرف تین پیسے تھے، اپنی ذات کے لئے کسی کے روبرو دستِ سوال دراز کرنا قطعاً گوارا نہ تھا، لہٰذا پختہ ارادہ کرلیا تھا کہ اول اتنا تیز چلیں گے اور ایک ایک دن میں دو یا اس سے بھی زیادہ منزلیں طے کرتے جائیں گے، دوسرے چوتھائی راستہ طے لینے کے بعد ایک پیسہ کھانے پر صرف کریں گے، چنانچہ چوتھی منزل پر پہنچ کر ایک پیسے میں ستو اور تھوڑا گڑ خریدا۔ گھول کر پینا چاہتے تھے کہ کان میں آواز آئی: ''چار روز کی بھوک نے ہلاکت کے کنارے پہنچا دیا ہے، مجھے نہ دو گے تو مر جاؤں گا۔''

سید صاحب خود یہ حالات بیان کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے، میرے نفس نے چاہا کہ سارا ستو چپ چاپ پی جاؤں، لیکن عقلِ خدا شناس نے رائے دی کی حرص کی آنکھ بند کر۔ چنانچہ گھلے ہوئے ستو اٹھائے اور پورے کے پورے اس درویش کے حوالے کردیے، خود تسبیح وتہلیل اور ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئے کہ اس سے بڑھ کر اطمینانِ قلب کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ **اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔**

عام لوگوں کو اس قسم کے حالات سے عموماً سابقہ نہیں پڑتا، سید صاحب کو قدرت نے خاص مقصد کے لئے پیدا کیا تھا، ان کے گردوپیش تربیت کے سامان بھی خاص فراہم کردیے اور صبر وہمت کے امتحان وآزمائش کی منزلیں برابر قدم قدم پر پیش آتی رہیں۔ ایسے ہی اصحاب کیلئے قرآن حکیم نے فرمایا ہے: **یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَلَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ۔**

مزید راستہ طے کر کے سید صاحب نے پھر ایک پیسے کے ستو اور تھوڑا گڑ لیا۔

رفیقوں سے الگ ہونے کے بعد یہ پہلی چیز تھی جو اس خدامست کے حلق سے نیچے اتری، مزید دو تین دن سفر میں گذر گئے وہ مشقتوں کے عادی تھے، جسم اتنا نرم و نازک تھا کہ شدائد یا قلب زادِ راہ کی تکلیف برداشت نہ کر سکتا، لیکن ایک دن میں کئی کئی منزلیں طے کی تھیں، اس وجہ سے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ مجبور ہو کر فیصلہ کر لیا کہ ایک دن آرام کر لیں، مسجد میں ٹھہر گئے رات بہ آرام گزاری، اگلے دن عصر کے وقت ایک غازی مسجد میں آیا اور انہیں غور سے دیکھنے لگا، پھر پوچھا:

بھائی صاحب! کہاں سے آنا ہوا؟

فرمایا: پورب سے۔

پوچھا: پورب کے کون سے شہر سے؟

فرمایا: رائے بریلی سے۔

وہ شخص آپ کے والد کا مرید تھا، رائے بریلی کا نام سنتے ہی پہچان گیا کہ سادات میں سے ہیں۔ اصرار کیا کہ گھر چلئے۔ سید صاحب نے فرمایا اس شرط پر چل سکتا ہوں کہ عہد کریں، مجھے دہلی جانے سے نہ روکیں گے۔ اس نے جواب دیا کہ نہ محض روکوں گا نہیں، بلکہ خود دہلی پہنچا دوں گا، البتہ یہ ضروری ہے کہ آپ چند روز آرام فرمالیں۔

اس نے گھر لے جا کر پاؤں دھوئے، حنا اور ببول کی پتیاں رگڑ کر چھالوں پر لیپ کی۔ جب سید صاحب کے پاؤں اچھے ہو گئے تو سواری کا انتظام کر کے انہیں دہلی پہنچایا، پھر رائے بریلی جا کر اقربا کو سید صاحب کا پورا حال سنایا۔

بعض عجیب وغریب روایتیں

مرزا حیرت نے ''حیاتِ طیبہ'' میں لکھا ہے۔

۱۔ سید صاحب لکھنؤ سے دہلی روانہ ہوئے تو آپ کے والد کے دوست نے

بہ اصرار ایک گھوڑا اور کچھ زر نقد دیا، یہ چیزیں آپ نے کان پور میں چار مصیبت زدہ آدمیوں کے حوالے کر دیں، جن میں سے ایک مریض تھا، دوسرا زخمی اور دو بوڑھے تھے۔

۲۔ راستے میں سید صاحب نے ایک ضعیف کو اپنے کندھے پر اٹھا کر اس کے گھر پہنچایا، جو تیرہ میل کے فاصلے پر تھا۔

۳۔ ایک سرائے کی مہترانی نے سید صاحب کے زخمی پاؤں پر دوا لگائی۔(۱)

ان میں سے کوئی بات بھی غیر اغلب نہیں، لیکن اس روایت کی تصدیق کسی ذریعے سے نہ ہو سکی اور جب یہ ثابت ہے کہ سید صاحب لکھنؤ سے نہیں بلکہ کھیری لکھیم پور کے اطراف سے دہلی گئے تھے، تو انھیں کان پور جانے کی کیا ضرورت تھی، جو ان کی جائے روانگی سے دور جنوب میں واقع تھا اور وہ سیدھے مغرب کو جانا چاہتے تھے۔ میرے نزدیک اس روایت کے لئے کوئی بنیاد واساس موجود نہیں۔

اسی طرح ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ہے کہ سید صاحب پہلے پہل شاہ ولی اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حالانکہ شاہ ولی اللہ کی وفات اور سید صاحب کی پیدائش میں کم وبیش چوبیس برس کا فصل ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ سید صاحب پہلی مرتبہ صرف چھ روز دہلی میں ٹھہر کر واپس چلے گئے، اور چھ مہینے کے بعد دوبارہ آئے۔(۲) جو مستند روایتیں اوپر بیان ہو چکی ہیں، انہیں سامنے رکھتے ہوئے چھ روز ٹھہر کر واپس جانا اور چھ ماہ بعد دوبارہ آنا بالکل مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ ''ارواحِ ثلاثہ'' کی روایات میں ایسی کئی خامیاں ہیں۔

---

(۱) حیات طیبہ ص ۲۷۸، ۲۷۹۔

(۲) ارواحِ ثلاثہ ص: ۹۶

چھٹا باب:

دماغی اور روحانی تربیت

شاہ عبدالعزیز سے ملاقات

دہلی پہنچتے ہی سید صاحب شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پہلے سے شناسائی نہ تھی، اور نہ سید صاحب نے کسی ذریعۂ تعارف کا انتظام کیا تھا۔ شاہ صاحب نے معمول کے مطابق مصافحے و معانقت کے بعد پاس بٹھا کر پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟

سید صاحب: رائے بریلی سے۔

شاہ صاحب: کس قوم سے تعلق ہے؟

سید صاحب: وہاں کے سادات میں محسوب ہوں۔

شاہ صاحب: سید ابوسعید اور سید نعمان کو جانتے ہو؟

سید صاحب: سید ابوسعید میرے حقیقی نانا تھے، اور سید نعمان حقیقی چچا۔

یہ سنتے ہی شاہ صاحب نے دوبارہ گرمجوشی سے معانقہ فرمایا اور پوچھا: کس غرض سے اتنے لمبے سفر کی صعوبت گوارا کی؟ سید صاحب نے عرض کیا کہ آپ کی ذاتِ مقدس کو غنیمت سمجھ کر اللہ تعالیٰ جل شانہٗ کی طلب میں پہنچا ہوں۔ شاہ صاحب نے فرمایا: خدا کا فضل شامل حال ہے تو اپنی پدری اور مادری وراثت حاصل کر لو گے۔ پدری اور مادری وراثت سے اشارہ دماغی اور روحانی تربیت کے انہیں مدارجِ عالیہ کی طرف تھا جو سید ابوسعید اور سید نعمان پہلے حاصل کر چکے تھے۔

پھر ایک خادم کو حکم دیا کہ انہیں میرے بھائی مولوی عبدالقادر کے پاس اکبر آبادی مسجد میں پہنچا کر ان سے کہنا کہ ان مہمانِ عزیز کا مفصل حال میں خود ملاقات کے وقت بیان کروں گا، انہیں غنیمت سمجھیں اور خدمت میں حتی الامکان کوتاہی نہ کریں۔

اکبر آبادی مسجد

اکبر آبادی مسجد ہی میں سید صاحب نے تعلیم پائی، اسی کے ایک حجرے میں انہوں نے ابتدائی قیامِ دہلی کی پوری مدت بسر کی، اسی کے ایک حجرے میں وہ اس وقت ٹھہرے جب رائے بریلی سے نواب امیر خاں کے پاس راجپوتانہ جاتے ہوئے دہلی سے گذرے تھے۔ نواب سے الگ ہونے کے بعد بھی اسی مسجد کے ایک حجرے میں مقیم ہوئے تھے، اور جہاد کے لئے تنظیم کی مستقل اسکیم مرتب کی تھی۔ یہی مسجد تھی جہاں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے برسوں درس دیا، ان کی وفات پر یہ خدمت شاہ رفیع الدین سے متعلق ہوگئی، یقین ہے کہ شاہ صاحبان سے پہلے بھی اس مسجد میں درس جاری ہوگا۔ گویا دہلی میں اس مسجد کی حیثیت ایک بہت بڑے دینی دارالعلوم کی تھی، افسوس کہ اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہا، اسلامیت کے جاہ وجلال کی ایمان افروز بہاریں دیکھنے والی کئی مسجدیں اور کئی عمارتیں دہلی میں موجود ہیں، لیکن اکبر آبادی مسجد کو قدرت نے شانِ اسلامیت کے ساتھ ہی سطح ارض سے ناپید کر دینا مناسب سمجھا۔ بادِ مخالف کے جس جھکڑ نے اسلامیت کا آخری چراغ گل کیا تھا اس نے اس مسجد کی بھی اینٹ سے اینٹ بجادی۔

یہ مسجد شاہ جہاں بادشاہ کی بیگم اعزاز النساء نے رمضان المبارک ۱۰۶۱ھ (اگست ۱۶۵۰ء) میں بنوائی تھی۔ چونکہ بیگم کا خطاب اکبر آبادی محل تھا، اس لئے مسجد کا نام اکبر آبادی مشہور ہوا، اس پر ڈیڑھ لاکھ روپے صرف ہوئے تھے، اور دو برس میں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ مسجد کا مسقف حصہ تریسٹھ گز لمبا اور سترہ گز چوڑا تھا، اس کے تین گنبد اور سات

در تھے، مسقّف حصے کے سامنے کی طرف دائیں بائیں دو خوب صورت اور بلند مینار تھے، تریسٹھ گز لمبائی اور تریسٹھ گز چوڑا صحن تھا، جو زمین سے تین گز اونچا تھا اور اس کے گرد تین گز اونچا کٹہرا بنا ہوا تھا۔ صحن سے باہر سامنے کی طرف وضو کے لئے حوض تھا، اس کے دونوں جانب سے مسجد میں جانے کیلئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

پوری عمارت سنگ سرخ کی تھی، سامنے کی طرف سنگِ مرمر کی خوبصورت بیلیں بنادی گئی تھیں، مسجد کی شمالی، غربی اور جنوبی سمت میں تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر حجروں کی قطاریں کھڑی تھیں، خوب کھلے اور صاف حجرے، ان کے آگے برآمدہ، برآمدے کے آگے تین چار گز چوڑا چبوترہ، اس نقشے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مسجد خاص طور پر تعلیم کی غرض سے بنی تھی، اس کے ساتھ خاصا بڑا وقف تھا، جس سے طلبہ کو وظیفے ملتے تھے، اور ان کے کھانے پینے یا دوسرے مصارف کا انتظام ہوتا تھا۔

یہ مسجد فیض بازار میں واقع تھی جو قلعہ سے شروع ہو کر دہلی دروازے تک جاتا تھا۔ اب بازار کا صرف ایک حصہ باقی رہ گیا ہے۔ مسجد کی اصل جگہ وہ تھی جہاں اب ایڈورڈ پارک بنا ہوا ہے۔

شاہی مسجد اور قلعے کے درمیان اب جو وسیع میدان نظر آتا ہے یہاں غدر سے پہلے گنجان آبادی تھی اور قلعے کے لاہوری دروازے سے شاہی مسجد تک ایک پُررونق بازار جاتا تھا، جسے اردو بازار کہتے تھے، اسی حصے میں خانم کا بازار تھا۔ آبادی کی ابتدا یوں ہوئی کہ جن امراء کو قلعے میں نوبت بہ نوبت حاضر رہنا پڑتا تھا، انہوں نے پاس ہی حویلیاں بنالیں، ان کے ساتھ متوسلین کے مکانات تعمیر ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد انگریزوں نے یہ ساری آبادی منہدم کرادی، مکان اور محلے بارود سے اڑادیے۔ یہ میدان آس پاس کی سڑکوں سے کئی فٹ بلند ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ منہدم مکانوں کا ملبہ پھیلا کر بچھا دیا گیا تھا۔

سرسید احمد خاں نے جب آثار الصنادید لکھی تھی تو یہ مسجد موجود تھی، البتہ اس کے ایک مینار کی برجی ٹوٹ گئی تھی، اب کچھ بھی باقی نہیں رہا، کھدائی کی جائے تو یقین ہے کہ مسجد کی پوری بنیادیں نکل آئیں۔

سلام مسنون کا معاملہ

ارواحِ ثلاثہ میں ایک روایت ہے کہ سید صاحب دہلی پہنچے تو خود شاہ عبدالعزیز کے خاندان میں بھی سلام مسنون کا رواج نہ تھا، بلکہ وقت کی عام رسم کے مطابق اس طرح سلام کیا کرتے تھے: ''عبدالقادر تسلیمات عرض کرتا ہے''، ''رفیع الدین تسلیمات عرض کرتا ہے''۔ سید صاحب شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچے تو ''السلام علیکم'' کہا۔ شاہ صاحب اتنے خوش ہوئے کہ حکم دیدیا، آئندہ سب لوگ اسی طریقہ پر سلام کیا کریں۔(۱)

''ارواحِ ثلاثہ'' کی ایسی کسی روایت کو اس وقت تک اطمینانِ قلب سے قبول کر لینا مشکل ہے، جب تک کہ کسی دوسرے ذریعے سے اس کی تصدیق نہ ہو جائے، لیکن اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اس زمانے میں سلام مسنون کا طریقہ بالعموم مٹ چکا تھا، اور بعض اونچے گھرانوں میں تو شرعی سلام کو آدابِ مجلس کے منافی سمجھا جاتا تھا۔

سید صاحب نے جب نواب امیر خاں سے الگ ہو کر اصلاح و تجدید کی مستقل دعوت کا انتظام کیا تھا اور اس سلسلے میں مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ کا دورہ فرمایا تھا تو شمس الدین نام کے ایک صاحب نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کے والد زندہ تھے اور خاصے امیر تھے۔ شمس الدین نے گھر پہنچ کر والد کو آداب و بندگی کے بجائے السلام علیکم کہا تو وہ اتنے ناراض ہوئے کہ کہنے لگے جس شخص نے تمہیں (معاذ اللہ) بے ادبی کا یہ شیوہ سکھایا ہے، میں اس سے ضرور سمجھوں گا۔

---

(۱) ارواحِ ثلاثہ ص:۹۶

تحصیلِ علم

بہر حال سید صاحب نے اکبر آبادی مسجد میں سکونت اختیار کی اور شاہ عبد القادر سے عربی و فارسی کی کتابیں پڑھنے لگے۔ ہم چوتھے باب میں ''ارواحِ ثلاثہ'' کے حوالے سے میزان، کافیہ اور مشکوٰۃ پڑھنے کا ذکر کر چکے ہیں، اس سے زیادہ تفصیل معلوم نہیں۔ یہ حکایت بھی لکھ چکے ہیں کہ کتاب دیکھتے دیکھتے حروف ان کی نظروں سے غائب ہو جاتے تھے، اور اس بناء پر شاہ عبد العزیز نے کہہ دیا تھا کہ انہیں کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔

''انوار العارفین'' کا بیان ہے کہ چیزے از علمِ صرف و نحو خواند غلبۂ شوق در تحصیل علم باطن بیشتر بود۔(۱) یعنی صرف و نحو بھی کسی قدر پڑھی تھی، علم باطن حاصل کرنے کا شوق بہت زیادہ تھا۔

بلاشبہ سید صاحب نے خالص درسی نقطۂ نگاہ سے علوم میں وہ ممتاز درجہ حاصل نہ کیا جو مثلاً شاہ اسماعیل یا مولانا عبد الحئیؒ کو حاصل تھا، لیکن وہ عربی و فارسی بولتے بھی تھے اور سمجھتے بھی تھے۔ جنگ بالاکوٹ سے پیشتر سچوں میں ٹھہرے ہوئے تھے تو شاہ اسماعیل سے فرما دیا تھا کہ غازیوں کو روزانہ مشکوٰۃ کا سبق دیا کریں، چنانچہ شاہ صاحب روزانہ صبح کی نماز کے بعد اور ظہر و عصر کے درمیان مشکوٰۃ کی ایک فصل پڑھ کر حدیثوں کے مطالب و معانی کی شرح فرماتے۔ مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں:

> امیر المومنین ہم اسرار و نکات از بعض احادیث از زبان فیض ترجمان خود می فرمودند، مسلمانان ازاں بہرۂ وافی می اندوختند۔(۲)

ترجمہ: سید صاحب بھی بعض احادیث کے اسرار و نکات زبانِ فیض ترجمان سے ارشاد فرماتے اور مسلمان ان احادیث سے پورا فائدہ اٹھاتے۔

---

(۱) انوار العارفین ص: ۵۱۹		(۲) منظورہ ص: ۱۱۰۲

اسی سلسلے میں لکھتے ہیں:

آنجناب کتاب موصوف را در دست گرفتہ در اکثر اوقات شغل بداں می داشتند، احیاناً معنی کدام لغت از ہر کس کہ پیش می گزشت می پرسیدند۔(۱)

ترجمہ: سید صاحب بھی اکثر مشکوٰۃ کا مطالعہ فرماتے رہتے تھے، اگر کسی لفظ کے معنی نہ آتے تو جو پاس سے گذرتا، اس سے پوچھ لیتے۔

جو شخص مشکوٰۃ پڑھ سکتا تھا اور اس کے مطالعہ میں خاصا وقت بسر کرتا تھا، اسے ''امی'' ثابت کرنا سراسر تعجب انگیز ہے۔

علم کا صحیح مفہوم

سرحد میں ایک مرتبہ سید صاحب کے ایک عقیدت مند ملا نے عرض کیا تھا کہ اخوند درویزہ نے اپنی کتاب ''مخزن'' میں مرشد کے لئے عالم ہونا شرط قرار دیا ہے، اس کا مطلب کیا ہے؟ سید صاحب نے فرمایا:

مراد از عالم ایں نیست کہ صدرا و شمس بازغہ خواندہ باشد، بلکہ مراد از علم ہمیں است کہ مرضیات و نامرضیاتِ حضرت پروردگار تعالیٰ شانہ را بخوبی دانستہ باشد۔ حضرت صدیق اکبر و عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہدایہ و شرح وقایہ نہ خواندہ بودند و پیشوائے صاحب ہدایہ و صاحب شرح وقایہ ہستند کہ مصنفانِ ایں کتب بلکہ مجتہدان و پیشوایانِ شاں از کلامِ پاک آں ہادیانِ دین سند می آرند و آں را محکِ امتحان قرار دادہ سرہ از ناسرہ ممتاز می سازند۔(۲)

ترجمہ: عالم سے یہ مراد نہیں کہ وہ صدرا اور شمس بازغہ پڑھ چکا ہو، یہاں علم سے یہی مراد ہے کہ جانتا ہو، اونچی شان والا پروردگار کن باتوں سے راضی ہوتا ہے اور کن باتوں سے ناراض (یعنی اوامر و نواہی کا اسے پورا علم ہو)

(۱) منظورہ ص:۱۱۶۴ (۲) منظورہ ص:۵۴

حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ نے ہدایہ یا شرح وقایہ نہیں پڑھی تھی
لیکن وہ ہدایہ اور شرح وقایہ کے مصنفوں کے پیشوا تھے، نہ صرف یہ لوگ بلکہ ان
کے پیشوا اور مجتہدین بھی انہیں ہادیانِ دین کے کلام پاک سے سندیں لاتے
ہیں اور اسے کسوٹی قرار دے کر کھرے کو کھوٹے سے الگ کرتے ہیں۔

یقیناً علم اصل میں یہی ہے کہ باری تعالیٰ کے مرضیات و نامرضیات سے انسان بخوبی آگاہ ہو جائے باقی چیزیں علم نہیں بلکہ صرف آرائشِ علم ہیں:

ایں ہا ہمہ آرایش افسانۂ عشق است

ان معنوں میں سید صاحب بالغ نظر عالم تھے، اگرچہ انہوں نے بعض دوسرے مشہور عالموں کی طرح علومِ آلیہ کی تحصیل میں عمر کا بڑا حصہ صرف نہ کیا، پھر وہ عالمِ عامل تھے، یعنی مرضیات و نامرضیات کا نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس علم کے سانچے میں اپنی پوری زندگی ڈھال لی، یہی علمی روح وہ ہر مسلمان میں پیدا کر دینے کے آرزومند تھے۔ اسی مقصد کے لئے جیے اور اسی مقصد کی راہ میں سعی و جہاد کرتے ہوئے درجۂ شہادت حاصل کیا، یہ مقامِ بلند ہر شخص کے حصے میں نہیں آتا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

زمانۂ طلبِ علم کے بعض واقعات

روایت ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے تین آدمیوں کو سید صاحب کی خدمت کے لئے مقرر کر دیا تھا: ایک سید ثمن علی خان پوری، دوسرے قاری نسیم خان پوری، تیسرے قاری صاحب کے چھوٹے بھائی۔ ان سے کہہ دیا تھا کہ سید صاحب کو جس چیز کی ضرورت پڑے، اس کا انتظام کر دیا کرو اور ایک ٹھلیا اپنے پاس سے دی جس میں سید صاحب کے لئے دریا سے پانی لایا جاتا تھا۔ قاری نسیم اور ان کے چھوٹے بھائی زہد و تقویٰ میں اتنے

بلند پایہ تھے کہ عام لوگ مولوی مظفر حسین صاحب کاندھلوی کے تقویٰ کو ان کے تقویٰ سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں شاہ صاحب کے خاندان میں شادی کی ایک تقریب ہوئی، جس مقام پر شامیانہ تانا جانا تھا، وہاں نیم کا ایک درخت تھا، اس وجہ سے شامیانہ ٹھیک تنتا نہ تھا، اور اس میں جھول رہتا تھا۔ سید صاحب نے یہ حالت دیکھی تو خود نیم کے درخت پر چڑھ گئے، اور اس زور سے شامیانہ کو کھینچا کہ جھول بالکل نکل گیا، غیر معمولی جسمانی قوت کی یہ بھی ایک روشن نمائش تھی۔

یہ بھی لکھا ہے کہ شاہ عبدالقادر نے سید صاحب سے کہہ دیا تھا کہ شغل وذکر کے وقت میری سہ دری کے پاس بیٹھا کرو، چنانچہ مینہ آتا یا آندھی آتی یا دھوپ، سید صاحب مقررہ جگہ پر بیٹھے رہتے اور جب تک شاہ عبدالقادر کا حکم نہ ہوتا، نہ اٹھتے۔(۱) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شغل وذکر اور تعلیم سے فارغ ہو کر جمنا میں شناوری کی مشق بھی فرمایا کرتے تھے۔

سید صاحب کی طبیعت کو غیر مشروع مشاغل سے اس درجہ ناسازگاری تھی کہ ان میں شریک ہونے یا حصہ لینے کا ظاہراً امکان ہی نہ تھا۔ جمنا کے کنارے ہندوؤں کا ایک میلہ لگا کرتا تھا، جس میں عورتیں بہ کثرت جمع ہوتی تھیں، بے تکلف رفیقوں نے ایک مرتبہ سید صاحب کو بھی اس میلے میں لے جانا چاہا، آپ نے انکار فرما دیا۔ دوست جبراً اٹھا کر لے گئے، جب میلے کے قریب پہنچے تو آپ پر سکراتِ موت کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ رفیق یہ دیکھ کر ڈر گئے اور وہیں سے آپ کو واپس لے آئے۔ ''تواریخ عجیبہ'' میں ہے کہ رفیق ایک مرتبہ آپ کو ایک مجلس میں لے گئے، وہاں اچانک ساز بجنے لگے تو آپ بے ہوش ہو گئے۔

---

(۱) یہ تینوں روایتیں ''ارواحِ ثلاثہ'' سے ماخوذ ہیں (ص:۹۶،۹۷)

بیعتِ تزکیۂ نفس

۱۲۲۲ھ میں سید صاحب نے شاہ عبد العزیز سے بیعت کی، اس وقت ہندوستان میں تصوف کے تین سلسلے زیادہ رائج تھے، یعنی نقشبندیہ، قادریہ اور چشتیہ۔ طالب جس سلسلے میں بیعت کرنا چاہتا تھا، شاہ صاحب اسی سلسلے کا طریقۂ ذکر و شغل سکھاتے تھے۔ سید صاحب نے تینوں سلسلوں میں بیعت کی۔(۱) پہلے دن لطیفۂ اول یعنی ذکرِ قلب کی تعلیم ہوئی، دوسرے دن باقی لطائف یعنی لطیفۂ روح، لطیفۂ سِر، لطیفۂ خفی، لطیفۂ اخفیٰ اور لطیفۂ نفس کا ذکر سکھایا گیا، تیسرے جلسے میں سلطان الاذکار اور چوتھے جلسے میں ذکر نفی واثبات بتایا گیا۔ پھر شغلِ برزخ کا حکم ہوا جس میں صورتِ شیخ کا تصور صوفیہ میں مروج تھا۔(۲)

تصورِ صورتِ شیخ کا حکم سنا تو سید صاحب نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت! اس شغل اور بت پرستی میں کیا فرق ہوا؟ مفصل ارشاد ہو۔ شاہ عبد العزیز نے جواب میں خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا:

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید — کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

سید صاحب نے دوبارہ عرض کیا کہ میں بہر حال فرماں بردار ہوں اس لئے کہ کسب

(۱) ''مخزنِ احمدی'' میں ہے: در سنہ بست و دوم بعد مرور یک ہزار و دو بست و بست و دو سال ایں سعادت عظمیٰ و عطیہ کبریٰ بہ حضرت ایشاں دست داد (ص:۱۸)

(۲) لطائف ستہ کی سرسری کیفیت میں نے پیش کر دی ہے، سلطان الاذکار کا مطلب یہ ہے کہ سراپا ذکر بن جائے، نفی واثبات شرح کا محتاج نہیں۔ ان تمام امور یا شغلِ برزخ کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا اس لئے کہ خود اس کوچے سے نابلد ہوں۔ البتہ یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ متن کے تمام مطالب ''مخزنِ احمدی'' (ص:۱۸، ۱۹) اور ''وقائع احمدی'' (ص:٦) سے ماخوذ ہیں۔

فیض کی غرض سے آیا ہوں، لیکن تصورِ شیخ تو صریح بت پرستی معلوم ہوتا ہے۔ اس خدشے کو زائل کرنے کے لئے قرآن وحدیث سے کوئی دلیل پیش فرمادیں، ورنہ اس عاجز کو ایسے شغل سے معاف رکھیں۔ شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی سید صاحب کو سینے سے لگالیا، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دیے اور فرمایا: ''اے فرزندِ ارجمند! خدائے برتر نے اپنے فضل ورحمت سے تجھے ولایتِ انبیاء عطا فرمائی ہے۔''(۱)

ولایتِ انبیاء اور ولایتِ اولیاء

سید صاحب نے ولایتِ انبیاء اور ولایتِ اولیاء کی تشریح پوچھی تو شاہ صاحب نے فرمایا: جس شخص کو ولایتِ اولیاء عطا ہوتی ہے وہ رات دن ریاضت ومجاہدات، صوم وصلوٰۃ اور کثرتِ نوافل میں مشغول رہتا ہے، لوگوں کی صحبت پسند نہیں کرتا۔ چاہتا ہے کہ گوشۂ تنہائی میں خدا کی یاد سے لذت اندوز ہوتا رہے۔ اسے فاسقوں اور فاجروں کو وعظ ونصیحت سے کچھ سروکار نہیں ہوتا، صوفیائے کرام کی اصطلاح میں اسے ''قرب بالنوافل'' کہتے ہیں۔

ولایتِ انبیاء کا درجہ جس خوش نصیب کو مرحمت ہو، اس کے دل میں محبتِ الٰہی اس طرح سما جاتی ہے کہ اس کے سوا کسی چیز کے لئے گنجائش باقی نہیں رہتی۔ وہ ہر وقت

(۱) یہ روایت مخزنِ احمدی، وقائع احمدی اور دوسری کتابوں میں اسی طرح درج ہے۔ ممکن ہے اس سے کسی صاحب کو وسوسہ پیدا ہو کہ کیا شاہ عبدالعزیز جیسا یگانہ عالم دین اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ تصورِ صورتِ شیخ کے لئے قرآن وحدیث میں کوئی سند موجود نہیں، یا اس تصور کو عام صنم پرستی سے الگ نہیں کیا جاسکتا؟ میں اس بارے میں تحقیقی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیال یہ ہے کہ صوفیہ نے طالب کی توجہ جمانے کے لئے مختلف طریقے اختیار کیے، ان میں سے ایک طریقہ تصورِ صورتِ شیخ کا بھی تھا، جس سے یہ بزرگ کام لیتے رہے۔ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک ومزکّٰی تھی کہ اسے قبول نہ کرسکی۔ شاہ صاحب چونکہ طبیبِ حاذق تھے اس لئے سمجھ گئے کہ یہ دوا سید کے مزاج کے لئے سازگار نہ ہوگی، لہٰذا اسے چھوڑ دیا۔ جب یہ مقصود دوسرے طریقوں سے بوجہ احسن حاصل ہوسکتا تھا تو تصورِ شیخ پر اصرار کی ضرورت نہ تھی۔

بندگانِ خدا کو نیکی کی راہ پر لگانے کے لئے کوشاں رہتا ہے۔ مرضیاتِ باری تعالیٰ کے کسی کام میں دنیا داروں کے طعن و ملامت کی پروانہیں کرتا۔ وہ توحید کی اشاعت میں بے خوف اور سننِ رسولِ پاک ﷺ کے احیاء میں بے باک ہوتا ہے۔ ضرورت پیش آئے تو مخالفوں کے ساتھ مجاہدات میں مال و جان قربان کرتے وقت بھی متامل نہیں ہوتا۔ وہ للہ فی اللہ تمام محفلوں اور مجلسوں میں جاتا ہے، سب کو وعظ و نصیحت سناتا ہے۔ اس کارِ خیر میں جو تکلیفیں اور اذیتیں پیش آئیں اُن پر صبر کرتا ہے۔ اسے اصطلاح میں 'قرب بالفرائض' کہتے ہیں۔ (۱)

بہر حال سید صاحب نے سیر و سلوک کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر لیں، شاہ عبدالعزیز نے خود ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

> ایں سید عالی تبار در علم باطن چناں ذکی الطبع اند کہ بہ اندک اشارہ مقاماتِ عالیہ رافہم نمودہ طے مے کنند۔
>
> **ترجمہ** : یہ سید عالی تبار، علم باطن میں اتنے ذکی ہیں کہ معمولی سے اشارے کی بناء پر مقاماتِ عالیہ کو سمجھ جاتے ہیں اور انہیں طے کر لیتے ہیں۔

شبِ قدر اور سعادتِ حضوری

اس زمانے میں سید صاحب نے بڑی کٹھن ریاضتیں اور مجاہدے شروع کر دیے تھے۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم نے لکھا ہے کہ آغازِ سلوک میں سالہا سال تک سید صاحب عشاء فجر کی نمازیں ایک وضو سے ادا کرتے رہے، یعنی دونوں نمازوں کا درمیانی وقت کاملاً عبادت میں بسر فرماتے تھے۔ (۲) بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ قیامِ لیل کے باعث آپ کے پاؤں متورم ہو جاتے تھے۔

(۱) یہ بیان ''مخزنِ احمدی'' اور ''وقائع احمدی'' کی تحریرات پر مبنی ہے۔ (۲) وصایا نصف اول ص: ۲۵٦

رمضان المبارک ۱۲۲۲ھ کی اکیسویں تاریخ کو شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا کہ لیلۃ القدر کونسی رات ہوگی؟ رات بھر عبادت گزاری معمول بن گئی تھی، استفسار سے مقصود غالبًا یہ تھا کہ اس مبارک شب میں جاگنے کا خاص اہتمام کر لیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا:

> ''فرزند عزیز! شب بیداری کا معمول جاری رکھو، یہ بھی واضح رہے کہ محض جاگتے رہنے سے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا، پاسبان ساری راتیں آنکھوں میں گزار دیتے ہیں مگر انہیں فیض آسمانی کی دولت سے کب حصہ ملتا ہے۔ خدائے برتر کا فیض شامل حال ہونا چاہئے، نصیبہ یاور ہوتو انسان کو سوتے سے جگا کر دامنِ طلب برکات کے موتیوں سے بھر دیا جاتا ہے۔''

سید صاحب قیام گاہ پر چلے آئے کئی راتیں بیداری میں گزاریں۔ ۱۷ر رمضان المبارک (۲۸ر نومبر ۱۸۰۷ء) کو عشاء کے بعد بے اختیار نیند آگئی، رات کا ایک حصہ باقی تھا کہ اچانک کسی نے جگا دیا، اٹھے تو دیکھا کہ دائیں بائیں حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر تشریف فرما ہیں، اور زبانِ مبارک پر یہ کلمات جاری ہیں:

> ''احمد! اٹھ اور غسل کر، آج شب قدر ہے، خدا کی یاد میں مشغول ہو اور قاضی الحاجات کی بارگاہ میں دعاء ومناجات کر۔''

آپ اُٹھے۔ کپڑوں سمیت حوض میں غسل کیا، پھر کپڑے بدل کر عبادت میں لگ گئے، اس کے ساتھ ہی حضوری کی سعادت ختم ہوگئی۔ سید صاحب نے بارہا فرمایا کہ اس رات مجھ پر افضالِ الٰہی کی عجیب بارش ہوئی اور حیرت انگیز واردات روح افروز ہوئے۔ بصیرتِ باطنی اس طرح روشن ہوگئی کہ اشجار واحجار بھی بارگاہِ ایزدی میں سربسجود نظر آتے تھے، اور اس طریق پر تسبیح وتہلیل کر رہے تھے کہ اسے معرضِ بیان میں لانا مشکل ہے۔ صبح کی اذان تک یہی کیفیت رہی، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ عالم غیب کا معاملہ تھا یا عالم شہادت

کا، یعنی رؤیا میں سب کچھ پیش آیا یا عالمِ اجسام میں۔

دوسرے دن نمازِ اشراق کے بعد شاہ صاحب کو ماجرائے شب سنایا، انہوں نے جو کچھ فرمایا اسے سید محمد علی نے مندرجہ ذیل اشعار میں بیان کیا ہے:

تو بودہ چو سہا ایں زماں چو ماہ شدی — ہزار شکر کہ بودی گدا وشاہ شدی
کلاہِ گوشۂ خود را بہ آسماں برساں — کہ ذرہ بودی وخورشید چاشت گاہ شدی
مرید بودی، اینک مراد یافتہ — بہ فضلِ ایزدِ متعال شیخِ راہ شدی

بہ خواب دولتِ بیداری یافتی بہ کنار
کمینہ بودی و مقبولِ بارگاہ شدی(۱)

دہلی سے رائے بریلی

۱۲۲۲ھ کے اواخر یا ۱۲۲۳ھ کے اوائل میں آپ اجازت لے کر وطن گئے، کمل کا جبہ بنالیا تھا، سر پر فقیرانہ کلاہ تھی اور ہاتھ میں چمڑے کا آبدان۔ شاہ عبد العزیز نے وہ خاندانی دلق بھی آپکے حوالے کردی تھی جو شاہ صاحب کے جد امجد عبد الرحیم کے زمانے میں رائے بریلی سے دہلی آئی تھی، سارا راستہ پیدل طے کیا، عصر کے وقت تکیہ علم اللہ کی مسجد میں پہنچے، چونکہ وطن سے نکلے ہوئے چار پانچ برس ہو چکے تھے اور داڑھی مونچھیں خوب نکل آئی تھیں، نیز لباس بالکل اجنبیوں کا سا تھا، اس لئے اول نظر میں اقربا بھی پہچان نہ سکے۔

سید عبد القادر بن سید امان اللہ نصیر آبادی نے یا سید علم الہدیٰ (بن سید محمد ثابت، بن سید محمد حیا، بن سید سنا، بن محمد ہدیٰ، بن سید علم اللہ) نے بڑی دیر کے بعد پہچانا اور تمام عزیزوں کو خبر دی۔ اس زمانے میں اہل خاندان عموماً آپ کو "میر احمد" یا "میاں صاحب"

(۱) "مخزنِ احمدی" ص:۲۳

کہہ کر پکارتے تھے۔ بعض خاندانی وثیقوں پر سید صاحب نے بطور گواہ دستخط کیے تھے، ان میں بھی اپنا نام "میر احمد" ہی لکھا۔

والدہ اور اہل خاندان انہیں فقیری کے بھیس میں دیکھ کر سخت متاسف ہوئے، معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب نے ضروریاتِ سفر کے پیش نظر یہ لباس پہن لیا تھا، پھر والدہ اور اقربا کے پاسِ خاطر سے اسے ترک کر دیا۔

شادی

دہلی سے سید صاحب رائے بریلی پہنچے تو عمر کے بائیس مرحلے گذر چکے تھے اور تیئیسویں میں قدم پڑ چکا تھا، اقربا نے طے کیا کہ ان کا نکاح کر دیا جائے۔ ممکن ہے یہ خیال بھی اس تجویز کا محرک ہوا ہو کہ نکاح کے بعد خانگی ذمہ داریوں کا بوجھ سر پر پڑے گا تو دنیاداری کے لحاظ سے مفید و سودمند کام میں لگ جائیں گے۔

نسبت بہت پہلے سے ٹھہر چکی تھی اور لڑکی والے سید صاحب کے ہم خاندان تھے، لیکن جب ان کے درویشانہ مشاغل کو دیکھا تو توقف میں پڑ گئے۔ آخر مختلف اقربا نے انہیں راضی کیا۔ چنانچہ ۱۲۲۳ھ میں سید صاحب کی شادی نصیر آباد میں ہوئی۔ بی بی کا نام سیدہ زہرہ تھا، جو سید علم اللہ شاہ کے حقیقی چچا سید اسحاق کی اولاد میں سے تھیں۔ شجرۂ نسب یہ ہے: سیدہ زہرہ، بنت سید محمد روشن، بن سید محمد شافع، بن سید عبد الغفار، بن سید تاج الدین، بن سید محمد اسحاق عم سید علم اللہ (یعنی برادر سید محمد فضیل) بن سید محمد معظم۔ ۱۲۲۴ھ میں سید صاحب کی بڑی صاحبزادی سیدہ سارہ پیدا ہوئیں۔

عبد اللہ پہلوان کا واقعہ

غالباً اسی زمانے میں آپ ایک مرتبہ نصیر آباد گئے تو عبد اللہ پہلوان کے ساتھ کشمکش کا واقعہ پیش آیا۔ یہ شخص طاقت اور تنومندی میں دور دور مشہور تھا، ہر وقت فسق و فجور میں

مبتلا رہتا اور سحر وافسون بھی جانتا تھا۔ سید صاحب جب اس سے ملتے تو فرماتے: بھائی عبداللہ نماز پڑھا کرو اور برے کام چھوڑ دو۔ ایک روز محلّہ قضیانہ کی مسجد کے پاس ایک تنگ کوچے میں اس سے ملاقات ہوگئی۔ سید صاحب نے عادتِ مبارک کے مطابق اسے نماز اور دوسرے احکامِ دین پر کاربندی کی تلقین فرمائی، اس نے بگڑ کر مجادلے کا رنگ پیدا کرلیا اور بولا:

نماز سے کیا حاصل ہوگا؟

سید صاحب: ادا نہ کروگے تو فرشتے قبر میں عذاب دیں گے۔

پہلوان: فرشتے آئیں گے تو دو چار مکے رسید کرکے انہیں بھگادوں گا۔

سید صاحب نے بڑے تحمل سے فرمایا: اس قسم کے کلماتِ تکبر موجبِ کفر ہیں، فرشتوں کو خدائے برتر نے اتنی قوت عطا کر رکھی ہے کہ سارے انسان مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

پہلوان یہ سنتے ہی آگ بگولا ہوگیا اور سید صاحب کو مارنے کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ آپ نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور مسجد کے پشتے کے ساتھ اس زور سے رگڑا کہ بات کرنے کی بھی تواں نہ رہی۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے، اس لئے کہ کسی کو خیال بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ بیس بائیس برس کا نوجوان، طاقت وقوت کے اس دیو کو یوں مسل کر رکھ دے گا۔ پہلوان اٹھا تو طاقت کا گھمنڈ کافور ہوچکا تھا، بےتوقف سید صاحب کا معتقد بن گیا اور تمام منہیات سے توبہ کرلی۔

ایک روز کہنے لگا کہ آپ کیلئے شکار لانے کو جی چاہتا ہے، چنانچہ بندوق لے کر جنگل کو چلا گیا، اتفاقیہ سینگڑے میں آگ لگ گئی، بارود بھڑک اٹھی اور عبداللہ جل کر فوت ہوا۔

ساتواں باب:

نواب امیر خاں کی رفاقت

مستقل مشغولیت کا انتظام

سید صاحب دہلی سے رائے بریلی گئے تھے تو عمر کے تیئیسویں مرحلے میں تھے، یقین ہے اسی زمانے میں سوچنے لگے ہوں گے کہ کونسا مشغلہ اختیار کیا جائے، جو مزاج وطبیعت کے عین مطابق ہو اور اس سے پیش نظر مقاصد کی تکمیل کو فائدہ پہنچے۔ غور وفکر کے بعد نواب امیر خاں کی رفاقت کا فیصلہ کیا اور ۱۲۲۶ھ میں دوسری مرتبہ وطن سے نکل پڑے۔ ''حیاتِ طیبہ'' نے جمادی الاخریٰ ۱۲۲۴ھ کی تاریخ تعین سے پیش کی ہے۔(۱) مجھے اس کا ماخذ معلوم نہیں، لیکن سید ابوالحسن علی صاحب نے بعض ایسی شہادتیں پیش کی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ تک یقیناً رائے بریلی میں تھے، مثلاً:

۱۔ سید محمد علی، سید احمد علی اور سید حمید الدین صاحبان نے اپنے والد ماجد سید عبدالسبحان کے قرضے کا اقرار نامہ لکھا، جس پر سید صاحب کی گواہی تھی۔ اس اقرار نامے کی تاریخ ۲۰؍ربیع الاول ۱۲۲۶ھ (۱۴؍اپریل ۱۸۱۱ء) تھی۔

۲۔ سید قطب الہدیٰ نے اپنی تمام مملوکہ کتابوں کا ہبہ نامہ اپنے بھتیجے سید محمد ظاہر حسن کے نام لکھا اس پر سید صاحب کی بھی مہر ثبت تھی، یہ ہبہ نامہ ۲۸؍ربیع الاول ۱۲۲۶ھ کو لکھا گیا (۲۶؍اپریل ۱۸۱۱ء)۔

(۱) ''حیاتِ طیبہ'' ص: ۲۸۹

۳۔ سید قطب الہدیٰ کا انتقال سید صاحب کے سامنے ہوا، اور آپ احتضار کے وقت موجود تھے، اس واقعے کی تاریخ گلشن محمودی کے مطابق ۱۹ر ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ ہے (۱۳ر مئی ۱۸۱۱ء)۔

۴۔ ''امیر نامہ'' کے بیان کے مطابق دھمکولہ کا محاصرہ ۱۲۲۷ھ میں پیش آیا (۱۸۱۲ء)۔

بہر حال ربیع الآخر ۱۲۲۶ھ تک سید صاحب کا رائے بریلی میں ہونا بالکل واضح ہے، اور وسط ہند کا سفر اس کے بعد ہوا۔

نواب کے پاس جانے میں یہ امر بھی محرک ہوا ہوگا کہ سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابراہیم پہلے نواب کے لشکر میں رہ چکے تھے، غالباً سپاہی کی حیثیت میں پہنچے، لیکن زہد وتقویٰ کی بنا پر لشکر میں امامتِ نماز کی خدمت ان سے متعلق ہوگئی۔ وسط ہند کے کسی مقام پر ۴ر شوال ۱۲۲۴ھ (۱۲ر نومبر ۱۸۰۹ء) کی رات کو فوت ہوئے۔ جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں سید صاحب ان کی زندگی میں نواب کے پاس نہیں پہنچے تھے۔

اخفاءِ حال اور مشقِ سپہ گری

لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ نواب کے پاس جانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ کیا محض معیشت کی مجبوری انہیں کھینچ کر لے گئی تھی؟ اب تک سید صاحب کے جو حالات بیان کیے جا چکے ہیں، ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسبابِ معیشت کی ترتیب وفراہمی سے ان کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہ تھی، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

> آپ کو واسطے تکمیل اپنے حال کے اس وقت اخفاء منظور تھا، اور نیز اس جوہر سپہ گری کی بھی، جو آپ کے اندر ودیعت تھا، مشق کرنی منظور تھی۔(۱)

(۱) تواریخ عجیبہ ص: ۱۲۔ اس کتاب کی عبارت سے مترشح ہوتا ہے گویا سید صاحب نے رائے بریلی سے نکل کر دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، پھر وہ سکونتِ دہلی کو ترک کر کے نواب کے پاس گئے، یہ صحیح نہیں۔ نواب کے پاس جاتے ہوئے، سید صاحب یقیناً دہلی سے گذرے، اس لئے کہ عام راستہ یہی تھا، دہلی میں ٹھہرے بھی ہوں گے، لیکن وہاں سکونت گزیں نہ ہوئے تھے۔

لیکن تکمیل حال اور اخفاء کا مدعا وطن یا دہلی میں بوجہ احسن پورا ہوسکتا تھا، اس زمانے میں سید صاحب ولی اللٰہی خاندان کے ہزاروں مریدوں میں سے ایک معمولی اور گمنام مرید تھے، وہ جہاں بھی بیٹھ جاتے تکمیل حال و اخفاء کے مقاصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نواب کے لشکر میں پہنچنے کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی وہ اخفاء کی مصلحتوں کے سراسر خلاف تھی، جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا۔ جوہر سپہ گری یا کسبِ معیشت کے لئے لکھنؤ ان کے وطن سے بہت قریب تھا اور ان کے خاندان کے متعدد اکابر لکھنؤ ہی میں ملازم رہے تھے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ سپہ گری کی مشق کا وہ پیمانہ سید صاحب کے زمانے میں موجود ہی نہ تھا جس کے تصور میں ہم لوگ آج کل سرمست ہیں، عام ہتھیاروں کا استعمال سب لوگ جانتے تھے۔ لڑائیوں کا طریقہ ایسا تھا کہ جوانمردی اور استقامت ہی کو کامیابی کا سب سے بڑا اگر سمجھا جاتا تھا، خود نواب امیر خاں نے کونسی عسکری تربیت گاہ میں سپہ گری کے ہنر سیکھے تھے کہ اس کے لشکر میں شمول جوہر سپہ گری کی مشق کے لئے زیادہ موزوں نظر آیا؟ جب سید صاحب نے خود مستقل فوجی تنظیم کا بندوبست کیا تھا تو ان کے رفیقوں میں سے کتنے تھے، جن کے لئے سپہ گری کی باقاعدہ مشق کا انتظام کیا گیا تھا؟

شاہ اسماعیل صاحب، سید صاحب کے سپہ سالاروں میں سب سے ممتاز مانے جاتے تھے، انہوں نے کب اور کہاں سپہ گری کی مشق کی تھی؟ آخر میں یہ بھی ظاہر ہے کہ سید صاحب نے سات برس نواب کے لشکر میں گزارے، وہ مختلف لڑائیوں میں شریک رہے، لیکن جس حد تک میں معلوم کرسکا ہوں نہ اس کے لشکر میں جنگی فنون کی مشق کے لئے کوئی تربیت گاہ موجود تھی اور نہ سید صاحب کو کسی تربیت گاہ میں کم یا زیادہ مدت بسر کرنے کا موقع ملا۔

حقیقی مقصد

مجھے یقین ہے کہ آپ کو وہی جذبہ خدمتِ دین کشاں کشاں نواب کے لشکر میں لے گیا تھا جس کی بناء پر انجام کار انہوں نے بطورِ خود فدا کاروں کی ایک جماعت مرتب کی اور حیاتِ طیبہ کے گراں بہا اوقات جانبازی اور جانفشانی میں صرف کر دیے۔ یعنی وہ اسلامی حکومت کے احیاء کی خاطر جہاد فی سبیل اللہ کا عزم لے کر امیر خاں کے پاس گئے تھے، لیکن حالات نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ امید و آرزو کا یہ چراغ زیادہ دیر تک روشن نہ رہ سکا، یہاں تک کہ سید صاحب کو نواب سے الگ ہو کر خالص اسلامی اصول پر ایک جماعت منظم کرنی پڑی۔

خود سید صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بناء پر وہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے، وقائع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا:

> قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الٰہی سے الہام ہوا کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی، وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مژدۂ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا، چند روز میں آ کر ملازمت نواب صاحب ممدوح کی حاصل کی۔(۱)

''منظورہ'' کے الفاظ اس سے بھی واضح تر ہیں:

> از زمانیکہ حضرت امیر المومنین ...... بناء بر الہامیکہ در باب اقامت جہاد مے شد، رہگرائے لشکر ظفر اثر ...... امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر مرحوم شدند۔(۲)

> **ترجمہ**: جس زمانے میں حضرت امیر المومنین اقامت جہاد کے متعلق غیبی اشاروں کی بناء پر امیر الدولہ نواب امیر خاں مرحوم کے لشکر ظفر اثر

(۱) وقائع ص:۲۲ (۲) منظورہ ص:۲۳۷

کی جانب روانہ ہوئے۔

''مخزن احمدی'' میں ہے کہ سید صاحب از جانب ایزد متعال مامور و محکوم ہو کر گئے۔(۱)

غرض، نہ تکمیل حال محرک ہوئی، نہ سعی اخفاء، نہ سپہ گری کے جوہر کی مشق مطلوب تھی نہ وجہ معیشت۔ غرض صرف یہ تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے قیام کی سعی کی جائے اور یہ اقدام غیبی اشاروں کی بناء پر عمل میں آیا تھا۔

ہندوستان کا سیاسی نقشہ

ممکن ہے سوال پیدا ہو کہ اس غرض کے لئے امیر خاں کے لشکر کو منتخب کرنے کی کونسی وجہ تھی؟ اس انتخاب کا اندازہ کرنے کے لئے ہندوستان کے سیاسی حالات کا سرسری نقشہ سامنے رکھ لینا چاہئے۔

اس زمانے میں مغلوں کی قوت مضمحل ہو چکی تھی، جس کی عظمت کا ڈنکا کابل وقندھار سے آسام وارا کان تک اور قرہ قرم سے راس کماری تک اڑھائی سو سال بجتا رہا۔ تمام صوبے ایک ایک کر کے مرکز سے الگ ہو چکے تھے، اور مغل بادشاہوں نے ہندوستان کے مختلف ٹکڑوں کو باہم جوڑ جوڑ کر اسے ایک عظیم الشان ملک اور جلیل القدر سلطنت بنانے کا جو کام دو سو برس میں پورا کیا تھا، وہ برباد ہو چکا تھا۔ خانہ جنگی اور بدنظمی کا دور دورہ تھا اور ہر حصے میں نئی نئی قوتیں بروئے کار آ چکی تھیں۔ مسلمانوں کی سیاسی عظمت و برتری کا علم سرنگوں ہو رہا تھا، میسور میں حیدر علی نے ایک نئی اور صالح سیاسی قوت کی بنیاد رکھی، ٹیپو سلطان نے اس کی رگوں میں دینی حمیت کا گرم خون دوڑایا، لیکن اس قوت کو اپنوں کی بے حمیتی اور کوتاہ اندیشی نے موت کی نیند سلا دیا۔

---

(۱) مخزن احمدی ص:۳۲

مغلوں کے دورِ انحطاط میں مرہٹے ملک کے بڑے حصے پر چھا گئے تھے، ایک موقع پر تو مغلوں کا تخت بھی ان کی دسترس میں آگیا تھا، مرہٹوں پر پہلی کاری ضرب احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کے میدان میں لگائی، اگرچہ وہ اس کے بعد بھی چالیس پچاس برس تک موجود رہے، لیکن ان کا بکھرا ہوا شیرازہ پھر نہ جم سکا۔ پہلے ٹکڑوں میں بٹے، پھر ایک دوسرے سے لڑتے بھڑتے ختم ہو گئے۔

پنجاب میں رنجیت سنگھ نے بظاہر ایک مستقل حکومت کا ڈول ڈالا تھا، لیکن تاریخ داں اصحاب جانتے ہیں کہ وہ حکومت نہ تھی بلکہ ایک طرح کا عارضی سا فوجی غلبہ تھا جو رنجیت سنگھ کی زندگی تک قائم رہا، جب وہ مرا تو جانشینوں نے چار پانچ ہی برس میں اس کا تار و پود ہمیشہ کے لئے بکھیر کر رکھ دیا، حالانکہ رنجیت سنگھ نے اس میں حکومت کی سج دھج پیدا کرنے کے لئے چالیس برس صرف کئے تھے۔

سندھ کی حکومت چار امیروں کے ہاتھ میں تھی، اودھ میں شجاع الدولہ نے، دکن میں نظام نے، بنگال، بہار اور اڑیسہ میں علی ویردی خاں نے اس امید پر خودمختاری کی بساط آراستہ کی تھی، کہ اگر پورے ہندوستان کو سنبھالا نہیں جا سکتا تو اپنے اپنے علاقوں ہی کو سنبھال لیں۔ اودھ کی آدھی سلطنت سعادت علی خاں نے حکمرانی کی حرص میں گنوادی۔ اس کے جانشینوں نے بقیہ نصف کو بھی تیزی سے اس حالت پر پہنچادیا کہ کلکتہ سے ایک فرمان کا اجرا اسے ختم کر دینے کے لئے کافی سمجھا گیا۔

دولتِ نظام بھی داخلی بدنظمیوں اور حاکموں کی مسلسل بے تدبیریوں کی بناء پر تحلیل ہوتے ہوئے آدھی رہ گئی تھی اور جو رہ گئی تھی اس کے اعمال اور وظائف کے بارے میں کچھ کہنے سے نہ کہنا ہزار درجہ بہتر ہے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی حکومت کو علی ویردی خاں کی وفات کے ایک برس بعد انگریزوں نے شل کر کے رکھ دیا اور وہی علاقے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا سنگِ بنیاد بنے۔

انگریز

یہ سب ملکی طاقتیں تھیں، اکثر اسلامی اور بعض غیر اسلامی، لیکن سید صاحب کی ولادت سے کم وبیش تیس برس پیشتر ایک اجنبی قوت نے بھی ہندوستان میں قدم جما لئے تھے، یہ انگریز تھے جو تاجروں کے بھیس میں آئے، ملکی حاکموں کی بدعملیوں نے ان میں حکمرانی کے ولولے پیدا کر دیے۔ سب سے پہلے کرناٹک، بنگال، بہار اور اڑیسہ ان کے زیر اثر آئے پھر انہوں نے مرہٹوں اور نظام کو ساتھ ملا کر سلطنت میسور کو ختم کیا۔ اُدھر سے فارغ ہوئے تو مرہٹوں، نظام اور اودھ پر توجہ مبذول کی، تھوڑے ہی دنوں میں سب کو امدادی فوجی نظام کی زنجیروں میں جکڑ کر بے دست و پا بنا دیا۔ پھر دہلی پہنچے تو اس تخت گاہ کے مختار کل بن گئے جو پورے ہندوستان کی اطاعت و انقیاد کا مرجع تھی۔ سید صاحب کے ہوش سنبھالنے سے پہلے یہ سب کچھ پورا ہو چکا تھا۔

یہ حقیقت محتاجِ بیان نہیں کہ اسلامی حکومت کے احیاء کا خواب دیکھنے والے ہر شخص پر واضح ہو گیا تھا کہ انگریزوں کی قوت سے ٹکرائے اور اسے پاش پاش کئے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا۔

ملکی کارفرماؤں میں سے اگر کوئی شخص اس جہاد میں رفاقت و اعانت کا حق ادا کر سکتا تھا تو وہ صرف امیر خاں تھا۔ ہمت، شجاعت اور جوانمردی میں اس کی دھاک دور دور تک بیٹھی ہوئی تھی، استعدادِ حرب وضرب میں بھی اس کا مرتبہ بہت اونچا تھا، جس خصوصیت نے اسے اقران و اماثل میں سب سے بڑھ کر سربلند کر دیا تھا، وہ یہ تھی کہ اس پر انگریزی اثر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھی، وہ بالکل آزاد تھا، اس لئے اسلام و وطن کی آزادی کی خاطر صلاحیت جہاد میں کوئی اس کا ہمسر نہ تھا، نظر بظاہر یہ آخری خصوصیت ہی سید صاحب کے لئے بطورِ خاص جذب و کشش کا باعث بنی ہوگی۔

نواب امیر خاں

امیر خاں بونیر (سرحد آزاد) کے سالار زئی قبیلے میں سے تھا جَوُڑ (جیم مفتوح واوٴ مشدد و مضموم) اس کے آباء کا اصلی وطن تھا، اس کا دادا طالع خاں محمد شاہ کے عہد میں ہندوستان آیا تھا، روہیل کھنڈ کی لڑائیوں میں شریک رہا اور سنبھل میں توطن اختیار کر لیا، وہیں فوت ہوا۔ اس کے بیٹے محمد حیات خاں نے بھی آبائی پیشہ اختیار کیا، لیکن جب روہیلوں کو شجاع الدولہ اور انگریزوں نے مل کر شکست دی اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں شہید ہو گئے تو محمد حیات خاں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

امیر خاں اسی محمد حیات خاں کا بیٹا تھا۔۱۱۸۲ھ (۶۹-۱۷۶۸ء) میں پیدا ہوا، لکھنے پڑھنے کا بالکل شوق نہ تھا اور سپہ گری سے خاصی وابستگی تھی۔ بیس برس کی عمر میں چند رفیقوں کے ساتھ گھر سے نکل پڑا، اس زمانے کے رئیسوں اور جاگیرداروں کی یہ حالت تھی کہ جب کوئی مہم پیش آتی تو عارضی طور پر فوج بھرتی کر لیتے۔ امیر خاں نے وسطِ ہند، گجرات، دکن وغیرہ کئی مقامات پر عارضی ملازمت کی، من چلا آدمی تھا، روپیہ مل جاتا تو ساتھیوں کو نہال کر دیتا، نہ ملتا تو پریشانی میں دن گزارتا۔ ایک موقع پر کچھ پاس نہ رہا تو اپنا گھوڑا بیچ کر ساتھیوں کے خورد و نوش کا سامان مہیا کیا۔ رفتہ رفتہ اس کے پاس خاصی جمعیت فراہم ہو گئی۔

ہلکر سے تعلق

اس زمانے میں مرہٹہ سرداروں کے درمیان سخت کشمکش بپا تھی، تکوجی ہلکر کا بیٹا جسونت راوٴ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا اور اپنی خاندانی میراث حاصل کرنے کے لئے اس نے کوششیں شروع کیں، بعض خیر خواہوں نے مشورہ دیا کہ امیر خاں کو ساتھ ملاوٴ۔ چنانچہ جسونت راوٴ امیر خاں سے ملا، دونوں کے درمیان عہد و پیمان ہوا کہ ایک

دوسرے کا ساتھ دیں گے، اور جو کچھ ہاتھ آئے گا نصف نصف بانٹ لیں گے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ دونوں نے پگڑیاں بدل لی تھیں اور اس زمانے میں یہ عہدِ یگانگی کی نہایت مؤثر صورت تھی۔ امیر خاں نے تھوڑی سی مدت میں جسونت کیلئے شانِ امارت پیدا کردی۔

جب مرہٹوں اور انگریزوں کے درمیان لڑائی چھڑی تو جسونت اس سے الگ رہا، مرہٹے شکست کھا گئے، انگریز جسونت سے بھی معاملہ طے کرلینا چاہتے تھے، لیکن اس نے ایسی سخت شرطیں پیش کیں جنہیں انگریز مان نہ سکے، اس طرح لڑائی شروع ہوگئی۔ جسونت اور امیر خاں نے مل کر انگریزی فوج پر شدید حملے کئے اور اسے سخت نقصان پہنچایا۔ ان لڑائیوں کے دوران میں دونوں کو پہلے پٹیالہ پھر پنجاب آنا پڑا، انگریزوں کو اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں سکھ ان کے ساتھ نہ مل جائیں، اس وجہ سے دوبارہ صلح کی گفتگو شروع کی اور جسونت راؤ کو اندور کی ریاست دے کر راضی کرنا چاہا۔ امیر خاں نے اس صلح نامے کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا میں کابل جا کر شاہ شجاع کو ساتھ لاؤں گا، وہ نہ آئے گا تو اپنے ہم قوموں کا لشکر بھرتی کروں گا اور انگریزوں سے لڑوں گا۔ مشیروں نے یہ سنتے ہی ہلکر سے کہا کہ اگر نواب پٹھانوں کو لے آیا تو حکومت اس کے ہاتھ میں ہوگی، تمہاری مستقل حیثیت بالکل ختم ہوجائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ انگریزوں سے صلح کرلو اور ریاست لے کر آرام سے بیٹھ جاؤ۔

ہلکر اس پر راضی ہوگیا اور اپنے مدت العمر کے حلیف اور دوست سے بدعہدی کی ٹھان لی۔ ایک طرف انگریزوں کے ساتھ تعلق پیدا کرلیا، دوسری طرف امیر خاں کے پاس جا کر پگڑی پاؤں پر رکھ دی اور ہاتھ باندھ کر بولا مجھے جو کچھ ملا ہے، صرف آپ کی وجہ سے ملا ہے۔ آپ ہی اسے قائم رکھ سکتے ہیں۔ نواب نے ہلکر کا عجز والحاح دیکھ کر مہر اس کے سامنے پھینک دی کہ جہاں چاہتے ہو اسے لگا کر اپنا مدعا پورا کرلو۔ (۱)

(۱) ''تواریخ محمد آباد'' میں ہے کہ جب ہلکر نے عہد نامہ دکھا کر امیر خاں سے مہر لگانے ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

عہد نامے پر امیر خاں کے لئے ہلکر اس وجہ سے مجبور تھا کہ انگریز کہتے تھے جب تک امیر خاں کی مہر نہ ہوگی ہم عہد نامہ نہ کریں گے، اس طرح امیر خاں کی جنگی اسکیم ختم ہوگئی، ہلکر اندور کی ریاست لے کر بیٹھ گیا۔

امیر خاں نے اگرچہ ہلکر کے عہد نامے پر مہر ثبت کردی تھی، جس پر انگریز مطمئن ہوگئے، لیکن اس نے انگریزوں کی ماتحتی قبول نہ کی تھی اور اپنی آزاد حیثیت برقرار رکھی، اسی حالت میں وہ راجپوتانہ پہنچ گیا۔

آخری دور کی سب سے بڑی آزاد قوت

امیر خاں کی آزادانہ زندگی کے باقی دس بارہ سال راجپوتانہ ہی میں گذرے، جہاں اس وقت تین بڑی ریاستیں تھیں: جے پور، جودھ پور اور اُودے پور۔ چھوٹی ریاستوں کا شمار نہ تھا۔ جے پور، جودھ پور اور اودے پور کے تعلقات بھی سخت بگڑ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اودے پور کے راجہ کی بیٹی کشن کماری حسن و جمال میں شہرۂ آفاق تھی، اس کی منگنی پہلے جودھ پور کے راجہ سے ہوئی، پھر بعض جھگڑوں کی بناء پر والئ اودے پور نے اس نسبت کو توڑ کر کرشن کماری کا رشتہ مہاراجہ جے پور سے کردیا، اس طرح تینوں ریاستوں میں لڑائیاں شروع ہوگئیں۔

امیر خاں نے ان لڑائیوں میں کبھی ایک ریاست کا ساتھ دیا اور کبھی دوسری کا۔ آخر میں وہ اودے پور کے دربار کی طرف سے تحصیل مال کا ذمہ دار بن گیا۔

غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا، ایک موقع پر اس کے پاس چالیس ہزار جانباز جمع ہوگئے تھے، اور ایک سو پندرہ توپیں

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... کی درخواست کی تو اس نے کہا تم صلح کرلو، میں کیوں مہر کروں؟ کیا کم ہمت ہوں؟ ہلکر نے انگریزوں سے کہہ دیا کہ ہم دونوں میں کوئی مغایرت نہیں، میری ہی مہر عہد نامے کے لئے کافی ہے۔ امیر خاں میرا شریک حال ہے، میرے ساتھ چلے گا۔ (تواریخ محمد آباد ص:۱۳)

تھیں۔(۱) اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلبِ ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، لیکن انہیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکرائیں، اس لئے کہ جانتے تھے من چلا آدمی ہے، مقابلہ پر ڈٹ جائیگا تو ممکن ہے دوسری ملکی قوتیں بھی، جو بظاہر دب گئی تھیں ابھر آئیں اور ہمیں بستر بوریا سنبھال کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔ وہ امیر خاں سے ٹکرائے نہیں، لیکن جو عناصر اس کے لئے کمک و یاوری کا سرچشمہ بن سکتے تھے، انہیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ توڑتے رہے، یہاں تک کہ اس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دوانیاں خاصی پھیل گئیں۔

سید صاحب کا نصب العین

نواب میں بعض کمزوریاں بھی تھیں، مثلاً یہ کہ جو شخص لجاجت آمیز روش اختیار کرتا، اس کی بات فوراً مان لیتا، اگرچہ وہ بہترین مصلحتوں کے خلاف ہوتی۔ روپیہ ہاتھ آتا تو بے دریغ لٹاتا۔ جب فوج کی تنخواہ چڑھ جاتی تو پریشانیاں اٹھاتا۔ ان وجوہ سے اس کی زندگی کے بہترین اوقات فضول مشغلیتوں میں ضائع ہو رہے تھے۔

سید صاحب یہ نصب العین لے کر امیر خان کے پاس گئے تھے کہ اس عظیم الشان آزاد قوت کو صحیح راستہ پر لگائیں اس سے آزادیٔ وطن اور احیائے اسلام کا کام لیں۔ ان واقعات پر ڈیڑھ سو سال کے لیل و نہار گذر چکے ہیں، اور وقت کا سیل پل کے نیچے سے

(۱) ''مخزن احمدی'' میں ہے کہ ایک لاکھ سوار، بے شمار پیادے اور صاعقہ بار توپیں اس کے پاس تھیں۔ وہ راجپوتانہ کے غیر مسلم راجاؤں سے بے شمار مال بطور جزیہ وخراج وعشر لیتا تھا۔ اس مال سے علماء فضلاء مشائخ اور سادات کی خدمت انجام دیتا تھا۔ (ص:۳۰، ۳۲) ایک انگیز مؤرخ نے خود نواب کے بیان کی بناء پر لکھا ہے کہ ۱۸۱۴ء میں اس کے پاس پچاس ہزار سوار، بارہ ہزار پیادے اور بھاری توپ خانہ تھا (تاریخ ہندوستان مصنفہ مل دوانسن جلد ہشتم ص:۹۲۲) ایک اور مصنف نے لکھا ہے: امیر خاں ایک قابل قائد اور بہادر سپاہی تھا، اس کی فوج نہایت اسلح تھی اور ہندوستان کی تمام ریاستی فوجوں میں سے بہترین ساز وسامان والی فوج سمجھی جاتی تھی۔

(لارڈ ہیٹنگز اور ہندوستانی ریاستیں مصنفہ موہن سنہا مہتہ ص:۱۱)

گذر کر بہت دور جا چکا ہے، ہمارے سامنے ان واقعات کو جس رنگ، جس انداز جس اسلوب میں پیش کیا گیا وہ ان لوگوں کا ایجاد کردہ تھا، جو ہماری ہر چیز کی حقیقی قدر و قیمت کو مٹانے اور کم کرنے کے درپے تھے، لیکن سید صاحب کی زندگی کے ابتدائی عہد کا ماحول سامنے رکھ کر تمام حقائق کا بالغ نظرانہ جائزہ لیا جائے تو یقین ہے کہ قلب سلیم ہمارے بیان کے ایک ایک حرف کی تصدیق کرے گا۔ سید صاحب کی یہ خوشگوار امید بلاشبہ پوری نہ ہوئی لیکن ثواب کی بنیاد نتائج پر نہیں بلکہ حسنِ نیت اور اخلاصِ عمل پر ہے۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ ضروری نہیں ہر فرد یا جماعت کی ہر سعی ہر حال میں تمنا کے مطابق نتائج پیدا کرے، لیکن اس وجہ سے ترکِ سعی کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

سید صاحب مختار تھے یا مامور

ہمارے زمانے میں مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے یہ دعویٰ فرمایا کہ سید صاحب کو شاہ عبد العزیز نے خاص پروگرام دے کر امیر خاں کے لشکر میں بھیجا تھا، وہاں پہنچ کر انہوں نے انقلابی کام شروع کیا۔

جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے، اس سے صاف آشکارا ہے کہ سید صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ فرمایا، شاہ عبد العزیز کے امر و حکم کو اس اقدام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں رائے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہوا کہ نواب کے پاس جاؤ، چنانچہ وہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔

''وقائع'' میں ایک خط کا حوالہ ہے، جس میں سید صاحب نے نواب سے قطع علائق کا ذکر کرتے ہوئے شاہ عبد العزیز کو لکھا تھا:

> ''یہ خاکسار سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی کو عنقریب حاضر ہوتا ہے، یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا، نواب صاحب فرنگی سے مل گئے، اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔(۱)

(۱) وقائع ص:۳۱

اس خط کو محولہ بالا دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، اس طرح کہ اگر سید صاحب شاہ عبد العزیز کے فرستادہ نہ ہوتے تو ایسا خط کیوں لکھتے؟ (۱) کوئی نیک کام شروع کرتے وقت کسی مقدس و تجربہ کار بزرگ سے مشورہ کر لینا یا اس کے ایما و اشارہ کے مطابق قدم اٹھانا موجبِ عیب نہیں، بلکہ سرچشمۂ برکت ہوتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ سید صاحب، شاہ صاحب کے فرستادہ نہ تھے، اس لئے کہ:

۱۔ انہوں نے بطورِ خود حسبِ اشارہ ہائے غیبی لشکر میں جانے کا فیصلہ کیا۔

۲۔ محولہ بالا خط میں سید صاحب نے نواب کے لشکر سے بے تعلقی کی محض اطلاع دی ہے، اگر وہ شاہ صاحب کے فرستادہ ہوتے تو بطورِ خود لشکر میں رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ نہیں کر سکتے تھے، بلکہ شاہ صاحب کو سارے حالات کی اطلاع دے کر اجازت منگاتے۔

۳۔ اگر شاہ صاحب نے سید صاحب کو بھیجا تھا تو کیا وجہ ہے کہ سات برس تک ایک مرتبہ بھی اپنے پاس بلا کر ممکناتِ عمل کی کیفیت نہ پوچھی یا جو کام سید صاحب کر چکے تھے اس کی تفصیل نہ سنی؟

اگر نواب انگریزوں سے صلح نہ کرتا تو سید صاحب بدستور وہیں رہتے، کیا آمر ماموریں سے اسی طرح کام لیا کرتے ہیں؟

جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں، مولانا عبید اللہ مرحوم کے دعوے کے لئے کوئی بناء موجود نہیں اور مستند روایات اس دعوے کی تردید کر رہی ہیں۔ اس سلسلے میں مزید بحثیں موقع پر آئیں گی۔

کیفیتِ سفر

جس زمانے میں سید صاحب دہلی سے راجپوتانہ گئے تھے، ''مخزنِ احمدی'' کے

(۱) شاہ ولی اللہ کی سیاسی تحریک ص: ۱۵

بیان کے مطابق لشکر نواب کے تمام راستے غیر مسلموں کے ہجوم کے باعث مسدود تھے۔ لیکن سید صاحب:

متوکلاً ومعتصمًا بحفظہٖ بہ فراغ بال فرد أوحید أشاداں وفرحاں مانند کسے بہ سیر بوستاں یا خانہ دوستاں مے رود از بلدہ شاہ جہاں آباد نہضت فرمودہ بعد دہلی مراحل ومنازل کہ ہر مرحلہ ہفت خواں رستم واسفندیار بود طے فرمودہ، بہ وجود فیض آمود خود لشکر را منور ومشرف ساختند۔(۱)

ترجمہ: متوکلاً اور خدا کی حفاظت پر بھروسا کرتے ہوئے بے فکری کے ساتھ یگانہ وتنہا روانہ ہو گئے، اس درجہ شاداں وفرحاں تھے کہ جیسے کوئی شخص سیر باغ کو نکلے یا دوستوں کے گھر جائے۔ دہلی سے چل کر ایسی کڑی منزلیں طے کیں، جن میں ہر منزل رستم واسفندیار کے ہفت خواں جیسی تھی۔ اس طرح لشکر آپ کے لبریز فیض وجود سے منور ومشرف ہوا۔

(۱) مخزنِ احمدی ص:۳۲

آٹھواں باب:

عسکری زندگی کا دَور

دھمکولہ کا محاصرہ

سید صاحب خود فرماتے ہیں:

> جس وقت میں بیچ لشکر نواب صاحب کے پہنچا اور شرف ملاقات ان کی سے مشرف ہوا، ان روزوں نواب صاحب ساتھ لشکر جرار پیادہ وسوار بے شمار کے شاہ پورے کے علاقے میں قصبہ دھمکولہ کے قلعے کا محاصرہ کئے ہوئے مستعد جنگ تھے۔ آخر الامر والیٔ قلعہ نے تنگ ہو کر نواب صاحب سے مصالحہ کر لیا اور کچھ نقد زر دے کر رخصت کیا۔(۱)

امیر نامہ کے بیان کے مطابق دھمکولہ ۱۸۱۲ء میں فتح ہوا۔ سمجھنا چاہئے کہ اگر چہ سید صاحب ۱۸۱۲ء میں نواب کے پاس پہنچے مگر وہ اس سے پہلے وطن سے نکل چکے تھے، ممکن ہے ۱۸۱۱ء کے وسط یا اواخر میں روانہ ہوئے ہوں۔

''وقائع'' کا بیان ہے کہ اس زمانے میں سید صاحب کے حالات سے لشکر کے آدمی بالکل ناواقف تھے، بعض لوگوں کو صرف اتنا معلوم تھا کہ آپ سید زادے، آلِ رسولؐ، نیک اور پرہیز گار ہیں۔ اگر چہ آپ تنہا گئے تھے، لیکن ابتداءً لشکر میں تین آدمی آپ کے ساتھی بن گئے تھے، ان میں سے ایک کا نام رحمت اللہ تھا، دوسرے کا قادر بخش، تیسرے کا نام معلوم نہ ہو سکا۔(۲)

(۱) ''وقائع'' ص: ۱۰- دھمکولہ یا دکولہ میری تحقیق کے مطابق بوندی اور کرولی کے درمیان ایک مقام ہے، شاہ پورہ بھی اسی حصے کا ایک مشہور قصبہ ہے، دھمکولہ بعد میں فتح ہوا۔

(۲) ''وقائع'' ص: ۱۰

جے پور کی جنگ

سید صاحب جے پور کی لڑائی میں بھی شریک تھے، جس کی سرسری کیفیت یہ ہے کہ والیٔ جے پور کے ذمے نواب امیر خاں کی بھاری رقم تھی، اسے ادا کرنے میں پس وپیش ہوتی رہی۔ خود نواب جودھپور میں تھا، اس کے لشکریوں کو مدت تک تنخواہ نہ ملی تو انہوں نے ایک ہنگامہ بپا کر دیا۔ یہ اطلاع جے پور پہنچی تو وہاں کے سپہ سالار چاند سنگھ نے جوراجا کا قریبی رشتہ دار تھا، نواب کے مقبوضات میں سے مالپورے پر قبضہ کیا، ٹونک کو لوٹا اور امیر گڑھ کا محاصرہ کرلیا۔ اسے خیال ہوگا کہ فوج برگشتہ ہے، تو نواب کوئی قدم اٹھا نہ سکے گا۔

چاند سنگھ کی اس جسارت نے راجستھان کے مختلف حصوں میں نواب کے خلاف سرکشی کی آگ بھڑکا دی، وہ سرکشوں کی گوشمالی کے لئے جودھپور سے نکلا تو چاند سنگھ تمام متصرفہ مقامات کو چھوڑ کر تیزی سے جے پور بھاگ گیا۔ نواب نے جے پور کے مختلف مقامات فتح کئے، فوج کی تنخواہ کے لئے کچھ روپیہ وصول کیا، باقی رقموں کی تحصیل اپنے ایک ماتحت افسر کے ذمے لگا کر وہ شیخاواٹی (۱) کی طرف نکل گیا۔

چاند سنگھ نے میدان خالی پایا تو دوبارہ فتنہ انگیزی شروع کر دی، جب نواب نے دوبارہ جے پور کا رخ کیا تو چاند سنگھ پھر میدان چھوڑ کر جے پور شہر میں جا بیٹھا، ان تمام لڑائیوں میں سید صاحب برابر شریک رہے۔

شہر پر حملہ

تھوڑی دیر گذر گئی تو خود جے پور کے رئیس اور عہدیدار دو فریقوں میں بٹ گئے،

(۱) شیخاواٹی سے مراد جے پور کا شمالی ومغربی حصہ ہے، جہاں بارش کم ہوتی ہے۔ جے پور کے پرانے راجاؤں میں سے ایک اودے کرن تھا، اس کے پوتے موکل جی کے اولاد نہ ہوتی تھی۔ شیخ برہان الدین اس زمانے میں ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے، ان سے دعا کرائی، خدا نے بچہ دیا تو اس کا نام شیخا یا شیخ جی رکھا، اس کی اولاد کا علاقہ شیخ واٹی کہلایا۔ اگرچہ یہ لوگ ہندو ہیں لیکن کلمہ پڑھتے ہیں، جانور مسلمانوں کی طرح ذبح کرتے ہیں، سور کو حرام سمجھتے ہیں۔

سابق دیوان چھتر بھوج اور بعض امراء ایک فریق تھے، دیوان مانجی داس پروہت نے اپنا فریق الگ بنا رکھا تھا۔ چھتر بھوج وغیرہ نے نواب امیر خاں سے مدد مانگی۔ نواب فوج لے کر جے پور پہنچ گیا، لیکن مانجی داس پروہت نے دفاع کا خوب انتظام کر رکھا تھا۔ اس نے فوج کو تین حصوں میں بانٹا، ایک حصہ اس باغ میں متعین کیا جو شہر کے مشرق میں تھا، دوسرے حصے کو ایک اور باغ میں ٹھہرایا، جو خود دیوان کے نام سے مانجی کا باغ کہلاتا تھا۔ تیسرے حصے کو چاند سنگھ کی سپہ سالاری میں باغ بھٹ میں کھڑا کر دیا۔ موتی ڈونگر(۱) پر بھاری توپ خانہ نصب کرا دیا۔

نواب نے خود آگے بڑھ کر چاند سنگھ پر حملہ کیا، اس کے ایک سالار نے مشرقی باغ والی فوج کو مار بھگایا، اس طرح شہر پر حملے کا راستہ صاف ہو گیا۔ لیکن جونہی نواب کے ایک سالار مہتاب خاں نے قدم آگے بڑھایا، موتی ڈونگر کے قلعے سے توپوں کے گولے برسنے لگے، نواب نے فوراً پیغام بھیجا کہ اگر گولہ باری بند نہ ہوئی تو شہر کو چھوڑ کر موتی ڈونگر کا رخ کر لوں گا اور ایک آدمی کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اس انتباہ کے ساتھ ہی موتی ڈونگر کا توپ خانہ خاموش ہو گیا۔

اب نواب نے مانجی کے باغ کا رخ کر لیا، وہاں سے بھی جے پوری فوج شکست کھا کر بھاگی اس طرح بیرونِ شہر کے تمام مورچے ٹوٹ گئے اور دیوان مانجی داس شہر کے دروازے بند کر کے بیٹھ گیا۔

محاصرہ اور صلح

چوبیس روز محاصرہ جاری رہا، آخر نواب نے شہر پر گولہ باری کا حکم دے دیا، گھبرا کر جے پور کے راجہ جگت سنگھ(۲) نے صلح کی درخواست کی۔ نواب کہتا تھا کہ جب تک

(۱) جے پور شہر کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، ڈونگر جے پوری زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں۔
(۲) سب مورخ مانتے ہیں کہ جگت سنگھ سے زیادہ بدمزاج، بدقماش اور بدروش ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

روپیہ نہ ملے گا، بات بھی نہ سنوں گا۔ راجا شاید بحالت مجبوری روپے دے دیتا، لیکن اس کا خزانہ بالکل خالی پڑا تھا۔ آخر اس نے اپنی رانی سے کہا کہ تم کوشش کرو، یہ رانی جودھپور کے راجا مان سنگھ کی بیٹی تھی جسے امیر خاں نے بھائی بنا رکھا تھا۔ چنانچہ رانی نے نواب کو رقعہ بھیجا کہ آپ میرے باپ کے بھائی بنے ہوئے ہیں اور میں آپ کو چچا نہیں بلکہ باپ سمجھتی ہوں۔ کیا آپ کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ میرے شہر کا محاصرہ کریں اور اس طرح اپنی بیٹی کی رسوائی کے درپے ہوں؟'' یہ رقعہ ملتے ہی نواب نے محاصرہ اٹھانے کا حکم دے دیا اور ایک کوڑی لئے بغیر شہر چھوڑ گیا۔

سوانح نگارانِ سید کے بیانات

جے پور کی لڑائی کا یہ نقشہ عام تاریخی بیانات پر مبنی ہے، اب وہ تفصیلات بھی سن لیجئے جو سید صاحب کے سوانح نگاروں نے پیش کی ہیں، ان کا مفاد یہ ہے:

۱۔ اس جنگ میں سید صاحب نواب کے ساتھ تھے۔

۲۔ نواب نے اپنے ایک سالار محمد عمر خاں کو اس نالے میں مورچہ بنانے کا حکم دیا جو موتی ڈونگر کے قریب تھا، وہاں مورچہ بنانا ہی خطرناک نہ تھا بلکہ پہنچنا بھی جان جوکھوں کا کام تھا۔ محمد عمر خاں یہ سنتے ہی ششِ و پنج میں پڑ گیا، سید صاحب نے فوراً نواب سے کہا کہ مجھے محمد عمر خاں کے ساتھ جانے کی اجازت دیجئے، نواب نے کہا کہ آپ کو اپنے سے جدا نہیں کر سکتا۔ (۱) سید صاحب نے یہ سنا تو محمد عمر خاں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... راجا کچھواہہ خاندان میں کوئی نہیں ہوا۔ یہی راجا تھا جسکے پاس اودھ کے معزول فرمانروا وزیر علی خاں نے پناہ لی تھی، لیکن اس نے راجپوتی مہمانداری کے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر وزیر علی خاں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا، انگریزوں سے تو رقم لینے کا فیصلہ ہو ہی چکا تھا، وزیر علی خاں سے بھی جواہرات ہتھیا لئے تھے۔

(۱) منظورہ کے اصل الفاظ یہ ہیں: شارا از خود جدا نمی کنم (ص:۲۳۱) ''وقائع'' میں ہے کہ سید صاحب نے عرض کیا، مجھ کو ارشاد عالی ہو تو میں ہمراہ عمر خاں کے رہوں۔ حضور والا نے فرمایا کہ ہم تم کو اپنے ساتھ رکھیں گے، یہاں ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ (ص:۲۴)

''بھائی صاحب! مت ڈرو، خدا کو یاد کرو، کوئی بے موت نہیں مرتا، انشاء اللہ تمہاری فتح اور کفار کی شکست ہے۔'' ص:۲۰۔

۴۔ اس وقت معلوم ہوا کہ چاند سنگھ تیس ہزار سواروں کے ساتھ مانجی کے باغ کو پشت دیے کھڑا ہے۔ مقابلہ بڑا سخت تھا، سید صاحب نے گریہ وزاری کے ساتھ دعا کی، پھر نواب سے کہا کہ میں آگے چلتا ہوں، آپ لشکر کو ہمراہ لئے ہوئے کچھ فرق سے میرے پیچھے آئیں۔ نواب نے آپ کو روکنا چاہا لیکن آپ حملہ آور فوج کے آگے آگے روانہ ہوئے، چھ سوار آپ کے ساتھ تھے۔

چاند سنگھ پہلے ہٹ کر باغ کے اندر چلا گیا، سید صاحب نے خود باغ کے برج پر چڑھ کر رومال کے اشارے سے نواب کو دشمن کی پسپائی کی خبر پہنچائی، نواب باغ میں پہنچا تو ایک برج پر چڑھ کر دوربین لگائی اور دشمن فوج کی حالت دیکھنے لگا۔ سید صاحب باغبان کی جھونپڑی کے پاس سایے میں جا بیٹھے، بائیس آدمی آپ کے ساتھ تھے، وہاں توپ کے گولے اولوں کی طرح برس رہے تھے، اسی جگہ مغرب کا وقت آیا تو سید صاحب نے وضو کر کے برج پر نماز ادا کی۔ (۱)

مادھوراج پوری کا محاصرہ

مادھوراج پوری کا محاصرہ نواب کی آزادانہ زندگی کا آخری واقعہ ہے۔ یہ مقام راجا جگت سنگھ والئ جے پور کی رانی (دختر راجا جودھپور) کی جاگیر میں تھا، پاس کے ایک ٹھاکر بھرت سنگھ نے اس پر قبضہ کر لیا، پھر وہ نواب کے خسر محمد ایاز خاں کے اہل وعیال کو گرفتار کر کے لے گیا اور انہیں مادھوراج پوری کے قلعے میں بند کر دیا۔ نواب نے قلعے کا محاصرہ کر لیا، لیکن تسخیر قلعہ کی دو کوششیں یکے بعد دیگرے ناکام رہیں۔

(۱) ''وقائع'' ص:۲۵، ۲۶

ایک مرتبہ یہ فیصلہ کیا کہ قلعے کی دیوار کا کچھ حصہ بارود سے اُڑا دیا جائے، دشمن اس طرف متوجہ ہو تو ایک دم ہر سمت سے اس پر ہلّہ بول دیا جائے۔ ابھی بارود اڑی نہ تھی کہ نو وارد پٹھانوں کے دستوں نے حملہ کر دیا، وہ غالباً ہندوستانی بولی نہیں سمجھتے تھے، اور بارود اڑانے سے پہلے ہی موقع پر پہنچ گئے۔ انہیں سخت نقصان پہنچا۔ دوسری مرتبہ توپیں لگا کر قلعے پر گولے برسائے گئے، یورش کا وقت آیا تو ساری فوج کو یورش کی دستک سے آگاہ نہ کیا جا سکا، اس وجہ سے یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی۔

محاصرہ ابھی جاری ہی تھا کہ انگریزوں سے صلح ہو گئی، جس کی تفصیل آگے چل کر بیان ہوگی۔ غاصب ٹھاکر کے ساتھ گفت و شنید کے بعد محمد ایاز خاں کے اہل و عیال کو رہا کرایا گیا۔

اس محاصرے کے دوران میں ایک روز توپ کا ایک گولہ سید صاحب کے سینے کے محاذ میں اتنا قریب سے گذرا کہ اکثر لوگوں کو یقین ہو گیا کہ گولہ آپ کو لگا ہے۔ جب آپ کو بالکل محفوظ دیکھا تو سب نے سمجھ لیا کہ آپ کو کوئی عمل یاد ہے، اس وجہ سے گولے یا گولیاں آپ کو کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتیں۔ سید صاحب کو یہ خیال معلوم ہوا تو علی الاعلان فرمایا: مجھے کوئی عمل یاد نہیں، خدا نے محض اپنی قدرت اور فضل سے مجھے بچا لیا۔

اسی محاصرے میں ایک مرتبہ ہلّہ ہوا تو ایک گولی آپ کو پنڈلی میں لگی، کئی روز کے بعد زخم اچھا ہوا۔

متفرق واقعات

لڑائیوں کے علاوہ متفرق واقعات بھی ملتے ہیں: مثلاً:

۱۔ ابتدا میں برابر دو مہینے تک آپ کو بخار آتا رہا۔

۲۔ عام لشکریوں کو یقین ہو گیا تھا کہ آپ جو دعاء فرماتے ہیں، وہ منظور ہو جاتی

ہے۔ چنانچہ اکثر ضرورت مند مشکل کے وقت میں آپ کے پاس پہنچ کر دعاء کے خواستگار ہوتے تھے۔

۳۔ ایک مرتبہ شیر گڑھ (ریاست کوٹہ) سے آتے ہوئے دریائے چنبل پر پہنچے۔ پایاب گھاٹ سے لشکریوں نے گذرنا شروع کیا تو ایک دم سیل آگیا اور لشکریوں کا اسباب بہنے لگا۔ جو لوگ وسط دریا میں پہنچ چکے تھے وہ بڑی مشکل سے بیچ کی چٹانوں پر چڑھ کر بچے، سید صاحب نے اس موقع پر بھی دعاء کی، بہتا ہوا مال واسباب خود نکالا، تھوڑی دیر میں دریا اُتر گیا تو سب لوگ دوسرے کنارے پر پہنچے۔

۴۔ نواب کے لشکریوں کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی، لیکن چونکہ وہ عموماً صحرائی علاقے میں پھرتے رہتے تھے اس وجہ سے اجناس خوردنی بہت کم ملتی تھیں۔ سید صاحب نے ایسے مواقع پر کئی مرتبہ کشائش رزق کے لئے دعائیں کیں، بعض مقامات پر پانی نہیں ملتا تھا، سید صاحب پہلے بارگاہِ باری تعالیٰ میں دعاء کرتے، پھر خود کنوئیں کھودنے کے لئے جگہیں تجویز فرماتے، ان کنوؤں سے میٹھا پانی نکلتا۔

۵۔ ایک مرتبہ مارواڑ میں چلتے چلتے ایک ایسی بستی میں پہنچے، جہاں موٹھ اور باجرے کی فصل بہت اچھی ہوئی تھی اور دونوں جنسیں ٹکا گٹھری کے بھاؤ سے بکتی تھیں۔ سید صاحب نے اپنے ایک ساتھی عبدالرزاق نگرامی سے فرمایا کہ آٹھ دس روپے بھنالو اور جتنا غلہ مل سکے خرید کر رکھ لو۔ وہ بولے کہ ہم کوچ میں ہیں، یہ غلہ اٹھائیں گے کیوں کر اور اگر ٹھہرنا پڑا تو رکھیں گے کہاں؟ سید صاحب نے فرمایا کہ ریت میں گڑھے کھودلو موٹھ اور باجرا الگ الگ گڑھوں میں بھر دو، اتفاق سے اس جگہ ایک مہینہ ٹھہرنا پڑا۔ راوی کہتا ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں غلہ روپے کا دس سیر بکنے لگا، سید صاحب نے اعلان کر دیا کہ لشکر کے غریب لوگ ہمارے ہاں سے غلہ لے کر خرچ کرتے جائیں، اس وجہ سے کسی غریب کو تکلیف نہ ہوئی۔

۶۔ چونکہ تنگی وعسرت کے اوقات میں بھی سید صاحب یا آپ کے ساتھیوں کو کھانے پینے کی تکلیف کبھی نہ ہوئی، اس لئے بعض لوگوں کو گمان تھا کہ یا تو نواب پوشیدہ آپ کو روپے دیتا رہتا ہے یا آپ کے پاس کیمیا کا نسخہ ہے، یا دستِ غیب ہے۔(۱)

طریق اصلاح وہدایت

سید صاحب کا اصل وظیفہ یہ تھا کہ خلقِ خدا کو راہِ حق کی دعوت دی جائے اور ان کے عقائد، اخلاق اور اعمال کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھالا جائے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ راویوں نے بیان کیا ہے کہ آپ کی وجہ سے لشکر کی عام حالت میں زبردست تغیر پیدا ہوگیا۔ فسق وفجور مٹ گیا، کتاب وسنت کی پیروی عام ہوگئی، آپ اصلاح کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ جو لوگ مختلف ضرورتوں کے لئے دعاء کی غرض سے آپ کے پاس آتے تھے، ان سے دینی اور اخلاقی اصلاح کا اقرار لے کر دعاء فرماتے تھے۔ اس قسم کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ بادل خاں خانزادے کے ڈیرے میں ایک سپاہی کو ناڑو کی بیماری نے سخت پریشان کر رکھا تھا، آخر وہ آپ کے پاس پہنچا۔ فرمایا: پہلے برے کاموں سے توبہ کرو اور عہد کرلو کہ نماز باقاعدہ پڑھا کرو گے، پھر دعاء کروں گا۔ سپاہی نے اقرار کرلیا تو آپ نے دعاء فرمائی، خدا کے فضل سے اس کی تکلیف تھوڑے ہی دنوں میں جاتی رہی۔(۲)

۲۔ مدار بخش پنساری لشکر میں گھوڑوں کا مسالا بیچا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے عرض کیا کہ خرچ سے بہت تنگ رہتا ہوں، میرے لئے دعاء فرمائیے۔ فرمایا: پہلے اپنا نام بدل کر اللہ بخش رکھو، پانچوں وقت نماز پڑھا کرو، جھوٹ کبھی نہ بولو، جان بوجھ کر کسی سے

(۱) یہ تمام واقعات ''وقائع'' کی مختلف روایتوں سے ماخوذ ہیں، میں نے صفحات کے حوالے غیر ضروری تکلف سمجھ کر چھوڑ دیے۔

(۲) ''وقائع''، ص:۱۴۰

دغا فریب نہ کرو، اور جنس ہمیشہ پوری تولا کرو۔ اس نے یہ ساری باتیں مان لیں تو دعاء فرمائی، خدا کے فضل سے دو ہی برس میں اس کا کاروبار اتنا بڑھ گیا کہ سات آدمی نوکر رکھ لئے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کشائش کے بعد اس نے اصرار کیا کہ سید صاحب یا ان کے رفیقوں کے ہاں جو مسالا جاتا ہے، اس کی قیمت نہ دی جائے۔ سید صاحب نے انکار فرمایا اور ساتھیوں کو بھی ہدایت کی کہ ایسی کوئی پیش کش قبول نہ کی جائے۔(۱)

۳۔ نواب کے فیل بانوں میں سے شیخ محمد عبدالسمیع اور رمضان خاں نے تنگیٔ روزگار کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ ہاتھیوں کیلئے جو راتب مقرر ہے، اس میں رائی کے برابر بھی خیانت نہ ہونے پائے، یہ عہد کرلو تو خدا فضل کریگا۔ دونوں نے عہد کرلیا اور اسے پورے اہتمام سے نبھایا۔ تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے انہیں خوش حال بنا دیا۔(۲)

نواب کے ساتھ تعلق

سید صاحب لشکر میں پہنچے تھے تو آپ کو کوئی بھی نہیں جانتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں آپ بے حد ہر دل عزیز ہو گئے تھے۔ نواب آپ کا بہت احترام کرتا تھا، تمام اہم معاملات میں مشورے لیتا اور آپ کے مشورے کو کبھی پس پشت نہ ڈالتا۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ وہ غالباً ہر روز دربار میں جاتے تھے(۳) اس وجہ سے سمجھنا چاہئے کہ نواب کے مشیرانِ خاص میں شامل ہو گئے تھے۔

۲۔ جے پور کی جنگ کے سلسلے میں بیان ہو چکا ہے کہ نواب اہم موقعوں پر سید صاحب کو اپنے ساتھ رکھتا تھا، یہ قرب واعتماد کی ایک موثق دستاویز ہے۔

۳۔ نواب سے کوئی خاص بات منوانی ہوتی تھی تو لوگ سید صاحب سے استمداد

(۱) ''وقائع'' ص:۱۴ (۲) وقائع ص:۳۱ (۳) مثال کے لئے ملاحظہ ہو وقائع ص:۱۳، ۱۸

کرتے تھے۔ ایک مرتبہ نواب ایسی جگہ مقیم ہوگیا جہاں لشکریوں کو خورونوش کی چیزیں حاصل کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں، سید صاحب سے عرض کیا گیا کہ آپ نواب کو کوچ پر راضی کریں۔ آپ نے بے تکلف نواب سے مخلوق کی تکلیف بیان کر کے کوچ کا حکم صادر کرایا۔(۱)

۴۔ ایک مرتبہ بوندی کے دو کمان گر سولہ کمانیں، آٹھ لبادے اور بیس ترکش لے کر فروخت کی غرض سے لشکر میں آئے۔ چار آدمی ان کے ساتھ تھے۔ ہر چند کوششیں کی، لیکن کوئی چیز بک نہ سکی، آخر وہ لوگ سید صاحب کے پاس پہنچے اور عرض کیا کہ ہماری حالت بہت نازک ہو چکی ہے، آپ نواب صاحب سے کہہ کر یہ چیزیں بکوادیں۔ سید صاحب نے انہیں تسلی دی اور غالباً نواب سے بھی ذکر کیا، اس نے ساری چیزیں ایک ہزار میں خرید لیں اور پانسو روپے کمان گروں کو مدخرچ کے لئے دیے۔ (۲)

۵۔ جب نواب نے انگریزوں سے صلح کر لی تو سید صاحب الگ ہو گئے تھے، نواب سے آخری ملاقات صبح کو مسجد میں ہوئی۔ راوی کہتا ہے کہ نماز کے بعد نواب صاحب ''حضرت کا ہاتھ پکڑے میرے ڈیرے میں تشریف لائے۔'' (۳)

ان شواہد سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب نواب کے لشکر میں معمولی لشکری یا افسر نہ تھے، بلکہ نواب کے خاص مشیر اور صلاح کار تھے، اور نواب انہیں ایک عزیز دوست، حقیقی بہی خواہ اور حد درجہ معتمد علیہ رفیق سمجھتا تھا۔

مالی حالت

معلوم نہ ہو سکا کہ سید صاحب کے لئے نواب کے لشکر میں تنخواہ مقرر تھی، تو اس کی مقدار کیا تھی؟ لیکن یقین ہے کہ انہیں وقتاً فوقتاً خاصی بڑی رقمیں ملتی رہتی ہوں گی، اس

(۱) وقائع ص:۲۸　(۲) وقائع ص:۲۳، ۲۴　(۳) وقائع ص:۳۱

لئے کہ سید صاحب اچھے سروسامان کے مالک تھے، آپ کے پاس ایک یا زیادہ اونٹ تھے، اور خدا بخش آپ کا ساربان تھا۔(۱) آپ نے ایک موقع پر سات سو روپے کا گھوڑا مول لینا چاہا، مالک ساری رقم نقد مانگتا تھا، سید صاحب چھ مہینے کی مہلت چاہتے تھے، اس وجہ سے سودا نہ ہوسکا۔(۲) اس سے پیشتر ایک گھوڑا اسمند، سیاہ زانو دو سو روپے کا خرید چکے تھے،(۳) اس کے لئے روزانہ آٹھ سیر دودھ کا راتب مقرر تھا، اور میر چاند علی ساکن مال پورہ آپ کا سائیس تھا۔(۴)

نواب فتح علی خاں، رستم علی خاں، غلام حیدر خاں اور فقیر محمد خاں(۵) آپ کے عزیز دوست تھے، اکثر اکٹھے سیر کو نکلتے۔ ایک موقع پر اچانک رانگڑوں کا ایک غول نمودار ہوا، لیکن دور ہی سے بندوقیں سر کرتا ہوا پلٹ گیا، نزدیک نہ آیا۔ فقیر محمد خاں جب شیر گڑھ سے وطن لوٹے تو اپنے ساتھ یتیم چھوکریاں بھی لائے تھے، سید صاحب نے بھی دو یتیم چھوکرے ان کے ساتھ کر دیے، جن میں سے ایک کا نام غلام غوث تھا اور دوسرے کا کریم بخش، اور کہا تھا کہ انہیں ہمارے بھائی سید اسحاق کے سپرد کر دینا۔(۶)

ان تمام بیانات سے ظاہر ہے کہ سید صاحب کی مالی حالت خاصی اچھی ہوگی۔

رفیق

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے ابتدا میں سید صاحب کے تین رفیق تھے، جن میں سے صرف دو کے نام معلوم ہوسکے۔ ان کے علاوہ روایتوں میں مندرجہ ذیل اصحاب کے نام

(۱) وقائع ص:۱۳ (۲) وقائع ص:۱۶ (۳) وقائع ص:۱۶ (۴) وقائع ص:۱۷

(۵) وقائع ص:۱۷۔ غلام حیدر خاں غالباً وہی ہیں جو بعد میں مہاراجا گوالیار کے پاس ملازم ہوگئے تھے، ان کے نام سید صاحب کے خطوط بھی موجود ہیں۔ فقیر محمد خاں آفریدی بھی نواب امیر خاں سے الگ ہو کر لکھنؤ کی فوج میں اونچے عہدے پر مامور ہوگئے تھے۔ شاعر بھی تھے، گویا ان کا تخلص تھا۔ جوش ملیح آبادی ان کے پوتے ہیں۔ فقیر محمد خاں زندگی کے آخری سانس تک سید صاحب کے مخلص معتقد رہے۔

(۶) وقائع ص:۱۹

بہ طور رفیق آئے ہیں:

سید عبد الرزاق نگرامی، شیخ محمد عارف کرنالی، نصرت علی امروہہ والے، قادر بخش دکنی، نواب زادہ عثمان خاں کنج پوری، سید صاحب کے خادمِ خاص میاں دین محمد، یہ چھ آدمی جے پور کی جنگ میں ساتھ تھے، جب کہ سید صاحب نے نواب کے لشکر سے آگے بڑھ کر مانجی کے باغ پر حملہ کیا تھا۔ ان کے علاوہ شیخ پیر علی آپ کے ڈیرے میں رہتے تھے۔ چونکہ ان کے پاس بہت بڑی ڈھال تھی، اس لئے وہ عام طور پر ''سپر والے'' مشہور تھے۔ سید ظہور احمد نگرامی (برادر عبد الرزاق) ہدایت علی، برکت علی، حاجی زین العابدین رام پوری، سید اللہ نور شاہ، مولوی محمد حسن اور شیخ محمد ناصر نصیر آبادی کے نام بھی بطور رفقاء مختلف روایتوں میں آئے ہیں۔ ایک روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک موقع پر آپ کے پاس کھانا کھانے والے چھتیس آدمی تھے۔(۱) نواب فتح علی خاں، رستم علی خاں، غلام حیدر خاں اور فقیر محمد خاں کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

ریاضتیں

سید صاحب اس زمانے میں بھی بڑی شاقہ ریاضتیں کیا کرتے تھے۔ مولوی محمد حسن کہتے ہیں کہ جہاں لشکر چار پانچ روز کے لئے ٹھہر جاتا، آپ کا معمول تھا، لوٹا، مصلّٰی ایک چادر یا کھیس اور چمڑے کی چھ انگل چوڑی پٹی لے کر دور نکل جاتے، وضو کرتے اور سب سے الگ تھلگ ہو کر کسی درخت کے نیچے مصلّٰی بچھاتے۔ پہلے نفل پڑھتے، پھر چمڑے کی پٹی سے زانو باندھ کر اور چادر یا کھیس اوڑھ کر متواتر چار گھڑی مراقب رہتے، آخر میں دعاء فرماتے۔

ساتھیوں اور عام لشکریوں کی خدمت گزاری کا اہتمام اس زمانے میں بھی بہت

(۱) وقائع ص:۱۳۰

زیادہ تھا۔ اپنے کپڑے خود دھوتے، جب دھونے کے لئے جاتے تو ساتھیوں کے کپڑے بھی زبردستی اٹھا لے جاتے اور انہیں دھولاتے۔

لطیفہ

آخر میں ایک لطیفہ بھی سن لیجئے۔ ایک دفعہ لشکر کے ایک پٹھان کا کچھ مال کسی نے چرا لیا۔ اتفاق سے اسی روز سید صاحب، مولوی محمد حسن کے ہمراہ باہر پھر رہے تھے کہ پٹھان سے آپ کی ملاقات ہوگئی۔ وہ آپ کو جانتا نہ تھا، خدا جانے کس بناء پر اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہوگیا کہ مال سید صاحب نے چرایا ہے۔ چنانچہ وہ آگے بڑھا اور سید صاحب کے ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا: ''تم چور ہو''۔ سید صاحب نے کمالِ تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا: ''مجھے اللہ تعالیٰ نے ایسے شنیع فعل سے محفوظ رکھا ہے، بھائی صاحب آپ کو خواہ مخواہ مجھ پر ایسا گمان ہوا ہے۔''

پٹھان نے بدستور اصرار کیا کہ نہیں! میرا مال تمہیں نے چرایا ہے۔ سید صاحب نرم الفاظ میں پٹھان کو سمجھاتے رہے، لیکن اس کا شبہ قوی تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس نے تلوار نکال کر کہا: ''میرا مال واپس دیدو ورنہ ابھی تمہارا فیصلہ کرتا ہوں۔'' مولوی محمد حسن فوراً لشکر کی طرف دوڑے کہ رفیقوں کو خبر کریں۔ وہاں سے سید ظہور احمد، نصرت علی، برکت علی، فقیر محمد خاں وغیرہ تلواریں لے کر آئے، پٹھان نے ان لوگوں کو آتے دیکھا تو اس کا رنگ فق ہوگیا۔ سید صاحب نے فرمایا: ''جا بھائی! کھیت میں چھپ جا۔ میں انہیں واپس لے جاؤں گا، تو نکل کر اپنے ڈیرے پر چلے جانا۔ میں نے تمہارا مال نہیں چرایا، تمہیں بے وجہ مجھ پر ایسا گمان ہوا۔''

ایک عجیب قصہ

سید محمد علی نے سید صاحب کی زبان سے قیامِ لشکر کے زمانے کے جو قصے سنے ان

میں سے ایک قصہ بڑا دلچسپ ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میرا خیمہ پنڈاروں کے قریب برپا ہوا، لوٹ مار پنڈاروں کا عام مشغلہ تھا۔ ان میں ایک بہت بوڑھا آدمی تھا، جس کی کمر کمان کی طرح جھک گئی تھی۔ بوڑھے کے سامنے دوپہر کا کھانا رکھا گیا، جس میں سبزیاں تھیں۔ سبزیاں کھاتے ہی اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تمہیں یاد ہے کہ یہ سبزیاں کہاں سے آئیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ دس بارہ کوس پر ایک گاؤں ہے، وہاں سے لائے ہیں۔ بوڑھا بولا: کھانا کھا کر کمریں باندھ لو، گھوڑوں پر سوار ہو جاؤ، دو تین بیل اور کلند وغیرہ ساتھ لے لو۔ جس زمین کی سبزیاں تھیں، اسے دو تین جگہ سے کھودو، وہاں خزانہ دبا ہوا ہے۔"

وہ لوگ گئے اور دوسرے دن یہ منظر دیکھا کہ پنڈاروں کے خیمے کے ارد گرد نفیس چیزوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور عورتیں خوشی سے گا رہی تھیں۔ سید صاحب نے بوڑھے سے پوچھا کہ آپ کو دولت کا پتہ کیوں کر چلا؟ بولا کہ ہم لوگ سبزیاں یا میوے چکھ کر زمین کے اندرونی حالات کا پتہ لگا لیتے ہیں، یہ علم ہمیں استادوں نے سکھایا ہے۔(۱)

(۱) مخزن احمدی، ص: ۳۴

نواں باب:

نواب امیر خاں سے علیحدگی

امیر خاں کی حالت

نواب امیر خاں لاریب بڑا بہادر اور جواں مرد تھا، لیکن یہ حقیقت تسلیم کر لینا چاہئے کہ کام کے بہترین مواقع حاصل ہونے کے باوجود اپنی کاردانی اور سپاہ کی کثرت سے کوئی ایسا نتیجہ پیدا نہ کر سکا، جو تاریخ میں اس کے لئے دائمی عزت وعظمت کی یادگار بن سکتا۔ اس کی ساری طاقت اور پورے اوقات صرف معمولی وقتی فوائد کے لئے وقف رہے، کبھی ایک رئیس کو دبایا، کبھی دوسرے کو جا دبوچا، جس نے پیسے دے کر فوجی مدد مانگی، اس کی اعانت ویاوری کے لئے نکل پڑا۔ پھر کشادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ جو روپیہ ہاتھ آتا، بے تکلف خرچ کر ڈالتا، بعض اوقات مہینوں تک سپاہ کو تنخواہ نہ ملتی، لوگ تنگ آجاتے تو مخالفت کے ہنگامے بپا کر دیتے، مجبور ہو کر نواب اٹھتا اور کسی نئے خزانے کا دروازہ کھولنے کا عزم کر لیتا۔

انگریزوں کا دائرۂ اثر آہستہ آہستہ باقاعدگی کے ساتھ پھیل رہا تھا، ہندوستانی رئیس یکے بعد دیگرے ان سے مل رہے تھے۔ اہل بصیرت کو صاف نظر آ رہا تھا کہ نواب کی سرگرمیوں کے لئے فضا لحظہ بہ لحظہ تنگ ہوتی جا رہی ہے، خود نواب کے اپنے آدمیوں کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ یہ حالات زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے اور بعض کی نگاہیں انگریزوں کی طرف اٹھنے لگی تھیں۔

جودھپور کا ایک واقعہ

''وقائع'' میں ہے کہ جودھپور کی رانی، ولی عہد اور بعض ٹھاکروں نے خفیہ خفیہ نواب کو بلایا اور کہا کہ راجا مان سنگھ، اندوراج وزیر اور اپنے گرو دیوناتھ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا ہے، اس مصیبت سے ہمیں نجات دلایئے۔ نواب نے اپنے بعض آدمیوں کو کہا کہ اندوراج اور دیوناتھ کو قتل کردو گے تو تین لاکھ روپے انعام دوں گا۔ یہ کام آدمیوں نے پورا کردیا تو نواب نے ایک لاکھ روپیہ دیا اور کہا کہ باقی دو لاکھ اس وقت دوں گا جب کہیں سے فتوح حاصل ہوگی۔

انہوں نے کسی طور نہ مانا اور نہایت تنگ کیا کہ ہم تو ابھی لیں گے، اگر نہ دو گے تو ہم آپ کو پکڑ کر معاً انگریزوں کے سپرد کردیں گے۔ یہ گفتار ناہموار نواب نامدار، دولت مدار کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی، ان غداروں نابکاروں کو بہت سخت سست کہا کہ بڑے نمک حرام و بے وفا ہو، میرے ہی سبب سے تم سب یہ عیش و آرام کر رہے ہو، میرے ایسے بدخواہ و ناسپاس ہو کہ انگریزوں کو پکڑا دو گے؟ خیر تم سے خدا سمجھے، انشاء اللہ تعالیٰ میری پلاؤ کی رکابی کہیں نہیں گئی، مگر تم کو بھیک مانگے نہیں ملے گی۔(۱)

اس قسم کے واقعات نے بھی نواب کی آنکھ نہ کھولی اور وہ کوتاہ اندیشانہ اطوار پر قائم رہا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ سید صاحب نے اسے اہم قومی اور اسلامی راہ پر لگانے کے لئے کیا کیا کوششیں کیں، اس لئے کہ ہمارے سامنے حالات کا تفصیلی نقشہ موجود نہیں۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ سید صاحب کی وجہ سے نواب کے لشکر کی فضا دینی ہوگئی تھی۔ آپ نے نواب کی آزادیٔ عمل کو محفوظ رکھنے میں بھی کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا ہوگا، اور جب تک وہ آزاد رہا، اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یقیناً اس لئے نہ چھوڑا کہ اس سے کام لینے کی خوشگوار

(۱) وقائع ص:۲۷

امید باقی ہوگی، لیکن جونہی اس نے انگریزوں سے ربط ضبط پیدا کیا، سید صاحب الگ ہو گئے، اس لئے کہ جس غرض سے انہوں نے نواب کی رفاقت اختیار کی تھی، اس کے پورا ہونے کی کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

وسطِ ہند کی حالت

وسطِ ہند میں اس وقت بڑی ابتری پھیلی ہوئی تھی، راستے مخدوش تھے، لوگوں کے گھر غیر محفوظ تھے، آئے دن دیسی رئیسوں میں لڑائیاں چھڑی رہتی تھیں۔ ان کی وجہ سے عوام کے لئے اطمینان کی زندگی مفقود ہو چکی تھی، خصوصاً مرہٹہ سرداروں کی تو یہ حالت تھی کہ وہ لڑائی کیلئے نکلتے تو جس راستے سے گذرتے دیہات کے دیہات ویران کر ڈالتے۔ راجستھان کے تمام فرماں راؤں کے سلاسل نظم ونسق درہم برہم ہو چکے تھے، بدنظمی کا ایک بہت بڑا عنصر پنڈارے (۱) تھے، جنہوں نے بھاری لشکر جمع کر لئے تھے۔

(۱) پنڈارے مرہٹہ گردی کے ابتدائی دور میں پیدا ہوئے۔ ان کی حیثیت بے قاعدہ لشکروں کی تھی۔ مرہٹوں کی قوت کا آغاز چونکہ لوٹ مار سے ہوا تھا، اس لئے پنڈاروں کو غارتگری میں کمال بہم پہنچانے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ ۱۷۹۴ء میں پنڈاروں کے دو بڑے سرداروں کو مادھوجی سندھیا نے وادی نربدا میں جاگیریں دے دیں، یہ سردار فوت ہو گئے تو ان کے بیٹوں دوست محمد اور واصل محمد نے عنانِ قیادت سنبھالی، پھر ایک سردار کریم خاں نام نے بہت قوت جمع کر لی، وہ ہلکر سے مل کر کام کرتا رہا، اور ۱۸۰۶ء میں گیارہ پرگنوں کا مالک ہو گیا تھا، جن کی آمدنی پندرہ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ سندھیا نے اسے نواب کا خطاب دیا، وہ عام طور پر سندھیا شاہی کے لقب سے معروف تھا، اس نے بھوپال کے بھی کچھ علاقے چھین لئے تھے، دولت راؤ سندھیا نے کسی بات پر بگڑ کر اسے قید کر دیا، چنانچہ وہ پانچ برس گوالیار میں اسیر رہا، اس زمانے میں چیتو نے بہت رسوخ پیدا کر لیا۔ دوست محمد اور واصل محمد کی پارٹیاں بھی چیتو کے ساتھ مل گئیں۔
کریم خاں نے چھ لاکھ روپے دے کر قید سے مخلصی حاصل کی، انگریزوں نے راجستھان کے راجاؤں سے معاہدے کر لینے کے بعد پنڈاروں کے خلاف کارروائی شروع کی، ایک ایک کر کے سب سردار حوالگی قبول کرتے گئے۔ نامدار خاں نے ۱۸۱۳ء میں ہتھیار ڈالے، کریم خاں اور واصل محمد خاں گورکھپور اور غازی پور میں جاگیریں لے کر بیٹھ گئے۔ چیتو آخر تک مقابلے پر جما رہا، اس کے پاس پندرہ ہزار سوار تھے، مردانگی سے لڑا اور شکست کھا کر جنگل میں جا چھپا۔ ۱۸۱۷ء میں اُسے شیر نے پھاڑ ڈالا، چیتو اصلاً میواتی تھا اور بڑا غیور مسلمان تھا، ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

انگریزوں نے جب ان کے خلاف اقدام کا فیصلہ کیا تو یہ بھی طے کر لیا کہ وسطِ ہند کی تمام قوتوں کو اپنے ساتھ ملا لیں۔ چنانچہ راجستھان کی ریاستوں میں سب سے پہلے جے پور سے گفت وشنید کا آغاز ہوا، یہ گفت وشنید خاصی دیر تک جاری رہی، جے پور کے ساتھ معاملہ طے ہوا تو جودھپور، اودے پور، کوٹہ، بوندی، کشن گڑھ، کرولی وغیرہ تمام ریاستیں یکے بعد دیگرے انگریزوں سے وابستہ ہوگئیں، بالآخر سندھیا نے بھی انگریزوں کی اعانت قبول کر لی۔

نواب امیر خاں کی مشکلات

نواب امیر خاں کو ان انگریزی تدبیروں کا علم نہ ہو سکا، یا سمجھ لیجئے کہ وہ اپنی بہادری اور جوانمردی کے زعم میں ان کے نتائج کا اندازہ نہ کر سکا اور پوری بے پروائی سے اپنے اوضاع واطوار پر قائم رہا۔ یہاں تک کہ ۱۸۱۷ء کے اواخر میں بالکل اکیلا رہ گیا۔ اس اثناء میں انگریزی فوج کی تین شاخوں نے تین مختلف راستوں سے وسطِ ہند میں پیش قدمی شروع کر دی۔ پیش قدمی کی اسکیم عجیب بنائی گئی۔ ایک طرف پنڈاروں، امیر خاں اور سندھیا کے درمیان انگریزی فوج اس طرح بیٹھ گئی کہ تینوں میں باہم گفت وشنید یا میل جول کا کوئی موقع نہ رہا۔ دوسری طرف ایک انگریزی جیش خود امیر خاں کی فوج کے دو حصوں کے درمیان حائل ہو گیا اور ان کے اتصال کا ہر رشتہ کاٹ ڈالا۔ ساتھ ساتھ

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... پنڈارے بھی ہندوستان کی آزادی کے بچاؤ کے لئے عظیم الشان خدمات انجام دے سکتے تھے، لیکن امیر خاں کی طرح گرد وپیش کے مخصوص حالات نے انہیں اطمینان ودلجمعی سے مستقل مقصد کے لئے کام کی مہلت نہ دی۔ یہ قوت بھی پنڈارا سرداروں کی کوتاہ اندیشی اور آس پاس کے دیسی فرمانرواؤں کی غداری کے باعث ضائع ہوگئی۔ ہندوستانی تاریخ نگاروں کی بے خبری باعث تعجب ہے کہ وہ آج تک اس وقت کی حقیقی حیثیت کا صحیح اندازہ نہ کر سکے۔ اس سے بھی عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ نواب امیر خاں کو بھی پنڈاروں ہی کے گروہ میں شامل کرتے رہے، حالانکہ اس مرحوم کو پنڈاروں سے اس کے سوا کوئی تعلق نہ تھا کہ ضرورت کے وقت پنڈارے اس کی پناہ لے لیتے تھے، اور وہ پناہ دے دیتا تھا۔

امیر خاں کے مختلف سرداروں کو لالچ دے کر انگریزوں نے توڑ لیا۔ چنانچہ انگریزی فوج کی پیش قدمی کے ساتھ ہی فیض اللہ بنگش اپنا رسالہ لے کر انگریزوں سے مل گیا، سخت اندیشہ پیدا ہو گیا کہ دوسرے سردار امیر خاں کو اچانک گرفتار کر کے انعام کی حرص میں انگریزوں کے حوالے نہ کر دیں۔

یہ حالات بروئے کار آ چکے تو انگریزوں نے امیر خاں سے مصالحت کی بات چیت شروع کی اور دہلی سے مٹکاف صاحب نے منشی نرنجن لال کو عہد نامے کا مسودہ دے کر نواب کے پاس بھیج دیا۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، نواب اس وقت مادھو راج پوری کا محاصرہ کئے بیٹھا تھا۔

عہد نامہ

نواب نے مجبور ہو کر اپنے معتمد علیہ سفیر داتا رام کو، جو جے پور میں تھا، لکھا کہ انگریزوں سے گفتگو کر کے صلح نامہ مرتب کر لے۔ چنانچہ جو شرطیں طے ہوئیں ان میں سے قابل ذکر یہ تھیں۔

۱۔ ہلکر نے نواب کو جو علاقے دیے تھے، وہ سب اس کے قبضے میں رہیں گے، انہیں علاقوں کے اشتمال سے ریاست ٹونک صورت پذیر ہوئی۔

۲۔ ساری فوج منتشر کر دی جائے گی اور صرف اتنے آدمی باقی رکھے جائیں گے جو علاقوں کے انتظام کیلئے ضروری متصور ہوں گے۔ انگریزوں نے ذمہ اٹھایا کہ زیادہ تر منتشر کردہ آدمیوں کو وہ اپنی فوج میں لے لیں گے۔

۳۔ توپ خانہ اور ساز و سامانِ جنگ انگریز مناسب معاوضے دے کر خرید لیں گے۔ یہ اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ قابلِ ذکر سامانِ حرب نواب کے پاس نہ رہے، اس وجہ سے بھی ضروری تھا کہ نواب کو فوج کی تنخواہ ادا کرنے کیلئے روپے کی ضرورت تھی اور تنخواہ ادا کئے بغیر فوج کو منتشر کرنا مشکل تھا۔

۴۔ نواب کسی علاقے پر حملہ نہ کرے گا، بلکہ پنڈاروں کو ختم کرنے میں انگریزوں کو مدد دے گا۔

توپوں اور دوسرے سامانِ حرب کیلئے انگریزوں نے پانچ لاکھ روپے دینے کا وعدہ کیا اور دولاکھ فوراً ادا کر دیے۔ چونکہ اس وقت تک یقین نہ تھا کہ نواب تمام شرطیں خوش دلی سے پوری کرے گا، اس لئے مطالبہ کیا گیا کہ ضمانت وکفالت کے طور پر وہ اپنے فرزند اکبر صاحبزادہ محمد وزیر خاں کو دہلی بھیج دے۔ جب معاہدہ مکمل ہو جائے اور انگریز مطمئن ہو جائیں کہ سب شرطیں پوری ہو جائیں گی تو بقیہ تین لاکھ روپیہ ادا کر دیا جائے گا۔

انگریزوں کی عیاری

نواب جتنا شجاع تھا اُتنا مدبر نہ تھا۔ وہ چاہتا تو راجپوتانہ میں ٹونک سے متصل خاصا بڑا علاقہ مانگ سکتا تھا اور حالات ایسے تھے کہ انگریز اسے زیادہ علاقہ دینے کے لئے بے تکلف تیار ہو سکتے تھے، مگر اس نے یہ عجیب مطالبہ کیا کہ ٹونک کے علاوہ یوپی میں پرگنہ سنبھل دے دیا جائے جو اس کا آبائی وطن تھا۔ حالانکہ وہ ذرا بھی غور وفکر سے کام لیتا تو سمجھ جاتا کہ سیکڑوں میل کے فاصلے پر دو منفک علاقوں کو زیر تصرف رکھنا غیر ممکن ہے۔ انگریزوں نے اس وقت صاف جواب نہ دیا، جب نواب ہاتھ پاؤں تڑوا کر بیٹھ گیا تو پہلے کہا کہ سنبھل کے بجائے پلول کا علاقہ لے لیا جائے، نواب اس پر بھی راضی ہو گیا۔ پھر انگریزوں نے کہا کہ اس کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں رہے گا، صرف مالیہ نواب کو ملتا رہے گا۔ آخر نواب ڈیڑھ لاکھ روپے سالانہ کا وظیفہ صاحبزادہ محمد وزیر خاں کے نام مقرر کر کے پلول سے بھی دست بردار ہو گیا۔

۹ر نومبر ۱۸۱۷ء کو نواب کے وکیل نے اصل معاہدے پر دستخط کر دیے۔ ۱۵ر نومبر کو گورنر جنرل نے اس کی تصدیق کر دی۔ ۹ر دسمبر کو نواب نے معاہدہ بعد تصدیق سر ڈیوڈ

آ کر لونی کے حوالے کر دیا، جسے وقت کی دیسی تاریخوں میں عموماً ''لونی اختر'' لکھا جاتا ہے اور جو کاملاً ہندوستانی تمدن اختیار کر چکا تھا، یہاں تک کہ شادی بھی ایک ہندوستانی عورت سے کر لی تھی۔

سید صاحب کی طرف سے مخالفت

صلح کی ساری بات چیت پس پردہ ہوئی، مادھوراج پوری کا محاصرہ جاری تھا کہ انگریزوں کی طرف سے ایک شتر سوار معاہدے کا آخری مسودہ لے کر نواب کے پاس پہنچا۔ نواب اسے دیکھتے ہی ڈیرے میں چلا گیا۔ اس وقت مشیرانِ خاص کو صورتِ حالات کا علم ہوا۔ اکثر کی رائے تھی کہ انگریزوں سے مصالحت کر لی جائے، سید صاحب نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی، نواب کو سمجھایا کہ آپ انگریزوں سے لڑیں، خدا آپ کے ساتھ ہے، اگر فتح ہوئی فھو المراد، اگر شہید ہوئے تو بھی بہت ہے، مگر انگریزوں سے ملنا اور مصالحت کرنا بہت برا ہے۔ نواب نے عذر پیش کیا کہ لشکر کا سامان درست نہیں، لوگ خود غرضی میں مبتلا ہو گئے ہیں، ان میں باہم اتفاق نہیں، اس وقت مصالحت ہی مناسب ہے۔ دس پندرہ لاکھ روپے انگریزوں سے لے کر لشکر کا سامان درست کریں گے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ مصالحت کے بعد آپ سے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ (۱)

نواب نے مصالحت کی تیاریاں شروع کر دیں، سید صاحب نے فرمایا کہ آپ انگریزوں سے ملتے ہیں تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ نواب نے بہت روکا لیکن سید صاحب چند آدمی ساتھ لے کر اسی وقت لشکر سے نکلے اور جے پور چلے گئے۔ گویا ان کے نزدیک نواب سے تعلق صرف اس وقت تک بجا تھا، جب تک وہ آزاد تھا۔ انگریزوں کے زیر اثر آتے ہی اس میں اور دوسرے دیسی رئیسوں مثلاً نظام یا والیٔ اودھ میں اصلاً کوئی فرق

(۱) ''وقائع''، ص: ۳۰

نہیں رہا تھا۔ اس سے سورج کی طرح روشن ہے کہ سید صاحب کے سامنے اصل نصب العین یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کے تصرف سے پاک کریں اور یہاں خالص اسلامی نظامِ حکومت کی بنیاد رکھیں، وہ اسی غرض سے امیر خاں کے پاس پہنچے تھے۔ جب تک نواب آزاد رہا، اس کے ساتھ رہے جب وہ انگریزوں سے مل گیا تو الگ ہو گئے، اس لئے کہ آگ اور پانی یکجا نہیں رہ سکتے تھے۔

آخری کوشش

اس اثناء میں خبر گرم ہوئی کہ ڈیوڈ آکٹرلونی نواب سے ملنے کے لئے آرہا ہے۔ سید صاحب نے اپنے خادمِ خاص میاں دین محمد سے کہہ دیا کہ جب نواب انگریزوں کے پاس جائے تو تم ہمارے پاس چلے آنا۔ آکٹرلونی کے پہنچنے سے پہلے سید صاحب اچانک آدھی رات کے وقت لشکر میں پہنچ گئے۔ اسی وقت نواب کو اطلاع ہوئی، صبح کی نماز کے لئے وہ مسجد میں گیا بعد نماز سید صاحب کا ہاتھ پکڑ کر باتیں کرتا ہوا باہر نکلا۔ اس موقع پر سید صاحب نے پھر کہا کہ نواب صاحب! میں آخری مرتبہ سمجھانے کے لئے آیا ہوں، ابھی کچھ نہیں گیا، اختیار باقی ہے:

> اگر میرا کہنا مانو تو ان انگریزوں سے لڑو اور ہرگز نہ ملو، بعد ملنے کے آپ سے کچھ نہ ہو سکے گا، یہ کفار بڑے دغاباز و مکار ہیں، کچھ آپ کے واسطے جاگیر یا تنخواہ وغیرہ مقرر کر کے کہیں بٹھا دیں گے کہ روٹیاں کھایا کیجئے، پھر یہ بات ہاتھ سے جاتی رہے گی۔

نواب نے پھر وہی جواب دیا کہ اس وقت ملنا ہی مناسب ہے، میں لڑ کر عہدہ برآنہ ہو سکوں گا۔ سید صاحب نے کہا کہ خیر! آپ مختار ہیں، میں آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ دین محمد سے کہا کہ میں آگے چلتا ہوں، تم میرے پیچھے چلے آنا۔

جب نواب اور ڈیوڈ آکٹرلونی موضع رانول میں باہم ملاقات کر چکے تو دین محمد نے

جے پور پہنچ کر سارے حالات سنائے۔ سید صاحب پھر ایک روز لشکر میں گئے، جس کسی سے کچھ لینا دینا تھا، لیا دیا۔ نواب سے بھی ملے۔ راوی کہتا ہے:

حضور پرنور (نواب) بہت آبدیدہ ہوئے کہ حضرت (سید صاحب) جو کچھ تقدیر میں تھا، وہی ہوا۔ حکم الٰہی سے چارہ نہیں، اگر آپ دہلی کو جاتے ہیں تو صاحبزادہ محمد وزیر خاں کے ہمراہ جائیے۔ آپ نے قبول کیا۔ (۱)

شاہ عبدالعزیز کو خط

کئی دن بعد سید صاحب نے شاہ عبدالعزیز کے نام خط بھیجا جس کا مضمون یہ تھا:

یہ خاکسار سراپا انکسار حضرت کی قدم بوسی میں عنقریب حاضر ہوتا ہے۔ یہاں لشکر کا کارخانہ درہم برہم ہوگیا، نواب صاحب فرنگی سے مل گئے، اب یہاں رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ (۲)

نواب کے پاس اس وقت بھی خاصی فوج تھی۔ ''امیر نامہ'' کے بیان کے مطابق صرف جمشید خاں شیخاواٹی میں دس بارہ ہزار سوار اور پیادے لئے بیٹھا تھا، لیکن نواب کے عزم وہمت پر اچانک ایسا ضعف طاری ہوا کہ کچھ بھی نہ کرسکا۔ ہندوستان میں آزادی کا وہ آخری طاقتور شہباز تھا، لیکن خود ہی اپنے بازو نچوا کر انگریزوں کے جال میں پھنس گیا۔ محمد عمر خاں، محمد ایاز خاں اور راجا بہادر لال سنگھ کی فوجیں انگریزوں کی طرف منتقل کردی گئیں، جمشید خاں نے مصالحت سے انکار کردیا، کرنل سکنر نے اسے شکست دے کر حوالگی پر مجبور کیا۔

اپنوں کی افسانہ طرازیاں

یہ حقیقی حالات کا نقشہ تھا، لیکن اپنوں نے اس کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ

(۱) وقائع ص: ۳۱ (۲) ''وقائع'' ص: ۳۱

رکھی۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری لکھتے ہیں کہ نواب امیر خاں انگریزوں سے لڑ رہے تھے، توپیں اور بندوقیں چل رہی تھیں، سید صاحب اپنے خیمے میں تھے آپ نے گھوڑا تیار کرایا اور اس پر سوار ہو کر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے، جہاں انگریز سپہ سالار اپنے مصاحبوں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ اسے ساتھ لے کر اپنے خیمے میں آئے۔ بات چیت کے بعد انگریز سالار نے عہد کیا کہ میں ابھی نواب کے مقابلے سے ہٹ جاتا ہوں اور سرکار انگریزی کو اس بات پر مجبور کروں گا کہ وہ نواب سے صلح کر لے، اس کے بعد نواب اور انگریزوں میں جنگ نہ ہوئی اور صلح کی بات چیت شروع ہو گئی۔ (۱)

اس افسانے کے لئے تاریخ وسوانح کے قلمی یا مطبوعہ ذخیرہ میں اب تک مجھے سرسری اشارہ تک نہ مل سکا اور نہ عقلِ سلیم کے نزدیک اس کا کوئی پہلو قابلِ قبول ہے۔ مرزا حیرت نے اس سے بھی عجیب تر افسانہ تراشا۔ فرماتے ہیں کہ سید صاحب نے:

۱۔ امیر خاں کی ملازمت میں ایک ناموری کا کام یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں میں صلح کرادی۔

۲۔ لارڈ ہسٹینگز (گورنر جنرل) سید احمد کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا، دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تین آدمیوں کا معاہدہ ہوا۔ امیر خاں، لارڈ ہسٹینگز اور سید احمد صاحب۔

۳۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشے میں اتارا تھا، اور یقین دلایا تھا کہ انگریزوں سے لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لئے برا نہیں تو تمہاری اولاد کے لئے سمِ قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ (۲)

کیا سید شہید کے عزیز ترین نصب العین کی اس سے بھی بڑی تحریف ہو سکتی ہے، جو مرزا حیرت نے کی؟ سید صاحب نواب کو انگریزوں کے ساتھ ملنے سے روکتے رہے اور لڑائی کی ترغیب دیتے رہے، جب نواب نہ رکا تو صرف اسی بناء پر آپ نے نواب سے

(۱) تواریخ عجیبہ ص:۱۴، ۱۵ (۲) حیات طیبہ ص:۲۹۲

تعلق منقطع کر لیا۔ لیکن مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ سید صاحب نے صلح کرائی اور بڑی مشکل سے نواب کو شیشے میں اتارا۔ عجیب امر یہ ہے کہ ہسٹینگز سے نواب کی کوئی ملاقات نہ ہوئی، وہ ڈیوڈ آکٹرلونی سے ملا اور سید صاحب اس ملاقات کے وقت لشکر سے کوسوں دور بیٹھے تھے۔

انگریزی چالیں

انگریزوں نے سید صاحب کے کارناموں کو غلط بیانیوں کے گرد و غبار میں چھپانے کے لئے عجیب و غریب ہتھکنڈے اختیار کئے۔ ایک طرف سید کے ساتھ محبت و ارادت کے دعویداروں سے یہ پروپیگنڈا کرایا کہ وہ (سید صاحب) انگریزوں کے دوست اور محب تھے، اس طرح اس پاک نفس وجود کے داعیۂ جہاد کی آبرو مٹائی۔ پھر دوسرے لوگوں کو اُبھارا کہ وہ سید کی تحریک اصلاحِ عقائد و اعمال کو بے سروپا مطاعن کا ہدف بنائیں، اس طرح اس شہید کے کارنامۂ حیات کو ہر پہلو سے ملیا میٹ کر دینے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دشمنوں کے ہاتھوں کسی کا سر مشق مظلومیت بننا قطعاً تعجب انگیز نہیں، لیکن سید احمد شہید عالمِ انسانیت کے ان یگانہ مظلوموں میں سے ہیں جنہیں دوستوں اور محبوں نے دشمنوں سے بڑھ کر نہیں تو کم از کم ان کے برابر نشانۂ بیداد بنانے میں کوئی کوتاہی نہ کی۔

تاریخ مراجعت

اب صرف ایک معاملہ باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ سید صاحب کب نواب سے رخصت ہو کر دہلی پہنچے؟ یہ معلوم ہے کہ انگریزوں کے ساتھ معاہدے کی تصدیق کے وقت سید صاحب راجستھان ہی میں تھے، اور نواب کی فرمائش پر صاحبزادہ محمد وزیر خاں کے ہمراہ دہلی آئے تھے۔ ''منظورہ'' میں ہے کہ صاحبزادہ محمد وزیر خاں دہلی پہنچے تھے تو گرمی کا موسم تھا، اغلب ہے وہ مئی یا جون ۱۸۱۸ء میں آئے ہوں (رجب یا شعبان ۱۲۳۳ھ)، یہی

سید صاحب کی تاریخ مراجعت ہے۔

صاحبزادہ صاحب کو حوض قاضی کے پاس بلند بیگ خاں کی حویلی میں اتارا گیا تھا، سید صاحب اجمیری دروازہ کے باہر سرائے میں ٹھہر گئے۔ اگلے روز شاہ عبدالعزیز سے ملنے گئے تو پچیس روپے بہ طور نذر پیش کئے۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ مسجد اکبر آبادی میں اُترو، چنانچہ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی، حافظ قطب الدین، شاہ محمد یعقوب، مولوی محمد یوسف پھلتی، مولوی وحید الدین اور کئی اور صاحبوں کو حکم دیا کہ سید صاحب کا سامان سرائے سے اُٹھا کر مسجد اکبر آبادی میں پہنچا دیں۔ سید صاحب مسجد میں پہنچے تو پہلے دو رکعت نماز نفل ادا کی، پھر صحن میں آکر بیٹھے اور پانچ حجرے اپنے قیام کے لئے پسند فرمائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے رفیقوں میں اور بھی آدمی ہوں گے، آپ کے استاد شاہ عبدالقادر کئی برس پہلے واصل بحق ہو چکے تھے اور ان کی جگہ شاہ رفیع الدین مسجد میں درس دیتے تھے۔

دسواں باب:

دعوتِ اصلاح کا آغاز

دہلی میں تشریف آوری

سید صاحب نواب امیر خاں سے الگ ہو کر تیسری مرتبہ دہلی میں وارد ہوئے تو ان کی خداداد صلاحیتیں کمال پر پہنچ چکی تھیں اور ذکر و سلوک کی ان تمام منزلوں سے گذر چکے تھے، جو اس مشرب کے اکابر کے لئے مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ ان کی ریاضتیں اور مجاہدے اس عہد میں بھی تعجب کی حد تک نادر و یگانہ تھے، جب کہ ان مشاغل کو رواجِ عام حاصل تھا۔ عمر کے عشرۂ چہارم میں تھے، جب انسان کے قویٰ بلوغ کی آخری حد پر پہنچ جاتے ہیں۔ سات آٹھ برس تک اس لشکر گاہ میں ایک ذمہ دار مشیر کے طور پر کام کر چکے تھے، جو اپنے وقت میں سیاسیاتِ ہند کا ایک ممتاز مرکز تھی اور جہاں بیٹھ کر زیادہ سے زیادہ صحیح اندازہ ہو سکتا تھا کہ ملک کے مستقبل کی تقدیر کس نہج و طریق پر جا رہی ہے۔

اسلام و شریعت کی محبت سے ان کے وجود کا رگ و ریشہ خلقاً معمور تھا، یہ بھی جان چکے تھے کہ ملک جس خوفناک انقلابِ احوال سے دوچار ہے، اگر اس کا رُخ بدلنے میں پوری طاقت و قوت سے کام نہ لیا گیا تو نہ مسلمانوں کی سیاسی برتری کے باقیات سلامت رہ سکیں گے اور نہ احیاءِ تجدید دین کے لئے کوئی قابل ذکر کام ہو سکے گا۔ وقت کے بعض عظیم المنزلت افراد سے بھی ان کے گہرے تعلقات پیدا ہو چکے تھے۔

شاہ عبدالعزیز کا خواب

ایک روایت ہے کہ سید صاحب کے پہنچنے سے ایک ہفتہ پہلے شاہ عبدالعزیز نے

ایک خواب دیکھا، جس کا مفاد یہ تھا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم دہلی کی جامع مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ بے شمار خلقت ہر گوشے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدارِ فرحت آثار کے لئے اُمڈی چلی آرہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے شاہ صاحب کو دست بوسی کی سعادت سے شرف بخشا، پھر ایک عصا مرحمت کیا اور فرمایا: تو مسجد کے دروازے پر بیٹھ جا، ہر کسی کا حال ہمیں سنا۔ جس کیلئے ہمارے ہاں سے حاضری کی اجازت ملے، اُسے اندر آنے دے۔

شاہ عبدالعزیزؒ بیدار ہوئے تو اس خواب کی تعبیر پوچھنے کے لئے شاہ غلام علیؒ کے پاس خانقاہ میں پہنچے۔ انہوں نے کہا: سبحان اللہ! یوسفِ وقت مجھ سے تعبیر پوچھتا ہے! شاہ صاحب بولے: میں اس خواب کی تعبیر آپ کی زبان سے سننا چاہتا ہوں۔ شاہ صاحب کے سخت اصرار پر شاہ غلام علیؒ نے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض وہدایت کا خاص سلسلہ آپ سے یا آپ کے کسی مرید سے جاری ہوگا۔ شاہ صاحبؒ بولے: میرے خیال میں بھی یہی تعبیر تھی۔ جب سید صاحب دہلی پہنچے تو شاہ صاحب کو یقین ہوگیا کہ جس سلسلۂ ہدایت کے اجرا کی بشارت خواب میں دی گئی تھی وہ خدا چاہے تو سید صاحب ہی ذریعے سے جاری ہو۔

آج کل مذاقِ فہم وفکر اس نوع کی بشارتوں کو بہ اذعانِ قلب قبول کرے یا نہ کرے، لیکن اس حقیقت سے کسی کو بھی غالباً اختلاف نہ ہوگا کہ جس سید کو قدرت نے اصلاح وتجدید کی عزیمت مندانہ دعوت کیلئے چنا تھا اس کی تمام صلاحیتیں بلوغ وپختگی کی آخری حد پر پہنچ چکی تھیں اور آغازِ کار میں توقف وانتظار کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی۔

اصلاح وتجدید کی اسکیم

سید صاحبؒ کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان بنایا جائے، جہاد فی سبیل اللہ کی اس روح کو زندہ کیا جائے جو قرنِ اول کے

مسلمانوں کا طغرائے امتیاز (۱) تھی، اور ہندوستان میں خالص اسلامی حکومت کی بنیادیں استوار کی جائیں، جو آٹھ سو برس تک مسلمانوں کے زیر نگیں رہنے کے بعد تیزی سے اغیار کے قبضے میں جا رہا تھا۔ جب تک نواب امیر خاں آزاد رہا، سید صاحب نے اس کا دامن نہ چھوڑا، نواب نے انگریزوں سے معاہدہ کرلیا تو امید کا چراغ بھی گل ہوگیا اور سید صاحب کیلئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ نصب العین کی خاطر تنظیم کا مستقل بندوبست کریں۔ مجھے یقین ہے کہ دہلی پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنے ذہن میں ایک نقشۂ تنظیم بنا چکے تھے، جسے جامۂ عمل پہنانے کی غرض سے وہ دہلی میں ٹھہر گئے اور ایک برس تک وطن کا رُخ نہ کیا، اسی سلسلے میں انہوں نے میرٹھ، مظفرنگر، سہارنپور وغیرہ کا دورہ کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے سوچے ہوئے نظام کی کامیابی کے امکانات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرلیں، پھر جہاں جائیں، اسی کے لئے اپنی زندگی کے گرانمایہ اوقات وقف رکھیں۔

وہ نہ کسی خطے کے رئیس تھے نہ ذخائرِ زر کے مالک تھے۔ نواب امیر خاں نے جن حالات میں کام شروع کرکے بڑی جمعیت فراہم کرلی تھی، وہ بھی باقی نہیں رہے تھے، اس لئے کہ انگریز ہندوستان کے بڑے حصہ پر قابض ہو چکے تھے۔ سید صاحب کے پاس دینی حمیت، جذبہ احیائے اسلامیت اور روحانی دولت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہی قدوسی جوہر تھے جن کے بل پر انہوں نے ارشاد و ہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔

ایک طرف مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح پیش نظر رکھی، دوسری طرف ان کے سینوں میں جہاد فی سبیل اللہ کی حرارت پیدا کی۔ مسلمان اگر سچا مسلمان ہو تو ناممکن ہے کہ وہ جہاد فی سبیل اللہ کی حرارت کا بے پناہ آتش کدہ نہ بن جائے، ناممکن ہے کہ اس کے بدن کا ہر قطرۂ خون راہِ خدا میں بہنے کو اپنی سب سے بڑی سعادت نہ سمجھے، یہی طریقہ

(۱) یہی خصوصیت تھی جس کی طرف حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفۃ الرسولؐ اپنے پہلے خطبے میں ارشاد فرمایا تھا کہ جو قوم خدا کی راہ میں جہاد چھوڑ دیتی ہے وہ ذلت و خواری میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

تھا جسے سید صاحب سے چند سال بعد قفقاز کے شہرۂ آفاق مجاہد شیخ شامل نے اختیار کیا اور غازیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرلی جو ربع صدی تک روس کی جابر طاقت سے ٹکراتی رہی۔ یہی طریقہ تھا جسے سید صاحب سے چالیس برس بعد شیخ محمد احمد سودانی نے اپنے وطن میں اختیار کیا اور نہایت قلیل مدت میں بے روح سودانیوں کو منظم کر کے حمیت اسلام اور جوشِ آزادی کی راہ میں ایک بے پناہ قوت بنا دیا۔

آغازِ بیعت

سید صاحبؒ کو دہلی پہنچے ہوئے زیادہ مدت نہیں گذری تھی کہ بیعت وطریقت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، اکابر میں سے سب سے پہلے مولوی محمد یوسف پھلتی نے بیعت کی، جو شاہ ولی اللہ کے برادر اکبر شاہ اہل اللہ کے پوتے تھے، اور اس وجہ سے ولی اللّٰہی خاندان میں محسوب تھے۔ بیعت کے وقت سے آخری سانس تک مولوی محمد یوسف، سید صاحب کے خاص رفیق، معتمد علیہ مشیر، خزینہ دار اور داروغۂ کل بنے رہے۔ سید صاحب سرحد میں سوات کا دورہ کر رہے تھے، جب اس بزرگ ہستی نے انتقال کیا اور ''قطبِ لشکر اسلام'' کا لقب پایا۔

مولانا احمد اللہ ناگپوری کا بیان ہے کہ مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل نے مولوی محمد یوسف سے کہا تھا، پہلے آپ بیعت کریں مراقبہ وتوجہ میں جو انوار و برکات حاصل ہوں، ان کی تفصیل ہمیں بتائیں پھر ہم بیعت کریں گے۔ مولوی صاحب موصوف نے بیعت کے بعد عقیدت وارادت کو اس بلندی پر پہنچا دیا کہ ان کا رتبہ مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل سے برابر فائق و برتر رہا۔(۱)

(۱) منظورہ ص:۷۵

مولانا عبدالحیٔ کی بیعت

مولانا عبدالحیٔ کی بیعت کا واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز انہوں نے اسرارِ صلوٰۃ اور حضورِ قلب کے متعلق شاہ عبدالعزیز سے گفتگو کی، شاہ صاحب نے فرمایا کہ تصوف و اخلاق کی کتابوں میں ان امور کی تشریح موجود ہے۔ مثال کے طور پر ''احیاء العلوم'' کو دیکھ لینا چاہئے، لیکن مرشدِ کامل کے بغیر حصولِ مرام مشکل ہے۔ ساتھ ہی سید صاحب سے رجوع کا مشورہ دیا۔(۱)

مولانا عبدالحیٔ نے سید صاحب کے پاس پہنچ کر وہی سوال کیا، آپ نے جواب میں پوری کیفیت بتاتے ہوئے فرمایا:

> مولانا صاحب! حصول ایں مقصد بہ گفتگو راست نمی آید، ہمیں نماز است کہ در بدوِ نبوت سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) را حضرت جبرئیل امین بحکم رب العالمین برائے تعلیم آں امامت فرمودہ اند۔ بیا، برخیز و تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدائیم بربند۔ مولانا علیہ الرحمۃ حسب المامور بہ عمل آوردہ تحریمہ دو رکعت نماز بہ اقتدائے آں عالی جناب بربستند۔ دریں مقام اکثر آں عالی مقام (مولانا عبدالحیٔ) بیان مے فرمودہ کہ آنچہ درآں دو رکعت یافتہ ام ہیچ گاہ در عمر خود نیافتہ ام۔(۲)

ترجمہ: مولانا صاحب یہ مقصد گفتگو سے حاصل نہیں ہوسکتا، یہی

---

(۱) مخزنِ احمدی ص:۳۴، ۳۵۔ ''مخزن'' میں شاہ عبدالعزیز کی جگہ شاہ عبدالقادر کا نام مرقوم ہے، جسے مصنف یا ناقل کی لغزشِ قلم سمجھنا چاہئے۔ شاہ عبدالقادر ۲۲ رجمادی الثانی ۱۲۲۸ھ (جون ۱۸۱۳ء) کو فوت ہو چکے تھے۔ جب سید صاحب امیر خاں کے لشکر میں تھے، شاہ رفیع الدین نے سید صاحب کے دہلی پہنچنے سے تھوڑی مدت بعد ۵رشوال ۱۲۳۳ھ (۸راگست ۱۸۱۸ء) کو بہ عارضہ ہیضہ وبائی انتقال کیا، یقیناً یہ گفتگو شاہ عبدالعزیز سے ہوئی۔ یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہئے کہ شاہ عبدالعزیز مولانا عبدالحیٔ کے پھوپھا تھے، شاہ صاحب ہی نے مولانا کو پڑھایا تھا، پھر اپنی بیٹی سے شادی کر دی تھی۔

(۲) مخزن احمدی ص:۳۵

نماز ہے جو حضرت جبرئیل امین نے رب العالمین کے حکم سے خود امام بن کر حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو آغاز نبوت میں پڑھائی تھی۔ اٹھیے اور دو رکعت نماز میرے پیچھے پڑھئے۔ مولانا نے حسب ارشاد سید صاحب کی اقتداء میں دو رکعت نماز کی نیت باندھ لی، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ان دو رکعتوں میں جو نعمتیں حاصل ہوئیں، وہ عمر بھر مجھے نہ مل سکیں۔

مولانا کرامت علی صاحب جون پوری نے اس بارے میں مولانا عبدالحیٔ کا جو بیان اپنی کتاب ''نور علیٰ نور'' میں نقل کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحیٔ نے سلوک الی اللہ کے لئے شاہ عبدالعزیز سے درخواست کی تو آپ نے شاہ غلام علی کے پاس بھیجا، مقصد حاصل نہ ہوا تو فرمایا سید صاحب کے پاس جاؤ، چند روز بعد سید صاحب، مولانا عبدالحیٔ اور مولانا شاہ اسماعیل مدرسے میں سوئے، آدھی رات سے کچھ قبل سید صاحب نے پکارا تو مولانا عبدالحیٔ فرماتے ہیں کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ فرمایا: جایئے اس وقت اللہ کے لئے وضو کیجئے، دو تین قدم چلنے کے بعد روک کر بار بار تین مرتبہ فرمایا۔ پھر کہا کہ اللہ کے لئے نماز پڑھیے۔

مولانا کہتے ہیں، مشاہدۂ جلال میں اس طرح غرق ہوا کہ کچھ ہوش باقی نہ رہا، روتے روتے آنسوؤں سے داڑھی تر ہو گئی۔ دو رکعت پڑھ چکا تو خیال آیا کہ فاتحہ نہیں پڑھی، پھر نیت باندھ لی۔ غرض اس طرح بار بار کسی واجب کے ترک کا خیال آتا تو میں نیت باندھ لیتا، کم و بیش سو رکعتیں اسی طرح پڑھیں، پھر استغفار پڑھنے لگا۔ صبح کی نماز کے بعد مولانا اسماعیل سے یہ ذکر کیا تو انہوں نے بھی بیعت کر لی۔

شاہ اسماعیل کی بیعت

مولانا عبدالحیٔ بعد نماز سید صاحب سے اجازت لے کر گھر پہنچے اور پوری کیفیت شاہ اسماعیل کو سنائی، شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی مولانا کو ساتھ لیا اور سید صاحب کے پاس پہنچ

گئے۔ آپ نے شاہ صاحب کو بھی مولانا عبدالحیٔ کی طرح دو رکعت نماز پڑھائی۔ اسی دن سے دونوں نے سید صاحب کا دامن اس مضبوطی سے تھام لیا کہ پھر جیتے جی الگ نہ ہوئے۔ ''انوار العارفین'' کا بیان ہے کہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحیٔ اکٹھے امتحان کی غرض سے سید صاحب کے پاس پہنچے تھے اور نماز میں حضورِ قلب کے متعلق سوال کیا تھا، سید صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: آج رات میرے حجرے میں آ کر میرے پیچھے دو رکعت نماز ادا کیجئے۔ چنانچہ دو رکعت نماز سید صاحب کے ساتھ پڑھ چکنے کے بعد دو رکعتوں کی نیت باندھ لی، سید صاحب کی صحبت اور حقانی توجہ کی برکت سے ساری رات استغراق میں گزار دی۔ بس اس وقت سے ایسے معتقد ہوئے کہ پھر ساتھ نہ چھوڑا۔ (۱)

ان کے بعد شاہ اسحاق، شاہ یعقوب، حکیم مغیث الدین، مولانا وجیہ الدین، حافظ معین الدین اور ان کے فرزندوں نے بیعت کی۔ یہ سب لوگ خصوصاً مولانا عبدالحیٔ، شاہ اسماعیل اور شاہ اسحاق علم و فضل کے ستون مانے جاتے تھے۔ شاہ عبدالعزیز کے سوا شہرت اور درجے میں کوئی ان سے فائق نہ تھا، خود شاہ صاحب موصوف مولانا عبدالحیٔ کو ''شیخ الاسلام'' اور شاہ اسماعیل کو ''حجۃ الاسلام'' فرمایا کرتے تھے۔ شاہ اسماعیل بھتیجے اور شاہ اسحاق نواسے تھے، اکثر بہ طور تحدیث نعمت یہ آیت پڑھا کرتے تھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَنِیْ عَلَی الْکِبَرِ اِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحَاقَ (۲)

ہر تعریف اس خدائے پاک کیلئے ہے جس نے بڑھاپے کے عالم میں مجھے اسماعیل و اسحاق عطا کئے۔

شہرتِ عام

ان اکابر علم کی بیعت نے وقت کے اکثر اصحاب کی توجہ سید صاحب کی طرف

(۱) انوار العارفین ص: ۵۱۹

(۲) یہ آیت ابوالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانِ مبارک پر جاری ہوئی تھی، جنہیں خدا نے بڑھاپے میں پہلے حضرت اسماعیلؑ پھر حضرت اسحاقؑ عطا کئے۔

پھیر دی۔ دہلی، پھلت، بڑھانہ اور آس پاس کے تمام اقطاع و بلاد کی فضا آپ کی شہرت سے معمور ہوگئی، دور دور سے لوگ بیعت کے لئے دہلی پہنچنے لگے، جہاں جہاں یہ صدا پہنچی کہ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی اور شاہ اسحاق نے سید احمد کی بیعت کر لی، وہاں کے لوگوں میں طلب و شوق کی بے تابی پیدا ہوگئی۔

یہی زمانہ ہے جب مختلف مقامات سے دعوت نامے سید صاحب کے پاس پہنچنے لگے کہ سب لوگ حاضر خدمت نہیں ہو سکتے، لطفاً خود تشریف لایئے اور فیض توجہ سے مشرف فرمایئے۔ گویا دعوتِ اصلاح اور تنظیم جہاد کی جو اسکیم سید صاحب نے اپنے ذہن میں سوچ رکھی تھی، اس پر عمل کا سازگار وقت آ گیا تھا، اسی لئے انہوں نے وطن جانا ملتوی کیا اور اصل کام میں لگ گئے۔ اگرچہ اقربا کی طرف سے تقاضوں پر تقاضے آ رہے تھے کہ جلد وطن پہنچئے۔

مقامِ محبوبیت

شاہ اسماعیل فرماتے ہیں کہ مجھے بیعت کئے ہوئے تھوڑے ہی دن گذرے تھے، ایک روز شاہ عبدالعزیز کی خدمتِ والا درجت میں حاضر ہوا۔

انہوں نے پوچھا کہ میاں! سید کے فیض صحبت سے جو نعمتیں حاصل ہوئیں، ان کی کیفیت بیان کرو۔ میں نے عرض کیا کہ سید عالی تبار کے رتبے کا اندازہ میرے لئے مشکل ہے، البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ خدا نے آپ پر خاص احسان فرمایا، جس کا شکر واجب ہے۔ آپ کو دو علم عطا ہوئے تھے، علم ظاہر کے حامل شاہ عبدالقادر تھے، علم باطن کی وراثت سنبھالنے کیلئے خدا نے سید صاحب کو کھڑا کر دیا۔ یہ سن کر شاہ عبدالعزیز نے اپنے بارے میں کلماتِ عجز کہے، پھر فرمایا:

> میاں! یہ بات سمجھنے کے لائق ہے، بارگاہِ احدیت کے محب بہت ہیں، محبوب کمیاب ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ جناب رسالت مآب محبیب رب العالمین تھے۔

فرمایا: مرتبۂ محبوبیت مرتبۂ رسالت کی طرح نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ہو۔

میں نے عرض کیا: مثلاً محبوبِ سبحانی سید عبد القادر جیلانی۔

فرمایا: محبوبیت کا مرتبہ سید عبد القادر جیلانی پر بھی ختم نہیں ہوا، محبّ ہمیشہ بلا ومحنت اور رنج وکلفت میں مبتلا رہتے ہیں، اسکے برعکس محبوبوں کو کوئی تکلیف نہیں دیتا، بلکہ ان کی راحت وآرام کو دل وجان سے پسند کیا جاتا ہے۔ رب العالمین کے محبوں کو اکثر سرگردانی وپریشانی لاحق رہتی ہے، لیکن محبوبانِ بارگاہِ اقدس دنیا میں البسۂ فاخرہ، اطعمۂ لذیذہ اور خدم وحشم سے ممتاز رہتے ہیں، اور آخرت میں اس سے بھی زیادہ انعام پاتے ہیں۔

شاہ اسماعیل فرماتے ہیں کہ شاہ عبد العزیز نے سید صاحب کا نام تو نہ لیا، لیکن تمام اشارے بداہۃً آپ کی طرف تھے۔(۱)

''توجہ'' کی کیفیت

شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کا بیان ہے کہ شاہ عبد العزیز جب ''توجہ'' دیا کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مہین بوندوں کی پھوار پڑ رہی ہے۔ لیکن سید صاحب کی ''توجہ'' کا انداز لوہاروں کی دھونکنی جیسا تھا۔ مولانا خواجہ احمد نے شاہ یعقوب سے سنا کہ سید صاحب جب ''توجہ'' دیتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ میرا دل سید صاحب کے قلبِ صافی سے مضامینِ معرفت سن رہا ہے۔(۲)

(۱) منظورہ ص:۱۷

(۲) منظورہ ص:۱۷۳۔ میں نے توجہ پر واوین اس لئے لگائے کہ مقصود وہ توجہ ہے جو مصطلحہ تصوف ہے۔ ہمارے عہد میں یہ مشرب ومذاق بڑی حد تک ختم ہو چکا ہے، اس لئے شاید اس بیان سے عام قارئین محظوظ نہ ہو سکیں، لیکن سید صاحب کی سیرت میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، اگرچہ نظیری کا مصرعہ بار بار زبان پر آ رہا ہے: زشیوہ ہائے سمندر سپندرا چہ خبر۔

غالبًا اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ دہلی کے ایک شخص نے جو ''صوفی'' کے لقب سے مشہور تھا، سید صاحب کی مخالفت میں نمایاں درجہ حاصل کر لیا۔ بعض اصحاب نے اسے بہت سمجھایا لیکن کچھ اثر نہ ہوا، ایک روز رواجِ عام کے مطابق خواجہ حافظ کے دیوان سے فال نکالی تو یہ شعر نکلا:

کجاست صوفی دجال چشم ملحد شکل — بگو، بسوز کہ مہدی دیں پناہ رسید

یہ شعر دیکھتے ہی ''صوفی'' اپنی روش پر سخت نادم ہوا اور اسی وقت سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کر لی۔(۱)

ملّائے بخارا کی تربیت

انہیں دنوں میں بخارا سے ایک شخص تحصیلِ فیوض باطنی کی غرض سے شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوا، اسے ''ملا بخاری'' کہتے تھے۔ سید صاحب بھی شاہ صاحب کے پاس بیٹھے تھے، اگرچہ ذکر و شغل اور دعوتِ اصلاح و ارشاد کے لئے وقف تھے، لیکن ظاہری وضع سپاہیوں کی سی تھی، یعنی کٹار اور پستول وغیرہ کمر میں لگے رہتے تھے۔ شاہ صاحب نے ملّائے بخارا کو سید صاحب کے سپرد کیا، ملا معاً بولا: ''حضرت! یہ مرد سپاہی صورت مجھے کیا تعلیم دے گا؟'' ساتھ ہی سید صاحب سے سوال کیا: ''آپ نے کون کون سی کتاب پڑھی ہے؟'' سید صاحب تو چپ رہے، شاہ صاحب بولے: ''بھائی ملا!'' آپ کو اس بات سے کیا مطلب؟ یہ جان لیجئے کہ میرے پاس رہ کر بارہ برس میں جو کچھ حاصل کرو گے، وہ سید کے پاس رہ کر بارہ دن میں مل جائے گا۔''

ملا صاحب چپ چاپ اُٹھے اور سید صاحب کے قریب اکبر آبادی مسجد کے ایک حجرے میں جا ٹھہرے، جو مراد لے کر آئے تھے چند ہی دن میں حاصل ہو گئی۔ سید

(۱) وجدانی نشتر ص:۶۵

صاحب نے بعد میں کئی مرتبہ کہا کہ ہم نے ملا جیسا شائق طالبِ خدا نہیں دیکھا، ملا بھی کہا کرتا تھا کہ سید جیسا مرشدِ شفیق کہیں نہ پایا۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ مسجد میں بیٹھے بیٹھے ملا کو قے شروع ہوگئی۔ سید صاحب نے فوراً مٹی کا برتن سامنے رکھ دیا۔ برتن بھر گیا تو اپنا دامن پھیلا دیا، نہ ملا کی خدمت چھوڑی، نہ مسجد کا فرش خراب ہونے دیا، نہ کسی اور صاحب کو اس خدمت میں شریک کیا۔ بعد تکمیل سلوک ملا نے وطن جانے کی اجازت چاہی تو ساتھ ہی کہا کہ آپ سے مفارقت قطعاً گوارا نہیں، لیکن کیا کروں بار بار یہی خیال آتا ہے کہ جو نعمت حاصل کر چکا ہوں اس سے اقربا اور اہل وطن کو بھی فائدہ پہنچاؤں۔ سید صاحب نے اسے ایک ٹوپی، کرتا اور پاجامہ دیا، نیز برکت کے لئے ایک روپیہ عنایت فرمایا:

مسجد کی چھت کی صفائی

اکبر آبادی مسجد جب سے بنی تھی، اس کی چھت صاف نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ چھت سطح زمین سے بہت بلند تھی، اور اس کے اوپر چڑھنا سہل نہ تھا۔ سید صاحب نے ایک روز فیصلہ کر لیا کہ یہ کام بھی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ دو دو تین تین سیڑھیاں رسوں سے باندھ باندھ کر اوپر پہنچنے کا انتظام کیا، سب سے پہلے خود اوپر گئے، پھاوڑے سے کوڑا کرکٹ ڈھیریوں کی شکل میں جمع کیا، پھر ٹوکریوں میں بھر بھر کر نیچے ڈالتے رہے اور صبح سے تیسرے پہر تک چھت بالکل صاف کر دی۔

بھائی کی تشریف آوری

سید صاحب دہلی پہنچ کر اصلاح و تنظیم کے کام میں مصروف ہوگئے، اقرباء وطن میں انتظار کرتے کرتے تھک چکے تو آپ کے بھائی سید اسحاق اس غرض سے دہلی آئے کہ آپ کو ساتھ لے جائیں۔ بچھڑے ہوئے کم و بیش دس برس گذر چکے تھے، سید اسحاق کو قطعاً اندازہ نہ تھا کہ اس مدت میں سید صاحب کمال فضائل اور فضائل کمال کے کس بلند

درجے پر پہنچ چکے ہیں۔ جب دہلی میں دیکھا کہ خلق خدا بھائی پر والہ وشیفتہ ہے، خصوصاً ولی اللٰہی خاندان کے اکابر کی عقیدت کے مظاہرے نظر سے گذرے تو حیران رہ گئے۔

سید صاحب بھائی کے آنے سے پیشتر میرٹھ، مظفرنگر، سہارن پور وغیرہ کے دورے کا انتظام کر چکے تھے، اور دورہ ختم کئے بغیر وطن جانے کا مطلب یہ ہوتا کہ جس کام کو وہ اپنی زندگی کا اہم ترین مقصد سمجھ کر شروع کر چکے تھے، وہ پہلے ہی مرحلے میں معلق رہ جائے، اس لئے ساتھ نہ جا سکے، لیکن وعدہ فرمالیا کہ دورے کے بعد آ جاؤں گا۔ سید اسحاق نے اپنے ساتھی محسن خاں کو اس خیال سے سید صاحب کے پاس چھوڑا کہ بعد اختتامِ دورہ انہیں اصرار سے وطن لائے اور خود واپس چلے گئے۔

انہیں یقین تھا کہ بھائی کے ساتھ رفقاء کی بڑی جماعت ہوگی اور ان کی مہمان داری کے انتظامات خاص اہتمام کے محتاج تھے۔ سید صاحب نے رخصت کے وقت ساٹھ روپے اور ایک کاٹھیاواڑی بچھیرا بھائی کی نذر کیا۔ (۱)

سید اسحاق کا بیان

سید اسحاق دہلی سے لکھنؤ پہنچے تو وہاں خاندان کے کئی افراد بہ سلسلہ ملازمت موجود تھے، انہوں نے سید صاحب کا حال پوچھا۔ سید اسحاق نے فرمایا:

> آج سید احمد کو وہ رتبہ حاصل ہے کہ میں اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا، اپنی عمر میں نہ میں نے اس رتبے کا آدمی دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی عنایتِ بے غایت سے ایسا علم باطنی عطا فرمایا ہے کہ تمام علماء وفضلاءِ دہلی ان کی طرف رجوع ہیں اور ان کی تقریر کے آگے دم نہیں مار سکتے۔ ہم سے مولویوں کا تو کیا شمار کہ ان کے آگے بولیں اور لبِ چون وچرا کھولیں۔ (۲)

یہ اس بزرگوار کی شہادت تھی جو اپنے عہد میں بلحاظِ علم وفضل علم اللٰہی خاندان کا ممتاز

(۱) وقائع ص: ۴۴ (۲) وقائع ص: ۴۵

ترین فرد تھا۔ اقربا نے سمجھا کہ بھائی، بھائی کی ستایش میں سخن طرازی کر رہا ہے، سید اسحاق یہ کیفیت چہروں سے بھانپ گئے تو فرمایا:

''میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں، حقیقت یوں ہی ہے، اگرچہ وہ آپ لوگوں کے فہم میں نہ آئے۔ سید احمد آئیں گے اور انہیں دیکھو گے تو جانو گے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حرف بحرف درست ہے۔''

جماعت اور اس کے مصارف

بیعت شروع ہونے کے تھوڑے دن بعد سید صاحب کے پاس مخلصوں کی ایک جماعت فراہم ہوگئی۔ یہ لوگ ہر وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے، ان کے کھانے پینے اور پہننے کا انتظام آپ نے اپنے ذمے لے لیا تھا۔ یہ اس تنظیم کی ابتدا تھی جس کے لئے آپ اپنی زندگی وقف کر چکے تھے۔

آپ کے خادمِ خاص میاں دین محمد کہتے ہیں کہ جاڑے کا موسم آیا تو حکم ہوا کہ میرے لئے ایک سفید دگلا، دو سپید دوہریں، دو سرمئی میرزائیاں، ایک لبادہ، دو سرمئی پگڑیاں اور چار جوڑے کپڑے (یعنی کرتے اور پاجامے) بنوادو، جو بیس تیس لوگ ہمارے ساتھ ہیں، ان کے لئے جڑاول تیار کراؤ۔ ان سے دریافت کر دیکھو، جو چاہے ایک ایک دگلا اور ایک ایک دوہر بنوالے، جو چاہے ایک ایک میرزائی اور ایک ایک لحاف تیار کرالے۔ اکثر اصحاب نے دوہریں اور دگلے بنوائے، بعض نے میرزائیاں اور لحاف پسند کئے، ان چیزوں کی تیاری پر اسی روپے صرف ہوئے۔(۱)

میاں دین محمد اور میاں عبداللہ اس زمانے میں تمام انتظاماتِ پوشش وخورش کے ذمہ دار تھے، روپیہ انہیں کے پاس جمع رہتا تھا۔ بعض اوقات سید صاحب کو قرض لینے کی بھی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ مثلاً ایک موقع پر آپ اپنے ایک دوست شاہ میر سے دو سو روپے قرض لائے۔(۲) پھر نذر کے روپے آئے تو رقم واپس کر دی۔

(۱) وقائع ص:۴۵ (۲) وقائع ص:۴۴

گیارھواں باب:

دوآبے کا دَورہ اور مراجعتِ وطن

طلبی کے خطوط

جو لوگ بیعت کر چکے تھے، وہ جہاں جہاں گئے، سید صاحب کیلئے محبت وعقیدت کی عام حرارت پیدا ہوگئی۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ سب طالبانِ حق دہلی نہ پہنچ سکتے تھے، اس لئے طلبی کے خطوط آنے لگے۔ یہ خطوط زیادہ تر میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور سے آئے تھے۔ سید صاحب نے شاہ اسماعیل کی وساطت سے خطوط شاہ عبدالعزیز کی خدمت میں پہنچائے اور پوچھا کہ کیا حکم ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ضرور جایئے رخصت کے وقت اپنا خاص لباس عنایت فرمایا، جو سفید رنگ کا تھا، صرف دستار سیاہ تھی۔(۱)

اس طرح اس علاقے کے دورے کا فیصلہ ہوا جسے میں نے دوآبہ کہا۔ اس لئے گنگا اور جمنا کے مابین ہونے کی وجہ سے وہ ہمیشہ دوآبے کے نام سے موسوم رہا۔ دورے میں سید صاحب کے پیش نظر دو مقصد رہے، اول مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح، دوم اس بات کا اندازہ کہ دعوتِ جہاد کی پذیرائی کے امکانات کا کیا حال ہے۔ اسی پر ان کے پورے نقشۂ عمل کی کامیابی کا انحصار تھا۔

دورے کی عام کیفیت

اس دورے میں کم وبیش چھ مہینے صرف ہوئے۔(۲) جن مقامات پر سید صاحب

(۱) مخزنِ احمدی ص:۳۹ (۲) وقائع ص:۴۷

گئے، ان میں سے معروف یہ ہیں: غازی الدین نگر (غازی آبادی) مراد نگر، میرٹھ، سردھنہ، کاندھلہ، بڑھانہ، پھلت، مظفر نگر، دیوبند، گنگوہ، نانوتہ(۱)، تھانہ بھون، رام پور، لوہاری، سہارنپور(۲)، انبیٹھہ، متعدد کم معروف اور چھوٹے چھوٹے مقامات کے نام بھی روایتوں میں آئے ہیں مثلاً: شکارپور، ایسوبی، داتل، تولی، پائلی، ایڑنی، کھردی، بسوالی، چولی، بھوپاڑی، شیخ پورہ، املیا، سویری، لاکہ نور، چلکانہ، بھڑسور۔ ان میں سے کئی ایسے ہیں، جنکے ناموں کی صحت کے بارے میں بھی یقین کیساتھ نہیں کہا جا سکتا، بعض روایتوں میں نگینہ اور شیرکوٹ کے نام بھی آئے ہیں۔ مجھے اب تک ان کی صحت میں تامل ہے۔

رُفقائے سفر

سید صاحب دہلی سے روانہ ہوئے تھے تو کم وبیش بیس آدمی تھے، بعض کے نام بھی مذکور ہیں، مثلاً: حافظ قطب الدین، شیخ ولی محمد، شیخ صلاح الدین، (تینوں پھلت کے) شادل خاں کنج پوری، حسن شاہ پنجابی، سید ظہور احمد نگرامی، شیخ پیر الٰہ آبادی، میاں عبداللہ، مولوی محمد حسن، پیر محمد حجام اور محسن خان (دونوں رائے بریلی کے)، میاں دین محمد جو سید صاحب کا خادمِ خاص تھا، ساتھ نہیں گیا تھا، بعد میں اسے پیغام بھیج کر بلایا گیا تھا۔ مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل دہلی سے سیدھے بڑھانہ چلے گئے تھے، انہیں حکم ہوا تھا کہ بڑھانہ ہی میں انتظار کریں۔ مولوی محمد یوسف کو بھی غالباً براہِ راست پھلت بھیج دیا گیا تھا۔

موسم

دورہ یقیناً سردیوں میں ہوا، میرے اندازے کے مطابق سید صاحب نومبر ۱۸۱۸ء میں دہلی سے نکلے اور مئی میں واپس ہوئے۔ پھر مئی کے اواخر میں رائے بریلی روانہ ہوگئے۔ دورے کے سلسلے میں جو روایتیں میری نظر سے گذریں، ان میں سے بعض میں گو

(۱) تذکرۃ الرشید ص:۲۷۲ (۲) بونی کی مسجد

بنانے کا ذکر آیا ہے اور گُڑ عموماً سردیوں ہی میں بنایا جاتا ہے۔ ''وقائع'' کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ سید صاحب محرم ۱۲۳۴ھ میں سہارنپور میں تھے، نیز پورے دورے کو دورۂ سہارنپور بتایا گیا ہے۔ میں اس کا مطلب یہ سمجھتا ہوں کہ سید صاحب محرم ۱۲۳۴ھ میں دورہ شروع کر چکے تھے، اور خاصی مدت مختلف مقامات میں گزار کر سہارنپور پہنچے۔

مختلف مقامات میں مدتِ قیام

میری معلومات کے مطابق مختلف مقامات میں قیام کی مدت یہ تھی۔

غازی آبادی	پانچ دن
میرٹھ	پندرہ دن
بڑھانہ	بارہ دن
پھلت	سترہ دن
دیوبند	دس دن

اکثر مقامات میں ایک ایک دو دو راتیں ٹھہرے، سردھنہ میں تین دن رہے، سہارنپور میں بھی خاصی مدت گزاری۔

قابلِ ذکر واقعات

دورے کے قابلِ ذکر واقعات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ دہلی سے نکلے اور جمنا کو عبور کر کے ایک منزل راستے میں کی۔ غازی آباد میں تقریباً دو سو آدمیوں نے استقبال کیا۔ پہلے دن صرف چار آدمیوں نے بیعت کی۔ حافظ عبداللہ امام مسجد، شیخ عبدالرحمٰن، شیخ رمضان اور عبدالشکور خاں۔ پھر طلب گارانِ فیض کا اتنا ہجوم ہوا کہ سید صاحب کو پانچ روز تک ذرا سی دیر آرام کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ ہری رام کشمیری وہاں تحصیلدار تھا، وہ بھی عوام کے جوشِ عقیدت سے اس درجہ متاثر تھا کہ

نیازمندانہ حاضر ہوا اور شیرینی کے علاوہ کچھ رقم بھی بہ طور نذر پیش کی۔

۲۔ مرادنگر میں مفتی الٰہی بخش کاندھلوی کے صاحبزادے مولوی ابوالقاسم تھانیدار تھے، وہ برقندازوں سمیت بیعت سے مشرف ہوئے۔

۳۔ میرٹھ کے قاضی احمد اللہ (ابن قاضی حیات بخش) پچاس آدمیوں کے ساتھ استقبال کے لئے کئی میل باہر پہنچے ہوئے تھے، اور چار روز سے اسی طرح انتظار کر رہے تھے۔ وہاں پہلے سے اکابر نے باری باری دعوتوں کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جب معلوم ہوا کہ سید صاحب زیادہ دن نہ ٹھہریں گے تو بیعت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ بیعت کرنے والوں میں سے ممتاز اصحاب یہ تھے: داروغہ محمد ارحم، منشی محمدی انصاری بردوانی، مولوی محمد بخش (پندرہ متوسلین کے ساتھ) مولوی خدا بخش، قدن خان، صدرالدین اور ان کے بھائی کریم بخش روٹی والے، محمد تقی قصاب، جو انگریزی فوجوں میں گوشت کا بڑا ٹھیکیدار تھا۔ بعض نے شرینی پارچہ جات اور نقد کے کئی کئی خوان نذر میں پیش کئے۔ سید صاحب میرٹھ سے چلے تو اکثر اصحاب زار زار رو رہے تھے، یہ دیکھ کر آپ بھی آبدیدہ ہوگئے۔

۴۔ سردھنہ میں پچیس آدمی پیشوائی کی غرض سے راستے پر کھڑے تھے، سید صاحب سرائے میں ٹھہرے، سینکڑوں نے بیعت کی، ممتاز اصحاب یہ تھے: شیخ بلند بخت دیوبندی، منشی خواجہ محمد حسن پوری، حافظ امان اللہ، نتھے خان، نصر اللہ، پیر خاں، داراب خاں، ان میں سے بعض نے سید صاحب کے زیر قیادت جہاد میں عظیم الشان کارنامے انجام دیے۔ سپاہیوں نے دعوتِ طعام پر اصرار کیا تو فرمایا: اس پر منظور کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہوں پکایا جائے، انہوں نے مان لیا، فرمایا: جو کی روٹی اور ماش کی دال کھاؤں گا، ایسی دعوت میں امیر و غریب سب شریک ہو سکتے ہیں۔

بڑھانہ اور پھلت

طلبِ فیض کی بے تابیوں کا یہ حال تھا کہ جدھر سے گذر ہوتا آس پاس کے دیہات

سے لوگ جوق در جوق راستے پر آبیٹھتے اور انتہائی شوق والحاح سے عرض کرتے کہ کم از کم ایک وقت کی دعوت قبول فرمالیں۔ سید صاحب دعائے خیر فرماتے اور عذر کردیتے، بعض مقامات پر عذر سے کام نہ چلا اور مجبوراً تھوڑی دیر کے لئے رکنا پڑا۔ بڑھانہ میں مولانا عبدالحیٔ کے ہاں قیام کیا، مولانا شاہ اسماعیل، مولوی محمد یوسف، مولوی وحید الدین، شیخ سعد الدین، شیخ علاؤ الدین پہلے سے موجود تھے۔ میانجی نظام الدین چشتی، شیخ محمد حسن اور دوسرے اکابر نے بھی دعوتیں کیں۔ لیکن زیادہ تر مولانا عبدالحیٔ ہی کے ہاں کھانا پکتا رہا، وہ ہر روز غایت درجہ تکلف کرتے۔ سید صاحب تکلف سے روکتے تو کہتے: حضرت! آپ کی معمولی سی آسایش کیلئے میرا گھر بھی بک جائے تو اسے سعادت سمجھوں گا۔ ان کے صاحبزادے عبدالقیوم کمسن تھے، مولانا نے ان سے بھی تیمن کے طور پر بیعت کرائی۔

پھلت میں سید صاحب شیخ ولی محمد کے مکان پر ٹھہرے۔ یہ مکان شیخ صاحب کے عمِ حقیقی کمال الدین کا تھا، جن سے شاہ اسماعیل کی ہمشیرہ بی بی رقیہ کا پہلا نکاح ہوا تھا۔ حافظ کمال الدین کے دادا شاہ اسماعیل کے حقیقی نانا تھے، جن اصحاب نے دعوتیں کیں ان میں سے قابلِ ذکر یہ ہیں: شیخ ولی محمد کے والد شیخ محمد فضیل، شیخ غلام محمد، محمد عارف، حافظ غلام علی، حافظ معین الدین، حافظ احمد الدین، عبدالعلی، حافظ محمد عثمان (برادر مولوی محمد یوسف) یہی ایک مقام ہے جہاں کے متعلق روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ سید صاحب روزانہ ورزش کرتے تھے، بعض روایتوں میں تیر اندازی کی مشق کا بھی ذکر ہے۔ کیا ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ پھلت پہنچنے تک سید صاحب کو دعوتِ جہاد کی پذیرائی کے لئے فضا کی سازگاری کا اندازہ ہو چکا تھا، لہٰذا اصلاحِ عقائد اور تزکیۂ باطن کے ساتھ ساتھ استعدادِ جہاد کا کام بھی شروع کردیا گیا۔

باقی مقامات

پھلت سے نکلے تو مظفر نگر ہوتے ہوئے دیوبند پہنچے، دیوبند ہی سے املیا گئے۔ ان

مقامات میں قاضی نجم الدین نے پندرہ آدمیوں کے ساتھ، سید مقبول، مولوی شمس الدین، قاضی عظیم اللہ، شیخ رجب علی، ان کے فرزند منور علی، حافظ عبد اللہ، ان کے بھائی نظام الدین اور کریم الدین، ان کے والد امام بخش، کرامت حسین، محمد ماہ، شیخ چاند، مولوی فرید الدین، مولوی بشیر اللہ، سید محمد حسین وغیرہ اصحاب نے بیعت کی۔ گنگوہ میں مکلے کی سرائے میں قیام فرمایا تھا۔(۱)

نانوتہ میں جامع مسجد میں ٹھہرے تھے۔ایک ارادتمند کا بیان ہے، میری آنکھوں میں اب تک وہ منظر پھر رہا ہے کہ سید صاحب جامع مسجد کے وسطی در میں کھڑے ہیں، اپنی دستار اتار کر ایک سرا اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور باقی دستار کو دونوں جانب سے طالبانِ فیض نے تھام لیا ہے۔ دستار کی شکل کنکھجورے کی سی معلوم ہوتی تھی۔(۲) انبیٹھہ میں میاں صابر بخش سجادہ نشین شاہ ابو المعالی کے یہاں دعوت ہوئی تھی۔(۳)

سہارنپور میں سید صاحب مسجد بونبی میں ٹھہرے تھے، یہیں شاہ عبد الرحیم ولایتی سے ملاقات ہوئی، وہ بڑے پیر مانے جاتے تھے، سید صاحب کو دیکھا تو خود بھی بیعت کی اور مریدوں کو بھی بیعت کا حکم دیا۔ فرمایا کرتے تھے، ہمیں نہ نماز پڑھنا آتی تھی، نہ روزہ رکھنا آتا تھا، سید صاحب کی برکت سے ہم دونوں کام سیکھ گئے۔(۴) اس مقام پر دوسرے اصحاب کے علاوہ قصاب اور نور باف بہ تعدادِ کثیر فیض یاب ہوئے، مولوی شاہ رمضان رڑکی والے بھی سہارنپور میں بیعت ہوئے تھے۔ وہ بھی مجاہدین کا ایک قافلہ لے کر سرحد پہنچے تھے۔ سہارن پور کے تحصیلدار دھونکل سنگھ نے بھی سید صاحب کی دعوت کی تھی۔ کاندھلہ میں مفتی الٰہی بخش اور ان کے صاحبزادے بیعت ہوئے، مولوی محمد زکریا

(۱) ارواحِ ثلاثہ ص:۱۰۹۔ ایک روایت ہے کہ مولانا محمد قاسم کے خسر میاں وجیہ الدین نے بھی سید صاحب کی دعوت کی تھی۔

(۲) ارواحِ ثلاثہ ص:۱۰۹ (۳) ارواحِ ثلاثہ ص:۱۰۸ (۴) ارواحِ ثلاثہ ص:۱۱۵

ابن مولوی عبدالخالق ابن مولوی شمس الدین "شریعت کے لٹھ" کے مصنف کی حیثیت میں بہت مشہور ہیں، انہوں نے پہلے سید صاحب کی ہجو میں شعر کہے، پھر بیعت ہوئے۔ بیعت کرنے والوں میں ایک مولوی محمد حسین بھی تھے، جو قاضی علاؤ الدین بگھروی کے بھائی تھے اور ایک سو دس سال کی عمر پائی۔

دَورے پر تبصرہ

دورے سے مراجعت کے سفر کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی، یہ دورہ بہ ظاہر پیروں اور پیرزادوں کا سا تھا۔ یعنی سید صاحب مریدوں کی ایک جماعت کے ساتھ شہر بہ شہر اور قریہ بہ قریہ پھرتے رہے، ہر مقام پر دعوتیں بھی ہوئیں، توبہ وارشاد کی بیعت بھی لی جاتی تھی، عام پیروں کی طرح حلقے بنا کر "توجہ" بھی دی جاتی تھی، لیکن بعض خصوصیات میں یہ دورہ عام پیرزادوں کے دورے سے بالکل مختلف تھا، مثلاً باقاعدہ وعظ کہے جاتے تھے، جن میں بدعات ومحدثات کے ردّ وازالہ پر بہت زور دیا جاتا تھا، اسلامی احکام کے فضائل ایسے انداز میں سنائے جاتے تھے کہ جو سنتا دل وجان سے انہیں قبول کر لیتا۔ ان رسموں کو پورے اہتمام سے ختم کیا جاتا تھا جو مدت تک غیر مسلموں کی صحبت میں رہنے کے باعث مسلمانوں میں بھی سرایت کر گئی تھیں۔ غیر اسلامی نام بھی بدل دیے گئے، مثلاً امام بخش کا نام بدل کر امام الدین رکھ دیا گیا، خود سید صاحب کی توجہ اس درجہ پُرتاثیر تھی کہ اکثر لوگ ایک ہی مرتبہ آپ کے حلقے میں بیٹھ کر دینی شیفتگی کے پیکر بن گئے۔

غرض سید صاحب کے قدم جہاں جہاں پہنچے رحمتِ ایزدی کی بارش سے ارواح وقلوب کی بنجر زمینیں شاداب وسیر حاصل بن گئیں۔ مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم کے والد ماجد) فرماتے تھے کہ سید صاحب جن قصبات میں تشریف لے گئے، وہاں اب تک خیر وبرکت ہے۔ گویا وہ ایک نورِ مستطیل تھے کہ جدھر گئے وہ پھیل

گیا۔ ایک اور بزرگ مولانا محمد حسین فرماتے ہیں جہاں جہاں حضرت کے قدم گئے وہاں وہاں خیر و برکت کے آثار پائے جاتے ہیں۔(۱)

اصل مدعا

اصل مدعا بہر حال یہی تھا کہ اصلاحِ عقائد و اعمال کا پیغام پہنچایا جائے، ساتھ ساتھ یہ دیکھا جائے کہ مسلمان اس بڑے کام کے لئے کس حد تک مساعدت پر آمادہ ہیں جو بدوِ شعور سے سید صاحب کے قلب و روح میں ایمان کی طرح متمکن تھا، یعنی اغیار کے تسلط کو ختم کرنے کیلئے جہاد فی سبیل اللہ کا آغاز اور حکومتِ اسلامیہ کی تاسیس۔ اس نقطہ نگاہ سے بھی سید صاحب کا دورہ بہ ہمہ وجوہ کامیاب رہا۔ اسی طریقے پر دعوتِ احیاءِ اسلامیت دیتے ہوئے وہ رائے بریلی پہنچے، پھر اسی رنگ میں انہوں نے الہ آباد، بنارس، کان پور، لکھنؤ وغیرہ کے اطراف میں دورے کئے، یہاں تک کہ فداکارانِ اسلام کی ایک قدوسی جماعت تیار ہوگئی اور مستقلاً جہاد کا آغاز ہوگیا۔

بعض اصحاب سے معلوم ہوا کہ شاہ عبدالعزیز نے دوآبے کے دورے سے پیشتر جگہ جگہ خط بھی لکھ دیے تھے، اور پیغام بھی بھیج دیے تھے کہ سید صاحب ہمارے آدمی ہیں، ان کی تواضع میں کوتاہی نہ ہو۔ یہ یقیناً درست ہوگا، اس لئے کہ دورہ شاہ عبدالعزیز کے مشورے سے شروع ہوا تھا، لیکن مختلف مقامات پر خدمتِ دین اور شیفتگیٔ اسلامیت کا جو جذبۂ صادقہ پیدا ہوا وہ خدا کے فضل و کرم کے بعد صرف سید صاحب کی روحانی برکات اور والہیتِ احیائے اسلامیت کا کرشمہ تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے خطوط و پیغام مختلف حلقوں میں شناسائی کا ذریعہ ضرور بن سکتے تھے لیکن دل افروز نتائج و ثمرات صرف سفارشوں سے پیدا نہیں ہوتے۔

(۱) یہ بیانات مولانا سید عبدالحئی بریلوی کی کتاب ''ارمغانِ احباب'' سے ماخوذ ہیں۔

قصدِ وطن

دورہ ختم کر کے دہلی پہنچے تو وطن جانے کیلئے تیار ہوگئے، اقربا سے بچھڑے ہوئے دس برس گذر چکے تھے اور سید صاحب اپنے بھائی سے وعدہ کر چکے تھے کہ دورے سے واپس ہوتے ہی آجاؤں گا۔ سید اسحاق عزیز بھائی کے ساتھیوں کے لئے مہمانداری کے انتظامات کررہے تھے کہ اچانک بیمار ہوئے اور ۷ر جمادی الاخریٰ ۱۲۳۴ھ (۳ر اپریل ۱۸۱۹ء) کو رہگرائے عالم بقا ہوگئے۔ اس زمانے میں سید عبد الرحمٰن، ہمشیر زادۂ سید صاحب کے سوا اقربا میں سے گھر پر کوئی موجود نہ تھا۔ سید عبد الرحمٰن ہی نے کفن دفن کا انتظام کیا، سید صاحب کو اسلئے فوراً خبر نہ بھیجی گئی کہ سب کو پہلے سے ان کی آمد کا یقین تھا۔

دہلی سے روانگی کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، مہینہ یقیناً شعبان کا تھا۔ (۱) ساتھ کم سے کم پچاس اور زیادہ سے زیادہ بہتر تہتر آدمی ہوں گے۔ (۲) دریائے جمنا کو عبور کر کے آگے بڑھے تو پہلے سخت آندھی آئی پھر بارش شروع ہوگئی۔ ہندون ندی پر پہنچے تو اس میں سیل آگیا۔ رات کی تاریکی میں عبور کو قرین احتیاط نہ سمجھا گیا، اس لئے رات ندی کے کنارے پر گزاری، دوسرے دن غازی آباد پہنچ کر مسجد میں اترے جس کا امام حافظ عبداللہ، آپ کا مرید تھا۔

سید اسحاق کے انتقال کی خبر

رات کا کھانا ابھی کھایا نہیں تھا کہ رائے بریلی سے بھگوان نام ایک قاصد آپہنچا۔

(۱) ایک روایت میں ہے کہ ہفتے کے دن روانہ ہوئے، ایک دن پہلے یعنی جمعہ کو شاہ اسماعیل کے ہاں کھانے کی دعوت تھی۔ سید صاحب دہلی سے رائے بریلی گئے تو زیادہ تر مقامات میں صرف ایک ایک رات ٹھہرتے، غالباً رام پور میں زیادہ قیام کیا۔ پورے سفر میں بیس پچیس دن سے زیادہ مدت نہ لگی ہوگی، رمضان کے چاند کی رات رائے بریلی پہنچ گئے تھے۔ شعبان ۱۲۳۴ھ میں ہفتے کا دن ۴، ۱۱، ۱۸ اور ۲۵ کو تھا، اغلب ہے وہ ۴ر شعبان (۲۹ر مئی ۱۸۱۹ء) کو روانہ ہوئے ہوں، میں اسی کو درست سمجھتا ہوں۔

(۲) مخزنِ احمدی: ہفتادودو کس، وقائع: کم یا زیادہ پچاس آدمی۔

اس کے ساتھ ایک خط تھا، سید صاحب نے لے کر تھوڑا سا پڑھا، پھر لپیٹ کر پیر مبارک علی مصطفیٰ آبادی کو دے دیا اور تاکید فرمادی کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کیا جائے۔ آپ کا چہرہ خط پڑھتے ہی متغیر ہو گیا تھا، جب کھانے سے بھی انکار کر دیا تو ارادت مندوں نے وجہ پوچھی، اس وقت بتایا کہ بھائی فوت ہو گئے۔ یہ سنتے ہی سب رونے لگے، اس لئے بھی کہ سید اسحاق، سید صاحب کے بھائی تھے، اس لئے بھی کہ بلند پایہ عالم اور نیک کردار بزرگ تھے۔ چونکہ دہلی میں تعلیم پائی تھی اس لئے شاہ ولی اللہ کے خاندان سے فیض یاب علم ہونے والے اکثر اصحاب کے ساتھ ان کے گہرے تعلقات تھے۔ محسن خاں، جسے سید اسحاق دہلی سے جاتے وقت سید صاحب کے پاس چھوڑ گئے تھے، دہاڑیں مار مار کر رویا، سید صاحب نے کمالِ ضبط سے فرمایا: ''بھائی صبر کر، اللہ تعالیٰ انہیں بخشے'' آخر شاہ اسماعیل نے سید صاحب سے عرض کیا کہ جب تک آپ کھانا نہ کھائیں گے ساتھیوں میں سے بھی کوئی نہ کھائے گا۔ چنانچہ آدھی رات کے قریب آپ نے چند نوالے کھائے۔ (۱)

غازی آباد سے چلے تو ہاپوڑ، گڑھ مکتیشر، امروہہ اور مراد آباد ٹھہرتے ہوئے (۲) رام پور پہنچے اور حاجی زین العابدین کے مکان پر ٹھہرے، وہاں تین چار دن یا اس سے بھی زیادہ قیام فرمایا۔

طریقۂ محمدیہ

ہندوستان میں اس وقت تصوف کے تین ہی طریقے عام طور پر رائج تھے: قادری، چشتی اور نقشبندی۔ نقشبندی طریقے کا ایک سلسلہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی،

(۱) میرا خیال ہے کہ ابتداء میں قاصد اس لئے نہ بھیجا گیا کہ سب کو آپ کے آنے کا انتظار تھا، جب تقریباً دو مہینے انتظار میں گذر گئے تو اطلاع بھیجی گئی اور قاصد غازی آباد میں سید صاحب سے ملا۔

(۲) گڑھ مکتیشر کی مسجد میں اترے تھے، امروہہ اور مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے۔ ایک روایت کے مطابق مراد آباد میں ایک مجذوب سے بھی ملے تھے اور ایک دن شکار بھی کھیلا تھا۔

سے انتساب کے باعث طریقہ مجددیہ کہلاتا تھا۔ سید صاحب ان طریقوں کے علاوہ ''طریقہ محمدیہ'' میں بھی بیعت لیتے تھے۔ رام پور میں اس طریقے کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا: طریقہ محمدیہ یہ ہے کہ زندگی کا ہر کام صرف رضائے رب العالمین کے لئے کیا جائے، مثلاً محنت کا مقصد یہ ہو کہ انسان حلال روزی کما کر خود بھی کھائے اور اہل وعیال کو بھی کھلائے۔ استراحتِ شب کا مدعا یہ ہو کہ انسان جوفِ لیل میں اٹھ کر نمازِ تہجد ادا کرے اور نمازِ فجر اول وقت پڑھے۔ کھانا اس لئے کھایا جائے کہ جسم میں بقدر ضرورت طاقت بحال رہے تاکہ انسان خدا کے احکام مستعدی سے بجالائے، نماز پڑھے، روزے رکھے، حج کے لئے جائے، ضرورت پڑے تو جہاد کے لئے تیار ہو۔ غرض چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، کھانے پینے میں مقصود احکامِ خداوندی کی بجا آوری اور مرضاتِ باری تعالیٰ کی پابندی کے سوا کچھ نہ ہو۔ بالفاظِ دیگر ہر فرد آیت مبارکہ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کا عملی نمونہ بن جائے۔

رام پور میں اس مرتبہ جن اکابر نے بیعت کی، ان میں نواب احمد علی والیٔ رام پور بھی تھے۔

سکھوں کے ساتھ جہاد کا معاملہ

بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ رام پور میں افغانوں نے آپ کو مسلمانوں پر سکھوں کے ظلم وستم کی داستانیں سنائی تھیں اور یہ داستانیں سن کر آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا فیصلہ کر لیا۔ یہ محض سوانح نگاروں کے تخیل کا کرشمہ ہے، سید صاحب اس سے بہت پہلے جہاد کا پختہ فیصلہ کر چکے تھے، اور اس کی غرض وغایت یہ تھی کہ ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کریں۔ رام پور میں سکھوں کے ظلم کی کہانیاں ضرور سنی ہوں گی، لیکن جہاد کا فیصلہ ان کہانیوں کی سماعت پر مبنی نہ تھا۔ سید صاحب کے نزدیک جہاد کا پہلا

ہدف انگریز تھے، جو ہندوستان کے بہت بڑے علاقہ پر قابض ہو چکے تھے، سکھوں سے بھی جہاد ضروری تھا، لیکن وہ انگریزوں سے پہلے نہ آتے تھے، ان سے آغازِ جہاد اس لئے ہوا کہ سید صاحب نے جو مرکز تجویز فرمایا تھا اس میں سکھ سب سے پیشتر سامنے آگئے۔ اس مسئلے پر مفصل بحث ان ابواب میں ملے گی جن میں سید صاحب کے موقفِ جہاد کو واضح کیا گیا ہے۔

رائے بریلی میں

رام پور کے بعد ایک مقام راستے میں ہوا، پھر سید صاحب بانس بریلی پہنچ کر جامع مسجد میں ٹھہر گئے۔ بریلی کے نواب کو علم ہوا تو وہ باصرار اپنے مکان پر لے گیا اور مع متعلقین بیعت کی، دوسرے اصحاب بھی بیعت سے مشرف ہوئے، جن میں سے ایک حسینی مخنث تھا۔ سید صاحب نے اس کا نام ہدایت اللہ رکھا، یہ حج و جہاد میں ساتھ رہا، اکوڑے کی جنگ میں اس نے چھ سات دشمنوں کو برچھی سے مارا تھا، اس کا ایک اور بھائی امامی نام تھا، جو نابینا ہو گیا تھا، بعد کی منزلوں میں سے شاہ جہان پور میں قیام کا ذکر صاحب انوار العارفین نے مجملاً کیا ہے، وہاں اس زمانے میں خلیل شاہ نام ایک بزرگ تھے، صاحبِ ''انوار العارفین'' لکھتے ہیں:

> در آں زمانہ کہ جناب سید احمد از دہلی در شاہ جہاں پور تشریف بردند، مولوی اسماعیل و آنجناب (سید صاحب) برائے ملاقات ایشاں (خلیل احمد شاہ) آمدند۔

اس سلسلے میں سید صاحب کی صحبت کے اثرات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خاص و عام کے دل میں ایسی ہمت پیدا کر دی کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں بھائی نے بھائی کو، بیٹے نے ماں باپ کو، باپ نے بیٹے اور بیٹی کو، شوہر نے بیوی کو چھوڑا، اور سب

آپ کے ساتھ ہو گئے۔

آگے کے مقامات کا پورا حال معلوم نہ ہو سکا، صرف اتنا معلوم ہے کہ جس شام کو رائے بریلی میں رمضان المبارک کا ہلال دیکھا گیا، اسی شام کو برکاتِ اسلامی کا یہ بدرِ منیر دس برس کے بعد وطن مالوف کی فضا میں جلوہ افروز ہوا۔ یعنی شعبان کی انتیسویں تاریخ اور جون ۱۸۱۹ء کی تیئیسویں تاریخ کو۔

(۱) محسن خاں نے اس کا نام رمضانی بتایا ہے۔

بارھواں باب:

رائے بریلی میں زندگی

چھبیس مہینے کی سرگرمیاں

رائے بریلی پہنچنے کے بعد سے حج کیلئے روانہ ہونے تک سید صاحب نے دو برس اور دو مہینے (شعبان ۱۲۳۴ھ کی آخری تاریخ سے شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ تک) اصلاحی اور تبلیغ سرگرمیوں میں گزارے، مثلاً:

۱۔ اطراف و جوانب میں دورے کئے۔

۲۔ ملت کے مختلف طبقوں اور افراد کی باہمی کشمکش کو مٹا کر ان کے درمیان محبت و یکجہتی کے تعلقات استوار کئے۔

۳۔ غیر مشروع معاشرتی رسوم اور بدعات و محدثات کو مٹایا۔

۴۔ رفیقوں اور ارادت مندوں کو جہاد کے لئے تیاری پر بہ طور خاص متوجہ کیا۔

۵۔ متفرق اصلاحی اور دینی کاموں کو پایۂ تکمیل پر پہنچایا۔

ان سرگرمیوں میں سے بعض کی تاریخیں معلوم ہیں، اکثر کا وقت متعین کرنے کے لئے کوئی قرینہ نہ مل سکا، لیکن یہ یقینی ہے کہ مندرجہ بالا تمام کام اسی چھبیس مہینے کی مدت میں انجام پائے، ہم انہیں مختلف ابواب میں بیان کریں گے۔

عام کیفیت

سید صاحب کے ساتھ بہ روایاتِ مختلف پچاس یا تہتر آدمی دہلی سے آئے تھے، پندرہ

سولہ آدمی گھر کے تھے، جن کا نان ونفقہ خود سید صاحب کے ذمے تھا، پھر بیعت کے لئے بہ کثرت آدمی آتے رہتے تھے، اور روزانہ کھانا کھانے والوں کا اوسط ایک سو سے کم نہ ہوگا۔ عین اسی زمانے میں قحط پڑ گیا اور غلہ بہت گراں ہو گیا۔(۱)

سید صاحب نہ کسی ریاست کے مالک تھے نہ جاگیردار تھے کہ اتنے آدمیوں کے کھانے کا بوجھ مستقل طور پر برداشت کر سکتے، تاہم وہ کبھی دل تنگ نہ ہوئے جو کچھ پکتا، سب کو برابر بٹھا کر کھلا دیتے۔

بعض اوقات عسرت اس حد تک پہنچ جاتی کہ مسجد اور گھر میں چراغ نہ جلتا، ارادت منداس حالت میں بھی بالکل مطمئن رہتے، نہ کبھی کسی کے صبر وشکر میں فرق آیا، نہ رضا بالقضاء کے ماتھے پر شکن پڑی، نہ لب حرفِ شکایت سے آلودہ ہوا۔ مولوی محمد یوسف صاحب تمام امور کے ناظم تھے، انہیں کے پاس روپے رہتے تھے، کبھی صرف اتنے ہی پیسے ہوتے کہ تھوڑے سے چنے خریدے جاسکیں، انہیں جوش دے کر اور نمک ڈال کر سب کو دو گھونٹ پلا دیتے۔

یہ صورتِ حالات اگرچہ اختیاری نہ تھی، لیکن مجھے یقین ہے کہ جماعتی تربیت کے لئے اس سے گذرنا ضروری تھا۔ سید صاحب نے جس منزل میں قدم رکھا تھا وہ کمال عزیمت کی منزل تھی۔ عزیمت کو پختہ و پائدار بنانے کی شکل یہی ہے کہ انسان تنگیوں، سختیوں اور مشکلوں کا حد درجہ خوگر ہو جائے اور راحت وآسایش سے اس کی طبیعت کو کوئی مناسبت نہ رہے۔ وہ پھولوں کو ٹھکرائے اور کانٹوں کو پیار کرے۔ وہ پانی سے دور بھاگے

(۱) مخزنِ احمدی ص: ۴۰۔ بعض سوانح نگاروں نے اسے ۱۸۶۱ء بکرمی کا قحط قرار دیا ہے، حالانکہ یہ قحط سترہ برس پہلے گذر چکا تھا، مجھے کسی ایسے قحط کا سراغ نہ مل سکا جو ۲۰-۱۸۱۹ء میں صوبجات متحدہ غرب وشمال کے بڑے حصے میں پھیلا ہو۔ ممکن ہے یہ مقامی قحط ہو، سید محمد علی صاحب مخزنِ احمدی "نے اسے" بلائے قحط غلائی بہ شدت" سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ غلہ روپے کا پانچ سیر ملتا تھا، اس مرحوم کو کیا معلوم تھا کہ ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے جب روپے کا پانچ سیر غلہ انتہائی فراخی کا نرخ بن جائے گا۔

اور آگ سے کھیلے۔ سختیاں اتفاقیہ پیش آ گئی تھیں لیکن سید صاحب اپنی جماعت کی تربیت کے لئے جس ماحول کے طلب گار تھے، وہ یہی تھا اور ہمیں یہ ماننے میں تامل نہ ہونا چاہئے کہ قدرت نے خود بخود اس کا انتظام کر دیا تھا۔

سید محمد علی کا واقعہ

سید محمد علی صاحبِ ''مخزنِ احمدی'' فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ دو دن تک ایک دانہ بھی حلق سے نہ اترا اور بارش کے تواتر کا یہ عالم، گویا آسمان کے تمام دریچے کھل گئے تھے۔ دور و نزدیک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ رات ہوئی تو میں بستر پر جا پڑا، بھوک کی حالت میں نیند کب آسکتی تھی؟ کروٹیں لیتے لیتے رات کا ایک حصہ گذر گیا۔ آخر میں بے قرار ہو کر اُٹھا اور مسجد میں پہنچا، جہاں سید صاحب اور ان کے رفیق ذکر و شغل میں مصروف تھے، میں نے پوچھا کہ دوستو! کیا حال ہے؟ شاہ اسماعیل بولے: آیئے آپ بھی تجلیٔ بے رنگی کا تماشا دیکھ لیجئے۔ سید صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر پہلو میں بٹھا لیا، مجلس کا حال دیکھا تو سب پر سرور و شادمانی طاری تھی، ہر فرد زمانے کے غم و اندوہ سے بالکل فارغ البال تھا۔

میں بے اختیار ہو کر رو پڑا، سید صاحب کا دامن پکڑ کر عرض کیا کہ گھر میں سب لوگ بھوک سے اس طرح بدحال ہیں کہ بیان نہیں کر سکتا۔ آپ تو صبر و تحمل کا پہاڑ ہیں اور ایسی مشقتیں بے تکلف برداشت کر سکتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کی ہمت و طاقت جواب دے رہی ہے، خدا کے لئے حقِ قرابت کو پیش نظر رکھتے ہوئے دعاء فرمایئے کہ بارش تھمے اور ہم سیہ نصیبوں کی قوتِ لایموت کا کچھ سروسامان بنے۔

سید صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''بھائیو! اس آشفتہ حال کیلئے دعاء کرو'' چنانچہ سب دعاء میں مشغول ہو گئے۔ ایک گھڑی نہ گذری تھی کہ بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ سید صاحب اور ان کے تمام رفیق روتے ہوئے سجدۂ شکر میں گر گئے۔

یَرْزُقُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبْ

تھوڑی دیر بعد سئی ندی کے پار سے دو آدمیوں کی آواز آئی کہ کشتی بھیجو، سید صاحب خود مسجد سے باہر نکلے اور پوچھا: آپ کون لوگ ہیں؟ معلوم ہوا کہ سید صاحب کے ایک مرید، سید یاسین نے جو توپ خانے میں داروغہ تھا، کچھ روپیہ بہ طور نذر بھیجا ہے۔ کشتی بھیجی گئی، وہ آدمی آئے روپیہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا، آپ نے پورا روپیہ سید محمد علی کو دے کر فرمایا کہ کھانے کا انتظام فرمائیے۔ چنانچہ چاول اور دال منگوا کر کھچڑی پکائی گئی اور سب نے کھالی۔ سید صاحب نے فرمایا:

> ماتمام عمر بہ رزاقیٔ رزاق مطلق خود نوعے اعتماد واعتقاد داریم کہ اگر در فیافی ریگستان سندھ یا بوادیٔ عرب کہ اصلاً مطلقاً آب ودانہ در آنجا مفقود است باجمیع ساکنانِ ہفت اقلیم منزل گزینیم، زیادہ از آبادانی درآں ویرانی بہ احسن وجوہ رزق موجود ومہیا خواہد گردید۔ (۱)
>
> **ترجمہ**: ہمیں اپنے رازقِ مطلق کی رزق رسانی پر اس درجہ اعتماد واعتقاد ہے کہ اگر سندھ کے ریگستانوں یا عرب کے بیابانوں میں بھی ہوں جہاں آب ودانہ کا ملنا ناپید ہے، اور ساتوں ولایتوں کے باشندے ہمارے ساتھ ہوں تو ان ویرانوں میں آبادیوں سے بڑھ کر رزق موجود ومہیا ہو جائیگا۔

اسی زمانے میں ایک مرتبہ کوڑا جہان آباد کے نواب نے پانسو روپے کی ہنڈی سید صاحب کی خدمت میں بھیجی۔

---

(۱) یہ ''مخزنِ احمدی'' کا بیان ہے۔ وقائع میں بھی یہ واقعہ درج ہے، صرف اتنے اختلاف کے ساتھ کہ شکایت سید محمد علی نے نہیں بلکہ سید عبدالرحمٰن نے کی تھی۔ میرے نزدیک ''مخزنِ احمدی'' کی روایت اس بارے میں ''وقائع'' کی روایت پر مرجح ہے۔

فراخیٔ رزق کی دعاء

ہم بتا چکے ہیں کہ سید علم اللہ شاہ عموماً دعاء کیا کرتے تھے کہ ان کے اخلاف کو زیادہ رزق نہ ملے۔ مقصود یہ تھا کہ وہ لوگ دنیاداری کے مکروہات میں مبتلا ہو کر ذکرِ خدا سے غافل نہ ہو جائیں۔ خاندان میں تنگیٔ رزق کو سید علم اللہ شاہ ہی کی دعاء کا نتیجہ سمجھا جاتا تھا۔

ایک روز خاندان والوں نے سید صاحب سے کہا کہ ہمارے لئے فراخیٔ رزق کی دعاء کیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ضرور دعاء کروں گا، لیکن شرط یہ ہے کہ تمام افراد میرے ساتھ پختہ عہد و پیمان کر لیں کہ وہ اہلِ ہند کی گمراہیوں اور بدعتوں سے ہمیشہ دور رہیں گے۔ اہلِ خاندان نے یہ عہد کر لیا، پھر سید صاحب سید علم اللہ شاہ کے مزار پر جا کر دیر تک مشغولِ دعاء رہے۔

سید صاحب عصر کے بعد عموماً باہر نکل جایا کرتے تھے، سئی ندی کے کنارے بیٹھ جاتے اور پاؤں ندی کے پانی میں لٹکا لیتے۔ ایک روز ایک شخص ننگی تلوار کھینچے ہوئے آیا، بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سید صاحب پر قاتلانہ حملے کی نیت سے آیا ہے۔ حاجی نور محمد نے اسے پکڑ لیا اور اس کا گلا اس زور سے دبایا کہ قریب تھا اس کا دم نکل جائے۔ بعض ارادت مند زدوکوب کے ارادے سے اس پر پل پڑے۔ سید صاحب نے سب کو روک دیا، چاہا کہ اسے چھوڑ دیں۔ پھر خیال آیا کہ ممکن ہے حاکم پکڑ کر سزا دے۔ آپ نے حاکم کے پاس پیغام بھیج دیا کہ اگر اس کا ارادہ برا بھی تھا تو میں نے اسے معاف کر دیا، آپ بھی معاف کر دیں۔ حاکم نے اسے دو روز حوالات میں رکھا پھر سید صاحب کے پاس بھیج دیا کہ آپ جو سزا چاہیں دیں۔ سید صاحب نے اس کے لئے باقاعدہ رسد مقرر کر دی۔ چند روز بعد اس نے رخصت چاہی تو اسے کچھ روپے دیے۔

عبادات

سید عبدالرحمٰن بیان کرتے ہیں کہ میں اس زمانے میں قرآن حفظ کر رہا تھا۔ حضرت

تہجد کے لئے اٹھتے تو میں بھی اُٹھ کر حفظ میں مشغول ہو جاتا۔ آپ نماز کے بعد دعاء میں مشغول ہو جاتے اور اکثر شوق انگیز شعر پڑھتے۔ زیادہ تر خواجہ حافظ کے شعر ہوتے، مرزا بیدل کا یہ شعر بھی بارہا سنا:

تو کریم مطلق و من گدا، چہ کنی جز ایں کہ بخوانیم
درِ دیگرے بنما کہ من بہ کجا روم چو برانیم

صبح کی اذان ہوتی تو مسجد میں تشریف لے جاتے۔ بعد نماز دن چڑھے تک آیات واحادیث کے بارے میں مذاکرات جاری رہتے۔

مراقبہ لوجہ اللہ

ایک روز میں سورۂ روم کا یہ رکوع یاد کر رہا تھا:

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ ٥ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً، اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ٥ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ، اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ٥ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ، اِنَّ فِىْ ذَالِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ٥ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَيُحْيٖ بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا، اِنَّ فِىْ ذَالِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ٥ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ثُمَّ اِذَا دَعَاكُمْ دَعْوَةً مِّنَ الْاَرْضِ اِذَآ اَنْتُمْ تَخْرُجُوْنَ ٥ وَلَهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ ٥ وَهُوَ الَّذِىْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ وَلَهُ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ٥

ترجمہ: اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر اب تم انسان ہو کر جا بجا پھیل رہے ہو۔ اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ اس نے تمہاری ہی جنس سے عورتیں پیدا کیں تا کہ ان کی طرف مائل ہو کر آرام حاصل کرو اور تمہارے درمیان مہربانی اور محبت پیدا کر دی۔ جو لوگ غور کرتے ہیں، ان کے لئے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ اور اسی کے نشانات میں سے ہے آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنا اور تمہاری زبانوں اور رنگوں کا جدا جدا ہونا، اہلِ دانش کے لئے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ اور اسی کے نشانات میں سے ہے تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کی تلاش کرنا۔ جو لوگ سنتے ہیں ان کے لئے ان (باتوں) میں (بہت سی) نشانیاں ہیں اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ تم کو خوف اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور آسمان سے مینہ برساتا ہے۔ پھر زمین کو اس کے مرجانے کے بعد زندہ (شاداب) کر دیتا ہے۔ عقل والوں کے لئے ان باتوں میں (بہت سی) نشانیاں ہیں۔ اور اسی کے نشانات میں سے ہے کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں، پھر جب تم کو زمین سے نکلنے کے لئے آواز دے گا تو سب نکل پڑو گے اور آسمانوں اور زمینوں میں سب اسی کے مملوک اور اسی کے فرماں بردار ہیں، اور وہی ہے جو خلقت کو پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے، پھر اسے دوبارہ پیدا کرے گا اور یہ اس کے لئے بہت آسان ہے۔ آسمانوں اور زمینوں میں اس کی شان نہایت بلند ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

صبح کی نماز کے بعد مجھ سے پوچھا کہ رات کیا پڑھ رہے تھے؟ میں نے رکوع سنایا تو مولانا عبدالحئیؒ اور شاہ اسماعیل سے فرمایا ''مراقبہ لوجہ اللہ'' کا مضمون یہی ہے۔

فرائضِ مصالحت

سید صاحب باہم جھگڑوں کشمکشوں کو ختم کرانے کی بہت کوششیں فرمایا کرتے

تھے۔ محسن خان کا بیان ہے کہ تکیہ شریفہ سے ایک کوس پر کنواں تھا، جو ٹھنڈا کنواں مشہور تھا۔ ایک روز فرمایا کہ روزہ اسی کنوئیں پر چل کر کھولیں گے، چنانچہ افطار کا مختصر سا سامان لے کر وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت خبر ملی کہ شہر میں فلاں فلاں کے درمیان لڑائی ہوگئی ہے اور اندیشہ ہے کہ یہ کہیں زیادہ نہ پھیل جائے۔ سید صاحب نے اسی وقت چار پانچ آدمیوں کو دوڑا دیا(۱) کہ جایئے اور لڑنے والوں میں صلح کرایئے، اگر وہ باز نہ رہیں تو کہئے کہ ہمیں مار ڈالئے۔ آپ بھائیوں کو تکلیف تو ضرور ہوگی۔ روزے سے ہو، گرمی کا موسم ہے، پیاس لگے گی، لیکن اس قسم کی مشقتیں برداشت کئے بغیر مراتبِ کمال پر پہنچنا میسر نہیں آسکتا۔ چنانچہ سب گئے اور لڑنے والوں میں صلح کرادی، سید صاحب اس پر بہت خوش ہوئے۔

سید صاحب جب تک باہر رہے باغوں میں آپ کا جو حصہ تھا وہ اقربا کھاتے رہے۔ مدت کے بعد رائے بریلی آئے تو اقربا نے باہم مشورہ کر کے آم کی پوری فصل آپ کے حوالے کردی، آپ نے تمام باغوں میں اپنے چوکیدار مقرر کئے۔ پھل پک گئے تو تڑوا کر سب کے سب عزیزوں میں بانٹ دیے۔

تعمیر مساجد

بعض عزیزوں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ سید اسحاق فرمایا کرتے تھے، خدا وسعت دے گا تو مسجد بلند خاں (واقع لوہانی پور رائے بریلی) از سر نو بنواؤں گا۔ سید صاحب نے اپنے مرحوم بھائی کی خواہش پوری کرنے کیلئے اس کی تعمیر شروع کرادی، بہت سی اینٹیں لوگوں نے بطور نذر پیش کردیں کچھ سید صاحب نے خود خریدیں، اسی طرح ایک مسجد محلہ شیخاں میں شروع کرادی، تین مہینے میں دونوں مسجدیں مکمل ہوگئیں تو دونوں میں اپنے خرچ سے امام مقرر کئے۔ ''مخزنِ احمدی'' میں ہے:

(۱) روایت میں محسن خاں، محمود خاں، ابراہیم خاں، امام خاں اور شیخ لطافت کے نام آئے ہیں۔

در تعمیر و عبادت خانہ کہ از خشتِ پختہ وگچ بود آں حضرت اکثر بہ اکثر رفقاء
در تحمیل خشت و آہک خود را معاف نمی داشتند، ہم چنیں جمالی وشہتیر وتختہ وغیرہ
لوازماتِ تعمیر ہیچ گونہ تقصیر نمے کردند۔(۱)

ان دونوں عبادت گاہوں کی تعمیر پکی اینٹوں اور چونے سے ہوئی، سید صاحب بھی اکثر اپنے رفیقوں کی طرح اینٹیں، چونا، کڑیاں، شہتیر اور تختے وغیرہ اٹھا کر معماروں کو دیا کرتے تھے۔

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

سید صاحب حلم کا پہاڑ تھے، قیام بریلی کے زمانے کا ایک واقعہ اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

پیر داد خاں، لوہانی پور کا ایک پٹھان تھا۔ ایک مرتبہ اس کی گائے سید صاحب کے باڑے میں گھس آئی، نگہبانوں نے گائے کو باڑے سے نکال کر دور تک بھگایا اور اتنا بھگایا کہ اس میں چلنے کی سکت نہ رہی۔ پیر داد خاں نے یہ سنا تو جوش میں آ گیا اور سید صاحب کے پاس پہنچ کر اس نے درشت لہجے میں شکایت کی۔ آپکو یہ واقعہ معلوم نہ تھا، جب پوری کیفیت سنی تو فرمایا نگہبانوں نے بہت برا کیا، میں انہیں منع کر دوں گا، گائے کو نقصان پہنچا تو اس سے بہتر گائے معاوضے میں دیدوں گا، بھائی صاحب! خفگی چھوڑ دیجئے۔

اس وقت سید صاحب کے پاس کچھ آدمی بیٹھے تھے، ایک نورس آم اور ایک خربوزہ آیا ہوا تھا آپ نے آم تو ایک اور صاحب کو دے دیا، خربوزہ پیر داد خاں کو دینا چاہا تو اس نے غصے میں انکار کر دیا۔

سید عبدالرحمٰن، جو اس حکایت کے راوی ہیں، کہتے ہیں کہ میں گھر گیا ہوا تھا واپس

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی نے لکھا ہے، تعمیر کے کاغذات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مسجدیں ۱۲۴۰ھ میں یعنی حج کے بعد اور ہجرت بغرضِ جہاد سے پیشتر تعمیر ہوئیں۔ (سیرت سید احمد شہید طبع چہارم ص:۱۵۲ حاشیہ)

آیا تو دیکھا کہ سید صاحب کے گھوڑوں کے خبر گیر غلام رسول رو رہے ہیں۔ میں نے پوچھا خاں صاحب کیا ہوا؟ انہوں نے سارا قصہ سنایا اور کہا کہ میں بے ادب پیر داد خاں کی سخت گوئی سن نہ سکا اور اسے جھڑک دینا چاہا، حضرت نے مجھے جھڑک کر پیچھے ہٹا دیا۔

اقربا کو تفہیم

شیخ امان اللہ جو اندرونِ قلعہ میں رہتے تھے، ایک بزرگ آدمی تھے انہوں نے بھی پیر داد خان کو سمجھایا، لیکن اس کا جوش فرو نہ ہوا۔ سید صاحب کے اہل خاندان میں سے سید علم الہدیٰ اور سید محی الدین کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہیں بھی پیر داد خاں کی درشت مزاجی پر بہت غصہ آیا، بولے ہم اس سے سمجھیں گے۔ سید صاحب نے یہ سنا تو فرمایا: چپ رہئے اسے کچھ نہ کہئے ایسا نہ ہو کہ وہ جمعہ اور جماعت چھوڑ دے۔ صبر کیجئے۔

سید عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ مجھے بھی جوش آ گیا اور جا کر سید صاحب سے عرض کیا کہ وہ مردک بے ادبی کر کے سلامت چلا گیا، میں ہوتا تو دیکھتا۔ آپ نے فرمایا: تو بچہ ہے، تجھے کیا معلوم۔ ایسا نہ ہو کہ تیری کسی حرکت کے باعث پیر داد خاں کا جمعہ اور جماعت فوت ہو جائے۔

گھر پہنچ کر معافی مانگی

پھر آپ نے معذرت کے لئے پیر داد خاں کے گھر جانے کا ارادہ کر لیا۔ آپ روزانہ اپنی ہمشیر سے ملنے کے لئے قلعے جایا کرتے تھے، کئی لوگ ساتھ ہوتے، آپ ہمشیر سے ملنے کے بعد لوہانی پور گئے اور پیر داد خاں کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ اس نے سید صاحب کو دیکھا تو اندر زنانے میں چلا گیا، آپ گھوڑے سے اتر کر دروازے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: خاں صاحب! آج تو خطا معاف کرائے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔ اس اثناء میں چند آدمی جمع ہو گئے، وہ پیر داد خاں کو ملامت کرتے ہوئے سید صاحب کے پاس

لائے، آپ نے معانقہ کیا، پھر کہا: خاں صاحب! خطا معاف کر دیجئے، اگر آپ کی گائے مرجاتی تو اس سے بہتر گائے خدمت میں پیش کرتا۔

پیر داد خاں کا معاملہ تو ختم ہو گیا، اس کے بھائی نور داد خاں نے سید صاحب کا حلم وانکسار اور پیر داد خاں کا کبر دیکھا تو اسی وقت بھائی سے علیحدگی اختیار کر لی، بولا: ایسے فرشتہ سیرت بزرگ کے ساتھ تکبر غضبِ الٰہی کا موجب ہے، نور داد خاں سید صاحب کا مرید ہو گیا، جہاد میں ساتھ رہا، بالا کوٹ کے معرکے میں دادِ شجاعت دے کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہوا۔

جہاد کے لئے تیاری

سید صاحب رائے بریلی پہنچے تھے تو آپ کی اور ارادت مندوں کی عام مشغولیت ذکر وفکر اور مراقبے کے سوا کچھ نہ تھی، اگرچہ وقتاً فوقتاً جہاد کا ذکر بھی آتا رہتا تھا۔ صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ رائے بریلی پہنچنے سے کچھ مدت بعد آپ نے حکم دے دیا تھا کہ تمام رفیق اور ارادت مند زیادہ وقت جنگی فنون کی مشق میں صرف کیا کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ رفقاء میں سے بعض کو اس حکم پر تعجب ہوا، اسلئے کہ ذکر وشغل کے عام طریقوں کو جنگی فنون کی مشق سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ چنانچہ مولوی عبد الرحیم کاندھلوی کے ذریعہ سے یہ معاملہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا، آپنے فرمایا:

> ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل ہمارے درپیش ہے، اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے، یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں ہے، اس واسطے کہ وہ کام یعنی علم سلوک اس کے (جہاد کے) تابع ہے، اگر کوئی تمام دن روزے رکھے، تمام رات زہد وریاضت میں بسر کرے یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو رنجک اُڑائے تا کہ مقابلۂ کفار میں بندوق

لگاتے وقت آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبہ کو ہرگز نہ پہنچے گا۔

مراقبوں کا صحیح وقت

مزید فرمایا:

اور وہ کام (سلوک) اس وقت کا ہے، جب اس کام (جہاد) سے فارغ البال ہو، اور اب جو پندرہ سولہ روز سے دوسرے انوار کی ترقی نماز یا مراقبہ میں زیادہ معلوم ہوتی ہے، وہ اسی کاروبار کے طفیل سے ہے۔ کوئی بھائی جہاد کی نیت سے تیر اندازی کرتا ہے، کوئی بندوق لگاتا ہے، کوئی پھری گدکا کھیلتا ہے، کوئی ڈنٹر پیلتا ہے۔ اگر ہم اس کی (یعنی سلوک کی) اس وقت تعلیم کریں تو ہمارے یہ بھائی لوگ کام سے جاتے رہیں۔

پھر مولوی محمد یوسف پھلتی سے مخاطب ہوئے:

یوسف جی! آپ اپنے ہی حال کا خیال کریں کہ گردن ڈالے عالم سکوت میں رہتے ہو، اسی طرح اور لوگ بھی، کوئی کمل اوڑھے مسجد کے کونے میں بیٹھا ہے، کوئی چادر لپیٹے حجرے میں گھسا ہوا ہے، کوئی جنگل میں جا کر مراقبہ کرتا ہے، کوئی ندی کے کنارے گڑھا کھود کر بیٹھ جاتا ہے۔ ان صاحبوں سے تو جہاد کا کام ہونا دشوار ہے۔ آپ ہمارے بھائیوں کو سمجھائیں کہ اب اسی کام (استعدادِ جہاد) میں دل لگائیں، ان کے واسطے بہتر یہی ہے، حاجی عبدالرحیم صاحب سے بھی مشورہ کر کے جواب دیجئے۔

اسلامیت کا حقیقی وظیفہ

اس ارشاد کا کوئی حصہ تشریح کا محتاج نہیں، اسلامیت کا وظیفہ کیا ہے، یہ کہ ہر حلقہ بگوش اسلام اپنے خالق و مالک کی راہِ رضا میں قائم و استوار رہے اور اس کے احکام و اوامر کو دنیا میں نافذ کرنے اور نافذ رکھنے کیلئے ہر وقت کوشاں نظر آئے۔ ذکر و سلوک کی

غایت اس کے سوا کیا تھی کہ لوگوں کے دلوں میں دینی امور و معاملات کی محبت اس طرح جم جائے جس طرح نگینہ خاتم میں جم جاتا ہے، تاکہ وہ مرضاتِ الٰہی کے تقاضے بہتر واحسن طریق پر پورے کرسکیں۔

عام لوگوں نے سلوک کا مقصد یہ سمجھ رکھا تھا کہ رات دن مراقبے میں بیٹھے بیٹھے انوارِ باطنی کے تماشے دیکھتے رہیں، حالانکہ دین کا نصب العین اعلائے کلمۃ الحق تھا، نہ کہ تماشا گری و تماشا بینی۔ جب اسلامیت کیلئے ہندوستان کی فضا حد درجہ تنگ ہو رہی تھی، اس موقع پر اصلی دینی کام یہی تھا کہ اس فضا کو اسلامیت کیلئے زیادہ کشادہ اور سازگار بنایا جاتا۔ یہی غرض مدنظر رکھتے ہوئے سید صاحب نے اپنے ارادت مندوں کو ذکر و مراقبہ سے ہٹا کر جہاد کی تیاری پر لگایا تاکہ عزمِ راسخ کے ساتھ اس کام کو پورا کرسکیں، جسے پورا کئے بغیر اس سرزمین میں اسلام آزاد نہیں رہ سکتا تھا۔

طبیب حاذق پہلے تنقیہ کرتا ہے، اس کے بعد اصل نسخہ دیتا ہے۔ سید صاحب نے بھی پہلے ارادت مندوں کے دل ذکر و مراقبہ میں استغراق کے ذریعے سے پاک کئے۔ جب اس طرف سے اطمینان ہوگیا تو اصل کام کے سرانجام میں انہیں لگایا، اور اسے ذکر و فکر، سیر و سلوک اور مراقبہ و توجہ سے بدرجہا افضل قرار دیا۔

باطنی ترقی کا بلند ترین مقام

ایک مرتبہ مولانا شاہ اسمٰعیل نے پرانے زمانے کے مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

> ہم پر بھی ایک زمانہ گذرا ہے کہ ہر ایک اللہ جل جلالہٗ کے ذکر میں مدہوش تھا، یہاں تک کہ کھانے اور لباس کا بھی کسی کو خیال نہ تھا اور نہ کسی اور شغل میں لذت محسوس ہوتی تھی۔

سید صاحب نے یہ سن کر فرمایا:

> وہ منزل پیچھے رہ گئی، اس وقت لطفِ الٰہی نے ہمیں اس جانب متوجہ کر

رکھا تھا، حالت یہ تھی کہ جو شخص سامنے آ کر بیٹھتا، مراتب باطنی میں آناً فاناً ترقی کرتا اور جو کیفیت دوسرے مقامات پر برسوں میں پیدا ہوئی ہے ہمارے حلقے میں گھڑیوں میں پیدا ہو جاتی تھی۔ اس کے بعد بالاتر مرتبے کے لئے ہم پر وعظ و نصیحت کے دروازے کھل گئے، سلسلہ تبلیغ بھی اعلیٰ مراتب پر پہنچا اور یہ حقیقت مخالف و موافق پر روشن ہے، اب ہمیں کفار کے ساتھ جہاد کا حکم دیا گیا ہے، جو (باطنی ترقی کا) سب سے اونچا پایہ ہے۔ یہ انبیائے اولوالعزم کا طریقہ اور اسوہ ہے۔ والحمد للّٰہ علیٰ ذالك۔(۱)

اس طرح سید صاحب نے نواب امیر خاں سے الگ ہونے کے بعد تنظیم کی جو اسکیم سوچی تھی، اسے تربیت کے ساتھ معرضِ عمل میں لے آئے۔

صراطِ مستقیم

''صراطِ مستقیم'' کی تسوید قیامِ دہلی ہی کے دوران میں شروع ہو گئی تھی، جس کے کچھ اجزا شاہ اسماعیل نے لکھے۔ باقی مولانا عبدالحئی نے مرتب کئے۔ سید صاحب مضمون بتا دیتے، شاہ صاحب یا مولانا اس مضمون کو اپنے لفظوں میں لکھتے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مطالب میں پانچ پانچ مرتبہ ترمیمیں کرنی پڑیں، مولانا یا شاہ صاحب جو کچھ لکھ کر لاتے سید صاحب اگر اسے درست نہ سمجھتے تو اسقام واضح کر دیتے، ان کے ارشادات کی روشنی میں بعض مطالب کئی کئی مرتبہ لکھنے پڑے۔ میرا احساس ہے کہ اس کتاب کی تکمیل رائے بریلی پہنچ کر ہوئی یا کم از کم رد و بدل کا سلسلہ خاصی دیر بعد تک جاری رہا۔

(۱) منظورہ ص:۷۰

تیرہواں باب:

نکاحِ بیوگان اور واقعۂ نصیر آباد

نکاحِ بیوگان

قیامِ وطن کی اس مہلت میں سید صاحب نے احیاءِ سنت کے جو ممتاز کارنامے انجام دیے ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے گھر سے نکاحِ بیوگان کا آغاز کیا۔

مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ میل جول میں جو معیوب اور سراسر غیر شرعی رسمیں اختیار کر لی تھیں، ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ کسی خاتون کا شوہر فوت ہو جاتا تو ضرورت کے باوجود دوسرا نکاح نہ کرتی اور ایسے نکاح کو نجابت وشرافت کے منافی سمجھا جاتا تھا، خصوصاً اونچے گھرانوں میں تو اس کا تصور بھی موجبِ ننگ تھا۔

اکبر و جہانگیر کے زمانے تک مسلمانوں میں یہ بری رسم نہیں آئی تھا، خود اکبر نے بیرم خاں کی بیوہ سلیمہ سلطان بیگم سے نکاح کیا، جو بادشاہ کی عمہ زاد بہن تھی اور سلیمہ سلطان بیگم زندگی کے آخری سانس تک شاہی محل کی ممتاز ترین ہستی سمجھی جاتی رہی۔ جہانگیر نے نور جہاں بیگم سے بہ حالتِ بیوگی ہی شادی کی تھی، اور اس وقت بیگم کی عمر کم وبیش چونتیس برس کی تھی، بعد میں حالت بدل گئی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ جو ہندو اسلام کے حلقہ بگوش بنے، وہ اپنی بعض پرانی رسموں پر اہتمام سے قائم رہے اور ان میں سے ایک رسم یہ بھی تھی کہ بیوہ عورتوں کے نکاحِ ثانی کو بری نظروں سے دیکھا جاتا تھا، آہستہ آہستہ ان خاندانوں میں بھی یہ رسم پھیل گئی جو ظہورِ اسلام کے وقت سے مسلمان چلے آتے تھے۔

سید صاحب کے منجھلے بھائی سید اسحاق صاحب کی بیوہ جوان تھی، اس کا صرف ایک

بچہ تھا، سید اسماعیل، جس کی عمر بہ مشکل چھ سات برس کی ہوگی۔ سید صاحب نکاحِ بیوگان کا اجرا چاہتے تھے، احیاءِ سنت اور تجدید شیوۂ اسلامیت کے سلسلے میں وعظ و تبلیغ سے کہیں بڑھ کر فائدہ عملی اقدام سے پہنچ سکتا تھا، اس بنا پر خود اپنی بیوہ بھاوج سے نکاح کے لئے تیار ہو گئے۔

دنیوی رشتے اور علاقۂ عبودیت

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز مولانا عبدالحئی نے وعظ میں اس آیت کی تفسیر فرمائی:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ.

> نہ پاؤ گے تم ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں اللہ اور یومِ آخرت پر، کہ وہ محبت کریں اللہ اور اس کے رسول کے مخالفوں سے، اگرچہ وہ ان کے باپ ہوں یا بیٹے ہوں یا بھائی ہوں یا کنبے والے ہوں۔

اس سلسلے میں مولانا نے علم و مشیخت کے تمام ممتاز خاندانوں کے اعمال کو شریعت کی ترازو میں رکھ کر تولنا شروع کیا اور ایک ایک کی کمزوریاں کھول کھول کر بیان کر دیں، یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ اور سید علم اللہ کے خانوادوں کی خلافِ شرع باتوں کو بھی بے باکانہ واضح فرما دیا۔ سید صاحب بے تاب ہو کر اپنی جگہ سے اُٹھے، دو زانو مولانا کے سامنے بیٹھ گئے اور فرمایا:

> میں خدا کا بندہ اور اس کے رسولِ پاک کا فرماں بردار ہوں، اس سے پہلے سہارنپور میں بھی میں نے مولانا سے کہا تھا کہ میں خدا اور اس کے رسولؐ برحق کی اطاعت میں عزیزوں، رشتہ داروں اور امیر و غریب کسی کا پاس نہ کروں گا، کسی کی خوشی و ناخوشی کو خاطر میں نہ لاؤں گا۔ اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب (سید صاحب کے برادرِ اکبر سید ابراہیم کا فرزند) عزیز ہے، دنیا کی

چیزوں میں سے وہ جو چاہے لے لے، لیکن اللہ اور اس کے رسولؐ کے احکام بجالانے میں اس کی رعایت بھی نہ کروں گا۔ میرے تمام رشتے دار صاف صاف سن لیں کہ جو اللہ اور رسولؐ کی فرمانبرداری میں میرے شریک حال ہوں، حکموں کو پورا کرنے اور منع کی ہوئی باتوں سے دور رہنے میں کسی کے طعن وملامت کا خیال تک دل میں نہ لائیں، وہ میرے عزیز ہیں اور مجھے محبوب ہیں۔ اور جو اس کے لئے تیار نہ ہوں، ان کو میری طرف سے جواب ہے، اور مجھے ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ صاف کہتا ہوں جو اللہ کی راہ میں مستعد ہو وہی میرا ساتھی ہوگا، جسے یہ منظور نہ ہو وہ مجھ سے الگ ہو جائے۔(۱)

یہ سن کر مولانا عبدالحئی بولے: حضرت ہمیں آپ سے ایسی ہی امید تھی، اور اسی لئے ہم نے دوسرے مشائخ سے کنارہ کش ہو کر آپ کا دامنِ ہدایت تھاما۔

ایک خواب

اسی زمانے میں سید صاحب نے ایک خواب دیکھا کہ لکڑیوں کا ایک بھاری گٹھا پڑا ہے، اکثر لوگ اسے اٹھانے کا ارادہ کرتے ہیں لیکن گٹھا اتنا گراں بار ہے کہ اسے اٹھا نہیں سکتے۔ وہیں آپ کی بھاوج (اہلیہ سید اسحاق) بھی موجود ہیں آپ نے ان سے بہ کمال

(۱) سید صاحب کے ارشادات کا جو مکتوب ذخیرہ ہمارے پاس پہنچا ہے، اس میں یہ مضمون کئی مرتبہ آیا ہے، مثلاً جب آپ جہاد کے لئے سرحد پہنچ چکے تھے تو ازواج سندھ میں تھیں، (ان کے ساتھ دوسرے متعلقین کے علاوہ سیدہ زہرہ بی بی کی والدہ وجدہ مادری سیدہ سارہ) بھی تھیں۔ ایک مرتبہ سید صاحب کو علم ہوا کہ وہ گھر واپس جانا چاہتی ہیں تو بے توقف انہیں کہا کہ ان وساوس کو دل میں جگہ نہ دیجئے اور رضائے باری تعالیٰ کے خلاف ہرگز قدم نہ اٹھایئے۔ آخر میں فرمایا:

بر ضمیر منیر آشکار است کہ ایں بندہ ضعیف را آنچہ علاقہ باخورداں و بزرگاں می باشد، محض للہ فی اللہ می باشد۔ پس اگر احدے از خورداں و بزرگاں مخالفت خدا را لازم می گیرد، پس علاقہ او از دل اخلاص منزل ہم بدو می رود۔

(آپ پر واضح ہے کہ مجھے خاندان کے چھوٹوں یا بڑوں سے جو تعلق ہے صرف خدا کے لئے ہے اگر ان میں سے کوئی احکامِ خدا کے خلاف قدم اٹھائے گا، تو میرے دل میں اس کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہے گی)۔

الحاح وتملق کہا کہ آؤ ہم تم اس پشتارے کو اُٹھا کر گھر لے چلیں، جلانے کے کام آئے گا، انہوں نے بھی اسے بھاری جان کر انکار کیا، جب آپ نے نہایت خوشامد سے کئی بار بہ تکرار کہا تو وہ راضی ہوئیں، پھر آپ اور وہ دونوں مل کر اٹھا لے گئے۔(۱)

سید صاحب کا معمول تھا کہ نمازِ صبح کے بعد مراقبہ کیا کرتے تھے۔ جس رات خواب دیکھا، اس کی صبح کی نماز کے بعد شاہ اسمٰعیل اور مولانا عبدالحئی کو خواب سنایا اور کہا اس کی تعبیر پر غور کیجئے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ ہی بیان فرمائیں، آپ نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر کہا: خداوند تعالیٰ کے بعض حکم ایسے ہیں کہ لوگ انہیں بجالانا عار و ننگ جانتے ہیں، خصوصاً ہندوستان کے شرفاء و نجباء میں سے جو کوئی ان حکموں کو بجالاتا ہے، اسے مطعون کرتے ہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک امر بیوہ عورت کے نکاحِ ثانی کا ہے۔

زندگی دو قسم کی ہے: روحانی اور جسمانی، دنیاوی طعام جسمانی زندگی میں معاون ہے، روحانی طعام حیاتِ روحانی وحیاتِ اخروی کا سبب ہے۔ ایندھن کھانے پکانے کے کام آتا ہے، معلوم ہوتا ہے اس خواب کا تعلق جسمانی اور اہلی زندگی سے ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں اور میری بھاوج اپنی زندگی کے سلسلے میں بیوہ کے نکاحِ ثانی کو از سرِ نو جاری کریں گے اور رواجِ عام دیں گے۔ میں پہلے اپنے گھر میں سنت کو جاری کروں گا، پھر اوروں کو حکم دوں گا، تاکہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ کی وعید میں داخل نہ ہو جاؤں (یعنی کیا تم دوسرے لوگوں کو نیک کاموں کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلائے بیٹھے ہو؟)

اقرباء کے سامنے وعظ

چنانچہ آپ گھر تشریف لے گئے اور تمام رشتہ دار خواتین کو جمع کر کے وعظ فرمایا۔ اس

(۱) وقائع ص:۱۸۵

میں کہا:

اسلام یہ نہیں کہ انسان زبان سے کہے میں مسلمان ہوں یا گائے کا گوشت کھالے اور ختنہ کرالے ، یا مسلمانوں کی مروجہ رسموں میں شریک رہے۔ اسلام یہ ہے کہ تمام احکامِ الٰہی کی تعمیل دل وجان سے کی جائے ، یہاں تک کہ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی طرح ذبح فرزند کا بھی اشارہ ہوتو اسے خوشی خوشی بجالائے۔ منہیاتِ شرعی کا خیال بھی دل میں آئے تو چالیس روز تک استغفار کرے۔

انہیں احکام میں سے بیوہ کا نکاحِ ثانی بھی ہے، خصوصاً وہ بیوہ جو جوان ہو۔ افسوس کہ اس زمانے میں بیوہ کے نکاحِ ثانی کو شرک اور کفر کے برابر سمجھ لیا گیا ہے، اس پر عمل پیرائی کو نہایت درجہ قبیح و شنیع تصور کیا جاتا ہے۔ جو بیوہ نکاح کرلے اسے بہت نازیبا الفاظ سے مطعون کیا جاتا ہے، یہ کوئی نہیں سوچتا کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے، یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن، حضرت عائشہؓ کے سوا سب بیوہ تھیں۔

دوسرے روز پھر اسی مضمون کا وعظ فرمایا، ساتھ ہی اپنی خالہ صاحبہ سے (جو سیدہ ولیہ (۱) بیوہ سید اسحاق کی پھوپھی تھیں) کہا ہماری بھاوج کو جس طور سے ہوسکے، سمجھا کر راضی کیجئے کہ ہم سے نکاح کرلیں۔ یہ امر واسطے حظِ نفس کے نہیں چاہتا بلکہ محض ترویج سنت حضرت خیر الانامؐ مطلوب ہے۔

میرے گھر میں حسین وجمیل اور باعفت خاتون موجود ہے، میری خواہش صرف یہ ہے کہ اس سنت کا احیاء میرے گھر سے ہو۔

---

(۱) سیدہ ولیہ سید ابواللیث کی صاحبزادی تھیں، جو سید صاحب کے حقیقی ماموں تھے۔ ان کی چار بہنیں تھیں (یعنی بنات شاہ ابوسعید جد مادری سید صاحب) خیر النساء اہلیہ سید محمد مستقیم بن سید محمد معین، صالحہ ومریم جو یکے بعد دیگرے سید محمد ولی سے بیاہی گئیں، بی بی ناجیہ والدہ سید صاحب، صالحہ کا انتقال غالباً پہلے ہو چکا تھا، سیدہ ناجیہ بھی فوت ہو چکی تھیں۔ معلوم نہیں خیر النساء اور مریم میں سے سید صاحب نے کونسی خالہ کے ذمے یہ کام لگایا۔

نکاح

سیدہ ولیہ ابتدا میں نکاحِ ثانی پر راضی نہ تھیں، سب عزیزوں کے اصرار اور سعی وکوشش کے بعد بہ نیتِ احیائے سنت راضی ہوئیں۔(۱) لیکن معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب سے اقرار لے لیا تھا کہ کوئی اور نکاح ان سے اجازت لئے بغیر نہ کیا جائے گا، چنانچہ جب سرحد میں سید صاحب کو نکاحِ ثالث کی ضرورت پیش آئی تو اسے سیدہ ولیہ سے اجازت پر موقوف رکھا تھا۔اور جب تک مکتوب کے ذریعے سے اجازت نہ آگئی، نکاح نہ کیا۔

غرض سیدہ ولیہ نکاح پر راضی ہوگئیں، ایک روز جانبین کی طرف سے خفیہ ایجاب وقبول ہوا، پھر نکاح کا اعلان کیا گیا۔سید صاحب اس واقعہ کو زیادہ سے زیادہ مستحسن شکل میں عام لوگوں کے سامنے پیش کرنے کے اس درجہ مشتاق تھے کہ سیدہ ولیہ سے کہا اپنے نکاحِ ثانی کی شیرینی اپنے ہاتھ سے تقسیم کیجئے اور سب سے بے تکلف کہئے کہ یہ میری نکاحِ ثانی کی شیرینی ہے، تاکہ خواتین کے دل سے اس بارے میں تنفر کی کدورت زائل ہوجائے اور وہ یقین کرلیں کہ یہ فعل عین سنت کے مطابق ہے، اس لئے اسے قابلِ عزت وستائش سمجھنا چاہئے۔

اعلانِ عام اور اثرات ونتائج

نکاح کے تمام مراحل طے ہوچکے تو سید صاحب نے دہلی، پھلت، رام پور اور تمام دوسرے مرکزی مقامات پر خط بھجوائے تاکہ لوگوں میں اس فعلِ حسن کی خوب اشاعت ہو۔(۲) شاہ اسماعیل نے ان خطوط کے مسودے مرتب کئے، نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف مقامات

(۱) ''وقائع احمدیہ'' میں ہے کہ انہیں راضی کرنے میں کئی مہینے لگ گئے۔(ص:۱۸۶)

(۲) سید صاحب نے نکاحِ بیوگان کے متعلق ایک رسالہ بھی لکھوایا تھا، جو فارسی زبان میں تھا، اس کی ایک نقل میرے پاس موجود ہے۔

کے شرفاء نے بہ طوع و رغبت بیوہ خواتین کے نکاح کیے۔ اصل مسئلہ صرف ضرورت اور خواہش تک محدود تھا، لیکن چونکہ اس کی بندش کو معیارِ شرافت بنالیا گیا تھا، اس لئے بعض اولالعزم اصحاب نے بندش کو محو کرنے اور اصل سنت کو رواجِ عام دینے کے شوق میں ضرورت کے بغیر بھی بیوہ خواتین کے نکاح کر دیے، آخر قسم کی ایک مثال شاہ اسماعیل کی ہمشیر بی بی رقیہ کا نکاح تھا۔

بی بی رقیہ شاہ اسماعیل سے بڑی تھیں، ان کی عمر پچاس سے اوپر ہو چکی تھی، وہ شیخ ولی محمد پھلتی کے چچا شیخ کمال الدین سے بیاہی گئی تھیں۔(۱) غالباً جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھیں، اگرچہ حدِ یاس کو پہنچ چکی تھیں اور انہیں نکاح کی ضرورت نہیں رہی تھی، لیکن شاہ اسماعیل کو احیاءِ سنت کے ثواب میں شریک ہونے کا اتنا شوق اور ایسا ولولہ تھا کہ بہن کو راضی کیا اور مولانا عبدالحئی سے ان کا نکاح کر دیا۔(۲)

نصیر آباد

نکاحِ ثانی کے علاوہ دوسرا قابلِ ذکر واقعہ نصیر آباد کا ہے، جو غالباً ۱۲۳۵ھ (اکتوبر ۱۸۱۹ء) میں پیش آیا۔ یہ قصبہ قاضی سید محمود کے زمانہ سے سید صاحب کے اجداد کا وطن چلا آتا تھا، آپ کے بیشتر اقربا وہیں رہتے تھے۔ اہلیہ اولیٰ سیدہ زہرہ بھی نصیر آبادی کی تھیں، پہلے وہاں کے تمام لوگ سنی تھے، لیکن جب اودھ برہان الملک کی جاگیر میں آیا تو والیٔ ملک کے مذہبی عقائد کا اثر آہستہ آہستہ عام لوگوں پر بھی پڑنے لگا۔ ۱۱۶۶ھ میں نصیر آباد

(۱) بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ بی بی رقیہ کا نکاح شاہ رفیع الدین کے بڑے صاحبزادے مصطفیٰ سے ہوا تھا۔ ارواحِ ثلاثہ میں اس صاحبزادے کا نام عبدالرحمٰن مرقوم ہے، میرے نزدیک صحیح بیان وہی ہے جو متن میں درج ہے، شیخ کمال الدین بی بی رقیہ کے حقیقی ماموں کے بیٹے تھے۔

(۲) یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ سیدہ ولیہ کے نکاحِ ثانی پر اس زمانے میں ایک تعریض آمیز نظم بھی لکھی گئی تھی، میں اس کے شعر مثالاً بھی یہاں درج نہیں کر سکتا۔

میں مولانا سید دلدار علی پیدا ہوئے جو آخری دور کے جلیل القدر مجتہد مانے گئے، شیعہ حضرات انہیں عام طور پر ''غفران مآب'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔(۱) ان کے اثر ورسوخ اور وعظ و تلقین کے سبب سے اکثر گھرانوں نے شیعی عقائد قبول کر لئے۔سید صاحب کے زمانہ میں نصیر آباد کے چار محلوں میں سے تین شیعہ ہو چکے تھے، اور صرف ایک محلہ سنیوں کا رہ گیا تھا، انتظامی اعتبار سے نصیر آباد سلون کے پرگنے میں شامل تھا اور سلون بادشاہ بیگم کی جاگیر میں تھا، جو بڑی سخت گیر خاتون تھیں۔(۲)

شیعہ سنی اختلاف

دین کی حقیقی روح مضمحل ہو جاتی ہے تو لوگوں میں تنگ نظری اور ناروا داری بہت بڑھ جاتی ہے۔اصول ومبانی میں موافقت پر نظر رکھنے کے بجائے فروع وجزئیات میں اختلاف کو زیادہ اہم بنا لیا جاتا ہے۔شیعہ اور سنی حضرات کے درمیان بھی غلط تعصّبات کی بناء پر اختلاف کی خلیج حائل ہو گئی تھی۔کہتے ہیں کہ مولانا سید دلدار علی صاحب کی امداد کے بھروسے پر نصیر آباد کے شیعہ حضرات نے سنیوں کو تنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور غور ومشورہ

(۱) مولانا سید دلدار علی مجتہد ۱۹ر رجب ۱۲۳۵ھ (۲ر مئی ۱۸۲۰ء) کو فوت ہوئے۔قطعہ وفات کا آخری شعر یہ ہے:

سروش غیب ہماں وقت ناگہاں فرمود ستونِ دیں بہ زمین اوفتاد واویلا

سید انشا نے انہیں کو ایک موقع پر عروسِ سلطنت کا جھومر کہا تھا، ان کے پانچ فرزند تھے، سید محمد، سید علی، سید حسین، سید مہدی اور سید حسین، یہ سب وقت کے نامور عالم تھے۔

(۲) بادشاہ بیگم سے مراد غازی الدین حیدر شاہ اودھ کی بیگم ہے، جو مبشر خاں منجم کی بیٹی تھی، مبشر خاں شرف خاں کا فرزند اور خیر اللہ خاں رصد بند محمد شاہی کا شاگرد تھا۔غازی الدین حیدر شہزادگی میں بیگم کے حسن وجمال پر فریفتہ ہو گیا، سعادت علی خاں نے یہ شادی منظور کر لی بعد میں غازی الدین حیدر بیگم کی ایک خواص ''صبح دولت'' پر مائل ہو گیا، جس سے نصیر الدین حیدر پیدا ہوا۔بادشاہ بیگم نے صبح دولت کو مروا دیا، وہ بڑی مغلوب الغضب، خود رائے اور خود سر تھی۔ غازی الدین حیدر اس سے بہت خوفزدہ رہتا تھا، جب معتمد الدولہ آغا میر کو اقتدار حاصل ہوا تو بیگم نے اس کی مخالفت شروع کر دی، اس وجہ سے آغا میر نے اپنی بھلائی اسی میں جانی کہ بادشاہ اور بیگم کے تعلقات زیادہ سے زیادہ بگڑ جائیں۔میر فضل علی جو بعد میں اعتماد الدولہ کے لقب سے نائب السلطنت بنا، بیگم کا معتمد علیہ کارندہ تھا۔

کے بعد فیصلہ کیا کہ محرم کی آٹھویں تاریخ کو ایک جلوس نکالا جائے، جس کے شرکاء تبرا کہتے ہوئے سنیوں کے محلے سے گذریں، اگر وہ خاموش رہیں اور مرعوب ہو جائیں تو انہیں مزید دبانے کیلئے دوسرے اقدامات کی تجویزیں سوچی جائیں، اگر بگڑیں اور روکنا چاہیں تو انہیں بری طرح مارا جائے۔

چونکہ مجتہد صاحب کو حکومت میں بے حد اثر ورسوخ حاصل تھا اور وہ شیعہ حضرات کے ہم عقیدہ وہم وطن تھے، اس بناء پر کسی کو خفیف سا اندیشہ بھی نہ تھا کہ سنیوں کی فریاد درخورِ سماعت متصور ہوگی۔

سنیوں کی امداد طلبی

سنیوں کو اپنے شیعہ بھائیوں کی ان اسکیموں کا علم ہوا تو انہوں نے دب جانا گوارا نہ کیا، چونکہ تعداد میں بہت کم تھے، اس لئے اپنے سنّی عزیزوں اور ہمسایوں سے امداد کے طلب گار ہوئے۔ ۶ محرم کو نصیر آباد سے قاصد رائے بریلی پہنچا، جس نے سارے حالات سنائے۔ سید عبد الرحمٰن فرماتے ہیں کہ سید صاحب مسجد میں بیٹھے تھے، آپ نے مختلف اصحاب سے مشورہ کیا، بعض نے کہا کہ اپنے عزیزوں کو ہر ممکن مدد دینی چاہئے، بعض نے یہ رائے ظاہر کی کہ اس طرح حکومتِ وقت سے مقابلے کی صورت پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے، اس لئے مدد سے احتراز کرنا چاہئے۔

سید صاحب نے خود غور وفکر کے بعد فیصلہ کیا کہ ایک جماعت کو ساتھ لے کر نصیر آباد جائیں اور مصالحت سے اس فتنے کا سدِ باب کر دیں۔ جو گروہ شرارت سے باز نہ آئے اسے ہر ممکن سعی سے روکیں اور مظلوم کو ظالم کی دستبرد سے بچائیں۔ چنانچہ سید عبد الرحمٰن کو فوراً نصیر آباد بھیج دیا کہ سنی بھائیوں اور عزیزوں کو تسلی دیں، ۸ محرم تک ہم بھی پہنچ جائیں گے۔

غرض سید عبد الرحمٰن فوراً چلے گئے، ان سے پہلے وہاں کل اٹھائیس سنی مرد تھے، ان کو شامل کر کے انتیس مرد ہو گئے۔

سید صاحب کے انتظامات

سید صاحب نے روانگی کی تیاری کی تو اور لوگ خود بخود ساتھ جانے کے لئے تیار ہوگئے، آپ نے گھر سے روپے منگوا بھیجے، لیکن نقد ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ زہرہ بی بی نے اپنے پاؤں کا زیور اتار کر دیدیا کہ اسے فروخت کر کے خرچ چلایا جائے۔ سیدہ ولیہ (زوجہ ثانیہ) کو علم ہوا تو فوراً پچیس روپے آپ کے پاس بھجوادیے اور کہا کہ سیدہ زہرہ کا زیور واپس کردیا جائے۔

آپ عصر کے وقت دائرے سے روانہ ہوئے، مغرب کی نماز جہان آباد کے قبرستان میں ادا کی، عشاء کی نماز پڑھ کر چلے اور اسی شب کو نصیر آباد پہنچ گئے۔ پچھتّر آدمی ساتھ تھے، رات تالاب کے کنارے گزاری، صبح کی نماز کے بعد شہر میں داخل ہوئے۔ آپ کی ایک ہمشیر کی شادی نصیر آباد میں ہوئی تھی، پہلے اس کے مکان پر گئے پھر اہلیہ اولیٰ کے والدین سے ملے، بعدازاں جامع مسجد جا کر دوگانہ ادا کیا اور وہیں بیٹھ گئے۔ (۱)

تمام ہمراہیوں کو تاکید فرمادی تھی کہ کسی پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے اور دائرۂ اعتدال سے باہر قدم نہ رکھا جائے۔ مخالفوں میں سے اگر کوئی شخص زیادتی کر بیٹھے تو جواباً بھی مجادلے کی صورت پیدا نہ کی جائے۔ شیعہ حضرات کو پیغام بھیج دیا کہ ہمارے لوگ آپ کی طرف ہرگز نہیں آئیں گے، آپ خوشی سے تعزیہ داری کریں، کوئی مزاحم نہ ہوگا، مگر سابقہ دستور قائم رکھا جائے، یہی امر بنیادِ مصالحت بن سکتا ہے، کوئی نئی بات نہ کی جائے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ محلے میں مورچہ بندی کے انتظامات کر لئے گئے تھے تاکہ اگر ان پر اچانک حملہ ہوجائے تو روک تھام کی جاسکے۔ سید عبدالرحمٰن کو قرابین دے کر ایک مکان پر بٹھادیا گیا تھا، اور حکم تھا کہ خدانخواستہ حملہ ہوا تو پہلے قرابین

(۱) ''وقائع'' میں ہے کہ دیوان جی کی مسجد کے چبوترے پر تشریف فرما ہوئے۔

چلائی جائے، پھر بندوقیں استعمال کی جائیں۔

سعیٔ مصالحت

جب ذرا اطمینان ہوگیا تو شیعہ حضرات میں سے ایک معتبر و سر برآوردہ بزرگ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہم یہاں بہ طور مہمان آئے ہیں، برادر پروری کا تقاضا یہ ہے کہ ہر محلے میں سے ایک ایک بزرگ ملاقات کیلئے تشریف لائیں، اگر آپ کو تشریف آوری میں تأمل ہو تو ہمیں حاضر خدمت ہونے کی اجازت دی جائے۔ پیغام میں یہ بات بھی واضح فرمادی کہ اگر شیعہ حضرات کے نزدیک حضرات شہدائے کربلا کے ماتم وعزا کا حق اسی طریق پر ادا ہوسکتا ہے کہ وہ تمام محلوں میں جلوس لے کر پھریں تو اس پر بھی اعتراض نہ ہوگا، شوق سے پھریں، لیکن تبرا نہ کہیں۔

شیعہ حضرات سید صاحب کی آمد ہی کے باعث سخت رنجیدہ ہو چکے تھے، انہوں نے کہلا بھیجا کہ ہمیں جبراً تعزیہ داری سے روکا جا رہا ہے۔ اب ہم تعزیوں اور علموں کے ساتھ لکھنؤ جائیں گے اور حاکمِ وقت کے پاس فریاد کریں گے۔

یہ محرم کی آٹھویں تاریخ کے واقعات ہیں، چنانچہ شیعہ حضرات تعزیے اور جلوس لے کر لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ دو ہی منزل گئے ہوں گے کہ جائس کے پرچہ نویس نے سارے حالات تفصیل سے لکھ کر غازی الدین حیدر کے پاس بھیج دیے۔ شاہ نے وہ تحریر آغا میر نائب السلطنت کے حوالے کردی۔

کارسازِ ما بہ فکرِ کارِ ما

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، نصیر آباد سلون کے پرگنے میں تھا اور یہ پرگنہ بادشاہ بیگم کی جاگیر تھا، بیگم اور آغا میر نائب السلطنت کے درمیان شدید دشمنی تھی، نائب السلطنت چاہتا تھا کہ موقع ملے تو بیگم کے منتظموں پر فتنہ وفساد کا الزام عائد کر کے جاگیر ضبط

کرلے۔ اسے اپنا مقصد پورا کرنے کا یہ خداداد موقع مل گیا تو فوراً فقیر محمد خاں رسالدار کو بلایا، جو سید صاحب کا مخلص مرید تھا اور کہا کہ اپنے اور محمود خاں کے رسالے کا ایک ایک دستہ بے تاخیر نصیر آباد بھیج دو، سب کے سرعسکر کو بارہ ہزار روپے دو اور کہو کہ موقع پر پہنچتے ہی اس قضیے کو جلد سے جلد ختم کرا دیا جائے۔(۱)

انسدادِ فساد کے یہ خدا ساز اسباب تھے جو اچانک فراہم ہوگئے، اس اثناء میں نصیر آباد کے شیعہ حضرات لکھنؤ پہنچ گئے اور شکایت کی کہ سید احمد نے ہمیں علم اٹھانے سے روک دیا ہے، لیکن چونکہ صحیح حالات پہلے معلوم ہو چکے تھے، اور آغا میر بیگم کو شکست دینے پر تلا بیٹھا تھا، اس لئے اس نے شیعوں کی شکایت پر کوئی توجہ نہ کی۔

سید دلدار علی کی سعی

ایک روایت ہے کہ مولانا سید دلدار علی مجتہد خود آغا میر کے پاس پہنچے اور اس سے مدد چاہی۔ آغا میر نے کہا:

> حضرت آپ تشریف لے جائیں اور اپنے دولت کدے میں آرام سے بیٹھے رہیں، فتنے کی جو آگ آپ کی وجہ سے بھڑکی ہے اس کے شعلے آسمان تک پہنچ رہے ہیں، اگر اس کے اشتعال سے میں اور میرے آقائے محترم محفوظ رہیں اور ریاست کو کوئی گزند نہ پہنچے تو باقی عمر اس نعمت الٰہی کے شکر و سپاس میں بسر کردوں گا۔(۲)

آخر سید دلدار علی نے بھی شیعوں کو کہلا بھیجا کہ حالات بگڑ گئے ہیں، جس طور پر بھی

(۱) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالدار فقیر محمد خاں کو پہلے ہی تمام واقعات معلوم ہو چکے تھے، اس نے معتمد الدولہ آغا میر سے ذکر کیا، آغا میر نے یہ قصہ بادشاہ تک پہنچایا تو بادشاہ نے انسدادِ فساد کے سارے اختیارات آغا میر کو سونپ دیے۔ اس کے بعد آغا میر نے پانسو سوار نصیر آباد بھیجے۔

(۲) ''مخزنِ احمدی'' ص:۵۱

ممکن ہو، صلح کر لینی چاہئے۔

اس اثناء میں یہ خبر باہر پہنچی تو اردگرد کے سنی حضرات جوق در جوق نصیر آباد پہنچنے لگے۔ سید صاحب نے سارے لوگوں کے خورد ونوش کا انتظام اپنے ذمے لے رکھا تھا، کم وبیش پانسو آدمی دو وقت کھانا کھاتے تھے۔ آخر آپ کو اعلان کرنا پڑا کہ اب کوئی بھائی آنے کی تکلیف نہ کریں۔

مصالحت

سرکاری رسالہ نصیر آباد پہنچا تو اس کے سر عسکر نے شیعہ اور سنی حضرات میں سے معتبر آدمی بلائے، سارے حالات سنے، پھر دونوں فریقوں کے درمیان ایک معاہدہ کرایا جسکے مطابق طے ہوا کہ دیرینہ دستور و معمول کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے، آئندہ کوئی گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی نہ کرے۔ محرم اور چہلم کے موقع پر علی الاعلان تبرا نہ کیا جائے۔

اس معاہدے پر فریقین کے ذمہ دار اصحاب کے علاوہ قاضی اور مفتی نے بھی دستخط کیے اس طرح دونوں فریق مطمئن ہو گئے۔ یہی سید صاحب کا حقیقی مدعا تھا، یہی غرض لے کر آپ رائے بریلی سے نصیر آباد پہنچے تھے۔

ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ معتمد الدولہ آغا میر نے دو ہزار روپے سید صاحب کی خدمت میں بطور ہدیہ بھیجے، لیکن آپ نے یہ کہہ کر رقم واپس کر دی کہ اصل کام پر کوئی رقم خرچ نہیں ہوئی۔ سید صاحب ۸؍ محرم سے ۱۲؍ محرم تک نصیر آباد میں رہے اور تیرہویں کو رائے بریلی میں واپس گئے۔ (۱)

(۱) بعض رواتیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چہلم کے موقع پر پھر ہنگامے کا اندیشہ ہو گیا اور سید صاحب کو دوبارہ نصیر آباد جانا پڑا۔ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں، غالباً بعض راویوں کو محرم اور چہلم کے واقعات میں اشتباہ پیدا ہوا۔

واقعے کی اہمیت

سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ مولانا شاہ اسماعیل کے قول کے مطابق نصیر آباد کا واقعہ جہاد کا مقدمہ تھا، جس میں سید صاحب کی قیادت اور اسلامی صلاحیت کے جوہر سب سے پہلی مرتبہ عوام پر آشکارا ہوئے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ واقعہ جزم وتدبیر اور نظم وضبط کا ایک غیر معمولی مظاہرہ تھا، ایک طرف وہ غیر مناسب دباؤ ختم ہوگیا جو ایک فریق فراوانیٔ تعداد کی بناء پر دوسرے فریق کے خلاف عمل میں لانے کے درپے تھا، دوسری طرف انتہائی نازک حالات کے باوجود باہم کشمکش کی نوبت نہ آئی۔ سید صاحب کی وجہ سے حالات بگڑنے کے بجائے تدریجاً اصلاح پذیر ہوتے گئے۔

چودھواں باب:

تبلیغی دورے

اصلاح ودعوت

جن مختلف مشغولیتوں کا ذکر ہم گزشتہ دو بابوں میں کر چکے ہیں، ان کے علاوہ سید صاحب نے قیامِ وطن کی اس مہلت میں تبلیغی دورے بھی کئے، جن کا مقصد یہ تھا کہ عام مسلمانوں کے عقائد واعمال کی اصلاح کی جائے اور انہیں جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دی جائے۔ ان دوروں کا عام رنگ وہی تھا، جس کا نقشہ آپ کے سامنے میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور وغیرہ کے دورے میں پیش ہو چکا ہے۔ صحیح تاریخیں معلوم نہیں ہو سکیں، لیکن اتنا معلوم ہے کہ مختلف اوقات میں دو مرتبہ سید صاحب کانپور کی طرف تشریف لے گئے، ایک مرتبہ الٰہ آباد، بنارس وغیرہ گئے، ایک مرتبہ لکھنؤ پہنچے۔ میں ایک باب میں متفرق مقامات کے حالات بیان کروں گا، ایک باب میں صرف لکھنؤ کے سفر کا حال لکھوں گا۔

شوق وطلبِ عام

داعیٔ حق کبھی اس بات کا منتظر نہیں رہتا کہ لوگ بلائیں تو انہیں پیغامِ حق سنانے کے لئے باہر نکلے۔ اس کا وظیفۂ حیات یہی ہوتا ہے کہ اپنے اوقات کا ایک ایک لحہ دعوت وارشاد میں گزارے، جہاں تک پہنچنا اس کے امکان میں ہو، خود پہنچے اور ہر اندھیرے میں دعوت وتلقین کے چراغ جلا کر روشنی کا بندوبست کرے۔ سید صاحب کے دوروں کے سلسلے میں یہ حقیقت خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ ان سے کسبِ فیض کی آرزو حد درجہ عام

ہو چکی تھی اور جگہ جگہ سے دعوت نامے پہنچ رہے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ آدمی آتے اور بہ اصرار کہتے کہ ہمارے ہاں چلئے، چنانچہ "مخزنِ احمدی" میں کتنہ، مہروڑہ، اہلادگنج، الٰہ آباد وغیرہ کے دعوت ناموں کا ذکر بطور خاص کیا گیا ہے۔(۱)

سید صاحب جب دورے پر نکلتے تو شوق وطلبِ عام کا یہ حال ہوتا کہ ایک میل کا فاصلہ بھی طے نہ کرنے پاتے اور گرد وپیش کے دیہات ومقامات سے سیکڑوں آدمی آکر روک لیتے، پھر عجز والحاح سے اپنے ہاں لے جاتے۔ مثلاً جب الٰہ آباد کی طرف گئے، تو اگرچہ یہ مقام رائے بریلی سے صرف چار منزل پر تھا لیکن سید صاحب نے یہ فاصلہ بہ مشکل ایک مہینے اور چند روز میں طے کیا۔(۲)

سلون

جب الٰہ آباد و بنارس کے دورے پر نکلے تو "مخزنِ احمدی" کے بیان کے مطابق ایک سو ستر آدمی ہمراہ تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکثر نیازمندوں کو ایک لمحے کے لئے بھی مفارقت گوارا نہ تھی۔ پھر جو لوگ بہ اصرار روکتے تھے، یہ جانتے ہوئے روکتے تھے کہ بہت بڑی مہمانداری کا بوجھ اٹھانا ہوگا، بایں ہمہ ان کے شوق کا جذبہ قطعاً افسردہ نہ ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کیلئے عام لوگوں کے دلوں میں کس قدر والہانہ تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔ اس دورے میں پہلا بڑا مقام سلون آیا، جہاں شاہ اشرف (۳) کا مزار تھا، شاہ کریم عطا (۴) اس مسند کے سجادہ نشین تھے، غالباً عرس کا موقع تھا اور وہاں

(۱) "مخزنِ احمدی ص:۵۶ (۲) مخزنِ احمدی ص:۵۶

(۳) پیر شاہ اشرف سلونی کا انتقال ۱۱۶۷ھ (۱۷۵۴ء) میں ہوا، یہ اپنے عہد کے بلند رتبہ بزرگ تھے۔

(۴) شاہ کریم عطا نے سید صاحب کی شہادت سے دو برس بعد وفات پائی، ان کی تاریخ وفات یہ ہے۔

ڈوبا جو وہ نیرِ درخشاں کریم تاریک ہوا جہاں بہ چشم احباب
چلائے نکال جی بہ اہل افلاک "جنید زجائے خویش قطب الاقطاب"

مصرع تاریخ کے عدد ۱۲۶۱ بنتے ہیں۔ ان میں سے جی کے تیرہ عدد نکال دیئے جائیں تو ۱۲۴۸ھ تاریخ نکل آتی ہے۔

بڑے زور کی قوالی ہوتی تھی۔ مرید کورے گھڑے میں پانی بھر کر سر پر رکھ لیتے، اس حالت میں گاتے اور رقص کرتے۔

سید صاحب نے خود شاہ کریم عطا سے ملاقات کی اور کہا آپ درویش ہیں، دین کے ہادی سمجھے جاتے ہیں، آپ کی اجازت سے اس قسم کی خلافِ شرع حرکتیں ہوتی رہیں تو عام لوگوں کیلئے یہ حجت و دستاویز بن جائیں گی۔ انصاف سے بتایئے کہ کیا ان کے لئے سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کوئی دلیل موجود ہے؟ شاہ کریم عطا صاحب نے جواب دیا کہ اس کا جواب دوسرے موقع پر دیا جائے گا۔

سید صاحب نے بعد میں مولانا عبدالحئیؒ کو شاہ کریم عطا کے پاس بھیج دیا، مولانا نے چند لمحوں میں شاہ صاحب کو لاجواب کر دیا۔ انہوں نے پھر کہہ دیا کہ مزید گفتگو دوسرے موقع پر ہوگی، بعد میں سید صاحب کو پیغام بھیجا کہ صرف آپ سے مل کر بات چیت کی آرزو ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھا کہ کسی مرید نے شاہ کریم عطا کو بتا دیا تھا کہ سید صاحب زیادہ پڑھے لکھے نہیں اور انہیں گفتگو میں شکست دے لینا سہل ہوگا۔ سید صاحب یہ پیغام پاتے ہی خود گئے، چند لمحوں میں شاہ کریم عطا نے تمام خطاؤں کا اعتراف کر لیا اور اس عرس کے سلسلے میں ساری غیر شرعی حرکات بند کر دیں۔

الٰہ آباد

سلون سے نکل کر سید صاحب خدا جانے کہاں کہاں ٹھہرے، ہمیں الٰہ آباد تک صرف اہلادگنج، مانک پور اور کڑا کی منزلوں کا علم ہے، اہلادگنج میں وہاں کے حاکم میرزا کاظم بیگ اور بہت سے لوگوں نے بیعت کی، راستے میں ایک روز ایک ایسے مقام پر ٹھہرے جو بے چراغ ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے کھچڑی پکانے کا سامان فراہم ہوا، رکابیاں یا سینیاں ساتھ نہ تھیں، ایک کوئیں کی پختہ مینڈ کو دھو کر صاف کیا، کھچڑی اسی پر

ڈال لی اور درویشانِ باخدا کا وہ قافلہ خوشی خوشی کھا کر ذکر و فکر میں مشغول ہو گیا۔

الٰہ آباد میں جائے قیام کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاہ اجملؒ (۱) کے دائرے میں ٹھہرے تھے، جس کے متعلق ناسخ نے لکھا تھا:

آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں ہر پھر کے دائرے ہی میں رکھتا ہوں میں قدم

بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ قیام دوسری جگہ ہوا تھا، لیکن شاہ اجملؒ سے بھی ملاقات کی تھی اور ان کے ہاں کھانا کھایا تھا۔

شیخ غلام علی

الٰہ آباد کے زمانۂ قیام میں بے شمار لوگوں نے بیعت کی، ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر شیخ غلام علی صاحب ہیں۔ شیخ صاحب وقت کے ممتاز امراء میں شمار ہوتے تھے، اودت نرائن مہاراجہ بنارس کی طرف سے عملدار تھے، مہرونڈہ اصلی وطن تھا۔ شیخ صاحب ان تمام اخلاقی امراض میں مبتلا تھے جو اس زمانے کے امراء میں عام طور پر پھیلی ہوئی تھیں۔ سید صاحب سے ارادت مندی کا رشتہ استوار ہو گیا تو تمام غیر شرعی اعمال سے بہ اخلاصِ قلب توبہ کی، پھر ان کی پوری زندگی اسلامیت کے سانچے میں ڈھل گئی۔ ان کے پاس بیسیوں سنہری اور روپہلی حقے تھے، وہ سب تڑوا کر دریا میں بہا دیے۔ سید صاحب کے نیاز مندوں میں سے انفاق فی سبیل اللہ میں غالباً کوئی بھی شخص شیخ غلام علی کے درجے کو نہ پہنچ سکا۔ ایک راوی کا بیان ہے۔

(۱) ابوالفضل کنیت، ناصر الدین محمد اجمل نام، اپنے وقت کے اکابر اہل علم اور بزرگ اولیاء میں سے تھے۔ ۱۱۶۱ھ (۴۸-۱۷ء) میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۳۶ھ (۱۸۲۱ء) میں وفات پائی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحیٔ ملاقات کے لئے گئے تو دل میں طے کر لیا تھا کہ اگر اجمل ایک کو گڑ کا اور دوسرے کو شکر کا شربت پلائیں گے، تو سمجھ لیں گے کہ اہل کشف میں سے ہیں۔ شاہ صاحب نے دونوں مہمانوں کو گلے سے لگایا، پھر ملازم سے کہا کہ دو گلاس شربت لاؤ، ایک قند کا، دوسرا شکر کا۔ کیا کروں ان کی خواہش یہی ہے۔

حضرت کے ایسے مخلص بے ریا اور محب باصفا تھے کہ میں نے آج تک (ان جیسا) نہیں دیکھا۔(۱)

شیخ صاحب نے بیسیوں ہدایا کے علاوہ ایک نہایت قیمتی قالین بھی سید صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ آپ شیخ صاحب کے پاس خاطر سے ایک مرتبہ اس پر بیٹھے، پھر ساتھیوں میں سے ایک نے عرض کیا کہ میرے پاس لحاف نہیں، محترم سید صاحب نے وہی قالین اُٹھا کر اسے دیدیا۔

بنارس

الٰہ آباد سے نکلے تو مختلف مقامات پر ٹھہرتے ہوئے بنارس پہنچے۔(۲) وہاں مولوی عبدالقادر امیروں میں شمار ہوتے تھے، وہ سید صاحب کے دوست تھے، اس بناء پر ساتھیوں کا خیال تھا کہ غالباً وہیں قیام ہوگا، لیکن آپ نے فرمایا کہ مولوی عبدالقادر چونکہ ہمارے ہم طریق اور ہم مشرب نہیں، اسلئے انکے پاس ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا۔ چنانچہ جماعت نے مہیسر کی مسجد میں قیام کیا۔ خود سید صاحب رفیقوں کی ایک جماعت کے ساتھ پاس کی ایک شاہی مسجد میں مقیم ہو گئے، جو مدت سے بے آباد پڑی تھی، اور اس میں بہت کوڑا کرکٹ جمع ہو گیا تھا۔ سید صاحب نے اسے صاف کرا کے نئے سرے سے آباد کر دیا۔(۳)

(۱) وقائع ص:۴۵۹

(۲) سفر بنارس کی ایک روایت میں ہے کہ جاڑے کا موسم تھا اور قطرہ افشانی ہو رہی تھی، الٰہ آباد کے سلسلے میں بھی بیان ہو چکا ہے کہ ساتھیوں میں سے ایک نے عرض کیا، میرے پاس لحاف نہیں، سید صاحب نے شیخ غلام علی کا نذر کردہ قیمتی قالین اُٹھا کر اسے دے دیا۔ میرا خیال ہے کہ ۱۲۳۵ھ کا جاڑا ہوگا، جو ربیع الاول، ربیع الثانی اور جمادی الاولیٰ میں تھا، یعنی دسمبر ۱۸۱۹ء، جنوری اور فروری ۱۸۲۰ء میں۔

(۳) ''مخزن'' میں ہے۔ در مسجد مہیسر رحل اقامت انداختند۔ لیکن چونکہ دوسری روایتوں میں پاس کی ایک شاہی مسجد میں قیام کا ذکر بھی آیا ہے، اس لئے میرا خیال ہے کہ دونوں مسجدوں میں ساتھیوں کی جماعت بٹ گئی ہوگی، جو یقیناً بہت بڑی تھی، اور ایک مسجد میں سب لوگ سما نہ سکتے تھے۔

بنارس میں سید صاحب تقریباً ایک مہینہ قیام فرما رہے، اس اثناء میں جن مردوں اور عورتوں نے بیعت کی ان کی تعداد دس پندرہ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ بنارس زربفت کا بہت بڑا مرکز تھا اور وہاں مسلمانوں میں سے زیادہ تر نور باف، کندی گر اور دھوبی رہتے تھے۔ مولانا عبدالحئی وعظ فرمایا کرتے تھے، ان لوگوں پر بہت اثر ہوا، ان کے پیروں نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ ہر گھر سے چھ مہینے کے بعد مقررہ فتوح مل جاتی، پیر صاحب نماز اور روزہ وغیرہ اوامر کی معافی کے پروانے لکھ دیتے، سید صاحب کی برکت سے یہ تمام بدعملیاں ختم ہوگئیں اور لوگوں میں دینداری کا عام ذوق پیدا ہوگیا۔ بیعت کرنے والے اکابر میں شاہ عبداللہ شنگرفی اور میرزا کریم اللہ بیگ رئیس بھی تھے۔

وہاں تیموری شہزادے بھی رہتے تھے، ان میں سے بعض نے بیعت کی اور قیمتی پارچے بطور نذر سید صاحب کی خدمت میں گزرانے۔ آپ نے مولوی محمد یوسف پھلتی سے فرمایا کہ ان پارچوں کو فروخت کر کے گاڑھے اور گزی کے تھان خرید لو اور تمام ساتھیوں میں تقسیم کر دو، تاکہ ضرورت کے مطابق کپڑے بنوالیں۔(۱)

''مخزنِ احمدی'' میں بنارس کے انگریز حاکم آگسٹس بروک کی مسلمان بیوی حیات النساء بیگم کی بیعت کا بھی ذکر ہے۔ ''وقائع'' میں بہ تصریح مرقوم ہے کہ اس بارے میں سید محمد علی صاحب کو شبہ ہوا، اس بی بی کی بیعت کا واقعہ سفر حج میں پیش آیا۔(۲) لہٰذا ہم اسے اسی موقع پر درج کریں گے۔

قیامِ بنارس کے دوران میں سید صاحب اپنے رفیقوں کو برابر تاکید فرماتے رہے کہ خوب ذکر کرو، یہ شہر کفر و شرک کے ظلمات سے لبریز ہے، اسے ذکرِ الٰہی کے انوار سے منور

(۱) مولوی مرتضٰی خاں کا بیان ہے کہ ٹیپو سلطان کے شہزادوں نے بیعت کی تھی (تواریخ عجیبہ ص:۴۴) لیکن مجھے اب تک ٹیپو سلطان کے کسی شہزادے کی اقامتِ بنارس کا علم نہیں ہو سکا، میرا خیال ہے کہ مولوی مرتضٰی خاں نے تیموری شہزادوں کو ٹیپو سلطان کے شہزادے سمجھ لیا۔

(۲) ''وقائع'' ص:۱۱۷

کردو۔

سلطان پور

بنارس سے نکلے تو مختلف مقامات میں ٹھہرتے ہوئے سلطان پور کی طرف تشریف لے گئے، وہاں غلام حسین خاں لشکر کے ساتھ مل گیا، وہ سرکار لکھنؤ کی طرف سے سلطان پور کا حاکم تھا۔ اس لشکر کے بہت سے آدمی پہلے سے سید صاحب کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے، انہوں نے بہ اصرار ٹھہرالیا اور بہت لوگوں نے بیعت کی۔ دو ہفتے لشکر میں ٹھہر کر آپ حسب معمول جگہ جگہ قیام کرتے ہوئے رائے بریلی پہنچ گئے، میرا اندازہ ہے کہ اس تبلیغی دورے میں کم از کم تین ماہ کی مدت صرف ہوئی ہوگی۔

پہلا دورۂ کان پور

کان پور کی سمت میں سید صاحب نے دو مرتبہ دورہ کیا، پہلے دورے کے سلسلے میں محض مورائیں میں قیام کے کچھ حالات معلوم ہیں، کان پور کے متعلق صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ آپ چھاؤنی میں (غالباً سید محمد یاسین کے مکان پر) ٹھہرے تھے، یہاں ایک انگریز کی مسلمان بیوی بڑی دولت مند تھی، اس کے اولاد نہ تھی، دو لڑکوں اور لڑکیوں کو پال لیا تھا، ایک لڑکی کی شادی مرزا عبدالقدوس سے کردی تھی، مرزا صاحب سید صاحب کے گہرے عقیدت مند بن گئے، لیکن آپ نے اس بی بی کی دعوت قبول نہ کی۔

قیامِ مورائیں کے دوران میں چار دوست، اللہ بخش خاں، شمشیر خاں، مہربان خاں اور شیخ رمضان آپ کی خدمت میں اکٹھے حاضر ہوئے، چاروں بڑے سجیلے اور کڑیل جوان تھے۔ سید صاحب نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا: یہ بھائی ہمارے کام کے ہیں، پیرزادوں سے ہم کیا کام لے سکتے ہیں؟ (۱) ان چاروں نے بیعت کی اور سید صاحب

(۱) ''وقائع''ص:۳۱۳

کے ساتھ ہو گئے، سفر لکھنؤ میں بھی ہمرکاب تھے (۱)، حج سے بھی مشرف ہوئے۔

مہربان خاں سے ایک مرتبہ سید صاحب نے فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے اور کام لے گا اور ان تین بھائیوں سے اور کام لے گا، لیکن چاروں کے کام اس کی رضامندی کے عین مطابق ہوں گے۔ سید صاحب نے جہاد کی نیت سے ہجرت کی تو چاروں ساتھ تھے، مہربان خاں سید صاحب کے اہل وعیال کی خدمت پر مقرر ہوئے، اور سندھ میں رہے، واقعہ بالاکوٹ کے کئی برس بعد سید صاحب کے اہل وعیال ٹونک آئے تو مہربان خاں بھی ساتھ تھے۔ ۱۲۷۴ھ تک زندہ تھے، باقی تینوں جواں مرد اس جماعت میں شریک تھے جس نے اکوڑہ سے جہاد کا آغاز کیا تھا۔ اللہ بخش خاں اس جماعت کے قائد تھے، تینوں اس جنگ میں شہید ہوئے۔

دوسرا دورہ

دوسری مرتبہ سید صاحب نے کان پور کے اطراف کا دورہ اس زمانے میں کیا جب حج کے لئے سفر کا ارادہ فرما چکے تھے اور اعلانِ عام کر دیا تھا کہ جو چاہے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو جائے۔ اگر کسی کے پاس خرچ نہ ہو تو میں ادا کر دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کان پور کے انگریز کی مسلمان بی بی نے اپنے داماد مرزا عبد القدوس کو رائے بریلی بھیج کر سید صاحب کو بلوایا تھا۔

چنانچہ آپ رائے بریلی سے روانہ ہوئے تو پہلے بھور نام ایک بستی میں پہنچے جہاں والیٔ لکھنؤ کا ایک جیش ٹھہرا ہوا تھا، ان لوگوں نے روک لیا، پھر مورائیں، رنجیت پور، پڑھا، اور رنبیر پور وغیرہ مقامات میں دو دو تین تین دن قیام کا ذکر ملتا ہے، تفصیل کچھ نہیں بتائی گئی۔ اس کے بعد آپ گنگا کو عبور کر کے انگریز کی مسلمان بی بی کے مکان پر اُترے،

(۱) ایک روایت میں ہے کہ لکھنؤ میں جب معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت نے دعوت کی تھی تو جن لوگوں کو شاہ اسماعیل نے سید صاحب کے باڈی گارڈ کی حیثیت میں ساتھ لیا تھا، ان میں اللہ بخش بھی تھے۔

لیکن اترتے ہی مرزا عبدالقدوس سے کہہ دیا کہ ہمارے آدمیوں کو کھانا پکانے کی جگہ بتادی جائے، یعنی آپ اس بی بی کے ہاں سے کھانا کھانے پر راضی نہ ہوئے۔ مرزا عبدالقدوس نے عرض کیا کہ میرا اپنا کاروبار ہے، تجارت کرتا ہوں، وہی روپیہ آپ کی مہمانداری پر صرف ہوگا۔ اس کی دعوت آپ نے قبول فرمالی، لیکن جتنے دن ٹھہرے اکثر دعوتیں ہوتی رہیں اور مرزا عبدالقدوس کے ہاں سے بھی کھانا کھانے کی نوبت بہت کم آئی۔

مسلمان بی بی نے ایک موقع پر چار ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کئے، آپ نے فرمایا فی الحال حج کیلئے جا رہا ہوں، واپس آکر جب جہاد کو جاؤں گا تو جیسا مناسب ہوگا، کہلا بھیجوں گا۔ پھر بی بی نے ایک مکان نذر کیا جو اس زمانے میں بھی تیس چالیس ہزار روپے سے کم کی مالیت کا نہ تھا، سید صاحب نے فرمایا کہ میں اس مکان کو کیا کروں گا؟ حج کے لئے جا رہا ہوں اور اپنا مکان بھی چھوڑ جاؤں گا۔ بی بی نے عرض کیا کہ میں تو اب دے چکی، آپ جو چاہیں کریں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہی بات ہے تو اسے مرزا عبدالقدوس کو دے دو، بی بی بولی کہ میں نے آپ کو دے دیا ہے، آپ جسے چاہیں دے دیں۔ چنانچہ سید صاحب نے وہ مکان مرزا عبدالقدوس کو دے دیا۔

اس زمانے میں کان پور کے دو قصاب بہت دولت مند اور صاحب اثر مانے جاتے تھے، ایک عبداللہ اور دوسرا اس کا بھائی محمد تقی۔ محمد تقی پہلے بیعت کر چکا تھا، عبداللہ نے اب بیعت کی، ان دونوں کی وجہ سے کانپور کے بہت سے لوگ بیعت ہوئے، ان میں محمد بخش رفوگر اور اسکے بھائی حسین بخش کا بھی ذکر آتا ہے۔

مراجعت

کان پور سے سید صاحب منجھاؤں گئے، اصل میں قاضی حمایت اللہ نے اپنے بھائی کو بھیج دیا تھا کہ سید صاحب کو ساتھ لائے، وہاں مخنثوں کا ایک طائفہ رہتا تھا، جن

میں سے بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا قاضی حمایت اللہ کے بھائی سے بہت مانوس تھا، اس نے بھی سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی، عبداللہ بسم اللہ نام رکھا گیا، جہاد میں ساتھ تھا، اکوڑہ اور شیدو کی جنگوں میں شریک ہوا اور بڑی مردانگی سے لڑا۔ جنگ شیدو کے بعد مجاہدین چنگلئی (واقع خدوخیل) میں جا ٹھہرے تھے، وہاں بیمار ہو کر واصل بحق ہوا۔

منجھاؤں سے سید صاحب جہان آباد، کھجوہ اور فتح پور ہوتے ہوئے دلموٗ پہنچے، اس وقت تک مولانا عبدالحیٔ بھی کشتی کے ذریعے دلموٗ پہنچ گئے تھے، رات دلموٗ میں میاں عبدالصمد کے مکان پر گزاری دوسرے روز نمازِ ظہر سے قبل رائے بریلی پہنچ گئے۔(۱)

دعوتِ عزیمت

سید صاحب نے ایک ایسے کام کا ارادہ فرمایا تھا جو مقامِ عزیمت میں رسوخ واستحکام کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے تمام ارادت مندوں کو عزیمت کی تربیت دینے پر خاص توجہ مبذول تھی۔ غالباً اسی زمانے کا ذکر ہے کہ مولانا سید مظہر علی صاحب عظیم آبادی نے بیعت کی اور اپنے ہاں وعظ وتذکیر کے ذریعے سے مسلمانوں کو اتباع سنت پر آمادہ کرنے لگے۔ ایک موقع پر تعزیہ داری کو روک رہے تھے، خدا جانے کیا واقعات پیش آئے کہ ان پر تعزیہ شکنی کا الزام لگا، مقدمہ قائم ہو گیا اور گرفتار ہوئے۔ ایک دوست شیخ عیدا نے ضمانت دے کر رہا کرایا، مولانا رہائی پاتے ہی وطن سے بھاگے اور گورکھپور پہنچ گئے۔

سید صاحب سے ملنے کیلئے آئے اور آپ نے حالات سنے تو سخت ناراض ہوئے، مولانا سمجھے بیٹھے تھے کہ میں نے عشق دین میں وطن چھوڑا ہے، اس لئے ثواب کا مستحق ہوں۔ سید صاحب نے فرمایا: آپ ثوابِ ہجرت کے امیدوار ہیں؟ حالانکہ آپ کی

۱) بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گندہ بہار کا موسم تھا۔

بیعت بھی ٹوٹ گئی، آپ کے جسم کو خفیف سی تکلیف بھی نہیں پہنچی اور دوسرے نیک مسلمانوں کو مصیبت میں اُلجھا کر نکل آئے، دوبارہ بیعت کیجئے اور فوراً واپس جایئے، وہاں جو کچھ پیش آئے اسے صبر و خوش دلی سے برداشت کیجئے۔

چنانچہ مولوی صاحب واپس گئے، حسنِ اتفاق سے ان کے خلاف مقدمہ ثابت نہ ہو سکا اور بری ہو گئے۔

یہی تربیت تھی جس نے تھوڑی ہی مدت میں سید صاحب کے پاس انسانیت کے وہ گرانمایہ گوہر جمع کر دیے جن کی مثالیں اسلامی تاریخ کی اکثر صدیوں میں شاید ہی مل سکیں۔

پندرھواں باب:

دورۂ لکھنؤ

نائب السلطنت اودھ کا دعوت نامہ

اب صرف دورۂ لکھنؤ کی داستان باقی رہ گئی، جس کے متعلق زیادہ روایات ملتی ہیں، اگرچہ وہ غیر مرتب ہیں اور اس غرض سے ضبطِ تحریر میں نہیں لائی گئی تھیں کہ پچاس سو برس بعد میں آنے والا شائق تحقیق ان سے حالات کا صحیح نقشہ مرتب کر سکے۔

ایک روایت میں ہے کہ الٰہ آباد اور بنارس کے دورے سے سید صاحب لوٹے تو چند روز بعد لکھنؤ کا قصد کر لیا گیا، تمام قرائن اسی کے مؤید ہیں۔ لیکن یہ جان لینا چاہئے کہ سید صاحب الٰہ آباد و بنارس کے دورے سے پیشتر کانپور کا پہلا سفر کر چکے تھے، ان کا دوسرا نکاح بھی ہو چکا تھا اور نصیر آباد کا واقعہ بھی پیش آ چکا تھا، جو معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت اودھ سے سید صاحب کے تعارف کا ذریعہ تھا۔ صرف کان پور کا دوسرا دورہ سفرِ لکھنؤ کے بعد پیش آیا۔(۱)

''مخزن احمدی'' میں ہے کہ آغا میر نائب السلطنت نے خود لکھنؤ بلایا تھا، دعوت نامہ

(۱) وقائع احمدی سے ظاہر ہوتا ہے کہ سفر لکھنؤ ۱۲۳۴ھ میں ہوا، اس لئے کہ مفتی غلام حضرت کا انتقال اسی سال ہوا۔ تاریخ وفات:

مردہ مفتی غلام حضرت افسوس — کہ بود بہ شہر لکھنؤ حاکم شرع

سالِ تاریخ رحلت آں مرحوم — فرمود فرد کہ رود خادمِ شرع

۱۲۳۴ھ

(سیرت احمد شہید طبع چہارم ص: ۷۳ حاشیہ)

کا مضمون یہ تھا۔

آوازۂ وعظ و تذکیر آں روشن ضمیر عالمگیر گردیدہ اگر بہ قدومِ میمنت لزوم خود اہالیٔ لکھنؤ را عموماً و ایں مشتاق مستمند را خصوصاً بنوازند بعید از اخوت و مروت و فتوت نخواہد بود۔(۱)

ترجمہ : آپ کے وعظ و تذکیر کی شہرت زمانے بھر میں پھیل چکی ہے، اگر اہل لکھنؤ کو عموماً اور مجھ مشتاق و طلبگار زیارت کو خصوصاً تشریف آوری سے نوازیں تو یہ امر رشتۂ برادری، مروت اور عالی حوصلگی سے بعید نہ ہوگا۔

دعوت نامہ کیوں بھیجا؟

معتمد الدولہ آغا میر کی طرف سے اس قسم کا دعوت نامہ اس زمانے میں بھی تعجب انگیز ہوگا، اور آج تو یہ بات کسی واقفِ حال کے خیال میں بھی نہیں آسکتی کہ آغا میر نے شوق سے سید صاحب کو بلایا ہوگا۔ وہ سید صاحب کا ہم عقیدہ یا ہم مشرب نہ تھا، دین، ملک، قوم یا خلق خدا کی خدمت کے لئے اسکے پہلو میں کوئی جگہ نہ تھی، میرزا غالب سید صاحب کے اس سفر سے چند سال بعد کلکتہ جاتے ہوئے لکھنؤ بھی ٹھہرے تھے، اس زمانے میں بھی آغا میر ہی نائب السلطنت تھا، میرزا نے اس کے کردار و اخلاق کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دین و ملک اور قوم کی خدمت تو رہی ایک طرف وہ شخص دنیا داریوں اور کام جوئیوں میں بھی چنداں عالی ہمت، بلند نظر اور دور اندیش نہ تھا، پھر اسے سید صاحب سے کیوں دل بستگی پیدا ہوئی؟ میرا خیال ہے کہ وہ واقعہ نصیر آباد کے سلسلے میں سید صاحب کے عزم و ہمت کا اندازہ کر چکا تھا اور جانتا تھا کہ ان میں قیادتِ عامہ کے تمام جوہر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ عام لوگ جوشِ عقیدت میں پروانہ وار سید صاحب پر گر رہے

(۱) مخزن ص:۵۲

ہیں، ایسی شخصیت کے ربط وضبط سے آغا میر کیوں کر بے نیاز ہوسکتا تھا، جس کے نزدیک اپنی کارفرمائی کی حفاظت ہی زندگی کا پہلا اور آخری نصب العین تھی۔ سید صاحب کے کئی پرانے دوست اور رفیق لکھنؤ کی فوج میں بلند عہدوں پر مامور ہوچکے تھے، مثلاً فقیر محمد خاں آفریدی رسالدار اور عبدالباقی خاں قندھاری، آغا میر کو ان پر بہت بھروسہ تھا، ممکن ہے انہوں نے بھی نائب السلطنت کو سید صاحب کی طرف متوجہ کیا ہو۔

بہرحال دعوت نامہ آیا اور سید صاحب لکھنؤ گئے، لیکن دورانِ قیام میں حکومت یا آغا میر کی مہمانداری سے قطعاً فائدہ نہ اٹھایا، بلکہ دوستوں اور عقیدت مندوں ہی نے قیام کا انتظام کیا، البتہ آغا میر کے ہاں دو دعوتیں ضرور کھائیں۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ اس نے دعوت نامہ بھیجنے کے بعد مہمانداری کا انتظام خود نہ کیا یا سید صاحب نے مقاصد تبلیغ کے پیش نظر مہمان بننا مناسب نہ سمجھا۔ یہ بھی واضح ہے کہ ملاقات کے بعد آغا میر کا جوشِ عقیدت بظاہر ٹھنڈا پڑ گیا، اس لئے کہ پھر سید صاحب کے سلسلے میں اس کا ذکر نہیں آتا۔ اس پر تعجب نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ سید صاحب کسی درجے میں بھی آغا میر کے اغراض واصولِ کار کے لئے مفید وسودمند نہیں ہوسکتے تھے، اور آقا میر کیلئے خلقِ خدا سے ربط وتعلق صرف ذاتی اغراض ہی کی پیش برد پر مبنی تھا۔

سفر

سید صاحب نے لکھنؤ کا ارادہ فرمایا تو خاصی بڑی جماعت ساتھ ہوگئی، جس کی تعداد اسّی سے پونے دوسو تک بتائی جاتی ہے۔(۱) ان تمام اصحاب کا سامان چھکڑوں پر لاد دیا

(۱) سید عبدالرحمٰن کی روایت ہے کہ کل اسّی آدمی ساتھ تھے۔ ''مخزنِ احمدی'' میں ان کی تعداد ایک سو ستر بتائی گئی ہے اور ''وقائع'' میں پونے دوسو۔ یا تو یہ سمجھنا چاہئے کہ سید عبدالرحمٰن کی روایت میں سے سو کا ہندسہ اتفاقیہ حذف ہوگیا یا یہ ماننا پڑے گا کہ رائے بریلی سے چلتے وقت کل اسّی آدمی ساتھ تھے، بعد میں تعداد بڑھتی گئی، ارادت مندوں کا طریقہ یہ تھا کہ بیعت کے بعد کسبِ فیض کے لئے سید صاحب کے ساتھ ہوجاتے تھے۔ خود سید صاحب اصحابِ فراغت کو بہ نظر تربیت روک لیتے تھے۔

گیا، لیکن سب کے لئے سواری کا انتظام نہ کیا گیا اور نہ ضروری تھا، ہاں سید صاحب کے لئے ایک یکہ لے لیا گیا تھا اور غالباً پوری جماعت کیساتھ ایک دو گھوڑے بھی تھے۔

سید صاحب کے چھوٹے بھانجے سید عبدالرحمٰن بھی ساتھ تھے، جو اس زمانے میں لکھنؤ میں کسی فوجی عہدے پر مامور تھے اور قندھاریوں کی چھاؤنی میں رہتے تھے۔ رائے بریلی سے سید صاحب نکلے تو پہلی منزل حسن گنج میں ہوئی، دوسری منزل کا نام نہیں بتایا گیا، لیکن وہ لکھنؤ سے قریب ہوگی۔ دوسری منزل پر عشاء ہی کے وقت سید عبدالرحمٰن کو حکم دے دیا گیا کہ:

> کچھ رات رہے سے تم آگے چل کر قندھاریوں کی چھاؤنی میں اپنے مکان کو صاف کروا کر فرش بچھوا رکھو اور کچھ بھونے ہوئے چنے، اور نمک مرچ، اور کچھ گڑ بھی تیار رکھنا۔(۱)

چنانچہ سید عبدالرحمٰن کچھ رات رہے ہی سے روانہ ہوگئے۔ سید صاحب صبح کی نماز کے بعد سوار ہوئے اور پہر دن چڑھے قندھاریوں کی چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ سید عبدالرحمٰن کے مکان پر چنے، نمک، مرچ، گڑ وغیرہ چیزیں تیار تھیں، سب نے تھوڑے تھوڑے چنے چبائے پھر پانی پی کر کچھ دیر سو رہے۔ ظہر کی نماز کے بعد ملاقاتیوں کی آمد شروع ہوئی، ان میں سے پانچ چھ فوجی سردار بطور خاص قابل ذکر ہیں جنہوں نے ستر اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔(۲)

بارہ چودہ برس پیشتر سید صاحب لکھنؤ آئے تھے تو بالکل گمنام تھے، اب ان کی شہرت عظمت و تقدس سے اونچے اونچے ایوانوں میں گونج پیدا ہو چکی تھی، لیکن سادگی، بے تکلفی

---

(۱) ''وقائع'' ص: ۱۱۸

(۲) ان کے نام یہ ہیں: محمد حسن خاں (پانچ اشرفی)، فضیل اللہ خاں (چار اشرفی)، مصطفیٰ خاں بن حسن خاں (تین اشرفی)، عبدالرحیم خاں (تین اشرفی)، عبدالمعبود خاں (دو اشرفی)

اور فروتنی میں قطعاً فرق نہ آیا۔ دیکھئے! لکھنؤ میں ان کے دوست اور نیاز مند بھی موجود تھے، نائب السلطنت کی طرف سے دعوت بھی پہنچ چکی تھی، لیکن پہنچے تو نہ کسی کو خبر کی، نہ خود بخود کسی کے ہاں گئے۔ اپنے بھانجے کے مکان پر قیام کیا، چنے چبا کر وقت گزار لیا، لوگ خود آکر دعوتوں کا انتظام کرنے لگے تو دعوتیں قبول فرمالیں۔

جائے قیام

سید صاحب لکھنؤ میں خاصی مدت تک ٹھہرے رہے، میری نظر سے جو روایتیں گذری ہیں، ان میں چھ یا سات جمعے وہاں ادا کرنے کا ذکر ہے۔ مولانا عبدالحیٔ ہر جمعہ کے بعد عموماً وعظ فرمایا کرتے تھے، جاتے ہی قندھاریوں کی چھاؤنی میں ٹھہرے تھے، پھر اسد علی بیگ کمیدان اور میرزا اشرف بیگ رسالدار آپ کو شہر میں لے گئے، اور اکبری دروازہ کے پاس میر مسکین کی حویلی میں ٹھہرایا۔ قیام گاہ یقیناً اچھی اور وسیع ہوگی، لیکن پاس کی مسجد بہت چھوٹی تھی، سید صاحب ایسی جگہ رہنا چاہتے تھے جہاں قریب وسیع مسجد ہو، تا کہ ساتھی بھی بہ اطمینان نماز ادا کرسکیں۔ چنانچہ مختلف روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ اسد علی بیگ کمیدان نے شیخ امام بخش تاجر کی نوتعمیر کوٹھی کا انتظام کرلیا، جو دریائے گومتی کے کنارے شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد سے قریب تھی، چنانچہ سید صاحب اس میں منتقل ہوگئے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام رفیق کوٹھی میں ٹھہرے تھے لیکن خود سید صاحب شیخ امام بخش کے اس مکان میں قیام فرماتے تھے جو یحییٰ گنج میں تھا۔

مولوی خرم علی بلہوری جب لکھنؤ میں سید صاحب سے ملے تو آپکا ڈیرا فقیر محمد خاں رسالدار کی قیام گاہ (واقع خیالی گنج) کے احاطے میں ایک خیمے میں تھا، ایک اور روایت میں ہے کہ سید صاحب امام علی خاں داروغۂ شاہ لکھنؤ کے مکان میں ٹھہرے تھے۔

ان روایتوں میں تناقض نہیں، سید صاحب چونکہ ایک عرصے تک لکھنؤ میں قیام

فرمارہے، یقین ہے کہ مختلف دوستوں یا ارادت مندوں کے اصرار کے باعث انہیں تھوڑے تھوڑے دن کئی جگہ ٹھہرنا پڑا ہوگا، جس راوی نے انہیں جہاں مقیم دیکھا، وہیں کا ذکر کردیا۔ سمجھنا چاہیئے کہ قیامِ لکھنؤ کے دوران میں سید صاحب ان تمام مقامات پر ٹھہرے ہوں گے، لیکن میرا خیال ہے کہ جماعت کے لوگ شیخ امام بخش تاجر کی کوٹھی ہی میں مقیم رہے اور جمعہ کی نماز برابر شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد میں ہوتی تھی، جس کا نام مسجد عالمگیری تھا۔

دعوتیں

یقین ہے کہ قیام لکھنؤ کے دوران میں سید صاحب روزانہ یا اکثر کسی مرید یا دوست کے ہاں کھانے پر مدعو ہوتے تھے۔ بعض اوقات تمام رفیق ساتھ جاتے تھے، بعض اوقات صرف منتخب اصحاب کو دعوت دی جاتی تھی، جب کہیں دعوت نہیں ہوتی تھی تو جماعت میں عام دستور یہ تھا کہ ایک دیگ میں خشکہ پکایا جاتا اور دوسری میں دال۔ لکڑی کا ایک پیالہ بنوالیا تھا جو پیمانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا، ہر شخص کو دو دو پیالے خشکہ مل جاتا اور تھوڑی تھوڑی دال دے دی جاتی۔ مساکین وفقرا بھی تقسیم کے وقت آپہنچتے، افرادِ جماعت کے برابر انہیں بھی کھانا مل جاتا۔ جماعت والوں کی تو طبیعتیں ہی سید صاحب کی تربیت کے سانچے میں ڈھل کر ایسی بن چکی تھیں کہ انہیں جو کچھ مل جاتا خدا کی خاص نعمت سمجھ کر کھاتے اور کچھ نہ ملتا تو اس صورت میں بھی سراپا شکر بنے رہتے، لیکن بتایا گیا ہے کہ مساکین کو بھی اس دعوتِ شیراز میں اتنا مزا ملتا کہ وہ اُونچے گھرانوں کے پُرتکلف کھانوں پر اس خشکے اور دال کو ترجیح دیتے تھے۔

جن اکابر کی دعوتوں کا ذکر روایتوں میں آیا ہے، ان میں سے مولانا عبدالرب فرنگی

محلی (۱)، مرزا حسن علی محدث (۲) معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت اودھ، رسالدار فقیر محمد خاں آفریدی، عبدالباقی خاں قندھاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اصلاحی کام

لیکن ہمیں سب سے بڑھ کر یہ دیکھنا چاہئے کہ اس دورے میں اصلاحی کام کس حد تک انجام پایا۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے اوقات گرامی کا بیشتر حصہ اصلاحی کاموں ہی میں صرف ہوتا تھا، بعض اوقات کھانا بھی وقت پر نہیں کھا سکتے تھے۔ مولانا عبدالحئی عموماً وعظ کہتے رہتے تھے، ہر ہفتے جمعہ کی نماز سے نمازِ عصر تک وعظ جاری رہتا، ہزاروں آدمی اس میں شریک ہوتے۔ کہتے ہیں کہ مولانا نے ان وعظوں میں سورۂ انبیاء کی تفسیر مکمل کر دی، وہ ایک ایک پیغمبر کا اسوۂ حسنہ پوری تفصیل سے بیان فرماتے، ساتھ ساتھ بتاتے جاتے کہ خود ان کے عہد میں لوگوں کے اندر کیا کیا اخلاقی، اعتقادی اور عملی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں، پھر ان خرابیوں کے ازالے پر توجہ فرماتے جو اہل

(۱) مولانا عبدالرب، ملا عبدالعلی بحر العلوم کے چھوٹے صاحبزادے تھے، والد کے ساتھ رام پور اور بہار میں رہے، پھر مدراس چلے گئے، جہاں بحر العلوم کو نواب محمد علی خاں والیٔ کرناٹک نے بلا لیا تھا۔ درسی کتابیں والد سے پڑھیں، پھر نکاح کے لئے لکھنؤ آئے، والد کی وفات پر مولانا عبدالرب اپنے بھتیجے مولانا عبدالواحد (بن عبدالاعلیٰ بن بحر العلوم) کے ساتھ مدراس گئے، اس وقت تک نواب نے ملا بحر العلوم کی اسامی ایک اور صاحب کے حوالے کر دی تھی، جسے ملازمت سے ہٹانا منظور نہ تھا، لیکن ملا صاحب کی تنخواہ نصف اس شخص کے نام لکھ دی اور نصف مولانا عبدالرب کے حوالے کر دی۔ مولانا نے اپنے بھتیجے کو مدرس بنا دیا، خود دو سو روپے نواب مدراس کی سرکار سے اور پونے دو سو روپے سرکار انگریزی سے وظیفہ قبول کر لیا جو باقاعدہ ہر مہینے ریزیڈنسی کی معرفت انہیں لکھنؤ میں مل جاتا تھا، لکھنؤ ہی میں ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۷ء) میں وفات پائی۔

(۲) انہیں اس نام کے ایک دوسرے بزرگ سے امتیاز کی خاطر حسن علی صغیر کہتے ہیں۔ یحییٰ گنج میں رہتے تھے، میرک جمال الدین لقب تھا، بعض انہیں ساداتِ علوی بتاتے ہیں اور بعض مغل۔ حدیث کی سند شاہ عبدالعزیز سے حاصل کی، پھر سیکڑوں آدمیوں کو حدیث پڑھائی، اپنی تحقیق سے شافعی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ۲۶ رصفر ۱۲۵۵ھ (۱۱ رمئی ۱۸۳۹ء) کو بہ عہد محمد علی شاہ والیٔ اودھ فوت ہوئے۔

لکھنؤ میں عام طور پر رائج ہو چکی تھیں۔

ایک جمعہ میں اتنے آدمی آ گئے کہ وسعت کے باوجود مسجد میں ان سب کیلئے نماز ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ سید صاحب نے حکم دیدیا کہ صفیں بالکل قریب قریب کھڑی ہو جائیں اور پیچھے والے لوگ آگے والوں کی پیٹھوں پر سجدے کریں، جگہ تنگ ہو تو ایسا کر لینا درست ہے۔ مولانا عبدالحیؒ نے وعظ میں سورۂ انبیاء کے پانچویں رکوع کی تفسیر بیان فرمائی۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ ...... وَلُوْطًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا وَّنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ تَّعْمَلُ الْخَبٰٓئِثَ، اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فٰسِقِيْنَ ۝

> اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو پہلے سے نیکی کی راہ عطا کی تھی اور ہم اس کے حال سے خبردار تھے، جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ کیا ہیں یہ مورتیں، جن کے تم مجاور بنے بیٹھے ہو؟...... اور لوط علیہ السلام کو ہم نے حکمت اور علم عطا کیا اور ہم نے اس کو بچا نکالا اس بستی سے جہاں کے لوگ گندے کام کرتے تھے، اور وہ لوگ تھے بڑے نافرمان۔

راوی کا بیان ہے کہ اس تفسیر کے سلسلے میں مولانا نے تعزیہ داری، عرس راگ، رنگ، گور پرستی، پیرپرستی، داڑھیاں منڈانا، لبیں بڑھانا، پٹے رکھنا، مسی لگانا، کبوتر اڑانا، مرغ لڑانا، سیٹی بجانا، پتنگ اڑانا اور اس قسم کی تمام باتوں کو سختی سے رد کیا۔ وعظ میں فرنگی محل کے علماء، مولانا سید دلدار علی مجتہد کے شاگرد اور دوسرے عمائدِ علم موجود تھے، سب پر سکتہ طاری تھا، اکثر زار زار رو رہے تھے۔

سید صاحب کا ارادہ ابتدا میں غالباً زیادہ ٹھہرنے کا نہ تھا، لیکن جب دیکھا کہ لوگ اصرار کر رہے ہیں اور یہ اندازہ بھی فرما لیا کہ امتدادِ قیام سے عوام کو فائدہ پہنچے گا تو ابتدائی

فیصلے کے خلاف قیام لمبا کر دیا۔

بیعت

اس موقع پر جن اکابر و عمائد نے بیعت کی ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر مندرجہ ذیل اصحاب ہیں:

مولانا محمد اشرف(۱)، مولوی سید مخدوم، مولوی امام الدین بنگالی، مولوی امام الدین لکھنوی،

مولوی عبد الباسط (شاگرد مولانا اشرف)، مولوی سید ابوالحسن نصیر آبادی (۲)، مولوی عبد اللہ فرنگی محلی، مولوی رحیم اللہ فرنگی محلی، مولوی نجیب اللہ بنگالی، شاہ یقین اللہ لکھنوی، مولوی حافظ عبد الوہاب (فرزند ارجمند شاہ یقین اللہ)۔

اسی موقع پر مولانا ولایت علی عظیم آبادی (۳) نے بیعت کی، یہ تعلیم کی غرض سے لکھنؤ آئے ہوئے تھے اور مولانا محمد اشرف کے پاس پڑھتے تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز استاد نے شاگرد کو سید صاحب کی کیفیت معلوم کرنے کیلئے بھیجا، جب انہوں نے واپس جا کر پورے حالات بیان کئے تو ملاقات کا شوق پیدا ہوا تخلیہ میں ملنے کے لئے وقت

(۱) قاضی نعمت اللہ خوش نویس کے فرزند تھے، ان کے بزرگوں میں سے کوئی صاحب لاہور سے لکھنؤ گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ مولانا محمد اشرف نے مولوی نور الحق فرنگی محلی اور سید مخدوم لکھنؤ سے علم حاصل کیا، تاج اللغات کی ترتیب میں شریک رہے۔ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ۱۲۴۴ھ (۱۸۲۹ء) میں بہ مرض ہیضہ وفات پائی اور اپنی مسجد واقع بھوانی ٹولہ کے حجرے میں دفن ہوئے۔

(۲) انہیں دادا ابوالحسن کہتے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ سفر ہجرت کر کے سرحد پہنچے لڑائیوں میں شریک رہے، بالاکوٹ میں شہادت پائی۔

(۳) پٹنہ کے ایک رئیس مولوی فتح علی کے صاحبزادے اور رفیع الدین حسین خاں کے نواسے تھے، جو بہار کے ناظم رہ چکے تھے، دنیوی جاہ وحشمت کی فراوانی میں پیدا ہوئے اور اسی حالت میں پرورش پائی، لیکن سید صاحب کے ساتھ تعلق پیدا ہوا تو حالت یکا یک بدل گئی، پھر زندگی کا ایک ایک لمحہ جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کر دیا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد انہیں نے جہاد کا علم از سر نو بلند کیا، ان کے مفصل حالات موقع پر بیان ہوں گے۔

مقرر کرایا، استاد شاگرد دونوں پہنچے، سید صاحب نے دو گھنٹے تک وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کی تفسیر ایسے پرتاثیر انداز میں بیان فرمائی کہ استاد شاگرد دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا، اسی وقت دونوں نے بیعت کرلی۔

مولانا ولایت علی نے تعلیم چھوڑ دی اور سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی چلے گئے۔ جماعت کے دوسرے آدمیوں کی طرح ہر کام میں برابر شریک رہتے تھے۔ مثلاً اینٹیں تھاپتے، گارا بناتے، جنگل سے لکڑیاں لاتے، فرصت پاتے تو شاہ اسماعیل صاحب سے پڑھتے۔

دو ہندو بھی سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، آپ نے ایک کا نام عبدالہادی اور دوسرے کا عبدالرحمٰن رکھا۔ رحیم بخش خیاط، احسان علی چوبدار اور عبدالستار عطار نے بھی بیعت کی، آخر الذکر سفر جہاد میں بھی ہمراہ تھا۔ مولوی نور احمد نگرامی (۱) نے مینڈو خاں (۲) رسالدار کے اہل لشکر کے طرف سے دعوت کی، جس میں مینڈو خاں کے بھائی عبداللہ بیگ خاں نے چار سو سواروں کے ساتھ بیعت کی۔

مینڈو خاں نے بھی بیعت کرلی تھی، اور اپنے لئے دعاء کرائی تھی، سید صاحب نے یہ شرط لگائی تھی کہ جو مسافر اس کی لین میں آجائیں ان کی مہمانداری کا حق ادا ہوتا رہے۔

حمزہ خاں رام پوری نے بھی اسی زمانے میں لکھنؤ پہنچ کر سید صاحب کی بیعت کی۔ تفصیل حمزہ خاں کے حالات میں ملے گی۔

(۱) مولوی نور احمد نگرامی سید صاحب کے ساتھ جہاد پر گئے، بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے، انہوں نے سید صاحب کے حالات میں ایک کتاب "نور احمدی" کے نام سے مرتب کی تھی جس کی پوری رواتیوں کی تصدیق سید صاحب سے کرلی تھی۔ یہ کتاب غالباً جنگ کے بعد بالاکوٹ کی آتش زنی میں جل گئی۔

(۲) مینڈو خاں، بدل خاں رئیس دہلی کی اولاد میں سے تھے۔ لکھنؤ پہنچ کر مستاجری کی بدولت بڑے صاحب ثروت بن گئے۔ پہلے رسالدار بنے، پھر خیر آباد اور بہرائچ کی علاقہ داری ملی، عبداللہ بیگ خاں ان کے بھائی تھے۔ مینڈو خاں کا عروج ختم ہوا تو خاندان کے افراد دہلی آگئے، پھر سلطنت آصفیہ میں ملازمت کا سلسلہ جاری ہوا، اس خاندان کے افراد میں سے ہمارے زمانے میں منظور احمد خاں نے بڑا عروج پایا، منظور جنگ کا خطاب ملا اور تعلق دار بن گئے تھے، تقسیم کے بعد فوت ہوئے۔

فاسقوں کی اصلاح

لکھنؤ میں چوروں اور فاسقوں کا ایک مشہور گروہ تھا، جس کے سرعسکر امان اللہ خاں تھے، ان کے بھائی سبحان خاں، مرزا ہمایوں بیگ، غلام حیدر خاں، صدو خاں اور غلام رسول خاں وغیرہ اس میں شامل تھے۔ یہ طمطراق کے ساتھ چوریاں کرتے اور جو کچھ ہاتھ آتا اسے عیش وعشرت میں اُڑاتے۔

ان میں سے غالباً امان اللہ خاں، سبحان خاں اور میرزا ہمایوں بیگ ایک روز شاہ پیر محمد کے ٹیلے کی مسجد میں وعظ سننے کیلئے آگئے۔ لوگوں کو ان کے جرائم پیشہ ہونے کا حال معلوم تھا، سید صاحب کو سب کچھ بتادیا۔ آپ نے بڑی ہی شفقت سے مصافحہ ومعانقہ کیا، عزت سے پاس بٹھایا، تھوڑی دیر بعد آپ نے پوچھا: آپ بھائی کیا کام کرتے ہیں؟ وہ جھوٹ بولنے کیلئے تیار نہ ہوئے، دوایک مرتبہ سوال کا جواب ٹالا، پھر صاف صاف اپنا پورا حال بتادیا اور ساتھ ہی عرض کیا کہ ہم اسی وقت آپ کے ہاتھ پر تمام بری باتوں سے توبہ کرتے ہیں۔ یہ بھی بتادیا کہ ہم آپ کی شہرت سن کر محض دیکھنے کیلئے آگئے تھے، بیعت کا ارادہ نہ تھا لیکن آپ کے اخلاقِ عالیہ دیکھ کر آرزو پیدا ہوئی کہ کیوں نہ اپنی عاقبت درست کرلیں۔ سید صاحب نے ان سے بیعت لی، پھر ان کے دوسرے ساتھی بھی آکر بیعت ہوئے۔

سید صاحب جب رائے بریلی گئے تو امان اللہ خاں اور میرزا ہمایوں بیگ ساتھ ہوگئے، دوسرے اصحاب بھی جانا چاہتے تھے لیکن سید صاحب نے انہیں روک دیا اور فرمایا کہ ابھی اپنے مکان پر رہو، جب ہم جہاد کے لئے نکلیں گے تو ساتھ لے لیں گے۔ اس اثناء میں ان کے لئے فقیر محمد خاں رسالدار کے ہاں سے دس دس روپے ماہوار اس شرط پر مقرر کرادیے کہ چاہیں تو یہ لوگ گھر پر رہیں، چاہیں حاضر رہیں۔

چنانچہ ان میں سے امان اللہ خاں، مرزا ہمایوں بیگ اور غلام رسول خاں جہاد میں شریک تھے، آخر الذکر نے اکوڑہ کی جنگ میں شہادت پائی۔ امان اللہ خاں جنگ بالاکوٹ کے بعد ٹونک آ گئے تھے۔ میدانِ بالاکوٹ میں یہ آخری شخص تھے جنہوں نے سید صاحب کو زندہ دیکھا اور آپ کے آخری حالات کے بارے میں جتنی چشم دید روایتیں مہیا ہوسکیں، ان میں سے امان اللہ خاں کی روایت سب سے آخری ہے۔

معتمد الدولہ کی روش بدل گئی

ہم بتا چکے ہیں کہ معتمد الدولہ آغا میر نائب السلطنت اودھ ہی نے سید صاحب کو دعوت نامہ بھیج کر لکھنؤ بلایا تھا، یہاں ہزاروں آدمی آپ کے مرید بن گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان میں خاصی تعداد شیعہ حضرات کی تھی، اس وجہ سے اکابر کو تشویش لاحق ہوئی، سبحان علی خاں، تاج الدین حسین خاں (۱) اور بعض دوسرے حضرات نے سید صاحب کے وجود کو سلطنت اور امن عامہ کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ بتا کر معتمد الدولہ کے پاس شکایت پہنچائی، اس نے چوبدار کی معرفت پیغام بھیج دیا کہ شیعہ حضرات کو حلقۂ ارادت میں داخل نہ کیا جائے۔ سید صاحب نے بے توقف جواب دیا کہ میں نصیحت کو روک نہیں سکتا، کسی پر جبر نہیں کرتا، جو آئے گا اسے پیغامِ حق سنانے میں کوتاہی نہ کروں گا۔

آغا میر جیسے مختار کل کے لئے یہ پیغام بالکل خلاف امید تھا اس نے پھر کہلا بھیجا کہ اگر آپ کو کوئی صدمہ پہنچا تو مجھے بری الذمہ سمجھئے۔ سید صاحب نے پھر جواب دیا کہ میں عوام کو نامِ خدا کی تلقین کرتا ہوں، اگر تم لوگوں کا ارادہ فساد کا ہے تو اس کے ذمہ دار تم ٹھہرو گے، میں بالکل بے فکر ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ پروردگارِ لایزال کے حکم کے بغیر

(۱) سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں ذات کے کنبوہ تھے۔ کہتے ہیں کہ پہلے سرکار انگریزی میں تحصیل دار تھے، سعادت علی خاں نے انہیں اپنے ہاں ملازم رکھا، بڑا عروج پایا، سبحان علی خاں آغا میر کا نائب بن گیا تھا بعد میں بھی برسر عروج رہا۔

مجھے کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔

آغا میر نے تیسری مرتبہ فقیر محمد خاں رسالدار کو واسطہ بنایا اور کہا کہ سید صاحب کو سمجھاؤ ورنہ دو چار توپیں بھیج کر ان کی قیام گاہ کو مسمار کرادوں گا۔ فقیر محمد خاں یہ پیغام لے کر آئے تو سید صاحب نے فرمایا:

> آپ میرے قدیمی آشنا ہیں اور میرا حال جانتے ہیں، یہ بات مجھ سے نہ ہوگی کہ کلمۂ حق سے رک جاؤں، دو چار توپیں تو کیا چیز ہیں، میں تو سو توپوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ اگر مالکِ حقیقی میرا مددگار ہے تو مجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔

یہ حالات شاہی ملازموں سے سید صاحب کے مریدوں کو معلوم ہوئے تو انہوں نے آپ کی خدمت میں پیغام بھجوایا کہ ہم جاں نثاری کیلئے حاضر ہیں، لیکن آپ نے ان سے بھی کہہ دیا کہ بالکل امن چین سے بیٹھے رہو، مالکِ حقیقی کی حفاظت میرے لئے کافی ہے۔ فقیر محمد خاں رسالدار سے فرمایا:

> اگر کہا جاتا کہ تم ہماری رعیت ہو، شہر سے چلے جاؤ تو اس میں کچھ عذر وحیلہ نہ ہوتا، ہم مان لیتے۔ لیکن یہ کیا بات ہوئی کہ کلمۂ خیر لوگوں کو تعلیم نہ کرو؟ یہ بات اسلام کے خلاف ہے، طالبِ خدا سنی ہو یا شیعہ، جو میرے پاس آئے گا، میں اس کو ضرور راہِ حق سکھاؤں گا۔ میرے جو مرید ہیں وہ بھی بے شک یکسو رہیں اور فساد کے وقت نواب کا ساتھ دیں، مجھے کوئی اندیشہ نہیں۔

یہ عزمِ راسخ دیکھ کر معتمد الدولہ خود بخود نرم ہو گیا۔ (۱)

---

(۱) بعض روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد مشتاق ملاقات ہوا۔ لیکن یہ بیان اس وجہ سے قابل قبول نہیں کہ سید محمد علی کی روایت کے مطابق معتمد الدولہ نے خود دعوت بھیج کر سید صاحب کو لکھنؤ بلایا تھا، سید محمد علی نے دعوت نامے کا مضمون بھی لکھ دیا۔ جب تک کوئی مثبت قرینہ اس کے خلاف موجود نہ ہو، سید صاحب کے ابتدائی حالات کے بارے میں سید محمد علی کے بیانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ سید صاحب اور ان کے رفیقوں کا اثر و رسوخ دیکھ کر اور ارکانِ سلطنت کی طرف سے مسلسل شکایات سن کر معتمد الدولہ کی روش بدلی، پھر جب سید صاحب کے عزم و بے خوفی کا حال معلوم ہوا تو خاموش ہو گیا اور رفق و مدارات سے سید صاحب کو ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو مرتبہ سید صاحب کو شہید کرنے کا انتظام کیا گیا اس انتظام کا ذمہ دار تاج الدین حسین خاں تھا، دونوں مرتبہ سازشیوں کو ناکامی ہوئی، جن آدمیوں کو قتل کے لئے بھیجا گیا تھا وہ سید صاحب کے مرید بن گئے۔

معتمد الدولہ کے ہاں دعوت

اس کے بعد معتمد الدولہ نے اپنے ہاں کھانے پر بلایا، سید صاحب اور ساتھیوں کے لئے پالکیاں، گھوڑے اور ہاتھی بھیجے۔ کھانا بہت پرُ تکلف تھا، اس دعوت میں فقیر محمد خاں رسالدار، مینڈو خاں رسالدار، تاج الدین حسین خاں اور سبحان علی خاں بھی شریک تھے۔ مذہبی گفتگو بھی ہوتی رہی، مثلاً سبحان علی خاں نے "الحیاء شعبة من الایمان" والی حدیث کا مطلب پوچھا۔ مولانا عبدالحئیؒ نے پوری حدیث پڑھی، ایمان کی تمام شاخوں کی کیفیت بتائی۔ پھر بتاتے گئے کہ اصحابِ ایمان کے اوصاف ونشانات کیا کیا ہیں، اور اربابِ کفر کی کون کون سی علامتیں ہیں۔ اسی سلسلے میں ان تمام اعتقادی اور عملی خرابیوں کو بے باکانہ کھول کر بیان کیا جو اس وقت اہل لکھنؤ میں رائج تھیں اور خود عمائدِ لکھنؤ بھی ان میں مبتلا تھے۔

سبحان علی خاں نے گفتگو کے دوران میں امیر معاویہؓ کے متعلق سوال کر دیا، مولانا شاہ اسماعیل نے اسکے جواب میں ایسی تقریر فرمائی کہ سبحان علی خاں دم بخود ہو کر بیٹھ گیا۔

سبحان علی خاں اور تاج الدین حسین خاں دونوں عقل و دانش اور علم وفضل میں یگانہ مانے جاتے تھے، معتمد الدولہ کو ان کی رائے اور خوش تقریری پر بڑا بھروسا تھا، لیکن مولانا عبدالحئیؒ اور شاہ اسماعیل کے سامنے دینی یا عقلی علوم میں وہ کیا ٹھہر سکتے تھے، معتمد الدولہ اتنا متاثر ہوا کہ کھانے کے بعد پانچ ہزار روپے بطور نذر پیش کئے، سید صاحب نے ہر چند معذرت کی، لیکن معتمد الدولہ نے قبولِ نذر پر اتنا اصرار کیا کہ سید صاحب نے فقیر محمد خاں

سے کہا کہ آپ لے کر اپنے پاس رکھ لیں۔ یہ وعدہ بھی فرمایا کہ رائے بریلی جانے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر ملیں گے۔

رخصتی ملاقات میں سید صاحب نے ایک طرف معتمد الدولہ کو ان باتوں سے روکا جو رعایا پر ظلم کی حیثیت رکھتی تھیں، یہ فریضہ تبلیغ حق اور توصیۂ خیر کی بجا آوری تھی، نیز ایک نہایت عمدہ، بلند اور قد آور گھوڑی معتمد الدولہ کو بطور تحفہ دی جس کے ساتھ بچہ بھی تھا۔ سید صاحب کا دستور تھا کہ وہ ارادت مندں سے ہر قسم کی نذریں بے تکلف لیتے تھے، لیکن دوسرے آدمی اگر تحائف دیتے تھے تو یا تو انہیں قبول نہیں کرتے تھے، یا بدلے میں کچھ نہ کچھ ضرور دیتے تھے، اگر چہ بہ لحاظ قیمت وہ کم پایہ ہی ہو۔ معتمد الدولہ نے عذر کیا اور کہا آپ تین چار گھوڑے خود میرے اصطبل سے پسند فرما کر لے جائیں، سید صاحب نے فرمایا کہ میں اور کچھ نہیں لوں گا، اور یہ گھوڑی آپ کو قبول کرنی ہوگی۔

جہاد شانِ ایمان ہے

سید صاحب کا عام انداز اگر چہ وہی تھا، جس پر اس وقت کے پیرزادے عمل پیرا تھے، لیکن اول خدمتِ دین اور اصلاحِ عقائد و اعمال کے جس جذبۂ صادقہ سے آپ کا سینۂ صافی معمور تھا، وہ قرنوں سے کسی مصلح میں نظر نہیں آیا تھا۔ دوسرے سید صاحب ہر وقت تلوار، بندوق یا پستول باندھے رہتے تھے، تا کہ مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ تازہ ہوتا رہے، پیرزادوں کا شیوہ و شعار یہ نہ تھا۔ ایک موقع پر عبدالباقی خاں قندھاری نے، جو سید صاحب کا مخلص معتقد تھا، عرض کیا کہ آپ کی ہر ادا محبوب و دلکش ہے، لیکن ایک بات ناپسند ہے، جو آپ کے خاندان والا شان کے شعار سے مطابقت نہیں رکھتی۔ آپ کو وہی زیب دیتا ہے جو آپ کے آباء و اجداد کرتے آئے ہیں۔

سید صاحب نے پوچھا وہ کیا؟ عبدالباقی نے کہا تلوار اور بندوق باندھنا۔ یہ سب

اسبابِ جہالت ہیں۔

یہ سنتے ہی سید صاحب کا چہرہ سرخ ہو گیا، لیکن ضبط و تحمل سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

> خان صاحب! اس وقت آپ کو کیا جواب دوں؟ اگر آپ سوچیں تو یہی کافی ہے کہ یہ وہ اسبابِ خیر و برکت ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو عنایت فرمائے تاکہ کفار و مشرکین سے جہاد کریں، خصوصاً ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اسباب سے کام لے کر تمام اشرار کو زیر کیا اور جہان میں دینِ حق کو روشنی بخشی۔ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو نہ تم ہوتے نہ ہم ہوتے، بالفرض ہوتے تو خدا جانے کس دین و ملت میں ہوتے۔ آپ نے یہ ایسا کلمہ زبان سے نکالا کہ خدا کے بھی گناہگار ہوئے اور اپنا بھی نقصان کیا۔

یوں تو سید صاحب کی پوری زندگی سراسر تبلیغ حق اور قیامِ شریعت کیلئے وقف ہو چکی تھی، لیکن اس زمانے میں دو باتوں پر خاص زور دیتے تھے، اول یہ کہ عورتیں شرک سے احتراز کریں، ظاہر ہے کہ عورتوں کی اصلاح پر پوری امت کی اصلاح کا مدار تھا، اس لئے کہ آئندہ نسلیں انہیں کی آغوش میں پرورش پاتی تھی، دوسرے یہ کہ ہر مسلمان جہاد فی سبیل اللہ کی نیت رکھے، اور اس مقصد عظیم کو کسی بھی وقت فراموش نہ کرے۔

مراجعت

سید صاحب کو بادشاہ سے ملنے کا موقع میسر آتا تو اسے بھی ضرور پیغامِ حق سناتے، لیکن معتمد الدولہ، سبحان علی خاں، تاج الدین حسین خاں وغیرہ ذی رسوخ درباریوں نے ملاقات کی صورت پیدا نہ ہونے دی۔ سید صاحب لکھنؤ سے نکلے تو پہلے دولت گنج میں قیام فرمایا، پھر حسن گنج ٹھہرتے ہوئے رائے بریلی پہنچ گئے۔

زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ معلوم ہوا غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ نے کہیں سے سید صاحب کا ذکر سن لیا اور ملاقات کا مشتاق بن گیا، چنانچہ پھر سید صاحب کی طلبی کے

خطوط پہنچے۔ اس مرتبہ آپ خود نہ گئے، مولانا عبدالحیٔ اور شاہ اسماعیل کو بیس پچیس آدمیوں کے ہمراہ بھیج دیا، یہ بزرگ تقریباً دو ہفتے لکھنؤ میں ٹھہرے رہے، انہیں روزانہ ایک رقم مہمان داری کے طور پر مل جاتی تھی۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بادشاہ سے ملاقات کا سلسلہ مؤخر ہوتا جا رہا ہے تو واپس چلے گئے۔ کہتے ہیں کہ اس مرتبہ بھی تاج الدین حسین خاں اور سبحان علی خاں نے مختلف تدبیروں سے ملاقات کو مشکل بنا دیا تھا، یہ ''وقائع'' کا بیان ہے، ''مخزنِ احمدی'' اس بارے میں بالکل خاموش ہے۔

تعمیرِ مکان

لکھنؤ سے واپسی کے بعد ارادت مندوں اور ملاقات کے شائقوں کی اس درجہ کثرت ہوگئی کہ ایک مرتبہ سید صاحب مہمان خواتین کی زیادتی کے باعث کئی روز تک اپنے گھر بھی نہ جا سکے۔ اس بناء پر مہمانوں کیلئے ایک جداگانہ مکان بنانے کی ضرورت پیش آئی، ایک روز بیلچے اور کلند لے کر خود ایک گڑھے میں اُتر گئے، جس میں پانی تھا اور اینٹیں تھاپنے لگے۔ یہ دیکھتے ہی ارادت منداس کام میں لگ گئے اور پندرہ بیس روز میں پچاس ہزار اینٹیں تیار ہوگئیں۔ دو مہینے میں نیا مکان بن گیا جو بالکل کچا تھا۔ سید صاحب اپنے اہل وعیال کو اس نئے مکان میں لے آئے، جدی مکان مہمان عورتوں کے لئے وقف فرما دیا، مہمان مرد عموماً مسجد یا آس پاس کے حجروں میں ٹھہرتے تھے۔

مولانا ولایت علی تعلیم چھوڑ کر لکھنؤ سے سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی پہنچ گئے تھے، وہ بھی تعمیرِ مکان میں عام ارادت مندوں کے برابر کام کرتے رہے۔ انہیں دنوں میں ان کے والد نے ایک آدمی کو ان کی تلاش میں رائے بریلی بھیجا، وہ اپنے ساتھ روپے اور کپڑے بھی لایا، مولانا ایک موٹا سیاہ تہ بند پہنے ہوئے گارے میں لت پت تھے، آدمی انہیں پہچان نہ سکا، جب لوگوں کے بتانے سے اس نے پہچانا تو مولانا کی حالت دیکھ کر

زار زار رونے لگا، نقود و ملبوسات دے کر بولا کہ انہیں اپنے استعمال میں لایئے۔ مولانا سیدھے سید صاحب کی خدمت میں پہنچے، تمام چیزیں آپ کے سامنے رکھ دیں، چپ چاپ واپس چلے آئے۔

آدمی نے عظیم آباد واپس جا کر ساری کیفیت مولانا کے والد مولوی فتح علی کو سنائی تو وہ اپنے فرزند اصغر فرحت حسین کو لے کر خود رائے بریلی آئے اور سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔

سید صاحب کے فیض صحبت کا ایک کرشمہ یہ بھی تھا کہ امیر گھرانوں کے نونہالوں کے دل میں خدمت دین کی سچی تڑپ پیدا ہوگئی، وہ دنیوی راحت و آسائش کی ہر متاع کو بے دریغ ٹھکرا کر محنت و مشقت، زحمت کشی و جاں فشانی کو عین راحت سمجھنے لگے، یہ اس پاک نفس سید کی تربیت تھی جس کی بدولت اکثر نیاز مند منزلِ عزیمت پر پہنچے۔ عزیمت کو مدارِ کار بنائے بغیر اس میدان میں اترنا بالکل خارج از بحث تھا، جس کی دعوت کا پرچم سید صاحب نے بلند کیا تھا، نظیری نے کیا خوب کہا ہے۔

جائے کہ عاشقان اند، اختر بہ عکس گردد
دل در بلا سعید است، سر در خطر مبارک

سولھواں باب:

عزمِ حج

غیر متوقع فیصلہ

سید صاحب نے نواب امیر خاں سے الگ ہو کر جہاد کیلئے جس مستقل تنظیم کا فیصلہ کیا تھا وہ اس حد تک پوری ہو چکی تھی کہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر کے ایک آزاد مقام پر جا بیٹھتے، اس طرح اصل کام بھی شروع کر دیتے اور تنظیم کو بھی ساتھ ساتھ پورے اہتمام سے چلاتے جاتے۔ چنانچہ لکھنؤ سے مراجعت کے تھوڑی دیر بعد آپ نے اپنے رفقائے خاص یعنی شاہ اسماعیل، مولانا عبد الحئی اور بعض دوسرے اصحاب کو رائے بریلی سے رخصت فرما دیا تھا کہ اپنے خانگی معاملات کے انتظامات سے پوری فراغت حاصل کر لیں، تا کہ اطمینان و دلجمعی سے جہاد میں مشغول ہو سکیں۔ پھر اہل وعیال یا جائدادوں کی کوئی الجھن ان کی یکسوئی میں خلل انداز نہ ہو سکے، راہِ ہجرت میں قدم اٹھانے کا قطعی فیصلہ ہو چکا تھا، صرف اس امر کا انتظار تھا کہ جن اصحاب کو ساتھ جانا ہے وہ فارغ ہو کر پہنچ جائیں، اس اثناء میں اچانک آپ نے حج کا ارادہ فرما لیا۔

روایت ہے کہ ایک روز بعد نمازِ اشراق آپ مسجد تکیہ کی چھت پر چلے گئے، وہاں سے آواز دی کہ جتنے بھائی موجود ہوں سب چھت پر آ جائیں۔(۱) ارادت مندوں نے

(۱) سید صاحب ارادت مندوں کو عموماً ''بھائی'' کہہ کر مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ گویا حق دوست اصحاب کی جو جماعت انہوں نے تیار کی تھی وہ سراسر اخوت و برادری پر قائم تھی، ان کے درمیان ایک ہی رشتہ تھا، اور وہ اسلام کا رشتہ تھا۔ جس نے خاندان، نسل یا دنیوی وسائل کے تمام امتیازات مٹا دیے تھے۔ مختلف افراد کو مخاطب فرماتے تو ''بھائی'' کے ساتھ ان لوگوں کے مخصوص القاب شامل کر لیتے مثلاً ''خان بھائی'' یا ''شیخ بھائی''۔

اس حکم کی تعمیل کی، آگے پیچھے چھت پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سید صاحب مسجد کی منڈیر پر جو گھٹنوں سے ذرا اونچی تھی، دونوں ہاتھ ٹیکے کھڑے ہیں اور سئی ندی کی طرف دیکھ رہے ہیں، پھر ارادت مندوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ ہم حج کو چلیں گے۔ اس پر سب کو تعجب ہوا، بعض نے عرض کیا کہ آپ نے تو ہجرت کا ارادہ کر رکھا تھا؟ فرمایا: اب مرضیٔ الٰہی یہی ہے کہ پہلے حج کیا جائے۔

جو اصحاب اس موقع پر موجود تھے، ان کی تعداد معلوم نہیں، صرف مندرجہ ذیل کے نام روایت میں آئے ہیں: مولوی عبدالرحیم کاندھلوی، مولوی پیر محمد بانس بریلی کے، مولوی محمد قاسم پانی پتی، مولوی عبداللہ الہ آبادی اور میاں دین محمد جو سید صاحب کے خادمِ خاص تھے۔

ارادہ کیوں بدلا؟

سوال یہ ہے کہ یکا یک ارادہ کیوں بدلا؟ کیوں ضروری سمجھا کہ آغازِ جہاد سے پہلے حج کر لیں؟ کیا جذبۂ اداءِ فرض اس سلسلے میں محرک بنا تھا؟ یہ جذبہ بجائے خود کتنا ہی قابل قدر ہو، لیکن جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، سید صاحب کے مالی وسائل "مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْہِ سَبِیْلًا" کے مطابق نہ تھے، اور آپ نے حج کیلئے صلائے عام کی جو صدا لگادی تھی، اسے تو اس شرط سے قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی، پھر وہ کس وجہ سے یکا یک اس طرف متوجہ ہو گئے؟

میرے نزدیک اس فیصلے کی وجہ یہ تھی کہ علمائے ہند کے ایک گروہ نے بحری سفر میں اندیشۂ ہلاکت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فریضۂ حج کے اسقاط کا فتویٰ دیدیا تھا، سید صاحب لکھنؤ میں تھے، جب اس قسم کا فتویٰ انکے سامنے پیش ہوا تھا۔ شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحیٔ نے سختی سے اسے رد کرتے ہوئے فرضیت کا اثبات فرمایا۔ ایک صاحب منشی خیرالدین نے

اصل فتویٰ اور اس کا رد شاہ عبدالعزیز کے پاس بھیج کر آخری فیصلہ طلب کیا۔

اسی وقت سے یہ اہم معاملہ سید صاحب کے پیش نظر ہوگا، یہ سوچتے رہے ہوں گے کہ اس فتنے کے سدِ باب کی موثر ترین صورت کیا ہو سکتی ہے؟ نصوصِ شرعیہ کی بناء پر اس کا رد کیا جا سکتا تھا، اور کیا گیا لیکن اتنا ہرگز کافی نہ تھا، دینی حمیت کا چراغ بجھ رہا تھا، استعدادِ عمل ضعیف ہو چکی تھی، ایسی حالت میں بہانہ جو طبیعتوں کیلئے غلط اور بے سرو پا سہارے بھی اور فرض سے کنارہ کشی کی بہت بڑی دستاویز بن سکتے تھے۔ غور و فکر کے بعد سید صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ خود حج کریں، مسلمانوں کو صلائے عام دیدیں کہ جس کا جی چاہے تیار ہو جائے، خواہ اس کے پاس خرچ ہو یا نہ ہو، میں اپنی ذمہ داری پر سب کو حرمین شریفین پہنچاؤں گا اور اللہ کے فضل و کرم سے حج کرا کے لاؤں گا۔

فتوے کا پس منظر

مسلمانوں کے عہد عروج و اقبال میں بھی یہاں سے ہزاروں لوگ حج کیلئے جاتے تھے، امراء کی یہ حالت تھی کہ جب دربار میں کسی کی ہوا اکھڑتی تو وہ حرمین کا راستہ لے لیتا، جو اس دنیا میں ہر مسلمان کی سب سے بڑی پناہ گاہ ہے۔ اس زمانے میں بحر ہند اور بحیرۂ عرب پر عرب جہاز رانوں کا قبضہ تھا، جب پرتگیز ان سمندروں پر چھا گئے تو حجاج کے لئے خطرات پیدا ہو گئے، اس لئے کہ پرتگیز اپنے وطن میں صدیوں تک مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے تھے، اور مسلم دشمنی ان کی فطرت میں رچی ہوئی تھی۔ مغلوں کے عہد میں انھوں نے اور انگریزوں نے کئی مرتبہ حاجیوں کے جہاز کو نقصان پہنچایا اور اس وجہ سے عبرت ناک سزائیں پائیں۔ جب مغلوں کی حکومت کمزور ہو گئی تو فرنگی چیرہ دستیوں میں بے باک ہو گئے۔ اس وجہ سے بعض مسلمان علماء کو عذر تراشیوں کا موقع مل گیا اور انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ سمندر کے سفر میں بعض وقت جہاز ڈوب بھی جاتے ہیں یا ڈبو دیے

جاتے ہیں لہٰذا امنِ طریق باقی نہ رہا، جو من جملہ شرائط حج ہے۔ جب یہ شرط فوت ہوگئی تو مشروط کی فرضیت بھی اصلی حالت پر قائم نہ رہی۔

عبرت ناک بے عزمی

جب مسلمان خوف غیر اللہ سے کاملاً آزاد تھے اوران کے عزم وہمت کی شمشیر کے لئے خطرات ومہالک سنگ فساں کا کام دیتے تھے تو ان کے سفینے ساتوں سمندروں کے سینوں پر رات دن بے تکلف دوڑتے پھرتے تھے۔ وہی تھے جو ایشیاء کا مال یورپ اور یورپ کا مال ایشیاء پہنچاتے تھے۔ وہی تھے جنھوں نے ساری دنیا کے لئے بحری تجارت کی راہیں کھولیں۔ وہی تھے جن کی قیادت میں واسکوڈی گاما افریقہ کے ساحل سے ہندوستان پہنچا۔ وہی تھے جو کولمبس کے بیڑے کو یورپ سے امریکہ لے گئے۔ لیکن جب ان پر زبونیٔ عزم وہمت کی بلا نازل ہوئی تو ان کا سارا زورِ کاوش احکامِ شریعت کو ساقط قرار دینے میں صرف ہونے لگا۔

مسلمانوں کے سامنے فرنگی تاجر آٹھ آٹھ دس دس ہزار میل کے چکّر لگا کر ہندوستان، جزائر شرق الہند اور چین تک پہنچ گئے تھے، حالانکہ ان لوگوں کے سامنے کوئی دینی غرض اور کوئی مذہبی فرض نہ تھا، محض مال وثروت کی فراہمی ان کی جاں بازیوں کا مرجع تھی، لیکن مسلمانوں کی یہ حالت ہوگئی کہ اپنے ایک دینی رکن کی بجا آوری میں تین ہزار میل کے بحری سفر کی ہمت سے بھی محروم ہوگئے اور امکانی خطرات کے عذر کی بناء پر حج کی فرضیت کو ختم کر دینا انھیں ایک لمحہ کے لئے بھی نازیبا معلوم نہ ہوا۔

بے شک مشکلات موجود تھیں، خطرات میں کلام نہ تھا، لیکن دینی حمیت کا تقاضا یہ تھا کہ عزم وہمت کی بناء پر مشکلات کو دور کیا جاتا اور خطرات کی سنگینی کو توڑا جاتا، نہ یہ کہ مشکلات وخطرات کی وجہ سے اصل فرض کی جڑ پر اسقاط کا کلہاڑا رکھ دیا جاتا۔ بدر جہا

زیادہ خطرات کا ہجوم فرنگیوں کی حرصِ مال وزر کو افسردہ نہ کر سکا، لیکن ان مدعیانِ اسلام کے باب میں کیا عرض کیا جائے، جن کیلئے کمتر خطرات کا وجود ایک عظیم دینی فریضے کی بجا آوری میں عناں گیر ہوگیا، یہاں تک کہ انھیں عدمِ فرضیتِ حج کا فتویٰ تیار کرتے ہوئے بھی تامل نہ ہوا؟ تنہا اسی واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کے زمانے میں مسلمانوں کا دینی جذبہ کس درجہ پست وافسردہ ہو چکا تھا اور ان کے فکر وہمت کا زیغ کس منزل پر پہنچ گیا تھا۔

شاہ عبدالعزیز کا فیصلہ

لکھنؤ والا فتویٰ اور شاہ اسماعیل ومولانا عبدالحیٔ کا رد جب آخری فیصلے کیلئے شاہ عبدالعزیز کے روبرو پیش ہوا تو انھوں نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے:

۱ - علومِ دینیہ وعقلیہ میں اسماعیل اور عبدالحیٔ کا پایہ مجھ سے کم نہیں۔

۲ - جن لوگوں نے فریضۂ حج کو ساقط قرار دیا، انکے سامنے فتاویٰ کی دو چار مشہور کتابوں کے سوا کچھ نہیں، حالانکہ ان کتابوں کی سند ہرگز بلند نہیں اور جن معتبر کتابوں پر دین کا مدار ہے، ان سے یہ لوگ بہرۂ وافر نہیں رکھتے۔

۳- ان کے بیان کردہ حالات کی سند درجۂ اعتبار سے ساقط ہے اور ان کے لگائے ہوئے حکموں پر عمل پیرا ہونا سراسر گمراہی کا موجب ہے۔

۴- جن حضرات نے آج فرضیتِ حج کے اسقاط کا فتویٰ دے دیا ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کل نماز روزہ کی معافی کا حکم بھی نہ لکھ دیں گے؟ زکوٰۃ تو ان کے نزدیک بدرجۂ اولیٰ ساقط ہوگی۔

شاہ صاحب مرحوم نے تفسیر عزیزی میں بھی بسلسلہ تشریحات وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِیْ .... الخ مسئلے کے اس پہلو پر توجہ فرمائی تھی اور لکھا تھا:

ہر چند جہاز را گاہے نوبت بہ تباہی عارض شود، اما بیشتر اوقات بہ سلامت

می رسد۔ پس اورا خلاف امن طریق نتواں شمرد۔

ترجمہ : اگرچہ جہاز بعض اوقات ڈوب بھی جاتا ہے، لیکن چونکہ بالاکثر بسلامت منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے، اس لیے گاہ گاہ کی غرقابی کو امنِ طریق کے خلاف نہیں سمجھا جا سکتا۔

لیکن یہ صرف علمی اور نظری بحثیں تھیں اور اصل فتنے کے انسداد کیلئے ایک زبردست عملی اقدام کی ضرورت تھی۔ یہ اقدام ایک صاحب عزم قائد اور ایک بلند ہمت رہنما کی سبقت بالخیرات کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ سید صاحب کو خدا نے اپنے فضلِ خاص سے یہ اوصاف عطا کیے تھے، لہٰذا وہ نظر بہ بظاہر فقدانِ وسائل کے باوجود میدانِ عمل میں آ گئے۔ ان کے سوا کون ایسے اہم کام کا بیڑا اٹھا سکتا تھا؟

وسائل اور عمل

وسائل خود جمع نہیں ہوتے، انسان اپنے عزم وہمت سے ان کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے۔ مسلمانوں کو جب روم وایران کی شاہنشاہیوں کے ساتھ بیک وقت جنگیں پیش آ گئی تھیں تو ان کے پاس کونسے وسائل تھے؟ اور جو تھے، ان کی حیثیت روم وایران کے لامتناہی خزائن کے سامنے کیا تھی؟ لیکن مسلمانوں کے عزم وہمت کے مقابلے میں ان شاہنشاہیوں کے صدیوں کے اندوختے کچھ کام نہ دے سکے۔ قادسیہ، نہاوند اور یرموک کے معرکوں نے ہمیشہ کیلئے دنیا پر آشکارا کر دیا کہ فوجوں کے جنگل، مال وثروت کے انبار اور اسلحہ کے لامتناہی ذخائر انسانی عزم وہمت کے سامنے ہیچ ہیں۔ روحِ ایمان کی کارفرمائی کو مادی ساز وسامان کی فراوانی ہرگز نہیں روک سکتی۔

یہ بڑے بڑے سپہ سالار، جنھوں نے کشور کشائی میں عالمگیر شہرت حاصل کی، کیا سارے سامان ماں کے پیٹ سے لے کر آئے تھے؟ بالکل معمولی حالت میں کام شروع کیا، اپنے عزم وہمت اور خداداد صلاحیتوں کی بناء پر اتنے سامان فراہم کر لیے کہ ان کے

نام سن کر ہر صاحب وسائل پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔

سید صاحب اس حقیقت کو خوب سمجھ چکے تھے۔ انھیں خدا نے ایسی ہمت عطا فرمائی تھی جسے مشکلات کا کوئی ہجوم شکست نہیں دے سکتا تھا۔ ایسا عزم دیا تھا، جس میں خفیف سی لچک بھی پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر وہ ایمان و اخلاص کی سچی روح سے لبریز تھے۔ انھیں مالک الکل کی ذات پاک پر پورا بھروسہ تھا، لہٰذا باوجود فقدانِ وسائل فتح باب حج کا جھنڈا اُٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے عزم و اخلاص کی برکت سے وسائل خود بخود فراہم ہوتے گئے، جیسا کہ آئندہ ابواب کے ملاحظے سے واضح ہوگا، اور جس دروازہ کو بے عزم علماء بند کرنے کے درپے تھے، وہ اس طرح کھل گیا کہ پھر کسی کو اسے بند کرنے کیلئے ہاتھ بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔

خطوطِ دعوت

بہر حال سید صاحب چونکہ فتح باب حج کی غرض سے اٹھے تھے، اس لئے یہ فرض ایسے طریقے پر بجالانے کا فیصلہ کرلیا کہ ہندوستان کے طول و عرض میں اس کی اہمیت کا غلغلہ بلند ہو جائے اور خطراتِ طریق کے عذر تراشوں کا ہر فتوائے دجل اس غلغلے کی موجوں میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے۔ چنانچہ آپ نے اپنے تمام ارادت مندوں کو سید زین العابدین (ابن سید احمد علی، خواہر زادۂ سید صاحب) سے خط لکھوائے، جن کا مضمون یہ تھا:

> ہم واسطے اداءِ حج کے بیت اللہ جاتے ہیں۔ جن جن صاحبوں کو حج کرنا منظور ہو، انھیں اپنے ہمراہ لائیں۔ مگر یہ حقیقت ہر ایک پر واضح کردیں کہ ہمارے پاس نہ کچھ مال ہے، نہ خزانہ، محض اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے جاتے ہیں۔ اس کی پاک ذات سے قوی امید ہے کہ وہ اپنے فضل سے ہماری مراد پوری کرے گا اور جہاں کہیں راستے میں واسطے حاجت ضروری کے خرچ نہ ہوگا،

وہاں ٹھہر کر ہم لوگ محنت مزدوری کریں گے۔ جب بخوبی خرچ جمع ہو جائے گا تب وہاں سے آگے کو روانہ ہوں گے۔ عورتیں اور ضعیف مرد جو مزدوری کے قابل نہ ہوں گے، ڈیروں کی نگرانی پر رہیں گے، اور اس خرچ میں کمانے والے اور ڈیروں پر رہنے والے سب برابر کے شریک ہوں گے۔

جن صاحبوں کو یہ خط بھیجے گئے، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: مولانا عبدالحیٔ (بڑھانہ)، مولانا شاہ اسماعیل (دہلی) مولوی وحید الدین، انکے بھائی حافظ قطب الدین اور ان کے والد حافظ معین الدین (پھلت)، مولانا وجیہ الدین، حافظ عبدالرب، حکیم مغیث الدین اور انکے بھانجے شہاب الدین (سہارنپور)، ملّا دوندے (بھاؤپور)۔(۱)

اقربا کو دعوت

یہ تمام خطوط جان محمد پنجلاسہ والے کے ہاتھ بھیجے گئے تھے، اس لئے بھی کہ اس زمانے میں ڈاک کا انتظام نہ تھا اور اس لئے بھی کہ قاصد ہر مکتوب الیہ پر سید صاحب کے عزمِ راسخ کی کیفیت پوری طرح واضح کر دے۔ تھوڑی ہی مدت میں تمام ارادت مندوں کی طرف سے جوابات آ گئے۔ ان میں سے ایک جواب یہ تھا:

بشارت نامہ ہدایت شمامہ آیا۔ نہایت معزز و ممتاز اور خوش دل و سرفراز فرمایا۔ کیفیت فیض طویت جو اس میں درج تھی، دریافت ہوئی۔ انشاء اللہ عن قریب حاضر خدمت سراپا برکت ہونگے اور موافق ارشاد ہدایت بنیاد حضور پرنور وافر السرور کے جو صاحب عازم بیت اللہ ہونگے، انھیں ساتھ لائیں گے۔

اس اثناء میں سید صاحب نے اپنے اقربا کو بھی دعوتِ عام دے دی، خواہ وہ تکیے میں رہتے تھے یا قلعہ میں، نصیر آباد میں تھے یا جائس میں۔ بلکہ رائے بریلی کے پٹھانوں

(۱) وقائع ص:۲۱۷۔ روایت میں ہے کہ جس طرح حکیم مغیث الدین کی ذات بابرکت سے سہارنپور والوں کو ہدایت ہوئی تھی اسی طرح سے ملا دوندے کے سبب اطراف و نواحِ سہارنپور میں بے شمار لوگ راہِ حق پر لگے۔

اور عام مسلمانوں سے بھی کہا کہ جس جس کا جی چاہے تیار ہو جائے، خرچ کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔ زیادہ تر اقربا ابتدا میں متوقف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ علماء نے تو امنِ طریق نہ ہونے کے باعث اہل ثروت پر بھی حج فرض ہونے سے اختلاف کیا ہے، آپ کے پاس تو ایک دن کا خرچ بھی موجود نہیں۔ پھر کیوں عزیزوں کو خراب اور پریشان کرنے کے درپے ہیں؟ لیکن سید صاحب سب سے کہتے تھے کہ ساری تنگی رائے بریلی میں ٹھہرے رہنے تک ہے۔ یہاں سے نکلیں گے تو دیکھ لینا خدائے قدیر کس طرح ہر ضرورت کا سامان مہیا کرتا ہے۔ بہر حال میں ہر شخص کو پہلے حرمین بھجواؤں گا اور خود سب کے آخر میں جاؤں گا۔ چند اقربا ابتدا ہی سے تیار تھے: سید محمد یعقوب (برادر زادۂ سید صاحب) مع والدۂ ماجدہ، سید محمد علی، سید احمد علی، سید حمید الدین اور سید عبدالرحمٰن (خواہر زادگان سید صاحب) مع والدہ و اہل و عیال۔ سید صاحب کی خالہ (سید محمد کی خوش دامن) سید محمد ظاہر، سید محمد عمر نصیر آبادی، میاں محمد قائم جائسی (سید صاحب کے ہم زلف)۔

ایک روایت میں ہے کہ سید محمد علی ابتدا میں تنہا تیار ہوئے تھے۔ سید صاحب انھیں ملّا کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک روز پوچھا کہ بال بچوں کو کیوں ساتھ نہیں لیتے؟ سید محمد علی نے عذر پیش کیے تو فرمایا:

> بھائی! شاید موت کا ڈر ہے۔ بالفرض والتقدیر موت پیش بھی آ جائے تو نہیں سنا کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد؟ مع ہذا حج و عمرہ کا ثواب ملے گا نیز شرف شہادت، جس کا جویا ہر مسلمان ہے۔

اس کے بعد سید محمد علی بھی مع اہل و عیال تیار ہو گئے۔

عازمین کی آمد

سید صاحب جس زمانے میں کانپور کے دوسرے دورے سے رائے بریلی واپس جا رہے تھے تو کوڑا میں شیخ ولی محمد اور شیخ عبدالحکیم (باشندگانِ پھلت) ملے اور بتایا کہ

مولانا عبدالحیٰ تیس پینتیس اصحاب کے قافلے کے ساتھ آ رہے ہیں۔ انھیں تو تین روز کے لئے کان پور والوں نے روک لیا۔ دلمؤ کے گھاٹ پر عازمین حج کا یہ قافلہ سید صاحب سے ملا۔ رائے بریلی پہنچے تو اقربا کو یقین ہوا کہ حج کا ارادہ پختہ ہے، اس لئے کہ مولانا عبدالحیٰ قافلے کو لے کر پہنچ گئے تھے۔ انھیں دنوں میں مولانا شاہ اسماعیل کا خط ملا کہ حکیم مغیث الدین اور مولوی وجیہ الدین سہار نپوری، مولوی وحید الدین اور حافظ قطب الدین پھلتی وغیرہ عورت و مرد اڑھائی سو کا قافلہ جس میں خود میں بھی شامل ہوں، گڑھ مکتیشر کے گھاٹ سے کشتیوں پر سوار ہو چکا ہے۔ اس وقت سے سید صاحب نے سفر کا ضروری سامان دلمؤ بھیجنا شروع کر دیا، جہاں سے پورے قافلے کو لے کر کشتیوں پر کلکتہ روانہ ہونا تھا۔

اس زمانے میں اکثر لوگ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر بے سروسامانی کا ذکر چھیڑ دیتے تھے۔ آپ نے ایک روز فرمایا: اگر آج والیٔ لکھنؤ اعلان کر دے کہ جس مسلمان کا جی چاہے حج کے لئے تیار ہو جائے، خرچ میں ادا کروں گا تو کیا لوگ اس اعلان پر یقین نہ کریں گے؟ ایک معمولی دنیوی حکمراں کے اعلان پر آپ لوگوں کو اتنا بھروسا ہے، جس کے وسائل بہر حال محدود ہیں، اور خدائے پاک کے فضل و رحمت پر تکیہ کرنے میں تامل ہے؟ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ یہ کتنی افسوس ناک بات ہے۔ میں اگر عام مسلمانوں کو حج کی دعوت دیتا ہوں تو اسی رحیم و کریم خدا کی رحمت کے بھروسے پر دیتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ اس کی رحمت سے یہ کام پورا ہوگا۔

قافلہ

غرض تمام افراد زن و مرد رائے بریلی میں جمع ہو گئے۔ اس کے بعد جو قافلہ تیار ہوا، اس کی یہ کیفیت تھی:

شاہ اسماعیل اور اصحابِ پھلت وسہارن پور	تقریباً اڑھائی سو
مولانا عبدالحئی کا قافلہ	تقریباً چالیس افراد
سید صاحب کے اقربا	تقریباً چالیس افراد
رائے بریلی، دلمؤ، جائس نصیر آباد وغیرہ کے افراد	تقریباً ایک سو

اس طرح کم وبیش چار سو افراد کا قافلہ تیار ہوگیا، جو شوال ۱۲۳۶ھ کی آخری تاریخ (۳۰- جولائی ۱۸۲۱ء) کو پیر کے دن کامل بے سروسامانی کی حالت میں رائے بریلی سے روانہ ہوا۔

نہ برگ وساز کی پروا، نہ انتظارِ رفیق — یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
اگر خدا پہ بھروسا ہے، ہو یگانہ رواں — خدا سے بڑھ کے نہیں برگ وساز کی توفیق

ستر ہواں باب:

سفرِ حج

(رائے بریلی سے الٰہ آباد تک)

روانگی

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے سید صاحب کا قافلہ رائے بریلی سے دلمؤ روانہ ہوا، جہاں سے کشتیوں پر سوار ہو کر کلکتہ جانا منظور تھا اور پورے قافلے میں کم وبیش چار سو افراد تھے۔ زیادہ تر مرد، ان سے کم تر عورتیں، ان سے کم بچے۔ عام شہرت ہو چکی تھی کہ سید صاحب بڑے قافلے کے ساتھ حج پر جا رہے ہیں اور جو ساتھ جانا چاہے اس کے خرچ کی ذمہ داری اٹھا رہے ہیں۔ اس وجہ سے واقعے نے بہت اہمیت اختیار کر لی تھی اور لوگ جوق در جوق دیکھنے کیلئے چلے آ رہے تھے۔

سید صاحب نے تمام انتظامی معاملات مولوی محمد یوسف پھلتی کے سپرد کر رکھے تھے۔ روانگی کے وقت مولوی صاحب کے پاس ایک سو سے کسی قدر زائد روپے تھے۔ سید صاحب نے ان میں سے بیشتر روپے فقراء ومساکین میں بانٹ دیے۔ سئی ندی کو عبور کر کے ایک باغ میں ٹھہرے اور مختلف اصحاب سے رخصتی ملاقات کی۔ ایک میل جا کر پھر ایک باغ میں ٹھہر گئے کہ جو لوگ پیچھے رہ گئے ہوں وہ بھی ساتھ مل جائیں۔ وہاں سے چلنے کا ارادہ فرمایا تو مولوی محمد یوسف کے پاس صرف سات روپے رہ گئے تھے۔ سید صاحب نے وہ بھی ان فقرا کو دلا دیے جنھیں پہلی تقسیم میں حصہ نہیں ملا تھا، پھر ننگے سر کھڑے ہو کر

یوں دعاء کی:

> اے کریم کارساز! اتنی مخلوق اس ناچیز کے ہمراہ ہوگئی ہے۔ تو مجھ ناچیز پر اپنا لطف فرما۔ اپنے الطاف واکرام کی برکت سے ان سب کو بہ طریق احسن منزلِ مقصود پر پہنچا۔

اس طرح وہ برگزیدۂ بارگاہِ الٰہی بڑی جماعت کو ساتھ لے کر بالکل خالی ہاتھ حج کے لئے نکلا۔ ہزاروں روپے کا خرچ درپیش تھا، مگر اسے ایک لمحہ کے لئے بھی تشویش نہ تھی۔ خدائے عزوجل کے فضل ورحمت پر اس درجہ پختہ اور غیر متزلزل توکل کی مثالیں ہر دور اور ہر عہد میں نہیں مل سکتیں۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اسبابِ ظاہری کے کامل فقدان سے سفرِ حج شروع کرنے میں مصلحت تھی کہ اسکی فرضیت ساقط کرنے والوں کے اوہام ووساوس کی زیادہ مؤثر تردید ہو جائے۔

قافلے کا نقشہ

سید محمد علی نے ''مخزن'' میں قافلے کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگوں میں عجیب وغریب باتیں ہو رہی تھیں۔ ایک کہتا کہ میرے پاس صرف تین منزل کا خرچ ہے، دوسرا کہتا کہ میرے پاس تو اس کا ایک حبہ بھی نہیں، خدا جانے مجھ پر کیا گذرے۔ تیسرا کہتا کہ میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ جن مساکین کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں، وہ منزلِ مقصود پر کیوں کر پہنچیں گے اور انھیں قوتِ لایموت کہاں سے ملے گی؟ سید صاحب کے ایک رفیق خاص نے یہ گفتگو سنی تو کہا: جس کریم مطلق کے خزانۂ غیب سے دنیا بھر کے مہمانوں کو، جو دوست دشمن کے گھر روزانہ اترتے ہیں، طرح طرح کے کھانے ملتے ہیں، کیا آپ لوگوں کو وہ اپنے انعام واکرام سے محروم رکھے گا؟ حالانکہ آپ اس کے خانۂ فیض کاشانہ کا ارادہ لے کر نکلے ہیں؟

موسم کی یہ کیفیت تھی کہ کبھی بارش شروع ہو جاتی کبھی تیز دھوپ نکل آتی۔ راستہ کیچڑ

سے پٹا ہوا تھا۔ جگہ جگہ نالے بہہ رہے تھے۔ رفیقانِ خاص میں سے کوئی پھسل کر گر پڑتا تو مالک حقیقی کا شکر ادا کرتا ہوا اٹھتا اور کہتا: باری تعالیٰ! تیرے احسان کے قربان جاؤں کہ تیری راہ میں گرا۔ اس طرح سے تیرے فضل لایزال کی برکت سے میری سابقہ ہرزہ گردیوں کی تلافی کا موقع پیدا ہوگیا۔ گویا خواجۂ شیراز کا یہ شعر سب کے جمالِ حال کا ترجمان تھا:

در بیاباں گر ز شوقِ کعبہ خواہی زد قدم
سرزنش ہا گر کند خارِ مغیلاں غم مخور

سید صاحب کی ہدایات

سید صاحب نے اس سفر کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات فرمائیں، ان سب کا حصر مشکل ہے لیکن مندرجہ ذیل ہدایات خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

> کسی سے سوال نہ کرو۔ تقویٰ کو شعار بناؤ۔ پختہ ارادہ کرلو کہ مزدوری کریں گے۔ جو کچھ ملے گا، اس میں سے آدھا کھانے کے مصرف میں لائیں گے، آدھا زادِ راہ کے لئے بچائیں گے۔ میں اپنے حج کو ہمراہیوں کے حج پر مقدم نہیں کروں گا، اگر زادِ راہ کم ہوگی تو کلکتہ سے تھوڑے تھوڑے آدمی بھیجتا جاؤں گا۔ جب سارے ساتھی چلے جائیں گے تو خود جاؤں گا، لیکن رب العالمین کی ذاتِ پاک سے امید ہے کہ سب کے لئے سامانِ سفر بخوبی درست ہو جائے گا۔

اہل دلمؤ کو پہلے سے علم تھا کہ سید صاحب آنے والے ہیں۔ انھوں نے چند آدمی اس غرض سے رائے بریلی بھیج دیے کہ آپ کا کوچ ہوتے ہی جلد سے جلد خبر پہنچا دیں تاکہ ضرورت کے مطابق کھانے کا انتظام پہلے سے کرلیا جائے۔ ان آدمیوں نے بتایا کہ قلعہ قیام کے لئے خالی کر رکھا ہے۔ جگہ صاف کر کے فرش بچھا دیا ہے۔ پانی کے گھڑے

موجود ہیں۔ مستورات وہاں ٹھہریں گی۔ مردوں کے لئے ٹھہرنے کا الگ سے انتظام ہے۔ سید صاحب نے اس اہتمام پر پسندیدگی کا اظہار فرمایا، لیکن تاکید کردی کہ جب تک ہم دلموَ میں داخل نہ ہو جائیں، کھانا نہ پکایا جائے اور ہمارا یا ساتھیوں کا جتنا اسباب پہنچے، اس کی پوری حفاظت کی جائے۔

سید صاحب مردوں کے ساتھ نکلے، زنانہ سواریاں ایک دو روز بعد روانہ ہوئیں۔ سید عبدالرحمٰن (خواہر زادۂ سید صاحب) کو ان کی حفاظت اور انتظامِ سفر کے لئے مقرر کر دیا گیا تھا۔

دلموَ میں قیام

جب دلموَ دو میل کے فاصلے پر رہ گیا تو سید صاحب ایک باغ میں ٹھہر گئے، بستی کے لوگ پیشوائی کے لئے آئے ہوئے تھے۔ ان میں دو حقیقی بھائی بھی تھے، جن میں اس بناء پر جھگڑا ہو گیا کہ دونوں سید صاحب کی دعوت میں تقدم پر اصرار کر رہے تھے۔ آپ کو معلوم ہوا تو دونوں کو بلا کر فرمایا کہ ہم دونوں کے ہاں باری باری دعوت کھائیں گے۔ پھر چھوٹے بھائی سے کہا کہ یہ آپ کے بڑے بھائی ہیں، ان کا آپ پر حق ہے۔ جو یہ کہتے ہیں وہی سہی۔ پہلے انھیں دعوت کر لینے دو۔ اس طرح مناقشہ ختم ہو گیا۔

سید صاحب پیر کے دن دلموَ پہنچے تھے۔ متفرق سواریوں اور بار برداریوں کے بائیس روپے واجب الادا تھے۔ اس اثناء میں لوگوں سے نذریں ملتی رہیں۔ آپ نے بائیس روپے وہ ادا کیے تین روپے بطور انعام دیے۔ دلموَ میں ٹھہر کر پانچ کشتیاں سو روپے فی کشتی کے حساب سے (غالباً بنارس تک) کرایے پر لیں اور سو روپے ان لوگوں کو بطور پیشگی دے دیے۔ بعد نمازِ جمعہ کشتیوں پر سوار ہوئے۔ گویا چار راتیں دلموَ میں گزاریں۔

چونکہ سب ساتھی کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتے تھے، اس لئے سید صاحب نے قوی

ساتھیوں کو الگ کر کے حکم دے دیا کہ وہ دریا کے کنارے کنارے پیدل چلیں ۔ یہ بھی فیصلہ ہو گیا کہ مولانا شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحیٔ اور مولوی محمد یوسف پھلتی باری باری ان کے ساتھ چلیں۔

قیام ڈلمؤ میں ایک مرتبہ بھی کھانا پکانے کی نوبت نہ آئی، اس لئے کہ مقامی لوگ شوق و اصرار سے دعوتیں کرتے رہے، روزانہ مولانا عبدالحیٔ وعظ فرماتے تھے، جس میں توحید اور اتباع کتاب وسنت کی علاوہ حج وعمرہ کے فضائل تفصیل سے بیان کیے جاتے تھے۔

سید صاحب کا وعظ

ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ مولانا کا وعظ آپ لوگوں نے سنا، اب کچھ ہماری باتیں بھی سن لو۔ پھر جو کچھ زبانِ مبارک پر جاری ہوا، یہ تھا (میں نے پوری کوشش کی ہے کہ الفاظ بھی سید صاحب کے محفوظ رکھے جائیں):

بھائیو! اگر آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر اس نیت سے حج وعمرہ کے لئے جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہو، تو لازم ہے کہ آپس میں ایسا اتفاق اور تعلق رکھیں جیسے ایک ماں باپ کے نیک بخت بیٹے ہوتے ہیں۔ سب بھائی ہر ایک کی راحت کو اپنی راحت اور ہر ایک کے رنج کو اپنا رنج سمجھیں۔ ایک دوسرے کے کاروبار میں بلا انکار حامی و مددگار رہیں۔ ایک دوسرے کی خدمت کو ننگ وعار نہ جانیں، بلکہ عزت وافتخار سمجھیں۔ یہی کام اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے ہیں اور جب ایسے اخلاق آپ میں ہوں گے تو غیر لوگوں کو بھی شوق پیدا ہوگا کہ یہ عجیب قسم کے لوگ ہیں، ان میں شامل ہوا چاہیے۔

برہانِ ربوبیت

اللہ تعالیٰ کے فضل پر کامل بھروسا کریں۔ کسی مخلوق سے کسی چیز کی آرزو ہرگز نہ رکھیں۔ رزاقِ مطلق اور حاجت روائے برحق وہی پروردگارِ عالم ہے۔

بے حکم اس کے کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا۔ دیکھو تو، جس وقت بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا کون اسے روزی پہنچاتا ہے؟ وہی بچے کو آسانی سے باہر لاتا ہے اور اس سے پہلے ماں کی چھاتیوں میں اس کی روزی تیار رکھتا ہے۔ پھر اسی کی تعلیم سے بچہ دودھ پیتا ہے۔ جتنا چاہے پی لیتا ہے۔ باقی دودھ مکھی، بال اور گرد وغبار سے بالکل محفوظ ماں کی چھاتیوں میں جمع رہتا ہے کہ بچہ جب چاہے تازہ تازہ پیے۔ یہ اسی پروردگارِ عالم کی روزی رسانی ہے، جو کچھ مدت بعد دودھ چھڑا کر اسے دوسری غذا کی تعلیم فرماتا ہے۔ اسی طور پر پرورش پا کر وہ بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہوتا ہے، جو روزی کسی کی تقدیر میں لکھی ہے، وہ بہر صورت بے شک وشبہ اسے پہنچے گی۔

قادرِ برحق

خود اپنی حالت پر نظر ڈالو۔ ایک معمولی آدمی ہم لوگوں کو کھانے کی دعوت دے جاتا ہے۔ وہ چاہے جھوٹ کہہ جائے لیکن اس پر اعتماد کر کے ہم اپنے گھر کھانا پکانے کی ممانعت کر دیتے ہیں۔ اگر غازی الدین حیدر والیٔ لکھنؤ وعدہ کرے کہ میرا فلاں امیر بیت اللہ شریف کو جاتا ہے، اس کے ہمراہ جو شخص جائے گا، اس کے زادِ راہ کا انتظام میرے ذمے ہوگا تو ہزاروں آدمی خوشی بہ خوشی جانے پر مستعد ہو جائیں گے۔ وعدہ خلافی کا شک وشبہ اپنے دل میں نہ لائیں گے۔ مجھ سے تو شاہنشاہِ عالم، قادرِ برحق، رزّاقِ مطلق نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ اس سفر میں تیرے ساتھ ہوں گے، ان کے کھانے اور کپڑے کے متعلق تو کچھ اندیشہ نہ کر۔ وہ سب میرے مہمان ہیں اور وہ شاہنشاہ وعدے کا سچا ہے۔ وعدہ خلافی کا خفیف سا بھی احتمال نہیں۔ پھر میں کیوں کر سچ نہ جانوں اور کس بات کا اندیشہ کروں؟ وہ آپ سب بھائیوں کی پرورش کرے گا۔

شرطِ سفر

سو حاصل کلام یہ ہے کہ جن بھائیوں کو یہ سب باتیں منظور ہوں اور وہ میرے کہنے کو سچ جانتے ہوں، وہ تو میرے ساتھ چلیں۔ میں رنج وراحت میں ان کا شریک ہوں اور میری یہ باتیں اپنی عورتوں کو بھی سمجھا کر کہہ دیں۔ اگر انھیں یہ منظور نہیں تو ابھی مکان نزدیک ہے۔ وہ تکلیف سفر کی موقوف کریں۔ سفر میں ہر طرح کی تکلیف اور مصیبت بھی پیش آتی ہے اور راحت بھی ہوتی ہے۔ یہ سب باتیں اس غرض سے کھول کر بیان کر رہا ہوں کہ پھر کوئی بھائی کسی بات کا گلہ شکوہ زبان پر نہ لائے۔

مجھے عنایاتِ الٰہی سے قوی امید ہے کہ اس سفر باظفر میں اللہ تعالیٰ میرے ہاتھ سے لاکھوں آدمیوں کو ہدایت نصیب کرے گا۔ ہزاروں لوگ جو شرک و بدعت اور فسق و فجور کے دریا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور شعارِ اسلام سے مطلق ناواقف ہیں وہ پکے موحد اور متقی بن جائیں گے۔

دعائے فتح باب حرمین

میں نے اہل ہند کیلئے جنابِ الٰہی میں بہت دعاء کی کہ:

''الٰہی! ہندوستان سے تیرے کعبے کی راہ مسدود ہے ہزاروں مالدار، صاحبِ زکوٰۃ مر گئے، مگر نفس وشیطان کے بہکانے سے اس بناء پر حج سے محروم ہو گئے کہ راستے میں امن نہیں۔ ہزاروں صاحبِ ثروت اب جیتے ہیں اسی وسوسے میں پڑ کر حج کے لیے نہیں جاتے۔ الٰہی! اپنی رحمت سے ایسا راستہ کھول دے کہ جو ارادہ کرے، بے دغدغہ چلا جائے اور اس نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ رہے۔''

میری یہ دعاء اس ذاتِ پاک نے مستجاب فرمائی۔ ارشاد ہوا:

جب توجہ کرے گا تو یہ راستہ علی العموم کھول دیں گے۔ جو مسلمان بھائی
زندہ ہیں وہ انشاء اللہ بہ چشم خود یہ سب کچھ دیکھ لیں گے۔(۱)

فتح بابِ حج سلطانوں اور فرمانرواؤں کا کام تھا، جنھیں اسباب و وسائل پر وسیع قدرت حاصل ہوتی ہے، لیکن اس دروازے کو کھولنے اور راستے کی ساری مشکلات کو بے حقیقت ثابت کرنے کا شرف سید صاحب ہی کو ملا، جن کے پاس اسلام کی بے میل محبت کے سوا کوئی متاع نہ تھی۔ اسی طرح بابِ جہاد بھی اربابِ سلطنت و حکومت ہی کے ذریعے سے کھل سکتا تھا، جو خیل و خدم اور ثروت و حشم کے مالک ہوتے ہیں، لیکن اس مقدس فریضے کو بھی بارہ صدیوں کے بعد منہاجِ نبوت پر قائم کرنے کی برتری صرف سید صاحب کو حاصل ہوئی:

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

دھئی دھمدھمہ

۴/ذی قعدہ ۱۲۳۶ھ (۳/اگست ۱۸۲۱ء) کو سید صاحب دلمؤ سے روانہ ہوئے (۲) اگلا مقام دھئی دھمدھمہ میں تجویز ہوا تھا جہاں کے شیخ مظہر علی صاحب سید صاحب کے مخلص مرید تھے، اور دلمؤ پہنچ کر دعوت دے گئے تھے۔ مغرب کی نماز کشتیوں پر پڑھی گئی۔ اندھیرا ہو گیا تو دھئی دھمدھمہ کے گھاٹ کا پتہ نہ چل سکا اور کشتیاں آگے نکل گئیں۔ دریا چڑھاؤ پر تھا اور پانی کا زور تھا۔ جو استقبال کی غرض سے کنارے پر کھڑے تھے،

(۱) وقائع ایک نسخہ ص: ۲۲۷-۲۲۹، دوسرا نسخہ ۲۳۲-۲۳۴۔
(۲) سید ابوالحسن علی نے تفصیل یوں بتائی ہے کہ پہلی کشتی میں رائے بریلی اور نصیر آباد کی مستورات سوار تھیں، دوسری میں پھلت، دہلی وغیرہ کی، تیسری میں لکھنؤ کی، چوتھی میں قافلے کے ضعیف و معذور اشخاص، پانچویں میں غالباً سید صاحب اور بعض دوسرے رفقاء تھے۔

انھوں نے آوازیں دیں۔ بڑی مشکل سے کشتیاں روکی گئیں اور خاصے فاصلے پر رسوں کے ذریعہ سے کھینچ کھینچ کر انھیں کنارے پر لگایا گیا۔ مستورات کشتیوں ہی میں رہیں اور ان کیلئے وہیں کھانا پہنچا دیا گیا۔ سید صاحب کیلئے پینس کا انتظام تھا۔ بستی میں پہنچے اور اگلے روز صبح سے ڈیڑھ پہر تک بیعت کا سلسلہ جاری رہا۔ روانگی کے وقت سید صاحب نے وعظ فرمایا۔ اس میں کہا:

بھائیو! حاصل بیعت یہ ہے کہ تم لوگ جو شرک و بدعت کرتے ہو، تعزیے بناتے ہو، نشان کھڑے کرتے ہو، پیروں، شہیدوں کی قبریں پوجتے ہو، ان کی نذر و نیاز مانتے ہو، ان سب کاموں کو چھوڑ دو اور سوائے خدا کے کسی کو اپنے نفع و ضرر کا مالک نہ مانو اور اپنا حاجت روا نہ پہچانو۔ اگر یہ نہ کرو گے تو فقط بیعت سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

ڈگڈگی

دھئی دھمد ھمہ سے روانہ ہو کر کشتیاں ڈگڈگی کے سامنے پہنچیں تو وہاں کا زمیندار شیخ محمد پناہ کنارے پر منتظر کھڑا تھا، اس نے سید صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ کئی روز سے مہمانی کا سامان تیار کر رکھا ہے اور گرد و نواح سے تین سو آدمی بیعت کی غرض سے غریب خانے پر جمع ہیں۔ سید صاحب نے وہاں بھی مقام کیا۔ بیعت کرنے والوں میں محمد پناہ کا لڑکا محمد کفاہ بھی تھا۔

غالباً اسی مقام پر شاہ عطا کریم سلونی نے ایک آدمی کے ہاتھ شیرینی بھیجی تھی۔

صبح کو ڈگڈگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہوگئی تو ملاحوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں، جہاں آس پاس کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دور دور تک اس درجہ خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس اثناء میں کالی گھٹا اٹھی، تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہوگئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گزارنی ہوگی۔

اچانک دور مشعلیں نظر آئیں۔ سمجھا گیا کہ کچھ لوگ کشتیوں کی طرف آ رہے ہیں۔ پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیل کے انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کے پاسِ خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود گھوڑے پر ساتھ آیا ہے۔

کتنہ

وہاں سے آگے بڑھے تو پیر نگر پر، جو مانک پور سے دو کوس ہے، دریا دو دھاروں میں جانا چاہتا تھا، لیکن اس طرف کے دھارے میں چونکہ پانی کم تھا اور رات کو اس میں کشتیاں چلانا مشکل تھا، اس لئے ٹھہر گئے۔ کچھ کھانا دعوت کا بچا ہوا تھا، وہ کھایا۔ ایک دیگ ارہر کی کھچڑی کی پکوائی گئی۔ صبح کے وقت چلے تو کتنہ پہنچے اور آصف خاں رسالدار کے مکان پر قیام کیا۔ مستورات کے لئے حسبِ سابق کشتیوں پر ہی کھانا بھجوا دیا گیا۔ اس جگہ سے قریب ہی موضع گڑھ تھا جہاں کے مولوی یار علی نے فرضیت حج ساقط کر دینے پر قناعت نہیں کی تھی بلکہ سفرِ حج کی (معاذ اللہ) حرمت کا وعظ کہتا رہتا تھا۔

استدلال یہ تھا کہ سمندر کے سفر میں جہاز ڈوب جاتا ہے۔ چونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو" لَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ" اس لیے مولوی یار علی علی الاعلان کہتا رہتا تھا کہ جو لوگ خطرات کے باوجود حج کیلئے جاتے ہیں، وہ قرآن پاک کے اس حکم کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کا عمل سراسر غلط ہے۔

شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحئی چالیس آدمی ساتھ لے کر گڑھ پہنچے۔ شاہ ابراہیم علی کی مسجد میں مولوی یار علی سے گفتگو کی اور بہ دلائلِ واضح اسے اور دوسرے مسلمانوں کو فرضیتِ حج کا معتقد بنایا۔

کیما، اوجھنی اور چپری

کتنہ سے چل کر کشتیاں جہان آباد کے گھاٹ پر رکیں۔ وہاں سے تین کوس پر کیما

ایک مقام تھا جہاں کے شیخ حسن علی پہلے سے سید صاحب کے مرید تھے اور آپ کو اپنے گاؤں ساتھ لے جانے کی غرض سے کٹنہ پہنچے ہوئے تھے۔ چنانچہ جہان آباد کے گھاٹ پر سید صاحب تین روز رکے رہے۔ اس اثناء میں مہمانداری کا سارا انتظام شیخ حسن علی نے اپنے ذمے رکھا۔ پھر اپنے چاروں بھائیوں اور مستورات کو لے کر حج کے ارادے سے ساتھ ہو گئے۔

جہان آباد سے آگے ایک مقام اوجھنی میں ہوا۔ وہاں کے زمیندار شیخ لعل محمد نے دعوت کی اور سیکڑوں آدمی مرید ہوئے۔ آگے بڑھے تو راستے میں ایک انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔ سید صاحب نے اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کیا کہ اس کی دعوت نہ مانیے لیکن میری دعوت قبول کر لینے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے انگریز کی دعوت قبول کر لی۔ دوسرے روز بستی کے لوگوں نے دعوت کی۔ وہاں سے چلے تو چار کوس کے فاصلے پر موضع اسرولی کے زمیندار محمد وزیر نے (جو اوجھنی کے شیخ لعل محمد کا خسر تھا) روک لیا۔ سید صاحب جن لوگوں سے بیعت لیتے تھے، انھیں خود نماز پڑھاتے تھے اور بعض آدمیوں کو دینی تعلیم پر مقرر کر دیتے تھے۔ اسرولی میں بھی یہ انتظامات کیے۔

اسرولی سے چلے تو الہ آباد کے مقابل گنگا سے دوسرے کنارے پر چپری نام ایک موضع میں ٹھہرے۔ وہاں آس پاس سے تین ہزار آدمی بیعت کے لئے آئے ہوئے تھے۔ رات آپ نے چپری میں ہی گزاری۔ وہیں شیخ غلام علی الہ آبادی کے آدمی استقبال کے لئے پہنچ گئے۔

الہ آباد

اگلے روز الہ آباد پہنچے۔ گھاٹ پر شیخ غلام علی رئیس، محمد تقی اور ان کے بھائی عبداللہ

قصاب، شاہ اجمل کے فرزند شاہ ابوالمعالی، قلعہ الٰہ آباد کے داروغہ بستی میاں، رنجیت خاں میواتی، مولوی کرامت علی صدر امین، حافظ اکرام الدین دہلوی، حافظ نجابت علی سوداگر، محمد حسین، عبدالقادر، شیخ سارنگ وغیرہ استقبال کے لئے موجود تھے۔ یہ سب سید صاحب کے ارادت مند تھے۔ لیکن شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دورانِ قیامِ الٰہ آباد میں کوئی سید صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دیں۔ یہ احسان صرف میرے ذمے رہنے دیا جائے۔ ہاں اپنے مکان پر لے جا کر پان کھلائیں، عطر لگائیں، نذر پیش کریں۔ کھانا نہ کھلائیں۔ چنانچہ سید صاحب جب تک الٰہ آباد میں ٹھہرے رہے، پورے قافلے کی مہمانداری شیخ غلام علی ہی نے فرمائی، اور کس شان واہتمام کے ساتھ؟ آج اسکی تفصیلات سن کر شاید اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے۔ حالانکہ شیخ صاحب نے تواضع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا، اس کی محض سرسری کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

قیام وطعام

شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والیٔ بنارس کے مختار تھے۔ انھوں نے سید صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔ باقی قافلے کے لئے مہاراجہ کی بارہ دری خالی کرائی۔ پورے قافلے کیلئے دونوں وقت کا کھانا، قیام گاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا؟ ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہو کر آتیں۔ مثلاً قورما، پلاؤ، شیر مال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔ اس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہو چکی تھی، لیکن شیخ صاحب کے تکلف میں کوئی کمی نہ آئی۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ کم از کم ایک ہزار روپے روزانہ صرف کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اس زمانے کا خرچ ہے جب جنسیں بے حد ارزاں تھیں۔

نذریں

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لئے آتے۔ ایک مرتبہ بعد

نمازِ ظہر، دوسری مرتبہ بعد نمازِ مغرب۔ دونوں مرتبہ بیش بہا نذریں ساتھ لاتے۔ مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور تلواریں۔ بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔ واقف کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ نے اس طریق پر جو نذریں پیش کیں، وہ بحیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی۔

سید صاحب ہتھیاروں کو دیکھ کر فرماتے کہ شیخ بھائی ہم تو حج کے لئے جا رہے ہیں، وہاں ہتھیاروں کا کچھ کام نہیں۔ واپس آ کر جہاد کے لئے نکلیں گے تو لے لیں گے۔ شیخ صاحب عرض کرتے: ''حضرت! اول تو یہ معلوم نہیں کہ آپ کب اور کس جگہ سے علمِ جہاد بلند کریں گے۔ دوسرے خدا جانے میں اس وقت تک زندہ رہوں یا نہ رہوں اور یہ آرزو دل میں رہ جائے۔ ابھی لے لیجئے اور جہاں جی چاہے بہ طورِ امانت رکھوا دیجئے۔''

عازمین حج کی خدمت

اسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔ قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک جوڑی نئے جوتے، مردوں کو دو دو پاجامے، دو دو انگر کھے، دو دو ٹوپیاں اور ایک ایک چادر۔ مستورات کو دو دو پاجامے، دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے دیے۔ سب کو سرعام ایک ایک روپیہ دیا۔ سید صاحب کے اقربا کی خدمت میں دس دس روپے فی کس پیش کیے۔ علماء کی خدمت میں ان کی حیثیت و مرتبہ کے مطابق نذریں گزاریں۔

سید صاحب کے لئے روزانہ پانچ سو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ لے کر آتے۔ دونوں وقت کے کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے۔ ایک روز سید صاحب کی دونوں بیوی کو اسی اسی روپے دیے گئے۔ لطف یہ کہ جب نذریں پیش کرتے تو بڑی ہی انکساری سے تہی دستی کا اظہار فرماتے۔

رخصتی نذرانہ

رخصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے وہ بیس پچیس کشتیوں میں لگا ہوا تھا۔ اس میں مشروع، کمخواب، پشمینے، نینو، ڈھاکے کی ململ، محمودی، بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے، اور کشمیری شال بھی۔ ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔ دو نہایت خوبصورت مطلّا اور مذہّب قرآن مجید نذر کیے، ایک مکہ معظمہ کے لئے اور دوسرا مدینہ منورہ کے لئے۔ تمام اہل قافلہ کے لئے نو نو دس دس ہاتھ لمبے جامہ ہائے احرام تھے، جن میں ایک سو بیس تھان صرف ہوئے۔ دو سو چالیس تھان گاڑھے کے ان کے علاوہ تھے تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں۔ سید صاحب کی بیبیوں یا اقربا کے لئے جو پارچے تیار کرائے ہوں گے، ان کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

بقیہ نذرانے

باقی حضرات نے جو نذرانے پیش کیے ان کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔ بے شبہ وہ شیخ غلام علی کے برابر مال و دولت کے مالک نہ تھے لیکن یقین ہے کہ ان کے نذرانے بھی خاصے وقیع ہوں گے۔ بعض روایتوں میں صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ شیخ غلام علی نے چونکہ کھانے کا انتظام اپنے ذمے لے لیا تھا اور سب سے یہ کہہ دیا تھا کہ جو کچھ دینا ہو سید صاحب کی خدمت میں نقد پیش کر دیا جائے۔(۱) اس وجہ سے مولوی کرامت علی صدر امین، شیخ محمد تقی، بستی میاں، رنجیت خاں، ان سب نے دو دو سو روپے سید صاحب کو دیے۔ حافظ نجابت علی، محمد حسین، عبدالقادر جوتوں کی تجارت کرتے تھے، ان سب نے مل کر دو سو روپے نذر گزارے۔ قلعے کی میگزین کے خلاصیوں نے بھی دو ہی سو روپے

(۱) ایک بیان ہے کہ دو مرتبہ کھانا باہر کھایا۔ ایک مرتبہ شاہ اجمل کے دائرے میں، دوسری مرتبہ قلعے میں بستی میاں کے ہاں (وقائع ص: ۲۵۲)

دیے۔(۱) غرض یہ سب سید صاحب کے اخلاص وتوکل کی برکت تھی کہ گھر سے خالی ہاتھ نکل پڑے اور الہ آباد سے روانگی کے وقت تک تمام اہل قافلہ کو ضرورت کی چیزیں مل گئیں۔ نیز سید صاحب کے پاس ہزاروں روپے جمع ہو گئے۔

اس ساری مدت میں کشتیوں کے کرایے یا ایک آدھ وقت کے کھانے کے سوا کچھ بھی خرچ کرنے کی نوبت نہ آئی۔

قیامِ الہ آباد کی عام کیفیت

قیامِ الہ آباد کی مدت کے بارے میں قطعی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایک بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بارہ روز قیام کیا، دوسرے بیان میں بتایا گیا ہے کہ یہ مدت پندرہ روز سے بھی متجاوز تھی اور آپ نے وہاں تین جمعے پڑھے۔ پہلا جمعہ چوک کی مسجد میں ہوا۔ چونکہ جگہ تنگ تھی اور لوگ بہ کثرت آئے تھے، اس لیے باہر کپڑے بچھا بچھا کر شامل نماز ہوتے رہے۔ سید صاحب کو یہ معلوم ہوا تو فرمایا کہ آئندہ جمعہ شاہی مسجد میں ہوگا، جو قلعے کے سامنے تھی اور مدت سے بے آباد پڑی تھی۔ سید صاحب نے اسے خوب صاف کرایا اور بعد کے دو جمعے اسی مسجد میں ادا کئے بلکہ نماز بھی وہیں پڑھتے تھے۔ مولانا عبدالحئی حسبِ معمول وعظ کہتے تھے۔(۲)

موسم برسات کا تھا۔ دریا خوب زوروں پر تھا۔ نصف شہر میں پانی آ گیا تھا، بہ ایں ہمہ لوگ بے تکلف بیعت کے لئے حاضر ہوتے رہے۔ جس روز سید صاحب قلعے میں گئے تھے، آپ نے دریا کی بہار بھی دیکھی۔ حد نگاہ تک پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ میگزین

---

(۱) وقائع میں ہے کہ مولوی کرامت علی نے سفید پارچے اور پشمینے کے تھان اور چالیس روپے پیش کیے۔ شاہ اجمل کے ہاں سے پچاس روپے اور دو نہایت خوبصورت رضائیاں آئیں۔ قلعے والوں نے چالیس روپے نقد ایک پستول ایک کرچ اور ایک ولایتی قالین پیش کیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کس بیان کو زیادہ قابل اعتماد سمجھا جائے۔

(۲) وقائع ص: ۲۵۲

میں مختلف قسم کی توپوں اور دیگر اسلحہ کا بھی معائنہ کیا۔

ایک خراب رسم کا ازالہ

مسلمانوں نے ہندوؤں کی صحبت میں کئی بری رسمیں اختیار کر لی تھیں یا یوں سمجھ لیجئے کہ جو ہندو مسلمان ہوئے، وہ اپنے ہاں کی بعض بری رسمیں بھی ساتھ لے آئے اور حلقۂ اسلام میں آنے کے بعد بھی انھیں نہ چھوڑا۔ ان میں سے ایک رسم یہ تھی کہ شادی، غمی کی مجلسوں میں دیہاتی لوگ کھانا پتروں پر کھلاتے۔ شہری لوگ اس غرض کے لئے مٹی کی رکابیاں استعمال کرتے۔ جو کھانا بچتا اسے بیکار پھینک دیتے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ الٰہ آباد سے کلکتہ تک یہ رسم عام طور پر رائج تھی۔ سید صاحب کو اس کا علم ہوا تو اسے سختی سے روک دیا۔ فرمایا کھانا نعمتِ الٰہی ہے۔ اسے یوں پھینکنا کمال بے ادبی ہے۔ چنانچہ جہاں آپ پہنچے، اس کا بھی ازالہ فرما دیا۔

اٹھارہواں باب:

سفر حج

(الٰہ آباد سے ہوگلی تک)

بنارس سے روانگی

سید صاحب الٰہ آباد سے روانہ ہوئے تو تیز مخالف ہوا شروع ہوگئی تھی، اس کی وجہ سے کشتیوں کی رفتار کم ہوگئی، پہلے دن صرف آٹھ کوس کا فاصلہ طے ہوا اور سرسا نام ایک مقام میں قیام کیا۔ دوسرے روز ہوا کی شدت میں اور اضافہ ہوگیا اور ایک کوس سے زیادہ نہ چل سکے۔ تیسرے دن مرزا پور پہنچے جہاں شیخ عبداللطیف ناگوری اور شیخ شاہ محمد، سید صاحب کے ارادت مند تھے دونوں مشہور تاجر تھے۔ شیخ عبداللطیف کے متعلق تو بیان کیا گیا ہے کہ مختلف شہروں میں ان کی ستائیس تجارتی کوٹھیاں تھیں۔

مرزا پور کا پورا گھاٹ مال کی کشتیوں نے روک رکھا تھا اور سید صاحب کی کشتیوں کیلئے کوئی جگہ نہ تھی۔ دستور یہ تھا کہ معزز اور نامور آدمیوں کی کشتیاں آتیں تو مال والے جگہ خالی کر دیتے۔ چنانچہ سید صاحب کیلئے جگہ خالی کرانے کے انتظامات شروع ہوئے۔ آپ نے اس پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ہم کسی کو تکلیف دے کر آرام حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ پھر روئی سے بھری ہوئی ایک کشتی کے مالک سے پوچھا کہ کیوں بھائی آپ کو مال اتارنے میں کتنی دیر لگے گی؟ اس نے کہا کہ مزدوروں کیلئے آدمی بھیج چکا ہوں، وہ آجائیں تو سامان اتار کر چلا جاؤں گا۔ سید صاحب نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا

کہ بھائیو! ہمت کرو اور اس کا سامان اتار دو۔ چنانچہ جوانوں نے تھوڑی ہی دیر میں پوری روئی بلا اجرت اتار کر کنارے پر رکھ دی اور کشتیاں ٹھہرانے کی جگہ خالی ہوگئی۔

مرزاپور میں قیام

مرزاپور والے کم سے کم ایک ہفتہ ٹھہرانا چاہتے تھے لیکن قافلے میں ہیضہ کی وبا پھوٹ پڑی، اور دو موتیں ہوئیں: ایک شیخ حسن علی کی لڑکی، دوسرے لکھنؤ کے ایک صاحب محمد ہاشم۔ اس وجہ سے سید صاحب نے تین روز سے زیادہ قیام نہ فرمایا۔ کھانے کا انتظام شاہ محمد نے اپنے ذمے رکھا۔ صرف ایک وقت کا کھانا سید صاحب نے باہر کھایا۔ وہاں کے سرسری حالات یہ ہیں:

۱- بہت سے مسلمانوں نے بیعت کی، جن میں ایک طوائف بھی تھی۔ وہ حج کے لیے تیار ہوگئی۔ شاہ اسماعیل نے اپنی بہن رقیہ بی بی سے کہا کہ اسے اپنے پاس بٹھائیں اور دین کی تلقین کریں۔

۲- وہاں خشت پزوں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ وہ لوگ مسلمان تھے لیکن عام مسلمان ان کے ساتھ اچھوتوں کا سا برتاؤ کرتے تھے۔ انھوں نے عقیدۃً سید صاحب کو کھانے پر بلایا۔ آپ نے دعوت خوشی سے قبول فرمالی۔ کھانا کھایا۔ انھوں نے نذر پیش کی تو واپس کردی اور کہا کہ اول تو اس وجہ سے نذر نہیں لے سکتا کہ آپ بھائی غریب ہیں، دوسرے اگر میں نے نذر لے لی تو لوگ سمجھیں گے کہ صرف نذر کی خاطر کھانا کھایا۔ اور میں نے دعوت صرف اسلئے قبول کی تھی کہ مسلمانوں کے دل میں آپ کے متعلق جو غلط خیال بیٹھا ہوا ہے، وہ زائل ہو جائے۔ چنانچہ اس واقعہ کے بعد ہی خشت پزوں کے ساتھ مساوات کا برتاؤ شروع ہوا۔

۳- رخصت کے وقت شیخ عبداللطیف نے چار ہزار روپے نقد پیش کیے۔ شیخ شاہ

محمد نے چار یا پانچ سو روپے، بیس تھان ململ نینو اور مشروع کے اور اٹھارہ تھان گاڑھے کے نذر کیے۔ ایک اور صاحب نے اسّی روپے اور چالیس تھان گاڑھے کے دیے۔ شیخ عبداللطیف والدہ کو ساتھ لیکر حج کیلئے تیار ہو گئے اور اپنے لئے ایک الگ کشتی کرایے پر لے لی۔

چنار گڑھ

مرزا پور سے روانہ ہوئے تو رات ایک ایسی جگہ ٹھہرنا پڑا، جہاں ہندوؤں کا مندر تھا۔ آس پاس اور کوئی آبادی نہ تھی۔ جن گنے ہوئے اوقات میں سید صاحب کے قافلے کو خود کھانا پکانا پڑا، ان میں سے ایک وقت یہ بھی تھا۔ دوسرے دن چنار گڑھ پہنچے، جہاں تین روز قیام ہوا۔ وہاں کم وبیش ایک سو آدمیوں نے بیعت کی اور پانچ دعوتیں ہوئیں: ایک تمباکو کے تاجر کی طرف سے، دوسری چاولوں کی منڈی کے چودھری کی طرف سے، تیسری شہر کے چودھری کی طرف سے، چوتھی قلعے کے سپاہیوں کی طرف سے اور پانچویں قلعے کے خلاصیوں کی طرف سے۔

چوتھے روز سید صاحب چنار گڑھ سے نکلے اور بنارس پہنچ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق پورے سفر میں ایک مہینہ اور کچھ دن لگے۔ عید الاضحیٰ بنارس میں کی۔ چونکہ برسات کا زور ہو گیا تھا، اس لئے خلاف ارادہ وہاں بھی کم وبیش ایک مہینہ توقف فرمایا۔ میں بتا چکا ہوں کہ سید صاحب نے اپنے ساتھیوں میں سے مضبوط وتوانا آدمیوں کی ایک جماعت کو پیدل چلنے کا حکم دیا تھا۔ شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی اور مولوی محمد یوسف پھلتی باری باری اس جماعت کی قیادت فرماتے تھے۔ الٰہ آباد سے بنارس تک کے سفر میں شاہ اسماعیل نے فرضِ قیادت ادا کیا۔

بنارس میں قیام

ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے کندی گروں کی مسجد میں قیام کیا، ایک

جماعت مہیسر کی مسجد میں ٹھہری۔ سید صاحب کیلئے شیولال چوبے کی حویلی خالی کرا رکھی تھی، وہاں قافلے کی مستورات ٹھہریں۔ سید حمید الدین (خواہرزادہ سید صاحب) اپنے تمام اقربا کے ساتھ پاس کی ایک حویلی میں قیام فرما ہوئے، جو چھ روپے کرایے پر لے لی گئی تھی۔ سید صاحب بابو ساون سنگھ کی حویلی میں مقیم ہوئے۔

پہنچنے کے بعد پندرہ روز تک لگا تار بارش ہوتی رہی، لیکن دعوتوں کا سلسلہ اس زمانے میں بھی برابر جاری رہا اور ایک وقت بھی خود کھانا پکانے کی نوبت نہ آئی۔ عید کے موقع پر بہت سے جانور جمع ہو گئے تھے، تین روز تک برابر قربانیاں ہوتی رہیں۔ شہر کے خاصے بڑے حصے میں گوشت تقسیم ہوتا تھا۔

قیامِ بنارس کے دوران میں خلقِ خدا کی ہدایت واصلاح کا جو عظیم الشان کام انجام پایا، اس کی تفصیلات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ ہزاروں آدمیوں نے بیعت کی اور ہر شخص کی خواہش پوری کرتے رہے بلکہ بیان کیا جاتا ہے کہ لالٹین لے کر راتوں کو بھی پھرتے تھے۔

تیموری شہزادوں میں سے مرزا ابلاقی اور مرزا حاجی خود ملنے کے لئے حاضر ہوئے۔ مرزا ابلاقی کے ہاں چار مرتبہ سید صاحب کو کھانے پر بلایا گیا۔ ان کا مکان تیلیا نالے پر تھا۔ مسلمانوں کے بعض گروہوں میں اختلاف چلا آ رہا تھا۔ سید صاحب نے ان کے درمیان "فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ" کی پیروی میں صلح کرادی۔ جو مسلمان ہسپتال میں بیمار پڑے تھے، انھوں نے پیغام بھیجا کہ ہم حاضری سے معذور ہیں، ہمیں بھی زیارت سے مشرف فرمایا جائے۔ چنانچہ ایک روز سید صاحب نے ہسپتال جا کر سب کو دیکھا اور ان کی مزاج پرسی کی۔

راج گھاٹ پر تلّو کا نام کا ایک چمار رہتا تھا، وہ سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ آپ نے الٰہی بخش نام رکھا۔ بعد میں اس نے بڑا عروج پایا، لیکن اس کے مرید

حالات اس کتاب کے تیسرے حصے میں بیان ہوں گے۔

اسی زمانے میں حیات النساء بیگم کی طرف سے دعوت آئی، جس کا ذکر سید محمد علی صاحب مؤلف ''مخزنِ احمدی'' نے پہلے سفر بنارس میں کیا ہے۔ یہ خاتون پہلے ایک انگریز کے گھر میں رہتی تھی، بعد میں اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ سید صاحب کی خدمت میں چھ سات ہزار روپے کا مال پیش کیا لیکن آپ نے پیش کش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ رو پڑی اور عرض کیا کہ میں تو بری باتوں سے توبہ کر چکی ہوں، کیا میرے گناہ معاف نہیں ہو سکتے؟ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ کے پاس جو مال ہے، وہ خبیث ہے۔ میں صرف پاک اور حلال کمائی لے سکتا ہوں۔ بیگم کے مختار حکیم سلامت علی خان سید صاحب کے مرید و معتقد تھے، انھوں نے دس ہزار روپے کا انتظام کر کے بیگم کے نام پر تجارت شروع کر دی، جس میں بڑا نفع ہوا۔ جب سید صاحب جہاد کے سلسلے میں سرحد تشریف لے گئے تو اس مالِ طیب میں سے بیگم نے ایک بڑی رقم پیش کی۔ اس کا ذکر اس موقع پر آئے گا۔

زمانیہ

سید صاحب عید الاضحیٰ سے پہلے بنارس پہنچے تھے۔ ۱۰ رمحرم ۱۲۳۷ھ (۷ راکتوبر ۱۸۲۱ء) کو وہاں سے روانہ ہوئے۔ دلمؤ سے جو کشتیاں کرایے پر لی تھیں وہ بنارس تک تھیں۔ اگلے سفر کے لئے ایک بجرا اور چار کشتیاں پھر کرایے پر لے لیں۔ ۱۰ رمحرم کو دن رہتے زمانیہ پہنچ گئے۔ وہاں دریا کے کنارے بچے کبڈی کھیلنے لگے۔ جوانوں نے بھی سید صاحب سے کبڈی کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا کہ ورزش تو بہتر ہے خصوصاً مجاہدین کے لئے اور اس نیت سے کہ دشمن کے مقابلے کے لئے استعداد بڑھ جائے۔

زمانیہ میں سید صاحب دو راتیں ٹھہرے۔ آپ کے دوستوں میں سے ایک صاحب

رستم علی خاں تھے، وہ اس زمانے میں ٹونک گئے ہوئے تھے۔ ان کا بیٹا آپ کو اپنے گھر لے گیا۔ وہاں کے بہت سے پٹھانوں نے بیعت کی۔

زمانیہ کے لوگوں نے بتایا کہ قریب کے جنگل میں ایک مجذوب رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے پاس جانا چاہے تو پتھر مارتا ہے۔ سید صاحب اپنے بھانجے سید عبدالرحمٰن کو ساتھ لے کر اس سے ملنے کیلئے تشریف لے گئے۔ قیام گاہ کے قریب پہنچے تو سید عبدالرحمٰن کو ٹھہرا دیا اور تنہا مجذوب کے پاس گئے۔ سید عبدالرحمٰن کا بیان ہے کہ مجذوب خوش الحانی سے یہ شعر پڑھ رہا تھا:

تعالی اللہ چہ دولت دارم امشب — کہ آمد ناگہاں دلدارم امشب

پوری غزل اس نے کیف و مستی کے عالم میں پڑھی، پھر خواجہ حافظ کی اور غزلیں سنائیں۔ آخر میں پوچھا: کہاں کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ سید صاحب نے بتایا کہ حرمین شریفین۔ مجذوب بولا: کیا بیت المقدس، بغداد اور نجف و کربلا بھی جایئے گا؟ سید صاحب نے فرمایا:

> ”ایک ضروری کام درپیش ہے۔ بعد ادائے حج اس کی تدبیر کرنی ہے، اس لئے اور کہیں جانے کا ارادہ نہیں۔“

سید صاحب پانچ چھ گھڑی اس کے پاس رہے اور واپسی پر فرمایا کہ مجذوب بہت اچھا شخص ہے۔

غازی پور — چھپرا

تیسرے روز زمانیہ سے روانہ ہو کر غازی پور کے گھاٹ پر ایک مسجد کے پاس کشتیاں ٹھہرائیں اور وہاں کئی مقام کیے۔ غازی پور کے رئیس شیخ فرزند علی، سید صاحب کے مخلص مرید تھے۔ وہ مستاجری کے کام پر گئے ہوئے تھے۔ ان کے مختار مرزا محی الدین

بیگ کشمیری نے مہمانداری کی خدمت انجام دی۔ شاہ منصور عالم، منشی غلام ضامن اور قاضی محمد حسن کے ہاں بھی دعوتیں ہوئیں اور ان تمام حضرات نے مع اہل و عیال بیعت کی۔ ایک پیرزادے نے بھی دعوت کی۔ وہ کئی دیہات کا مستاجر تھا اور بڑے امیروں میں گنا جاتا تھا۔ لیکن بیعت نہ کی اور شادیوں کے بعض مراسم کے جائز و ناجائز ہونے کے متعلق سید صاحب سے گفتگو بھی کی۔

غازی پور سے روانگی عمل میں آئی تو باڑا میں آپ کو ٹھہرا لیا گیا۔ یہ گاؤں شیخ فرزند علی نے نیلام میں لے لیا تھا اور شیخ صاحب کا بیٹا محمد امیر وہیں تھا۔ اس نے نیز اکثر شرفاء وغرباء نے بیعت کی۔ سید صاحب نے تیغ علی خاں اور سردار خاں کو خلافت نامے دیے۔

باڑا سے چل کر بلیا میں ٹھہرے۔ یہ گاؤں بھی شیخ فرزند علی نے نیلام میں لے لیا تھا۔ بکسر پہنچے تو وہاں کے قاضی نے روک لیا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اس طرح ہر مقام پر ٹھہرتے رہے تو بیت اللہ شریف پہنچنے میں بڑی دیر لگے گی۔ ہاں بیعت مقصود ہو تو میں تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتا ہوں۔ کشتیوں کو آگے جانے دو۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ جہاں کشتیاں ٹھہری تھیں وہاں قاضی نے ایک دیگ پکوا کر بھجوادی۔ خود سید صاحب نے بکسر میں ہی کھانا کھایا۔

پھر آپ چھپرہ میں ٹھہرے۔ بہت سے لوگ پیشوائی کیلئے موجود تھے۔ وہاں کے ایک صاحب فرحت علی بڑے دیندار اور پرہیزگار تھے۔ سید صاحب ان کے مکان پر بھی گئے۔ یہاں تین چار طوائفیں چار یا پانچ روپے نذرانہ لے کر پہنچیں۔ سید صاحب نے ان کا نذرانہ قبول نہ کیا اور فرمایا کہ اپنے افعالِ بد سے توبہ کرو تو بیعت لے سکتا ہوں۔

داناپور

چھپرہ کے بعد داناپور میں منزل ہوئی۔ وہاں شیخ علی جان بڑے دولت مند آد

تھے۔ تجارت بھی کرتے تھے اور کشتی بانوں کے چودھری بھی تھے۔ انھوں نے پہلے سے سید صاحب کے استقبال کا سامان کر رکھا تھا۔ ان کی وضع سراسر ہندوانہ تھی۔ نام معلوم کیے بغیر کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ یہ علی جان ہیں۔ وہ سید صاحب کو اپنے مکان میں لے گئے اور عرض کیا کہ کئی پیرزادوں کی خدمت کی مگر حالت نہ بدلی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بسم اللہ کر کے اخلاص سے بیعت کیجئے، حالت کا بدلنا خدا کے اختیار میں ہے۔ انھوں نے جو ہدایا سید صاحب کی خدمت میں پیش کیے، ان میں چھ سات کرسیاں بھی تھیں، جن میں دو بہت بیش قیمت تھیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم مسافر ہیں، کرسیوں کو کہاں اٹھائے پھریں گے؟ اپنے ہی پاس رکھیے۔ جب شیخ صاحب نے بہت اصرار کیا تو ان کے پاسِ خاطر سے صرف ایک کرسی قبول کر لی۔

ان کے مکان کے پاس تعزیہ رکھنے کا ایک چبوترہ اور ایک امام باڑہ بھی تھا۔ سید صاحب سے بیعت کے بعد چبوترے کی جگہ مسجد تعمیر کرائی اور امام باڑہ مسافروں کے قیام کے لئے وقف کر دیا۔ سید صاحب جہاد کے لئے تشریف لے گئے تھے تو اطراف بہار کے عقیدت مندوں کی اعانتی رقوم شیخ غلام علی جان کے پاس ہی جمع ہوتی تھیں۔ گویا تحریک جہاد کا ایک مالی مرکز شیخ صاحب موصوف بھی تھے۔ ان کے نام سید صاحب کے مکاتیب بھی موجود ہیں۔

شیخ صاحب کے علاوہ داناپور کے ممتاز اصحاب میں سے صدر الدین قصاب نے بیعت کی۔ یہ شخص عام مسلمانوں خصوصاً مسافروں کی خدمت میں ہر لحظہ سرگرم رہتا تھا۔ سو پچاس آدمی روزانہ اسکے ہاں کھانا کھاتے تھے۔ غریب آدمیوں کے بچوں اور بچیوں کے نکاح اپنے خرچ سے کراتا۔ اولاد نہ تھی، عبدالرحیم نام ایک یتیم بچے کو متبنیٰ بنا لیا تھا۔ وہ بھی بہت نیک اور دیندار تھا۔ ایک وسیع باغ لگایا جس میں آم، نیبو، نارنگی، جامن کے درخت تھے۔ یہ باغ صرف مسافروں کے آرام و آسائش اور مہمانداری کیلئے وقف تھا۔

داناپور کی چھاؤنی کے مسلمان بھی سید صاحب کو لے گئے اور سیکڑوں نے بیعت کی۔

پھلواری شریف

سید صاحب کے سفرِ حج کے متعلق جو مکتوبات کا ذخیرہ میری نظر سے گذر چکا ہے، اس میں ہر قسم کی تفصیلات موجود ہیں۔ لیکن سفرِ مراجعت کے سوا پھلواری شریف جانے کے بارے میں اشارہ تک موجود نہیں۔ شاہ محمد وارث امام قادری پھلواروی سے معلوم ہوا کہ ان کے خاندانی کاغذات میں بہ تصریح مذکور ہے، سید صاحب پھلواری شریف کی خانقاہ مجیبیہ میں تشریف لائے۔ اس زمانے میں شاہ ابوالحسن فرد سجادہ نشین تھے اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ محمد امام کے ذمے واردین وصادرین کی خدمت ونگرانی تھی۔ انھیں علومِ عقلیہ ونقلیہ میں درجہ امتیاز حاصل تھا۔ قیامِ داناپور کے دوران میں پہلے شاہ اسماعیل چند آدمیوں کے ساتھ آئے اور شاہ ابوالحسن فردؔ نیز بعض دوسرے اکابر علم سے مل کر واپس چلے گئے۔ پھر سید صاحب تشریف لائے۔ معلوم نہیں اور کون کون ساتھ تھے۔ صرف مولانا عبدالحئیؒ اور مولوی عبدالحق کے نام کاغذات میں درج ہیں۔

سید صاحب نے کم از کم ایک وقت کا کھانا خانقاہ میں تناول فرمایا۔ کھانا تیار ہو رہا تھا تو بے تکلف باورچی خانے میں پہنچ گئے اور فرمایا کہ اس قدر تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ شاہ ابوالحسن فردؔ کے والد ماجد شاہ نعمت اللہ بھی حیات تھے۔ ان سے دیر تک تخلیہ میں ملاقات رہی۔ آخر میں سید صاحب نے فرمایا کہ میں نے سمجھا تھا، یہاں کے بزرگ بھی عام مشائخ جیسے ہوں گے، لیکن انہیں اپنے خیال وگمان سے بالکل الگ پایا۔ الحمد للہ کہ یہ خانقاہ بدعات سے بالکل پاک ہے۔

حیاتِ فرد مشمولۂ دیوان میں بتایا گیا ہے کہ پہلے سید صاحب اور مولانا عبدالحئیؒ آئے تھے۔ شاہ نعمت اللہ سے ملاقات کی اور دیر تک تنہائی میں گفتگو کرتے رہے۔ دوسرے دن

مولانا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحق آئے۔ شاہ صاحب سے ایک مسئلے کے متعلق مناظرے کی صورت بھی پیدا ہوگئی۔ آخر میں شاہ صاحب نے فرمایا: الحمدللہ میں نے اس خانقاہ کو بہ ہر طور بدعات سے پاک پایا۔ میرا مقصود کسی کا امتحان لینا نہ تھا، محض ملاقات کو آ گیا تھا۔(۱)

عظیم آباد

داناپور میں تین چار دن قیام کے بعد چلے تو عظیم آباد میں ٹھہرے۔ لوگ جا بجا گھاٹ دکھاتے گئے کہ جو پسند ہو، وہاں کشتیاں لگائی جائیں۔ عظیم آباد کے اگلے سرے پر ایک گھاٹ پسند فرمایا، یہاں کنارے پر نماز باجماعت کیلئے وسیع اور ہموار میدان موجود تھا۔ اسی جگہ کشتیاں ٹھہرائی گئیں۔(۲)

سید صاحب کی سواری کیلئے پینس موجود تھا۔ آپ شہر گئے۔ جامع مسجد میں نماز پڑھی، پھر مولانا عبدالحئی سے فرمایا کہ آپ وعظ کہیں۔ خود مولوی سید مظہر علی کے ساتھ ان کے مکان پر گئے۔ وہاں مولوی صاحب کے اہل وعیال، اقربا اور اہل محلّہ نے بیعت کی۔

(۱) ملاحظہ ہو حیاتِ فرد مشمولہ دیوان: ص ۴۸، ۴۹۔ سید ابوالحسن فرد ۱۰ ررجب ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) کو پیدا ہوئے۔ ۲۴ رمحرم ۱۲۶۵ھ (۲۰ ردسمبر ۱۸۴۸ء) کو وفات پائی۔ ان کا دیوان صرف ایک مرتبہ چھپا تھا۔ دفتر اول ص: ۲۸۶ اور دفتر دوم ص: ۲۹۰۔ آخر میں حیاتِ فرد شامل تھی۔ جس کے ۱۲۰ صفحات تھے۔ اب یہ مجموعہ بہت کمیاب ہے۔ دیوان میں غزلیات، قصائد رباعیاں، مناقب، مثنوی وغیرہ ہیں۔

(۲) ''حیات بعد الممات'' میں ہے کہ عظیم آباد میں سید صاحب کا قافلہ گول گھر کے سامنے ٹھہرا تھا اور لین کے میدان میں جمعہ کی نماز ہوئی۔ مولانا شاہ اسماعیل نے وعظ فرمایا۔ میاں سید نذیر حسین دہلوی فرماتے تھے کہ ''ہم اس وعظ و نماز میں شریک تھے۔ سارا میدان لین کا آدمیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلی ملاقات سید صاحب اور مولانا شہید سے پٹنہ میں ہوئی تھی'' (ص: ۲۰۱)

ارمغانِ احباب میں مولانا عبدالحئی فرماتے ہیں کہ میں نے میاں سید نذیر حسین مرحوم سے پوچھا تو آپ نے فرمایا میں نے پٹنہ میں سید صاحب کو دیکھا تھا۔ میں اس زمانے میں یوسف زلیخا پڑھتا تھا۔ سید صاحب کلکتہ سے آئے تھے۔ گویا میاں صاحب نے سید صاحب کو حج سے واپسی پر دیکھا تھا، نہ کہ حج کیلئے جاتے وقت۔

وہاں سے اٹھے تو مولوی الٰہی بخش صادق پوری کے مکان پر گئے۔ انکے دیوان خانے میں بے شمار لوگوں نے بیعت کی۔ انکے بڑے صاحبزادے کا نام احمد بخش تھا۔

بیعت کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ انھیں احمد اللہ کہا کرو۔ یہی مولانا احمد اللہ تھے جو آگے چل کر تحریک کا ایک بڑا مرکز بن گئے۔ اسی سلسلہ میں گرفتار ہوئے اور انڈیمان میں وفات پائی۔ شام کے وقت سید صاحب کشتیوں پر آگئے۔ گھاٹ پر بھی مشتاقانِ دید کا تانتا بندھا رہا۔

عظیم آباد میں کم وبیش آٹھ مقام ہوئے۔ وہاں ایک امیر لکھی میاں نے بیعت کی۔ مولانا ولایت علی کے والد ماجد مولوی فتح علی اوران کے تمام اقربا بیعت ہوئے۔(۱) جن میں شاہ محمد حسین محلہ تمو ہیمہ والے بھی شامل تھے۔ شاکر جان کشمیری اپنی بی بی، بیٹے اور بیٹی کو لے کر حج کو نکلا تھا۔ عظیم آباد پہنچا تو خرچ ختم ہوگیا۔ سید صاحب نے اسے نیز اس کے بال بچوں کو ساتھ لے لیا۔ ایک ڈومنی بھی اپنے دو لڑکوں اور لڑکی کے ساتھ تائب ہوکر حج کے لئے تیار ہوگئی۔ غرض آٹھ دن میں ہزاروں آدمی بیعت ہوئے۔

اسی مقام پر سید صاحب کو خیال آیا کہ کچھ پالیں تیار کرا لینی چاہئیں، جو کشتیوں پر سائبان کا کام دیں اور کہیں ٹھہرنے کی ضرورت پیش آئے تو جھونپڑیاں بنائی جاسکیں۔

(۱) اس سلسلے میں ایک غلط فہمی کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ مولوی فتح علی صاحب نے اپنے فرزند اکبر مولانا ولایت علی کے متعلق گزارش کی کہ وہ بڑا بدراہ ہے، دعاء فرمائیے، خدا اسے راہِ راست پر لائے۔ ایک روایت میں ہے کہ مولانا ولایت علی نے لکھنؤ سے اپنے والد اور دوسرے اقربا کو لکھا تھا کہ سید صاحب سفر حج میں عظیم آباد سے گذر رہے ہیں، ان کی ذات بابرکات سے فائدہ اٹھانا چاہیے، لیکن انھوں نے کچھ پروانہ کی۔ جب سید صاحب حج سے لوٹے تو مولانا ولایت علی تعلیم سے فارغ ہوکر عظیم آباد آچکے تھے۔ انھوں نے بھاگل پور میں سید صاحب کا استقبال کیا اور والد کے علاوہ تمام اقربا کو بیعت کرایا۔

میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ مولانا ولایت علی لکھنؤ میں بیعت ہو چکے تھے۔ ان کے والد اور دوسرے اقربا اس وقت بیعت ہوئے، جب سید صاحب حج کیلئے جاتے ہوئے عظیم آباد سے گذرے تھے۔ مولوی الٰہی بخش اور شاہ محمد حسین کو بھی مولانا ولایت علی کے خاندان سے بہت قریبی تعلق تھا۔

چنانچہ شیخ باقر علی دھئی دھمد ھمہ والے، رحیم بخش اور میاں عبداللہ نے بازار سے ٹاٹ خریدے جو بہت سستے تھے اور پالیں تیار کرالیں۔ ایک پال کیلئے ٹاٹ، رسیاں میخیں، بانس وغیرہ ایک روپے چھ آنے میں آئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہر کنبے کیلئے اسی قسم کی پالیں بنوالی جائیں۔ کھانا پکانے کے لئے توے، لوہے کے چولہے، پراتیں، گھڑے وغیرہ بھی خریدے گئے۔

تبت میں تبلیغ کا انتظام

عظیم آباد ہی میں سید صاحب کو تبتیوں کا ایک قافلہ ملا تھا، جسے آپ نے تبت میں ہی تبلیغ کا کام سونپا اور فرمایا کہ صبر اور استقامت کے ساتھ دین حق عام لوگوں تک پہنچاتے رہنا۔ اس راہ میں جتنی تکلیفیں پیش آئیں، انھیں خوشی خوشی برداشت کر لینا۔ خدا کے فضل سے امید ہے کہ نتیجہ بہت اچھا ہوگا۔ چنانچہ یہ لوگ تبت گئے۔ پورے اہتمام سے اپنے کام میں مصروف رہے اور حق پرست مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت پیدا کر لی۔ ان لوگوں کے ذریعہ سے سید صاحب کی تحریکِ اصلاح تبت میں شائع ہوئی۔

روایتوں میں ہے کہ یہ لوگ حج کیلئے نکلے تھے اور خرچ نہ ہونے کے باعث عظیم آباد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ آپ لوگوں پر حج فرض نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ لوٹ جائیں۔ لیکن یہ بات قیاس میں نہیں آتی، اس لئے کہ سید صاحب تو اکثر ان آدمیوں کو ساتھ لے جا رہے تھے، جن پر حج فرض نہ تھا، اس لئے کہ وہ سفر کا خرچ ادا کرنے کے قابل نہ تھے، بلکہ خود سید صاحب بھی اسی زمرے میں شامل تھے۔ پھر تبتیوں کو کس طرح روک سکتے تھے؟ میرا خیال ہے کہ وہ حج کیلئے نہیں بلکہ تجارت کے لئے عظیم آباد پہنچے ہوں گے۔ ممکن ہے سید صاحب کے سامنے انھوں نے حج کا ارادہ ظاہر کیا ہو اور آپ نے ان سے تبت کے مفصل حالات سن کر فرمایا ہو کہ واپس جاؤ اور عام لوگوں کو

اسلام کے پابند بناؤ۔

بہر حال وہ چھ مرد تھے اور تین عورتیں۔ سید صاحب نے پچیس روپے راستے کے خرچ کے لئے دیے۔ ہر مرد کو ایک ایک کرتا، ایک ایک عمامہ اور ایک ایک تھان سوسی کا اور ہر عورت کو ایک ایک تھان سفید اور دو دو تھان سوسی کے عنایت فرمائے۔ نیز توحید وسنت کے اثبات اور شرک وبدعت کے رد میں کچھ آیات واحادیث بھی لکھوا کر دے دیں۔

متفرق حالات

قیامِ عظیم آباد کے مزید حالات یہ ہیں:

۱- مولوی الٰہی بخش کے ہاں دعوت ہوئی تو اس میں آٹھ نو سو آدمی شریک تھے۔

۲- بعض شیعہ حضرات نے انگریز حاکم کے پاس شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ کیے بیٹھے ہیں اور ہم لوگ از روئے خیر خواہی یہ حقیقت آپ تک پہنچاتے ہیں، لیکن حاکم نے اس شکایت کو فرقہ وار رقابت کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

۳- ایک نواب زادے کا نام قطب الدین تھا، وہ بست ہزاری کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے اہل وعیال کے ساتھ بیعت کی اور پانسو روپے، ایک سرخ دوشالہ، ایک کڑھا ہوا رومال، کئی تھان سفید، کئی تھان گل بدن اور مشروع کے، دو شیشیاں عطر کی، ایک ٹوکرا شیرینی کا، ایک پرانی اور نہایت قیمتی گجراتی تلوار، ایک انگریزی پستول، ایک بندوق، دو کمانیں اور دو ترکش پیش کیے۔

۴- ایک نواب زادہ سو روپے، سات اشرفیاں، پانچ تھان سفید اور دو بنارسی دوپٹے لایا۔ تیسرے نواب زادے نے پچاس پچاس روپے کے چار توڑے، ایک بنارسی دوپٹہ، ایک تھان کمخواب کا، چار پانچ تھان سفید اور ایک پیش قبض فولادی نذر کے طور پر حاضر کیا۔

۵- رحیم خاں افغان تاجر چرم نے مع اقربا واعزہ بیعت کی، جن میں رحیم خاں کا

بھتیجا اور داماد امیر خاں بھی شامل تھے، وہ ایک سو پچاس روپے کھلے، اور ایک سو روپے ایک رومال میں بندھے ہوئے نیز سات آٹھ تھان لایا، جن میں سے کچھ سفید تھے، کچھ گل بدن اور مشروع کے تھے۔

۶- ایک اور تاجر عبدالرحمٰن نے بیعت کی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ شریعت کے حکموں پر چلو، مال میں سے باقاعدہ زکوٰۃ دیا کرو، اقربا کے حقوق کا خیال رکھو، محتاج ہمسایوں کی دستگیری کرو، مسکینوں اور مسافروں کی خدمت کو ضروری جانو۔ خدا تمہارے مال میں برکت دے گا۔

اگلی منزلیں

عظیم آباد سے بندر ہوگلی تک کی منزلوں کا سرسری حال یہ ہے:

۱- باڑہ: یہاں اردگرد کی بستیوں سے بہت سے آدمی آئے ہوئے تھے جن میں سے خواجہ مولا بخش، خواجہ افضل علی، شیخ سوپن، واجد علی خاں اور اکرام الحق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ سید صاحب نے کنارے پر جاجم بچھوا دی تھی اسی پر بیٹھ کر بیعت لیتے رہے۔ خواجہ مولا بخش یا کسی دوسرے صاحب نے آداب یا بندگی عرض کی۔ سید صاحب نے فرمایا یہ بری عادت ہے۔ لڑکا ہو یا بوڑھا، امیر ہو یا غریب سب کو "السلام علیکم" کہنا چاہیے۔ پھر خواجہ مولا بخش نے بیعت کیلئے خرمے منگانے چاہے۔ سید صاحب نے فرمایا: بیعت کے واسطے خرموں کے بالکل ضرورت نہیں اور بیعت کیا ہے؟ اپنے اللہ سے عہد کرنا کہ کوئی برا کام نہیں کریں گے۔ یہاں ایک صاحب شاہ گھسیٹا مرید ہوئے، جو بڑے ذی اثر اور بارسوخ تھے۔ سید صاحب نے انھیں کو خلافت نامہ دیا۔ ان کے ہاں کھانا بھی کھایا۔ شاہ صاحب نے دیگوں سے کھانا نکالنے کے لئے لکڑی کی ایک خوب صورت کشتی پیش کی جو سوا گز لمبی اور دس گرہ چوڑی تھی۔

۲- دوسری منزل ایک چھوٹی سی بستی کے پاس ہوئی۔ وہاں غریب لوگوں نے بیعت کی۔(۱)

۳- تیسری منزل مونگیر میں ہوئی۔ وہاں بھی زیادہ تر غریب لوگ بیعت کیلئے آئے۔

۴- چوتھی منزل بھاگلپور میں ہوئی۔ اس مقام کے قیام کا کچھ حال معلوم نہیں۔

۵- پانچویں منزل راج محل میں ہوئی، جہاں سے دریا دو شاخوں میں بٹتا ہے۔ ایک بڑی شاخ، جسے گنگا کہتے ہیں، آگے کو نکل جاتی ہے، دوسری شاخ جس کا نام بھاگیرتھی ہے اور جسے ہندو اصل گنگا سمجھتے ہیں، مرشد آباد ہوگلی ہوتی ہوئی کلکتہ کے پاس سے گذرتی ہے۔

راج محل میں سید صاحب نے کئی مقام کیے۔ منشی محمدی انصاری سید صاحب کے ایک خاص مخلص مرید تھے اور آخر میں میر منشی بن گئے تھے، ان کا وطن راج محل سے دس بارہ کوس پر تھا۔ وہ سید صاحب کو بہ اصرار اپنے ہاں لے گئے۔ وہاں تمام اقربا نے بیعت کی، جن میں سے بعض کے نام یہ ہیں: منشی شاہ محمد (والد منشی محمدی)، منشی رؤف الدین، منشی مخدوم بخش، منشی حسن علی، منشی فضل الرحمٰن، منشی عزیز الرحمٰن۔ اور لوگ بھی فیضیاب ہوئے۔ منشی شاہ محمد حج کیلئے تیار ہو گئے۔

۶- مرشد آباد: اس جگہ پر چار پانچ مقام ہوئے۔ زیادہ تر غریبوں نے فیض حاصل کیا۔

مرشد آباد کے بعد کٹوا (ضلع بردوان) میں مقام ہوا، پھر ہوگلی پہنچ گئے۔(۲)

---

(۱) باڑہ اور مونگیر کے درمیان ایک مقام سورج گڑھ بھی ہے۔ ''الحیات بعد الممات'' میں ہے کہ سادات سورج گڑھ نے بھی دعوت کی تھی اور سید صاحب کے قافلے کو پندرہ روز ٹھہرایا تھا۔ رواتیوں میں سورج گڑھ کے قیام کا ذکر مجھے نہیں ملا۔ ممکن ہے کہ سادات کی دعوت آپ نے منظور فرمائی ہو، لیکن پندرہ روز ٹھہرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔

(۲) رواتیوں میں ہے کہ ''کئی روز کے بعد'' میرے اندازے کے مطابق دو یا تین دن لگے ہوں گے۔ لیکن کٹوا اور ہوگلی کے درمیان کسی مقام پر ٹھہرنے کا ذکر نہیں آیا۔

انیسواں باب:

سفرِ حج

(قیامِ کلکتہ کے حالات)

منشی امین الدین احمد

سید صاحب ہوگلی میں ٹھہرے۔(۱) وہاں سے روانہ ہوئے تو تین چار کوس پر ایک مقام ہے، جسے اس زمانے کی عام اصطلاح میں ''پرمٹ'' کہتے تھے۔ وہاں کلکتہ جانے والی کشتیوں سے چنگی کا محصول لیا جاتا تھا۔ جب کوئی کشتی قریب پہنچتی تو پرمٹ والے نقارہ بجاتے۔ یہ کشتی ٹھہرا لینے کا انتباہ ہوتا۔ سید صاحب کی کشتیاں بھی ٹھہر گئیں۔ آپ نے قاضی احمد اللہ میرٹھی اور قاضی عبدالستار گڑھ مکتیسری کو بھیجا۔ وہ پرمٹ والوں سے محصول کا فیصلہ کرآئے۔

اسی مقام پر کلکتہ سے ایک تیز رفتار کشتی میں، جسے پنس کہتے تھے، ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا: امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے، جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے، اور کلکتہ کے ممتاز امیروں میں گنے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انھیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی

(۱) وقائع کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہوگلی میں صرف ایک رات ٹھہرے۔ لیکن صاحب ''مخزنِ احمدی'' کا بیان ہے کہ تقریباً ایک ہفتہ قیام ہوا اور بہت سے لوگ بیعت ہوئے۔ صبح سے شام تک سید صاحب کے پاس تانتا بندھا رہتا تھا۔

صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔ان کی ماہانہ تنخواہ مقرر نہ تھی لیکن حق وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحب ''مخزنِ احمدی'' کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار روپے کی تھیلیاں ہاتھی پر لد کر ان کے گھر پہنچتی تھیں۔ بڑے فراخ حوصلہ اور مخیّر تھے، کم وبیش چار پانسو طالب علموں کا خرچ اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

انھوں نے بہت پہلے سید صاحب کو کلکتہ آنے کی دعوت دی تھی۔آپ نے جواب میں لکھا کہ ہم ہجرت کر کے جا رہے ہیں، کلکتہ نہیں آسکتے۔ جو لوگ بیعت کرنا چاہیں، وہ سب ایک جگہ جمع ہو کر اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور آئندہ کیلئے شریعت کے پابند ہو جائیں۔ جب سید صاحب نے حج کا ارادہ کیا تو منشی صاحب کو بھی لکھا کہ ہم کلکتہ آتے ہیں۔موصوف نے شہر کے اندر ایک وسیع کوٹھی صرف سید صاحب کے قیام کیلئے خرید لی، جس میں تین تالاب تھے: ایک پانی پینے کیلئے، دوسرا نہانے کیلئے، تیسرا کپڑے دھونے کیلئے۔مردوں کیلئے الگ کمرے تھے، ان کے علاوہ بہت سے زنانہ مکان تھے۔

قیام کا اقرار

منشی صاحب نے عرض کیا کہ شہر میں مختلف آدمیوں نے آپ کیلئے ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ میں سب سے پہلے پہنچا ہوں، لہٰذا میرے ہاں قیام کا عہد فرمائیں۔ ضرورت کی سب چیزیں اس کوٹھی میں مہیا ہیں۔کھانے کی بابت یہ عرض ہے کہ اگر کہیں آپ کی دعوت ہو تو اس میں ضرور تشریف لے جائیں۔دعوت نہ ہو تو پورے قافلے کیلئے دونوں وقت کھانا میرے ہاں سے حاضر ہوگا۔سید صاحب نے یہ دعوت قبول فرمالی۔

پھر منشی صاحب نے مولانا شاہ اسماعیل کے متعلق پوچھا۔وہ دوسری کشتی میں تھے۔ مولانا عبدالحئی نے آدمی بھیج کر انھیں بلایا۔سفری کپڑے پہن رکھے تھے، جو میلے ہو گئے تھے، کشتی سے اتر کر مولانا شاہ اسماعیل سید صاحب کے بجرے کی طرف آئے تو اہل قافلہ میں سے کسی نے اشارہ کیا: وہ مولانا آتے ہیں۔منشی امین الدین احمد نے سمجھا کہ یہ کوئی

اور اسماعیل ہوں گے اور کہا کہ میں شاہ اسماعیل کو پوچھتا ہوں، جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے ہیں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہی شاہ اسماعیل ہیں تو ان کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر منشی صاحب بے اختیار آبدیدہ ہو گئے اور دو چار قدم آگے بڑھ کر ادب سے استقبال کیا۔

منزلِ مقصود

منشی صاحب نے یہ خوش خبری بھی سنائی کی جو جگہ ٹھہرنے کیلئے تجویز کی گئی ہے، اس میں میٹھے پانی کی کوئی کمی نہیں۔ سید صاحب نے اس پر عجز والحاح کے ساتھ بارگاہِ باری تعالیٰ میں دعاء کی۔ فارغ ہوئے تو فرمایا: میں نے کئی بزرگوں سے سنا تھا کہ کلکتہ میں میٹھے پانی کی قلت ہے۔ سفر میں کئی مرتبہ خیال آیا کہ مجھے تو لوگ پیر سمجھ کر شاید کہیں نہ کہیں سے میٹھا پانی لا ہی دیں گے، مگر اتنے مسلمان بھائی جو میرے ساتھ ہیں، ان کیلئے کیا انتظام ہوگا؟ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ تشویش بھی جاتی رہی۔

سید صاحب روانہ ہوئے تو شیو رام پور میں ٹھہرے، جہاں آپ کے خلیفہ سید عبداللہ ابن سید بہادر علی رہتے تھے۔ وہاں بھی بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ شیو رام پور سے چلے تو رات کے وقت کلکتہ میں بالوگھاٹ پر پہنچے۔ رات وہیں گزاری۔ صبح کو کشتیوں سے اترنے کا بندوبست ہوا۔(۱)

منشی صاحب کا اہتمامِ مہمانداری

منشی صاحب نے دریا کے کنارے بہت بڑی دری بچھوا دی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بہ کثرت منگالی تھیں۔ مثلاً پینس، ڈولیاں، بگھیاں، کرانچیاں، ہوادار وغیرہ۔

(۱) شیو رام پور کو عام طور پر سرام پور کہا جاتا ہے۔ یہاں پادریوں نے بہت بڑا مطبع قائم کرلیا تھا۔ بائبل کا پہلا سلیس اردو ترجمہ اسی جگہ چھپا تھا۔ نیز پادریوں کے عام تبلیغی رسالے یہیں سے چھپ کر شائع ہوتے تھے۔ سید عبداللہ نے بھی یہاں ایک مطبع قائم کیا تھا جس میں شاہ عبدالقادر کا اردو ترجمہ قرآن اور سیکڑوں دینی کتابیں اہتمام کے ساتھ طبع ہوتی رہیں۔ سید عبداللہ نے سید صاحب کے قافلے کے ساتھ حج کیا تھا۔

بار برداری کیلئے چھکڑے موجود تھے۔ مزدور بھی خاصی تعداد میں جمع تھے۔ پہلے مستورات کو پردہ کر کے اتارا گیا اور قیام گاہ پر بھیج دیا۔ پھر مرد سوار ہوئے۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں۔ منشی صاحب سید صاحب کو پینس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے گئے، پھر قیام گاہ پر پہنچایا، جہاں تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ متعدد اکابر نے بھی اپنے اپنے ہاں ٹھہرانے کی درخواست کی، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے ساتھ اقرار ہو چکا ہے، اس لئے معذور ہوں، البتہ دعوت قبول کرلوں گا۔

تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پرتکلف کھانے آتے رہے۔ مثلاً قورمہ، شیرمال، باقرخانیاں، ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ۔ کئی قسم کے مربّے اور اچار، کئی قسم کے میٹھے۔ سید صاحب کیلئے جو کھانا آتا، اس میں اور بھی کئی چیزیں ہوتیں۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لئے صرف ایک قسم کا کھانا آئے۔ انواع واقسام کے کھانوں کو اہل قافلہ میں تقسیم کرنا مشکل ہے اور ہم لوگ تکلّفات کو اچھا نہیں سمجھتے۔ منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں ہوتا اس لئے تکلّفات میں مزید اہتمام واضافہ کردیا۔

قافلے کی سادگی اور دیانت

آخر ایک روز خود سید صاحب نے خود منشی صاحب سے کہا کہ ہم لوگ تو ماش کی کھچڑی کھانے والے ہیں، آپ تکلف کیوں کرتے ہیں؟ بس سادہ غذا بھیج دیا کیجئے۔ منشی جی نے عرض کیا:

> حضرت! کیا فرماتے ہیں؟ میں کس لائق ہوں کہ پرتکلف کھانے بھیجوں؟ آپ کی خدمت گزاری میں تو جتنا بھی تکلف کیا جائے، تھوڑا ہے۔ میں نے کھانے کھائے بھی ہیں اور کھلائے بھی ہیں، لیکن آپ جیسے حقانی، ربانی، خداپرست، بے ریا بزرگ نہ آنکھ سے دیکھے اور نہ کان سے سنے۔ آپ اس

مقدمے کو یونہی رہنے دیں اور جو دال دلیا آتا ہے، اسے قبول فرماتے جائیں۔

سید صاحب نے فرمایا:

> خدمت گزاری سے غرض اللہ تعالیٰ کی رضا ہے۔ کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ ہونا چاہیے۔ جب کام اسراف اور ریا سے پاک ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لائق ہو۔ مال اسباب اللہ کا ہے ایک روز حساب دینا ہوگا۔ اس کو بے جا برباد نہ کرنا چاہیے۔ کھانے سے مقصود پیٹ بھرنا ہے۔ ایک قسم کا کھانا جب چاہیں بھیج دیا کریں۔

منشی صاحب نے پورا باغ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ اس میں نارنگی، چکوترے، سنگترے، کیلے، انار، امرود، ناریل، آم وغیرہ کے درخت تھے۔ انگور کی بیلیں بھی تھیں۔ اناس بھی تھے۔ سید صاحب کے رفیقوں کی تقویٰ شعاری کا یہ عالم تھا کہ خود پھل توڑنا تو رہا ایک طرف، جو پھل درختوں سے خود بخود گر جاتے انھیں بھی کوئی نہ اٹھاتا۔ ایسے تمام پھل سید صاحب کے پاس جمع ہوتے۔ آپ پورے قافلے میں تقسیم فرما دیتے۔ قافلے کے بعض افراد کے جوتے ٹوٹ گئے تھے، ''مخزنِ احمدی'' سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی امین الدین احمد نے پہلے ہی دن ضرورت مندوں کو تین سو روپے کے جوتے اور ایک ہزار سے زیادہ کے کپڑے خرید دیے۔

ہدایتِ خلق

میرے اندازے کے مطابق سید صاحب صفر ۱۲۳۷ھ (نومبر ۱۸۲۱ء) میں کلکتہ پہنچے ہوں گے، گویا رائے بریلی سے کلکتہ تک کم و بیش ساڑھے تین یا پونے چار مہینے لگ گئے۔ پھر تقریباً تین مہینے کلکتہ میں ٹھہرے رہے۔ اس پوری مدت کا ایک ایک لمحہ ہدایت وارشاد میں بسر ہوا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کتنے ہزار آدمی بیعت سے مشرف ہوئے اور شریعت کے پابند بنے۔ سیکڑوں گھروں میں بے نکاح بیبیاں تھیں، ان کے نکاح

کرادیے۔ سیکڑوں مرد غیر مختون تھے۔ سید صاحب نے اپنی قیام گاہ میں ایک الگ جگہ مقرر کر کے ان کیلئے ختنوں کا انتظام کیا۔ سید محمد علی نے لکھا ہے:

ہر خطے اور ہر کشور سے ہزاروں بلکہ بے شمار مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اہل شرک و بدعت اور سرکش و گناہ گار اپنے برے اعمال سے توبہ کر کے مخلص مومنوں کے زمرے میں شامل ہو گئے۔

سید صاحب نے کلکتہ پہنچ کر مولانا عبدالحئی سے فرمایا تھا کہ اگرچہ ہم حج کی نیت سے آئے ہیں، لیکن خدا کے فضل سے امید ہے کہ اس شہر میں بابِ ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔

یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اس کی تصدیق بعض انگریزوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً پرنسپ لکھتا ہے کہ ۱۸۲۲ء میں سید صاحب کلکتہ آئے اور مسلم آبادی بہت بڑی تعداد میں ان کی پیرو بن گئی۔ (۱)

شاہ اسحاق نے بیان فرمایا کہ سید صاحب کلکتہ پہنچے تو بہت سے مسلمانوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور آپ کے ارشادات کی برکت سے اس سرزمین مین خاص دینی رونق پیدا ہوگئی۔ (۲)

حاجی حمزہ علی خاں کہتے ہیں: آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ سید صاحب کو آرام کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ سب لوگ شیرینی لاتے اور زیادہ تر بتاشے ہوتے۔ لوگوں کے پاسِ خاطر سے سید صاحب کم از کم ایک دانہ ضرور چکھتے۔ اس طرح زبان مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے۔ بیعت کا سلسلہ دواڑھائی پہر دن چڑھے سے شروع ہو جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ عورتیں بھی بہ کثرت آتیں اور تھوڑی دیر کے بعد کمرہ بھر جاتا۔

(۱) پرنسپ کی کتاب ''رنجیت سنگھ'' ص:۱۴۶۔

(۲) رسالہ دراحوال مولوی نصیر الدین۔

بہت سے غیر مسلم سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ کلکتہ اصلاً انگریز بستی تھی۔ وہاں کی زندگی انگریزی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ عورتیں بے پردہ ہوتیں۔ شراب بہ کثرت پی جاتی۔ سید صاحب کی وجہ سے مسلمانوں میں پردے کا رواج ہوا اور شراب کی دکانیں بے رونق ہو گئیں۔

جن لوگوں نے سید صاحب کی وجہ سے ہدایت پائی ان میں خود منشی امین الدین احمد کا ذکر بھی ضروری ہے۔ وہ اگر چہ بڑے مخیّر تھے، لیکن دولت و ثروت کی فراوانی سے جو عیوب عام طور پر پیدا ہو جاتے ہیں، ان سے پاک نہ تھے۔ عدالت سے فارغ ہو کر آتے تو سارا وقت عیش و عشرت میں گزارتے۔ خدا کے فضل سے وہ بھی سید صاحب کی توجہ سے بالکل بدل گئے اور تمام منہیات سے بہ اخلاص توبہ کر لی۔

ٹیپو سلطان کے شہزادے

ٹیپو سلطان کے خاندان کے افراد کلکتہ میں ہی میں رہتے تھے۔ ان میں سے بعض شہزادوں کے عقائد مولوی عبدالرحیم فلسفی کی صحبت میں بگڑ چکے تھے۔ مولوی عبدالرحیم گورکھپور کے رہنے والے تھے۔ والد کا نام مصاحب علی تھا۔ شاہ عبدالعزیز، شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین سے تعلیم پائی تھی۔ پھر فلسفہ و منطق میں توغل کے باعث ''دہری'' مشہور ہو گئے۔ شہزادوں نے محمد قاسم خواجہ سرا کو بھیج کر سید صاحب کو اپنے ہاں بلایا۔ شاہ اسماعیل مولوی عبدالرحیم کو جانتے تھے۔ انھوں نے بات چیت کر کے فلسفی کا ناطقہ بند کر دیا۔ اکثر شہزادوں اور بیگمات (۱) نے سید صاحب کی بیعت کر لی اور دعوت بھی کی۔

(۱) بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ یہ شہزادے دس دس بارہ بارہ برس کے تھے، ممکن ہے یہ سلطان شہید کے پوتے ہوں۔ ان کے فرزندوں میں سے کوئی بھی دس یا بارہ برس کا نہیں ہو سکتا تھا، اس لئے کہ ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو سلطان شہید ہوا اور سید صاحب ۱۸۲۲ء میں کلکتہ پہنچے تھے۔ اگر کوئی شہزادہ سلطان کے سالِ شہادت میں بھی پیدا ہوا ہو گا تو اس کی عمر تیئس برس سے کم نہ ہو گی۔

بڑے شہزادے(۱) نے، جسے اپنے علم کا گھمنڈ تھا، بحث ضروری سمجھی۔ سید صاحب کے علاوہ اس مجلس میں مولانا عبدالحیٔ، شاہ اسماعیل اور مولوی محمد یوسف بھی شریک تھے۔

شہزادے نے پہلے عربی میں تقریر کی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بھائی مادری زبان میں بات کرو، تاکہ سب لوگ آپ کی گفتگو سے فائدہ اٹھائیں۔ پھر وہ فارسی میں بولنے لگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ عربی اور فارسی تقریروں سے آپ کا مبلغِ علم حاضرین پر ظاہر ہوگیا۔ تکلف کی حاجت نہیں رہی۔ اب اردو میں فرمایئے، پھر اس نے قواعدِ منطقیہ اور دلائل کلامیہ کی رعایت سے تقریر شروع کی، جو واجب الوجود، رسالت اور قرآن کے بارے میں گوناں گوں شبہات پر مبنی تھی۔ شاہ اسماعیل فرماتے ہیں: میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ سید صاحب مجھے جواب کا حکم دیں گے، لیکن آپ نے خود تقریر شروع کردی۔ مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ کمپنی کو آپ نے دیکھا نہیں، تاہم اگر اس کا ملازم پیغام دے کہ کمپنی آپ کو بلاتی ہے تو اجابتِ حکم لازم ہوگی یا نہیں؟ شہزادے نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر سید صاحب نے فرمایا:

> سبحان اللہ! کمپنی پر دیکھے بغیر اتنا ایمان ہے کہ اپنی بے حرمتی کا بھی خیال نہیں، لیکن قرآن سے انکار ہے، جس کا دعویٰ ہے: ''لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْجِنُّ وَالْاِنْسُ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا'' (اگر تمام جن اور انسان جمع ہوکر اس قرآن کے مثل لانا چاہیں تو کبھی نہ لاسکیں گے، اگرچہ سب ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں) اس نبی اکرم صلعم سے انکار ہے جو روشن معجزات سے مؤید تھا اور ان میں سے ایک معجزہ خود قرآن بھی تھا۔ اب تک ہزاروں شاعر اور نثر نگار پیدا ہوئے، جو آپ سے زیادہ سامان والے تھے، انھوں نے جزیہ اور قتل گوارا کیا، لیکن ایک چھوٹی سی آیت بھی قرآن جیسی نہ لاسکے۔

(۱) مجھے کسی روایت میں شہزادے کا نام نہ مل سکا۔

یہ تقریر مصطلحاتِ کلام و منطق کی آلائش سے بالکل پاک تھی، لیکن سادگی اور دل کشی کی وجہ سے اس نے شہزادے کے پندارِ علم کو چند لمحوں میں ھَبَـاءً منثـورًا بنا کر رکھ دیا۔ چنانچہ وہ بھی اپنے غلط خیالات سے تائب ہوا۔ سید صاحب کو کھانے پر بلایا اور مع اہل وعیال بیعت کی۔

متفرق واقعات

قیامِ کلکتہ کے متفرق واقعات یہ ہیں:

۱- پیگو (برما) سے سید حمزہ سونا فروخت کرنے کیلئے کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی داڑھیاں یا تو ہوتی نہیں یا بہت کم ہوتی ہیں۔ سید حمزہ کے غیر معمولی طور پر لمبی چوڑی داڑھی تھی۔ اس وجہ سے وہ حکام پیگو کے نزدیک بڑے معتبر سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس طرح آپ کی اصلاحی تحریک کی صدا برما تک پہنچی۔

۲- بعض حاسدوں نے انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ سید صاحب پہلے نواب امیر خاں کے لشکر میں نشان بردار تھا۔ نواب کمپنی سے مل گیا تو سید احمد نے پیری مریدی کا ڈول ڈالا اور اب انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ محض بے علم ہے۔ اس شکایت پر کسی نے توجہ نہ کی۔

۳- پورنیا کا ایک برہمن کا لڑکا خواب دیکھ کر سید صاحب کے پاس پہنچا اور مسلمان ہوا۔ حج میں ساتھ رہا۔ جہاد میں بھی ہم رکابی کا آرزومند تھا لیکن سید صاحب کے سفرِ ہجرت سے پیشتر ہی فوت ہو گیا۔

۴- سلہٹ، چاٹگام اور دوسرے دور افتادہ علاقوں سے بھی لوگ آئے اور سید صاحب کی بیعت سے شرف پا کر صراطِ مستقیم پر قائم ہوئے۔

۵- مولوی امام الدین بنگالی، سید صاحب کے خاص عقیدت مند تھے۔ جہاد میں ساتھ رہے، حج میں بھی ساتھ تھے۔ وہ سدارام ''نواکھالی(۱)'' کے رہنے والے تھے۔ والدہ سے ملنے کی اجازت لے کر گئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ والدہ بھی حج کرنا چاہیں تو ساتھ لے آنا۔ وہ تو نہ آئیں، لیکن مولوی امام الدین کے ساتھ تیس چالیس آدمی سید صاحب کی زیارت اور بیعت کی نیت سے آ گئے۔

۶- ایک پیرزادے نے سید صاحب کو اپنے مکان پر بلایا۔ معلوم ہوا کہ وہ شریعت حقہ کا پابند نہیں لیکن سید صاحب اس کے مکان پر گئے۔ باہر کے دروازے سے مکان کے اندر تک اس نے فرش پر پگڑیاں بچھا رکھی تھیں اور عرض کیا کہ ان پر چلیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ پگڑیاں سر پر باندھنے کیلئے ہوتی ہیں، ہم ان پر سے نہیں چلیں گے۔ اس نے خود بیعت کی اور اپنے مریدوں سے کہا کہ جو سید صاحب کی بیعت نہ کرے گا وہ میری مریدی سے بھی خارج ہوگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اپنے مریدوں سے آپ خود بیعت لیں۔ اس طرح جو بیعت ہوگی وہ ہماری بیعت سمجھی جائے گی۔

۷- بغداد کے ایک پیرزادے سید احمد ان دنوں کلکتہ آئے ہوئے تھے۔ انھیں اپنی بڑائی پر بہت فخر تھا۔ چاہتے تھے کہ سید صاحب خود آ کر ملیں۔ چنانچہ پیغام بھیجا کہ میں بیمار ہوں اسلئے آ نہیں سکتا اور ملاقات کا آرزومند ہوں۔ سید صاحب گئے۔ بات چیت کے دوران میں اس نے کہا کہ آپ اتنا بڑا قافلہ ساتھ لے کر جا رہے ہیں، اس کا خرچ کون دے گا؟ سید صاحب نے فرمایا: اگر انگریزوں کی حکومت چاہے تو کیا ہزاروں آدمیوں کو لاد کر حجاز یا کسی دوسرے ملک نہیں پہنچا سکتی؟ اگر یہ ہو سکتا ہے تو آپ کو شاہنشاہِ عالم پناہ، پروردگارِ کائنات کے متعلق کیوں شک ہے، جسکے سامنے انگریز ادنیٰ محتاجوں سے بھی زیادہ محتاج ہیں؟ پھر فرمایا: انشاء اللہ ان سب کو کرایہ دے کر لے جاؤں گا۔

(۱) ان کے وطن کا نام حاجی پور بتایا گیا ہے۔ یہ سدارام کے آس پاس کوئی گاؤں ہونا چاہیے۔

۸- سید صاحب کے بھانجے سید احمد علی صاحب کے اہل وعیال ساتھ آئے تھے، خود وہ بعض امور کے سرانجام کی غرض سے لکھنؤ میں ٹھہر گئے تھے۔ فارغ ہو کر کلکتہ پہنچے تو وہ پانچ ہزار روپے بھی ساتھ لائے جو سید صاحب نے فقیر محمد خاں رسالدار کے پاس امانت رکھوا دیے تھے۔ ستر روپے میں شاہ عبدالقادر کے ترجمۂ قرآن کا بھی ایک نسخہ ساتھ لائے، جو سید عبداللہ شیورام پوری کو بغرضِ طباعت دے دیا گیا۔

جہازوں کا انتظام

سید صاحب گھر سے خالی ہاتھ چلے تھے۔ راستے میں تحائف وہدایا کی شکل میں جو کچھ ملا، اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ آپ کے کل رفقائے حج سات سو ترپن تھے۔ ان میں سے چھ سو ترانوے کا کرایہ ادا کیا گیا، باقی لوگ وقت کے عام طریقے کے مطابق مساکین میں محسوب ہوئے اور ان کا کرایہ نہ لیا گیا۔ ابتدا میں گیارہ جہازوں کا انتظام کیا گیا تھا، بعد میں معلوم ہوا کہ پورے ساتھیوں کیلئے صرف دس جہاز کافی ہیں، اس لئے ایک جہاز چھوڑ دیا گیا۔ ابتدا میں فی کس سولہ روپے کرایہ طے ہوا تھا، بعد میں سامان وغیرہ کا کرایہ شامل کر کے بیس روپے فی کس وصول کئے گئے۔ اس طرح سید صاحب نے تیرہ ہزار آٹھ سو روپے کی رقم محض کرایہ میں دی۔

پورا قافلہ دس جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر جماعت ایک جہاز پر سوار ہوئی اور تمام جماعتوں کیلئے ایک ایک امیر مقرر ہو گیا۔ ذیل میں جہازوں، امیروں اور ناخداؤں (کپتانوں) کے نام نیز تعدادِ افراد درج ہے:(۱)

(۱) یہ نہ سمجھا جائے کہ پورے جہاز سید صاحب نے لے لیے تھے، ان جہازوں پر دوسرے مسافر بھی سوار تھے اور سامان بھی تھا۔ بعض میں سامان زیادہ تھا اور مسافر کم۔ راستے میں بھی جگہ جگہ سے مسافر ملتے گئے ہوں گے۔

نام جہاز	نام امیر جماعت	افراد کی تعداد	ناخدا یا کپتان
دریا تھی	سید صاحب	۱۵۰ (زیادہ تر اقربا)	سید عبدالرحمٰن
فتح الباری	مولوی عبدالحق	۷۰	عبداللہ بلال عرب
عطیۃ الرحمٰن	قاضی احمد اللہ میرٹھی	۶۷	محمد حسین ترک
غراب احمدی (یہ جنگی جہاز تھا اور اس پر سات توپیں تھیں)	مولوی وحید الدین و مولوی مغیث الدین	۵۰	احمد ترک
فتح الکریم	میاں دین محمد	۷۶	محمد حسین مسقطی
فیض ربانی	شاہ اسماعیل	۱۷۵	نام معلوم نہ ہو سکا
فیض الکریم	قاضی عبدالستار گڑھ مکتیشری	۵۰	نام معلوم نہ ہو سکا
عباسی	پیر محمد بانس بریلی کے	۴۰	نام معلوم نہ ہو سکا
تاج	قادر شاہ ہریانوی	۶۵	نام معلوم نہ ہو سکا
فتح الرحمٰن	محمد یوسف کشمیری	۵۰	نام معلوم نہ ہو سکا

مولانا عبدالحئی اور مولوی محمد یوسف پھلتی کے نام امیروں میں نہیں آئے۔ یہ دونوں سید صاحب کے ساتھ تھے۔

سامانِ خورونوش

کرایے کے علاوہ خورونوش کا انتظام ضروری تھا۔ چنانچہ چھ سو تین روپے آٹھ آنے

کے برتن یعنی دیگیں، دیگچے، دیگچیاں، لگن، کفگیر، چمچے، چولھے وغیرہ خریدے گئے۔ سات ہزار تین سو ستاسی روپے آٹھ آنے کی رقم رسد یعنی چاول، آٹا اور دال کی خرید میں صرف ہوئی۔ عورتوں کے لئے جہازوں میں پردہ دار جگہوں کا انتظام کیا گیا۔ اس پر مزید بارہ سو روپے خرچ آئے۔ گویا کل تئیس ہزار روپے صرف ہوئے۔ اس پاک نفس سید کی کرامت کا اس سے رشن تر ثبوت کیا ہوسکتا ہے جو خالی ہاتھ گھر سے نکلا تھا اور پورے ملک کے مسلمانوں کو حج کیلئے صلائے عام دیتا آیا تھا۔ یہ صرف کلکتہ سے حجاز تک کا خرچ تھا۔ خود جہاز میں ہزاروں روپے صرف ہوئے۔ پھر پورے قافلے کو اسی اہتمام کے ساتھ واپس لایا اور جب تک لوگ گھروں میں نہ پہنچ گئے، ان کے کھانے پینے کا پورا خرچ سید صاحب کے ذمے رہا۔

علاوہ بریں آپ وقتاً فوقتاً عام غرباء کو بھی رقمیں دیتے رہے۔ شیخ عبداللطیف مرزا پوری کا بیان ہے کہ کوئی لڑکے یا لڑکی کی شادی کیلئے امداد کی درخواست کرتا، کوئی کہتا کہ قرض دار ہوں، اس مصیبت سے نجات دلائیے، کوئی مسجد یا کنوئیں کے لئے رقم مانگتا۔ ان مدوں میں کم وبیش دس ہزار روپے خرچ ہوئے۔

سید صاحب کی سواری کا جہاز

سید صاحب نے اپنی سواری کے لئے ''دریابقی'' تجویز کیا تھا، جو پرانا جہاز تھا، اور اس کی رفتار بھی کم تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہوگی کہ سید صاحب ساتھیوں کو بہتر جہازوں پر روانہ کرنا چاہتے تھے تاکہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اپنے لئے اچھا جہاز رکھ لیا۔ دوسری وجہ یہ ہوگی کہ اس کا ناخدا ہفتہ بھر بعد روانہ ہونا چاہتا تھا اور سید صاحب اپنے اوقاتِ عزیز کا ایک ایک لحہ خلقِ خدا کی اصلاح میں صرف کرنے کے آرزومند تھے۔

شیخ غلام حسین کلکتہ کا ایک بڑا تاجر فخر التجار کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے ایک روز عرض کیا کہ آپ ''عطیۃ الرحمٰن'' میں سوار ہوں، جو شاہی جہاز ہے۔ اس طرح آپ کی عزت بڑھے گی۔ یہ سن کر سید صاحب کا چہرہ متغیر ہو گیا فرمایا:

''یہ کیا بات کہی؟ عزت تو صرف خدا کی طرف سے ہے، بندے کی طرف سے نہیں۔ ہم دنیا کی قدر و منزلت کو سڑے ہوئے مردار کتے سے بھی بدتر جانتے ہیں''

یہ سن کر غلام حسین چپ ہو گیا۔

مولانا عبدالحیٔ کے والد مولانا ہبۃ اللہ بھی اس سفر میں شریک تھے۔ وہ کلکتہ میں بیمار پڑ گئے اور وہیں وفات پائی۔

کلکتے کے ہدایا

کلکتہ والوں کے تحائف و ہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا، اس کی سرسری کیفیت یہ ہے:

۱- منشی امین الدین: پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گٹھڑی کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ململ وغیرہ۔ دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان، باقی گٹھڑیوں میں موٹا کپڑا۔ دو نہایت خوبصورت گھڑیاں، پانچ ہزار روپے اس غرض سے پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقاء کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ پانسو احرام دیے۔

۲- امام بخش سوداگر: تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے، دو شیشیاں عطر کی جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا، ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے باصرار واپس کر دیا۔

۳- غلام حسین تاجر: چار جہاز پورے نذر کئے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چونکہ انتظام ہو چکا تھا، اس لئے سید صاحب نے یہ نذر بہ شکریہ واپس کر دی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کر دیا۔ یقین ہے کہ بڑی رقم بھی ساتھ ہوگی۔ اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ ایک کوٹھی نذر کی، جو سید صاحب نے اسے واپس کر دی۔ مراجعت پر سید صاحب اسی کے یہاں ٹھہرے تھے۔

۴- شیخ رمضانی، سعد الدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہو چکے ہیں، عمرہ کے لئے باندھے جائیں، ہمارے احرام حج کے لئے استعمال کیے جائیں۔

۵- جس پیرزادے نے بیرونی دروازے سے مکان کے اندر تک سید صاحب کے لئے پگڑیاں بچھائی تھیں، اس نے سو روپے پیش کیے۔ اس درجے کی دوسری نذروں کا حساب پیش کرنا مشکل ہے۔

سید صاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دے دیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس جس کے پاس ایک جوڑا ہو اُسے تین جوڑے بنوا دیے جائیں، باقی لوگوں کیلئے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک سو کیلئے دو دو جوڑے سلوا دیے گئے۔

بیسواں باب:

سفرِ حج

(حج و زیارت اور مراجعت)

روانگی

خورونوش کا سامان ہر جہاز پر رکھ دیا گیا۔ سید صاحب کے رفقاء کا جتنا سامان تھا اس کی پہچان یہ تھی کہ ہر تنگ پر ہندسوں میں ''۱۲۷'' لکھ دیے گئے (''سید احمد'' کے اعداد از روئے ابجد) سارے جہاز یکے بعد دیگرے روانہ ہوئے۔ تمام کی تفصیل معلوم نہیں، اتنا معلوم ہے کہ ''فتح الکریم'' نے سب سے پہلے لنگر اٹھایا، جس میں امیر قافلہ میاں دین محمد تھے۔ ''وقائع احمدی'' میں زیادہ تفصیلات اسی جہاز کے متعلق ملتی ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ سفرِ حج کے متعلق زیادہ تر روایات میاں دین محمد کی تھیں اور وہ اپنے ہی جہاز کے حالات بالتفصیل بیان کر سکتے تھے۔ باقی جہازوں کے متعلق سنی سنائی باتیں بیان کی ہوں گی۔ اس کے بعد ''تاج'' چلا، پھر ''غراب احمدی''، بعد ازاں ''فیض ربانی'' جس کے امیر مولانا شاہ اسماعیل تھے اور رفقاء کی سب سے بڑی جماعت اسی جہاز پر سوار تھی۔ ''فیض ربانی'' کے بعد ''فتح الباری'' نے لنگر اٹھایا۔

سید صاحب کا جہاز سب کے بعد روانہ ہوا۔ روانگی کے سرسری حالات یہ ہیں:

۱- منشی امین الدین نے سید صاحب کو اپنے گھر پر کھانا کھلایا اور آپ ظہر تک وہیں رہے۔ مستورات کو سب سے پہلے جہاز پر پہنچا دیا گیا۔ اکثر رفقاء بھی چلے گئے۔ سید

صاحب ظہر کے بعد روانہ ہوئے۔ چلتے وقت آپ نے جو نصیحتیں فرمائیں، ان میں ایک یہ تھی: جو شخص کہے کہ سید احمد کی توجہ میں بڑی تاثیر تھی، اسے مفتری سمجھنا۔ یہ بات محض من جانب اللہ ہے۔ رخصت کے وقت اپنی سرمئی دستار منشی صاحب کے سر پر رکھ دی۔ اس وقت منشی صاحب پر بے حد رقت طاری ہوئی۔

۲- جس بگھی پر آپ روانہ ہوئے، آپ کے علاوہ سید عبدالرحمٰن، مولانا عبدالحئی، شیخ عبداللہ ابن شیخ غلام حسین تاجر اور منشی امین الدین احمد سوار تھے۔ سید محمد یعقوب اور مولوی محمد یوسف چلتی بگھی کے پیچھے کھڑے تھے۔ مسلم وغیر مسلم بہ کثرت مکانوں کی چھتوں پر بیٹھے روانگی کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔

۳- قلعے کے میدان میں نمازِ عصر پڑھائی۔ پھر سب سے مصافحہ کیا۔ بعض مساکین کو ایک ایک روپیہ عنایت فرمایا۔ اس طرح سات سو روپے خرچ ہوئے۔

۴- چاند پور گھاٹ پر کشتی کھڑی تھی، اس میں سوار ہوئے۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر سب کو بہ آوازِ بلند السلام علیکم کہا۔ اکثر لوگ رو رہے تھے۔ ہزاروں دیر تک کشتی کے ساتھ ساتھ کنارے کنارے چلتے رہے۔ مغرب کے وقت ان سب کو رخصت کیا۔

۵- دستور یہ تھا کہ سمندر میں جزر کے وقت کشتیاں روک دیتے۔ اندھیرا ہوتے ہی جزر شروع ہوا تو سید صاحب اور ان کے رفقاء کی کشتیاں بھی کنارے پر لگ گئیں۔ وہاں اکثر دوستوں اور عزیزوں کے نام خط لکھوائے، جنھیں مولوی نصیر الدین دہلوی اور شیخ محمد ساکن ڈھئی ڈھمڈھئی کے حوالے کیا گیا۔ وہ صرف سید صاحب کو رخصت کرنے کے لئے کلکتہ تک ساتھ آئے تھے، حج کے لئے جانے کا ارادہ نہ تھا۔

جہاز پر انتظامات

صبح کو گیلا کاچھی پہنچے۔ وہاں سے جہاز دو کوس پر تھا۔ جہاز پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ

آپ کی انا جمن بوا پر نزع کی حالت طاری ہے۔ آپ گھڑی بھر اس کے پاس بیٹھے رہے۔ وہ فوت ہوگئیں تو سید صاحب نے ناخدا سے اجازت لے کر میت کشتی پر سوار کرا کے کنارے پر پہنچائی اور جمن بوا کو وہاں دفن کیا۔ پہر رات رہے جہاز نے لنگر اٹھایا۔

۱- جہاز پر معمول یہ تھا کہ روزانہ صبح کی نماز کے بعد دعائے حزب البحر پڑھتے، پھر مولوی یوسف پھلتی سے سورۂ زخرف کا پہلا رکوع سنتے، بعد ازاں مختلف لوگ مذہبی باتیں پوچھتے۔ ظہر تک آرام فرماتے، بعد میں بھی نمازوں کے اوقات کے سوا مذہبی مذاکرات کا سلسلہ جاری رہتا۔

۲- سمندر کے سفر میں چونکہ اکثر ساتھیوں کو دورانِ سر اور قے کا عارضہ شروع ہوگیا تھا، اس لئے سید صاحب نے مولوی عبدالحیٔ سے مسئلہ پوچھ کر جمع بین الصلوٰتین کا اعلان فرما دیا۔

۳- بادل خاں پٹے باز طاقتور جوان تھا۔ اس نے جہاز پر پہنچتے ہی اعلان کر دیا کہ وضو کے لئے سمندر سے پانی نکالنے کی خدمت میرے حوالے کر دی جائے۔ چنانچہ نماز کا وقت قریب آتا تو بادل خاں جہاز کے ایک کنارے پر ڈول لے کر کھڑا ہو جاتا اور جو جو لگن لے کر آتا اسے بھرتا جاتا، ساتھ ساتھ اللّٰہ ھُو اللّٰہ ھُو کا ذکر بھی جاری رکھتے۔

۴- شیخ باقر علی ڈھئی ڈھمڈھئی والے نے کھانا پکانے کا کام سنبھال لیا۔ مزید چند اصحاب ان کی اعانت کیلئے تیار ہو گئے۔ سید صاحب کی جماعت کیلئے روزانہ دو دیگوں میں چاول پکتے اور ایک میں دال۔ بعض اصحاب کیلئے حسب ضرورت روٹی پکا دی جاتی۔

ہر جہاز کے تفصیلی حالات ہمیں معلوم بھی نہیں اور معلوم ہوتے تو انھیں درج بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، لیکن یقین ہے کہ ہر جہاز ایک دوسرے کی خدمت اور دینداری کی ایسی ہی کیفیات سے معمور ہوگا، جس کا سرسری نقشہ ہم سید صاحب والے جہاز کے سلسلے میں اوپر بیان کر چکے ہیں۔

سمندر کا سفر

سیلون کے پاس سے گذر کر راس کماری (۱) کا چکر کاٹا۔ یہ مقام اس زمانے میں جہازوں کیلیئے بہت خطرناک سمجھا جاتا تھا، اس لئے کہ بڑی تیز ہوائیں چلتی تھیں۔ آج کل بھی چلتی ہوں گی۔ لیکن اب جہاز رانی کا فن اور جہازوں کی مشینری بہت ترقی کر چکی ہے۔ اس حصے سے بخیر وعافیت گذرنے کے بعد جہاز کے خلاصی بڑی خوشیاں مناتے۔ ڈھول گلے میں ڈال کر ناخدا (کپتان) سے انعام لیتے، پھر مسافروں سے پیسے وصول کرتے۔ راس کماری سے گذر کر سید صاحب کا جہاز الپّی (۲) میں ٹھہرا، پھر کالی کٹ میں۔ کالی کٹ میں سید صاحب کے پہنچنے سے پہلے آپ کی شہرت پہنچ چکی تھی اور لوگ کشتیاں لیے آپ کے منتظر تھے۔ چنانچہ آپ جہاز سے اتر کر کالی کٹ (۳) گئے۔ شہر کے وسط میں ایک تالاب تھا، اس کے بیچ میں مسجد تھی وہیں آپ نے قیام فرمایا۔

(۱) راس کماری کو روایات میں ''قاف قمری'' لکھا ہے، جو غالباً کیپ کامورن کی تعریب ہے۔

(۲) الپّی جنوبی ومغربی ہندوستان کی مشہور بندرگاہ ہے جو کہ چین کے جنوب میں واقع ہے۔ سید صاحب کے سوانح نگاروں نے اسے ''الفی'' لکھا ہے۔ ممکن ہے کہ پرانا اسلامی نام یہی ہو، لیکن اسے آج کل الپّی کہتے ہیں۔

(۳) کالی کٹ کو کلی کوٹ لکھا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ سید محمد علی مؤلف ''مخزنِ احمدی'' نے ان مقامات کے ذکر میں تقدم وتاخر کر دیا ہے، اس وجہ سے ان کا بیان پیچیدہ ہو گیا ہے، لیکن سید صاحب کی جماعت کے عام محرروں کی طرح سید محمد علی نے بھی دقتِ نظر اور استقصاء جزئیات کے کمالات کی نمائش نہایت مستحسن انداز میں کی ہے۔

مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ خط استواء سے متصل ہونے کے باعث اس مقام میں سردی بالکل نہیں ہوتی۔ غیر مسلم، عورتیں اور مرد ننگے رہتے ہیں۔ ناکتخدائی کی علامت یہ ہے کہ ہر صبح کو غیر شادی شدہ لڑکیاں اپنے اندام پر پھول رکھ لیتی ہیں۔ بوڑھی عورتیں بعض اوقات کپڑے سے منہ ڈھانپ لیتی ہیں۔ مسلمان ستر وحجاب کی سخت پابندی کرتے ہیں، ان کی عورتیں برقعے پہن کر نکلتی ہیں اور پانچوں وقت نماز مردوں کے ساتھ مسجد میں ادا کرتی ہیں۔ عقیدۃً یہ لوگ شافعی ہیں۔ ہاتھی سب کے پاس ہیں اور ہر قسم کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً معماری کا کام کرنے والے کا ہاتھی مالک کو اینٹیں اور گارا سونڈ سے پکڑا تا رہتا ہے۔ مسجدیں پر رونق ہیں اور جھاڑ فانوس سے آراستہ۔ ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

کالی کٹ سے روانہ ہوئے تو جزائر لکادیپ کے مجمع میں سے گذرے۔ امنی (۱) سے پانی لیا۔ عقیدی (۲) کا بھی ذکر آیا ہے۔ پھر جزیرہ سقوطرہ کے پاس سے ہوتے ہوئے عدن پہنچے۔

عدن عرب کی پاک سرزمین کا پہلا خطہ تھا، جہاں سید صاحب نے قدم رکھا، اس لئے اترتے ہی دوگانۂ شکر ادا کیا، پھر شہر میں گئے۔ دنبہ لے کر ذبح کرایا۔ سید عیدروس ان اطراف کے مشہور بزرگ گذرے ہیں، ان کا مقبرہ عدن میں ہے۔ سید صاحب اس مقبرے میں بھی گئے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک رات شہر میں گزاری۔ دوسری روایت میں ہے کہ تین راتیں رہے۔

عدن سے چلے تو باب المندب (۳) میں پہنچے۔ یہ مقام بھی جہازوں کے لئے خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اس جگہ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ عرب ملتے ہیں۔ عرب اور افریقہ کے خطے بالکل قریب آگئے ہیں۔ تنگنائے کے عین بیچ میں ایک پہاڑی جزیرہ (پیرم) ہے اور بڑی احتیاط سے گذرنا پڑتا ہے۔ ذرا جہاز بے قابو ہوا تو موجیں اسے اٹھا کر پہاڑی سے پٹک دیں۔ اس وقت پہر رات باقی تھی۔ جہاز کے خلاصیوں نے سید صاحب کو جگایا کہ اس موقع سے بخیر و عافیت گذرنے کے لئے دعا فرمائیں۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... مسافر اترتے ہی نکاح کر سکتے ہیں، نصف مہر پہلے ادا کرنا پڑتا ہے۔ اگر مسافر جاتے وقت اہلیہ کو چھوڑنا چاہے تو باقی نصف مہر اور ایام عدت کا خرچ قاضی کے سامنے ادا کر دیتا ہے۔ اس طرح سیکڑوں بچے پیدا ہوتے ہیں، جنھیں باپوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ انھیں "ماپلا" یا "بچہ مادر" کہتے ہیں۔ میاں دین محمد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلم ناکتخدا عورتیں ننگی رہتی ہیں۔ بیاہی عورتیں لنگوٹی باندھتی ہیں۔ مسلمان عورتیں گھٹنوں تک تہمد اور لمبی آستینوں کی کرتی پہنتی ہیں۔ مچھلی، کیلا اور ناریل بہت ہوتا ہے۔ سیلون کے پاس مچھلی کے آٹے میں کھجور اور گھی ڈال کر پنڈیاں بناتے دیکھا۔

(۱) امنی کا پورا نام امین دیپ ہے۔ دیپ جزیرے کو کہتے ہیں یہ نام غالباً کسی عرب آبادکار کے نام پر رکھا گیا۔

(۲) عقیدی کا انگریزی تلفظ اگاتھی (AGATHE) ہے۔

(۳) "وقائع" میں اسے باب اسکندر لکھا ہے اور باب المندب کے نام سے بھی مشہور ہے۔

بحیرۂ قلزم کے سفر کا حال بیان کرتے ہوئے سید زین العابدین بیان کرتے ہیں کہ ایک روز حضرت جہاز کے اگلے حصے پر جنگلا پکڑے کھڑے تھے۔ بار بار سبحان اللہ وبحمدہ اور سبحان اللہ العلی العظیم پڑھ رہے تھے۔ پھر خواجہ حافظ کے دیوان سے بعض شوق انگیز اشعار پڑھنے لگے۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اسی حالت میں خدائے پاک کی عظمت کا بیان شروع کر دیا اور کئی گھڑیاں اسی کیفیت وذوق میں بسر فرمادیں۔

مخا میں قیام

عدن کے بعد جہاز یمن کی مشہور بندرگاہ مخا میں ٹھہرا۔ وہاں ایک مہینہ کا قیام اس وجہ سے ناگزیر ہو گیا کہ بہت سا سامان اتارنا تھا، نیز جہاز کا کپتان اپنے وطن ''ظفاء'' (حضرموت) جانا چاہتا تھا۔ حج میں چوں کہ چار پانچ مہینے باقی تھے۔ اس لئے ایک مہینے کے قیام میں مضائقہ نہ تھا۔ سید صاحب نے ایک حویلی کرایے پر لے لی اور ہمراہیوں کے ساتھ اسی میں رہنے لگے۔ آپ کی جماعت کے جو جہاز پہلے آچکے تھے، وہ بھی مخا میں ٹھہرتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔

سید صاحب نماز مخا کی جامع مسجد میں ادا کرتے تھے۔ وہاں لوگ عام طور پر حوضوں میں ننگے نہاتے تھے، ان کی بے خبری یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ایک روز مولوی امام الدین بنگالی کو تہمد باندھے ہوئے ایک حوض میں نہاتے دیکھا تو انھیں پکڑ کر قاضی صاحب کے پاس لے گئے اور شکایت کی کہ اس شخص نے ہمارا حوض گندہ کر دیا ہے۔ سید صاحب نے قاضی کے پاس آدمی بھیجے اور اسے ننگے نہانے کی قباحتوں سے آگاہ کیا۔ اس طرح مولوی امام الدین کو مخمصے سے چھڑایا۔ قاضی نے حکم دے دیا کہ کم از کم ہندوستانی قافلے کے قیام تک کوئی شخص کسی حوض میں ننگا نہ نہائے۔

قیامِ مخا کے دوران میں معلوم ہوا کہ یمن کے شہرۂ آفاق عالم دین، قاضی محمد علی

شوکانی نے ایک کتاب میں موضوع حدیثیں جمع کر دی ہیں۔ سید صاحب نے مولانا عبدالحئی سے فرمایا کہ یہ کتاب حاصل کرنیکی تدبیر کیجئے۔ مولانا قاضی شہر کے پاس پہنچے۔ مخا میں تو کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا، لیکن قاضی نے کہا کہ آپ ایک خط لکھ دیں، میں صنعا بھیج کر کتاب منگا دوں گا۔ چنانچہ مولانا نے مفصل خط عربی میں لکھ کر قاضی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح قاضی شوکانی کی کتاب سید صاحب کی وساطت سے ہندوستان پہنچی۔

جدہ

مخا سے چلے تو حدیدہ میں ٹھہرے۔ جہاں سید صاحب کے ایک ہندوستانی دوست قیام پذیر تھے۔ انھیں سید صاحب کی تشریف آوری کا علم ہو چکا تھا۔ جہاز پر آ کے ملے۔ آپ کی دعوت کی۔ سید صاحب نے چلتے وقت اس دوست کو ایک ولایتی تلوار، ایک سپرا اور ایک دونالی بندوق عطا فرمائی۔

یلملم کے محاذ میں پہنچے تو پورے قافلے نے غسل کر کے عمرے کا احرام باندھا۔ دو رکعت نماز ادا کر کے سب سے پہلے سید صاحب نے ''لبیک'' کی صدا بلند کی۔ پھر پورے قافلے کی صدائے لبیک سے جہاز گونج اٹھا۔ سید صاحب دو گھڑی دعاء میں مشغول رہے۔

جدہ پہنچے تو جو ہمراہی پہلے پہنچ چکے تھے ان میں سے اکثر مکہ معظمہ جا چکے تھے۔ کچھ لوگ سید صاحب کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ حیدر آباد دکن کے دو بھائی، محمود نواز خاں اور سلطان حسین خاں بسلسلہ تجارت مکہ معظمہ میں مقیم تھے۔ محمود نواز خاں سید صاحب کی شہرت سن کر بغرض زیارت جدہ آ گئے۔ سید صاحب کا خاندانی معلم بھی وہاں پہنچا ہوا تھا۔ اس کے پاس سید ابواللیث مرحوم (سید صاحب کے ماموں) کا مہری پروانہ موجود نہ تھا۔

سید صاحب چار دن جدہ میں ٹھہرے رہے۔ (۱) اس اثناء میں اس مقام کی بھی

(۱) ''مخزنِ احمدی'' میں ہے پانچ دن۔ ص:۹۰

زیارت کی جو مزارِ حوّا کے نام سے مشہور تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل کو تصفیۂ محاصل کے لئے چھوڑ دیا اور خود روانہ ہو گئے۔ کلکتہ سے روانگی کے وقت مختلف جماعتوں کے امیروں کو کچھ رقمیں متفرق مصارف کیلئے دے دی گئی تھیں۔ جدہ میں ان رقموں کا حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دو ہزار ایک سو روپے زائد خرچ ہوئے۔ سید صاحب نے یہ رقم بھی ادا فرما دی۔

مکہ معظّمہ میں داخلہ

جدہ سے چل کر ایک مقام حدہ میں کیا۔ پھر حدیبیہ (۱) میں ٹھہرے، جہاں بیعت رضوان ہوئی تھی۔ وہاں رفیقوں سمیت دیر تک دعاء میں مشغول رہے۔ (۲) تیسرے روز چاشت کے وقت مکہ معظمہ میں پہنچ گئے۔

شہر میں داخلے کے دو راستے تھے، ایک اسفل مکہ کی طرف سے اور دوسرا اعلائے مکہ کی طرف سے۔ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے دن اعلائے مکہ کی طرف سے شہر میں داخل ہوئے تھے۔ سید صاحب نے بھی تیمن وتبرک کے طور پر یہی راستہ اختیار کیا۔ شعبان ۱۲۳۷ھ کی اٹھائیسویں تاریخ تھی۔ (۲۱رمئی ۱۸۲۲ء) دھوپ بہت تیز ہوگئی تھی۔ (۳) سید صاحب حجون کی گھاٹی سے گذر کر جنت المعلٰی میں پہنچے اور ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ کے مزار پر دیر تک مصروفِ دعاء رہے۔ باب السلام سے حرمِ پاک میں داخل ہوئے۔ طواف کے بعد مقامِ ابراہیم پر دو رکعت نماز ادا کی۔ زمزم پر پانی پیا۔ سعی کے بعد حلق کیا اور احرام کھولا۔ اس طرح گھر سے نکلنے کے بعد حرمِ پاک میں پہنچنے

(۱) یہ مقام جدہ سے مکہ معظمہ ہو جاتے ہوئے حدِ حرم کے پاس ہے۔ آج کل حدیبیہ کے بجائے شمیسی کی شہرت زیادہ ہے۔ حدیبیہ اس کے قریب ہی تھا۔

(۲) مخزنِ احمدی میں ہے: برائے آمرزش جمیع قافلہ بہ کمال ابتہال وخضوع وخشوع بہ جناب رب العطایا مسئلت فرمودند۔

(۳) مخزنِ احمدی ص:۹۲۔

تک کل دس مہینے سفر میں بسر ہوئے۔ ایک مہینہ بنارس میں ٹھہرے، تین مہینے کلکتہ میں اور ایک مہینہ مخا میں۔ باقی مقامات پر کہیں پندرہ روز قیام کیا، کہیں آٹھ روز، کہیں دو چار دن اور کہیں صرف ایک رات۔

سید صاحب مکہ معظمہ پہنچے تھے تو روزانہ خرچ کی یہ کیفیت تھی:

آٹا	تیس ریال
متفرق جنسیں	چھ ریال سے گیارہ ریال
لکڑی	تین ریال

آٹے کا بھاؤ گیارہ کیل فی ریال تھا۔ کیل تقریباً پونے دو سیر کا ہوتا ہے۔ گویا چودہ من پندرہ من آٹا روزانہ خرچ ہوتا تھا۔ کل خرچ انتالیس ریال روزانہ تھا۔ آخری دور میں تو گھٹ کر پچیس ریال رہ گیا تھا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ تھی کہ گوشت کے بجائے زیادہ تر دال پکتی تھی۔ دوسری وجہ یہ ہوگی کہ ادائے حج کے بعد اکثر رفقاء مختلف جہازوں میں سوار ہو کر واپس آتے رہے۔

قیام گاہ اور عبادات

آپ کیلئے باب عمرہ کے پاس زین العابدین کی حویلی کرایے پر لی گئی تھی۔ رفیقوں کے ٹھہرنے کیلئے دوسرے مکانات کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ پہلے دن شیخ عبداللطیف مرزاپوری نے دعوت کی، جو سید صاحب سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے تھے۔ پھر لنگر جاری ہو گیا۔ شاہ اسماعیل نے جدہ سے چاول، آٹا اور دال وغیرہ چیزیں بھجوادی تھیں۔ گوشت بازار سے لیتے تھے۔ رمضان میں دونوں وقت گوشت پکتا رہا۔ پھر سید صاحب نے حکم دے دیا کہ روزانہ دال پکا کرے اور آٹھویں دن ایک مرتبہ گوشت پکایا جائے۔

ساری نمازیں حرم میں ادا کرتے تھے۔ نمازِ تراویح میں چوں کہ مختلف حفاظ اپنی

جماعتیں قائم کر لیتے تھے، اس لئے سماعِ قرآن میں سکون و یکسوئی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ سید صاحب نے یہ فیصلہ کرلیا کہ جب تک دوسری جماعتیں ہوں، سب بھائی آرام سے بیٹھے قرآن سنتے رہیں۔ جب دوسرے لوگ فارغ ہوجائیں تو اپنی جماعت کھڑی ہو۔ سید محمد (ابن سید ابوالليث) روزانہ دو پارے قرآن سناتے تھے۔

نمازِ تراویح کے بعد سید صاحب ایک گدھے پر بیٹھ کر تنعیم چلے جاتے، جہاں سے حدِ حرم بہت قریب ہے۔ وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کر آتے اور طواف کرتے۔ رات زیادہ ہوتی تو سعی وقصر کے بعد احرام کھولتے، پھر سحری کھاتے۔ اگر وقت کم ہوتا تو پہلے سحری کھاتے پھر سعی وقصر کرتے اور احرام کھولتے۔(۱) نمازِ فجر کے بعد اشراق تک طواف کرتے رہتے، پھر قیام گاہ پر آتے۔

۲۰ ررمضان المبارک سے آپ حرمِ پاک میں معتکف ہوگئے۔ شوال کا چاند نکلنے پر اعتکاف سے باہر آئے۔ عیدالفطر کے روز سید صاحب نے شیخ عمر بن عبدالرسول سے ملاقات کی۔ وہ اونچے پایے کے محدث اور بڑے تقویٰ شعار بزرگ تھے۔ سلطان ترکی نے ایک مرتبہ شتر بار دینار اس غرض سے بھیجے کہ میری طرف سے حج کریں۔ آپ نے یہ رقم واپس کردی اور فرمایا کہ میں سلطان کی طرف سے نیابۃً حج کر چکا ہوں۔ سید صاحب نے پانچ ریال شیخ عمر کی خدمت میں پیش کیے۔

عید کے دن اکابر میں سے جن اصحاب نے سید صاحب کی بیعت کی، ان کے نام یہ ہیں: شیخ مصطفیٰ امام حنفیہ، خواجہ الماس ہندی اور دوسرے خواجہ سرا شیخ شمس الدین، شیخ حسن آفندی۔

---

(۱) عام روایتوں میں ہے کہ روزانہ عمرہ ادا کرتے تھے۔ ''مخزنِ احمدی'' میں ہے کہ صرف دوشنبہ اور جمعہ کو ادا کرتے تھے۔

مولانا اسماعیل کی والدہ

قافلے کے لوگ خدا کے فضل سے عموماً ہر آفت سے محفوظ رہے۔ صرف چند موتیں ہوئیں: ایک عنایت علی عظیم آبادی بیمار ہوئے اور سیلون کے قریب فوت ہو گئے۔ دوسرے عبدالغفار خاں بخاری نے وفات پائی۔ یہ دونوں جہاز فتح الکریم پر سوار تھے۔ سید صاحب کی انا جمن بوا دریا بقی پر سوار تھیں اور کلکتہ کے قریب ہی فوت ہوئیں۔ مولانا شاہ اسماعیل کی والدہ حج کے لئے آئی تھیں، وہ مکہ معظمہ پہنچ کر سخت بیمار ہو گئیں اور زندگی کی امید باقی نہ رہی۔ شاہ صاحب کی دلی آرزو تھی کہ والدہ سید صاحب کی بیعت کر لیں۔ لیکن وہ فرماتیں کہ سید صاحب ہمارے خاندان کے مرید ہیں، میں ان کی بیعت نہیں کر سکتی۔ شاہ صاحب دعائیں کرتے رہتے تھے۔

ایک رات مرحومہ نے خواب دیکھا کہ آفتاب سوا نیزے پر آیا ہوا ہے، قیامت کی گرمی ہے، خلقِ خدا تشنگی سے بے تاب ہے اور دور دور تک نہ سایہ ہے، نہ پانی۔ ایک جگہ سایہ نظر آیا بے شمار خلقت اس سایہ میں شاداں و فرحاں تھی۔ پوچھا: یہ کون سا گروہ ہے؟ سید محمد علی جنھوں نے اس پورے واقعے کو نظم کر دیا تھا، فرماتے ہیں:

گفت ایں جملہ گروہِ احمدی است — سایۂ ظلِّ فیض سرمدی است
تو از ایشاں شو کہ تازی شاں شوی — دور کن افکار تا ز ایشاں شوی

مرحومہ جاگیں تو بے تکلف سید صاحب کی بیعت کر لی۔ اسی بیماری میں فوت ہوئیں اور جنت المعلّٰی میں انہیں دفن کیا گیا۔

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں: شیخ شمس الدین شطا، احمد پاشا سلطان مصر کے نائب شیخ حسن آفندی (ص: ۳۲۳) نیز علمائے مکہ میں سے شیخ عبداللہ سراج، سید محمد مغربی، حافظ بخاری مع قسطلانی، شیخ حمزہ محدث، شیخ احمد بن ادریس، محمد علی ہندی، ملا بخاری، امام شیخ صالح شافعی، حنفی مفتی اور واعظ شیخ علی سے برابر ملاقاتیں رہتی تھیں۔

ادائے حج

۸ ذی الحجہ کو حسبِ سنت حج کے لئے روانہ ہوئے۔ تمام مشاعر پر طویل دعائیں کیں۔ منیٰ میں خیمہ وسط مسجد خیف میں نصب کیا۔ غار مرسلات اور مسجد کبش میں بھی گئے۔ بیعت عقبہ کے مقام پر رفیقوں نے تبرکاً تجدید بیعت کی۔ سب سے لمبی دعائیں وقوفِ عرفہ کے دن جبلِ رحمت کے دامن میں کیں۔ ایک دعاء یہ تھی کہ قافلے میں سے کوئی شخص ''حاجی'' لقب سے ملقب نہ ہو، اس لئے کہ حج ایک اسلامی فرض ہے، اسے بجالانے پر امتیازی لقب کیوں اختیار کیا جائے؟ اس مقامِ پاک اور یومِ پاک کی برکات کے پیش نظر تمام رفقاء نے پھر بیعت کی۔ بعد غروب مزدلفہ میں آئے۔ کثرتِ ازدحام کے باعث قافلہ بکھر گیا۔ خود سیدہ زہرہ والدہ سائرہ بی بی کی سواری بھی الگ ہوگئی۔ چند رفیق ان کے ساتھ رہے۔ رمیٔ جمرات کے بعد قربانی کی۔ ایک سے زائد بکرے سید صاحب نے صرف اپنے لئے خریدے تھے۔ تین روز منیٰ میں مقیم رہے۔ روزانہ قربانیاں کرتے اور بعد نمازِ عصر طواف کے لئے حرمِ پاک میں پہنچتے۔

مکہ معظمہ میں مشغولیتیں

غرّہ محرم سے آپ نے محمد سعید عرب کی حویلی کرایہ پر لے لی تھی۔ سیکڑوں علماء، صلحا اور اشراف سے ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب سید محمد نام مغرب اقصیٰ کے تھے، جنھیں پوری صحیح بخاری مع شرح قسطلانی حفظ تھی۔ جادیوں اور بلغاریوں نے بھی بیعت کی۔

مولانا عبدالحیؒ نے حرمِ پاک میں مشکوٰۃ کا اور شاہ اسماعیل نے حجۃ اللہ البالغہ کا درس شروع کردیا تھا۔(۱) مولانا نے اس اثناء میں سید صاحب کی کتاب ''صراطِ مستقیم'' کا

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ایک قلمی یادداشت کی بنا پر فرماتے ہیں کہ درس مدینہ منورہ سے واپسی پر شروع ہوا تھا۔ واللہ اعلم

عربی میں ترجمہ کیا، جس کی نقلیں بعض اصحاب نے لے لیں۔(۱)

۱۲۳۷ھ کے حج میں قاضی شوکانی بھی آئے تھے اور شہر سے باہر ٹھہرے ہوئے تھے۔ مولانا عبدالحیٔ اور مولانا منصور الرحمٰن (ابوعبداللہ بن شیخ عبداللہ بن نواب جمال الدین انصاری دہلوی) نے قاضی شوکانی سے ملاقات کی تو انھوں نے ''اتحاف'' کا ایک ایک نسخہ دونوں کو تحفۃً دیا۔

سید صاحب کی شانِ للّٰہیت

مکہ معظمہ میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جس سے سید صاحب کی شانِ للّٰہیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ میاں عبداللہ نو مسلم دہلوی سید صاحب کے خاص خادموں میں تھے اور کنبے کے افراد کی طرح رہتے تھے، ان کا اور اہل وعیال کا پورا خرچ سید صاحب کے ذمے تھا۔ سید صاحب کے گھر میں بچی پیدا ہوئی۔(۲) اہلیہ عبداللہ کی گود میں ایک لڑکا تھا۔ سید صاحب نے اہلیہ عبداللہ سے کہا کہ ہماری بچی کو بھی دودھ پلا دیا کرو۔ اس نے عرض کیا، میرا دودھ اتنا کم ہے کہ خود میرے بچے کو بھی بمشکل کفایت کرتا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم دودھ بڑھانے کی دوائیں کھلائیں گے، اس نے پھر عرض کیا کہ میں ساری تدبیریں کر چکی ہوں، دودھ نہیں بڑھا۔ اگر بچی کو پلاؤں گی تو بچے کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، سید صاحب نے فرمایا کہ ''فکر نہ کرو اور بچی کو دودھ پلا دیا کرو۔''

میاں دین محمد کہتے ہیں کہ میاں عبداللہ نے اپنی اہلیہ سے یہ بات سنی تو پریشانی کی حالت میں مجھ سے ذکر کیا، میں نے کہا کہ بزرگوں کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا، یاد

---

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی کے قول کے مطابق یہ ترجمہ شیخ حسن آفندی کی خاطر کیا گیا تھا۔

(۲) منظورہ نسخہ ٹونک میں یہ تصریح مذکور ہے: ہم درآں ایام (قیامِ مکہ معظمہ) جناب ممدوح (سید صاحب) را از بطن مخدومہ ممدوحہ دخترے تولد شد۔ میرے قیاس کے مطابق یہ بچی سیدہ ولیہ کے بطن سے تھی اور غالباً سفر میں ہی فوت ہوگئی۔ اس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔

رکھو! حضرت کبھی پسند نہ کریں گے کہ ان کی بچی سیر ہو اور آپ کا بچہ بھوکا رہے۔

ایک دو روز کے بعد سید صاحب کو احساس ہوا کہ عبادت میں پہلے کی سی لذت ومحویت باقی نہیں رہی۔ بڑے پریشان ہوئے، آخر یاد آ گیا کہ اہلیہ عبداللہ کو باصرار دودھ پلانے پر مجبور کیا۔ آپ نے فوراً چند مستورات کو ساتھ لیا اور اہلیہ عبداللہ کے پاس پہنچے، وہ گھبرا گئی، آپ نے فرمایا: گھبراؤ نہیں ہم سے خطا ہوئی اور اب معافی مانگنے آئے ہیں۔ للہ معاف کردو۔ وہ رونے لگی، عورتوں کے سمجھانے پر اس نے کہا: معاف کیا۔ تین بار یہ الفاظ دہرا چکی تو سید صاحب نے اس کیلئے دعاء کی اور اپنی اہلیہ سے کہا کہ ان کی دل جوئی میں کوتاہی نہ ہو۔

پھر آپ شیخ عبداللطیف کی قیامگاہ پر پہنچے، جہاں مولانا عبدالحیؒ، شاہ اسماعیل، حکیم مغیث الدین اور دوسرے اصحاب موجود تھے، یہاں عبداللہ کو بلا کر پاس بٹھایا، اس کے بعد وعظ فرمایا، جس میں قادر ذوالجلال کی بے نیازی کا ذکر کرتے ہوئے بندوں کی مساوات پر زور دیا۔ آخر ماجرا سنایا اور کہا کہ مجھ سے خطا ہوئی، اہلیہ عبداللہ سے معافی لے چکا ہوں، اب آپ سب کے روبرو عبداللہ سے معافی مانگتا ہوں۔ عبداللہ کی زبان شدتِ گریہ سے بند ہوگئی، بولا تو یہ کہ ''میں فرماں بردار ہوں''۔ سید صاحب نے فرمایا: آپ میرے بھائی ہیں، مجھ سے تقصیر ہوئی، للہ معاف کردیں۔ اس نے کہا کہ اگر میرے کہنے ہی پر موقوف ہے تو میں نے جان ودل سے معاف کیا، اس پر سید صاحب نے میاں عبداللہ کے لئے بھی دعاء کی۔

مدینہ منورہ کا سفر

اواخر محرم میں مدینہ منورہ کا قصد فرمایا۔(۱) ایک سو بیس اونٹ کرائے پر لئے۔

(۱) بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسماعیل اس سفر میں ساتھ نہ جا سکے اور والدہ کی علالت کے باعث مکہ معظمہ میں قیام پر مجبور ہوگئے۔

شغدف اور شبریاں خریدیں، تمام اسلحہ مکہ معظمہ میں چھوڑے، میدان طویٰ میں دو روز قافلہ تیار ہوتا رہا۔ اس سفر کے سلسلے میں مندرجہ ذیل منازل کے نام آئے ہیں:

(۱) وادیٔ فاطمہ براہ سرف، جہاں ام المومنین حضرت میمونہ کا مزار تھا (۲) خلیص (۳) ایک بے آب جگہ (۴) دریائے شور کے پاس (۵) وادیٔ صفرا (۶) وادیٔ خیف (۷) ایک منزل جہاں کنوؤں کو خار بندی سے بند کر دیا گیا تھا (۸) ذوالحلیفہ۔

یہ کل آٹھ منزلیں ہوتی ہیں، لیکن جس راستے سے سید صاحب گئے وہ وہی تھا جسے ترکوں کے آخری زمانے میں "طریق سلطانی" کہتے تھے۔ اس راستے کی منزلیں کم از کم گیارہ تھیں، ظاہر ہے کہ بعض کے نام چھوٹ گئے، مثلاً وادیٔ فاطمہ اور خلیص کے درمیان ایک مشہور منزل عسفان ہے، جس مقام کو ایک بے آب جگہ بتایا گیا ہے وہ قضیمہ (عام لفظ قدیمہ) یا اس کے آس پاس ہونا چاہئے۔ دریائے شور کے پاس جو مقام بتایا گیا ہے وہ یقیناً رابغ ہے۔ رابغ اور وادیٔ صفرا کے درمیان میں ایک منزل ہونی چاہیے۔ بعد کے زمانے میں اس کا نام مستورہ تھا۔ وادیٔ صفرا مقامِ بدر سے ایک منزل جنوب میں ہے۔ ذوالحلیفہ وہی مقام ہے، جسے آج کل آبار علی کہتے ہیں، اور یہ مدینہ منورہ سے صرف چھ میل ہے۔

اگرچہ راستہ خاصا خطرناک بتایا جاتا تھا، لیکن سید صاحب نے ہتھیار مکہ معظمہ ہی میں چھوڑ دیے تھے۔ (۱) اعلان کر دیا تھا کہ ہم ہر تکلیف کو جھیلیں گے، اور کسی کے خلاف ہاتھ نہ اٹھائیں گے۔ ایک مقام پر رہزن حملے کے لئے آ گئے، سید صاحب نے تمام توانا آدمیوں کو چن کر چار جماعتوں میں بانٹا اور انہیں کو دائیں بائیں، آگے پیچھے کھڑا کر دیا، بیچ

(۱) "مخزنِ احمدی" میں ہے کہ عرب میں مشہور ہو چکا تھا، ہندوستان سے ایک سید ساڑھے سات سو کا قافلہ لے کر حج کیلئے آیا ہے اور سب کا خرچ خوراک و پوشاک اس نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ اسکے پاس بہت مال ہے، اسلئے لٹیرے بدوؤں کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ سید صاحب نے یہ جانتے ہوئے فرمایا کہ ہم کوئی سامانِ مدافعت نہ لیں گے۔

میں عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کو رکھا۔ اس اثناء میں شتر بانوں کے سردار نے بات چیت سے راہزنوں کو واپس کر دیا، یہ واقعہ ذوالحلیفہ سے پیشتر کی منزل میں پیش آیا۔(۱)

وادیٔ صفرا میں ایک بدو پستول بیچنے کے لئے آیا، سید عبدالرحمٰن نے کہا کہ ایسے پستولوں کی جوڑی ہو تو خرید لوں، بدو دوسرا بھی لے آیا، دس ریال میں سودا ہوا، مکہ معظمہ واپس آئے تو معلوم ہوا کہ یہ پستول احمد پاشا حاکم حجاز کے ہاں سے چرائے گئے تھے۔ سید صاحب نے پستول حاکم کے حوالے کر دیے۔ اس نے معاوضے میں اسلحہ خانے سے عمدہ پستولوں کی ایک جوڑی بھیج دی، وادیٔ صفرا میں حضرت ابو عبیدہؓ بن الحارث بن عبدالمطلب کی قبر کی زیارت کی، جہاں سے پانچ میل پر بدر تھا۔ چونکہ شتر بانوں میں سے اکثر بدو صفرا کے باشندے تھے، انہوں نے ایک دن قیام کی درخواست کی اور سید صاحب نے یہ منظور فرمالی۔

مدینہ منورہ میں ایک مہینہ

سید صاحب راستے میں سخت بیمار ہو گئے، بعض اوقات بیہوش ہو جاتے تھے، مدینہ منورہ پہنچنے سے پہلے تندرست ہو گئے۔ ذوالحلیفہ سے چل کر آدھی رات کو مدینہ منورہ میں پہنچے اور مناخہ میں اترے، پھر غسل کیا اور لباس بدلا، شہر کا دروازہ کھلا تو اندر گئے۔ باب السلام سے حرم پاک میں داخل ہوئے، شافعی امام کے پیچھے نماز صبح پڑھی۔ اشراق تک اوراد و وظائف میں مشغول رہے، بعد اشراق روضۂ منورہ کی زیارت کی۔

(۱) ''مخزنِ احمدی'' میں ایک اور واقعہ بھی مرقوم ہے، کہ جحفہ میں شتر بانوں اور اہل قافلہ کے درمیان اتفاقیہ جھگڑا ہوا، یہاں تک کہ بعض آدمیوں نے ایک دوسرے کے مکے بھی مارے اور باہم گتھم گتھا بھی ہوئے۔ شتر بانوں نے قافلے سے الگ ہو کر سنگ باری شروع کر دی، عورتیں اور بچے رونے لگے۔ سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو حزب البحر کا کچھ حصہ پڑھ کر دعاء کی اور شتر بانوں کے سردار کو بلا کر ہیبت انگیز انداز میں فرمایا کہ سنگ باری بند کراؤ، پھر سید صاحب اور شتر بانوں کے سردار نے دونوں فریقوں کے زخمیوں سے معانقہ کرا کے انہیں ٹھنڈا کیا۔

قیام کے لئے سید سمہودی کا مکان لے لیا تھا، جو حرمِ پاک کے پاس باب جبریل سے بالکل متصل تھا۔ اسی مکان میں حضرت عثمانؓ شہید ہوئے تھے اور یہی مکان بعد میں شیخ الحرم کیلئے مخصوص ہوگیا تھا۔ سید صاحب نے آہستہ آہستہ حرم مدینہ کے تمام مآثر کی زیارت کی، مثلاً جنت البقیع، سیدنا حمزہ، جبل احد، مسجد قبلتین، مسجد قبا، بیر خاتم وغیرہ۔(۱)

اس زمانے میں ارباب حکومت نجدیوں سے بے حد بگڑے ہوئے تھے، ان کے ساتھ جنگ کو ختم ہوئے چند ہی سال گذرے تھے، اگر کوئی شخص موحدانہ عقائد کی اشاعت میں ذرا سرگرم معلوم ہوتا اور بدعات و محدثات کے رد میں سختی سے کام لیتا تو اسے ''وہابی'' سمجھ کر مواخذے کا تختۂ مشق بنالیا جاتا تھا۔ سید صاحب کے ساتھیوں میں مولوی عبدالحق نیوتنوی بہت تیز مزاج تھے، وہ بعض مروجہ غیر شرعی مراسم کے رد و ابطال میں ذرا تیزی سے کام لیتے تھے، جھٹ شکایت ہوئی کہ یہ ''وہابی'' ہیں، چنانچہ ان پر مقدمہ قائم ہوگیا۔ مولانا عبدالحیٔ نے ضمانت دے کر انہیں چھڑایا اور مقدمے کی جواب دہی کے موقع پر بھی مولانا ہی نے عدالت سے بات چیت کی، اس طرح مولوی عبدالحق رہا ہوگئے، مکہ معظمہ تک سید صاحب کے ساتھ رہے، پھر صنعاء چلے گئے اور قاضی شوکانی سے حدیث کی سند لے کر ہندوستان آئے۔

بیت المقدس جانے کا ارادہ بھی ہوگیا تھا، لیکن ہمراہیوں کا اضطراب دیکھ کر یہ ارادہ ترک کردیا، اس لئے کہ سب کو ساتھ لے جانا مشکل تھا اور کسی کو پیچھے چھوڑنا بھی گوارا نہ تھا۔(۲) مدینہ منورہ میں سردی تیز ہوگئی، شیخ عبداللطیف نے کمبل خرید کر سید صاحب کے ہمراہیوں کو چغے سلوا دیے۔

---

(۱) انکے علاوہ بھی مدینہ منورہ میں کئی مآثر بتائے جاتے ہیں، یقین ہے کہ سید صاحب ان تمام مقامات پر پہنچے ہونگے۔

(۲) سید عبدالرحمٰن نے ارادہ کرلیا تھا اور سید صاحب بھی جانے کے خواہاں تھے، بیعت کے لئے چالیس آدمی چن لئے گئے، لیکن اخوند محمد عظیم نے یہ کہہ کر روک دیا کہ ہم سب تباہ ہو جائیں گے۔

مراجعت

اواخر محرم میں مکہ معظمہ سے روانہ ہوئے تھے، دس گیارہ دن سفر میں لگے، ایک مہینہ مدینہ منورہ میں گزار کر ۹ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ کو واپس ہوئے۔(۱) سید زین العابدین (ابن سید احمد علی) بہت بیمار ہو گئے تھے، سید عبدالرحمٰن کو ان کی خبر گیری کے لئے چھوڑ دیا۔ ایک رات ذوالحلیفہ میں گزاری، جہاں سے عمرے کا احرام باندھا، اس کے بعد صرف خلیص اور وادیٔ فاطمہ کی منزلوں کا ذکر آتا ہے۔

ہمراہیوں میں سے جن جن کیلئے جہازوں پر جگہیں نکلتی آئیں، انہیں ہندوستان بھیجتے گئے، خود پہلے کی طرح حرمِ پاک میں مشغولِ عبادت ہو گئے۔

فرماتے ہیں ایک مرتبہ طواف میں خیال آیا کہ اہل وعیال ساتھ ہیں، اب ہندوستان کیوں واپس جاؤں، جو دارالحرب ہے؟ بہتر ہے کہ حرم پاک ہی میں بیٹھا رہوں، لیکن غیب سے اشارہ ہوا کہ تم یہاں بیٹھے رہو گے تو ہم اپنا کام کسی دوسرے سے لیں گے، اس پر واپسی کا ارادہ پختہ ہو گیا۔

رمضان شریف حرم ہی میں گزارا۔ ۱۵ رشوال (۲۵ رجون ۱۸۲۳ء) کو مکہ معظمہ سے چلے، اس وقت تک صرف اتنے ساتھی رہ گئے تھے، جن کے لئے چار جہاز کرائے پر لینے پڑے۔ ''دریابقٰی'' ''ملک البحر'' ''عطیۃ الرحمٰن'' اور ''تاج'' پندرہ روپے فی کس کرایہ ٹھہرا۔ ''ملک البحر'' کی رفتار سب سے کم تھی، سید صاحب نے اسی کو اپنے لئے منتخب کیا۔

(۱) نواب وزیرالدولہ نے ''وصایا'' میں لکھا ہے کہ سید صاحب مدینہ پہنچے تھے تو حرم کے پاس روضہ مقدسہ کے سامنے قیام کیا تھا، جس روز پہنچے تھے، اسی روز رات کو سخت بخار آیا، بیدار ہو گئے، اپنے مسکن کی کھڑکی میں روضہ مقدسہ کے سامنے بیٹھ گئے، اسی حالت میں زیارت سے مشرف ہوئے اور عرض کیا: حضور کے امتیوں میں سے شیخ غلام علی (الٰہ آبادی) نے ایک قرآن مجید بھیجا تھا کہ روضے پر تلاوتِ قرأت میں رہے، یہاں میں نے دیکھا کہ بہت سے قرآن موجود ہیں اور کوئی نہیں پڑھتا، حضور اجازت مرحمت فرمائیں تو یہ نسخہ حرم پاک کے خدام میں سے الماس کو دے دوں، جو اسے باقاعدہ پڑھتا رہے گا، یہ اجازت مل گئی۔ (حصہ اول ص: ۲۹-۳۰)

ذی قعدہ کے آغاز میں جدّہ سے روانہ ہوئے، مخا میں پھر ایک مہینہ ٹھہرنا پڑا، قربانی کے جانور مخا ہی سے خرید لئے تھے، اور عید الاضحیٰ جہاز ہی میں ہوئی۔ مخا سے چلے تو بارہویں روز ۲۰/ذی الحجہ (۱۶/اگست ۱۸۲۳ء) کو بمبئی پہنچ گئے۔ مولوی انس صاحب نے استقبال کیا، انہیں کی مسجد میں ٹھہرے جو محلہ میمن واڑہ میں تھی۔ اٹھارہ دن قیام رہا، روزانہ پرتکلف دعوتیں ہوتی تھیں، پلاؤ میں گھی بہت ڈالتے تھے، یہ وقت بھی کلکتہ کی طرح ہدایت وارشاد میں بسر ہوا۔

بمبئی سے چار آدمی ساتھ ہو گئے، جن میں سے ایک مولوی انس کے صاحبزادے تھے، وہاں سے چلے اور ساتویں دن الپی وارد ہوئے۔ غرض ۶/صفر ۱۲۳۹ھ (۱۲/اکتوبر ۱۸۲۳ء) کو کلکتہ پہنچ گئے۔

کلکتہ سے مونگیر

شیخ غلام حسین فخر التجار فوت ہو چکا تھا، اس کا فرزند حج میں سید صاحب کے ساتھ تھا اور غالباً آپ سے پہلے کلکتہ پہنچ گیا تھا۔ پنس پر سوار کر کے لے گیا اور اپنے باغ میں ٹھہرایا۔ لوگ پہلے کی طرح پھر کثرت سے زیارت کے لئے آنے لگے، اس مرتبہ بھی کلکتہ میں غالباً خاصی دیر قیام رہا، امتدادِ قیام کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ آپ کے ساتھیوں کا جہاز ''عطیۃ الرحمٰن'' راستہ بھول گیا تھا، ایک مہینے تک اس کی کچھ خبر نہ ملی، اس اثناء میں سید صاحب دعائیں کرتے اور قنوت پڑھتے رہے۔ جب جہاز کی سلامتی کی خبر پہنچی تو سب کو بڑی خوشی ہوئی۔

کلکتہ سے واپسی کی منزلوں کے مفصل حالات معلوم نہیں، جو کچھ معلوم ہوا وہ ذیل میں درج ہے:

مرشد آباد کے دیوان غلام مرتضیٰ نے قافلے کو روک لیا اور اصرار کیا کہ میرے وطن (کہنہ) چلیے۔ جس بنگلے میں آپ کو ٹھہرانا منظور تھا اس کی محض درستی اور آرائش پر پانچ

ہزار صرف کئے، اس کے باہر بڑا بازار لگوایا اور منادی کرادی کہ سید صاحب کے ہمراہی جو کچھ خریدیں، اس کی قیمت کا حساب رکھا جائے، میں خود پوری رقم ادا کر دوں گا۔ روانگی کے وقت جو تحائف پیش کئے انکے بارے میں علم نہیں، صرف اتنا معلوم ہوا کہ ان تحائف میں سے عمدہ طمنچے اور سات دید بانوں کی ایک نادر رومی بندوق تھی، جو آپ سے یار محمد خاں درانی نے مانگ لی تھی، پورنیا کی رانی نے بھی طلب کیا تھا، لیکن آپ جا نہ سکے۔

مرشد آباد سے چلے تو منشی محمدی انصاری کے وطن بھی گئے، منشی صاحب کو گھر ٹھہرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے نکاح کیا، ایک بچہ پیدا ہوا، جس کا نام محمد یحییٰ رکھا۔ جب معلوم ہوا کہ سید صاحب ہجرت کے لئے تیار ہو گئے ہیں تو سب کچھ چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ پھر جیتے جی ساتھ نہ چھوڑا۔ مونگیر میں نماز جمعہ ادا کی، یہ مقام اسلحہ سازی کے لئے مشہور تھا۔ سید صاحب نے بندوقیں اور طمنچے خریدے۔ یہاں سے چار نالیوں والی ایک بندوق بھی لی تھی۔

عظیم آباد سے الہ آباد

مونگیر سے چلے تو عظیم آباد میں ٹھہرے جہاں سے مولانا ولایت علی، شاہ محمد حسین اور سید کرامت اللہ پیشوائی کے لئے قصبہ باڑھ تک پہنچے ہوئے تھے۔ دس روز وہاں مقام ہوا، پھر آپ پھلواری تشریف لے گئے۔ (۱) عظیم آباد سے چلے تو مولانا ولایت علی اور ان کے بھائی مولوی طالب علی، شاہ محمد حسین، محمد حیات اور سید کرامت اللہ سامان لے کر ساتھ ہو گئے۔ آپ ڈھکیا، دانا پور، بھوج پور، بلسار، چھپرا، بکسر ہوتے ہوئے محمود آباد پہنچے، پھر یوسف پور جا کر شیخ فرزند علی غازی پوری کو دیکھا، جو بیمار تھے، چھ روز وہاں قیام

(۱) سیرت سید احمد شہید میں پھلواری کے متعلق وہ حالات بہ سلسلہ مراجعت درج ہوئے ہیں جنہیں میں پہلے درج کر چکا ہوں۔

کیا۔ اس اثناء میں جامع مسجد نئے سرے سے آباد ہو گئی، دانا پور میں شیخ علی جان کے مکان پر ایک شخص بہ ارادۂ قتل آیا تھا، لیکن سامنے آتے ہی سب کچھ بھول گیا اور پاؤں پر گر کر معافی مانگ لی۔

بنارس چند فرلانگ رہ گیا تو تیموری شہزادے استقبال کے لئے پہنچ گئے۔ یہاں ایک مقام پایاب تھا، لیکن پانی کا بہاؤ وہاں بہت تیز تھا، ہمراہیوں میں سے ایک صاحب وہاں اُتر پڑے، پاؤں نہ جما سکے اور بہہ نکلے۔ مختلف لوگ انہیں بچانے کے لئے دوڑے، ان میں سید صاحب بھی تھے، سب کے پاؤں اکھڑ گئے، صرف سید صاحب اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑے رہے۔ اس اثناء میں سید عبدالرحمٰن کشتی لے کر پہنچ گئے اور سب کو اس میں سوار کرا کے کنارے لائے۔

بنارس میں اس مرتبہ صرف چند دن قیام رہا، مرزا پور میں شیخ عبد اللطیف اور دوسرے لوگوں نے دعوتیں کیں، وہیں شیخ غلام علی کے فرزند پیشوائی کے لئے پہنچے ہوئے تھے، اور شیخ صاحب کے حکم کے مطابق اسی مقام سے پورے قافلے کا خرچ انہوں نے اپنے ذمے لے لیا۔

مرزا پور سے آپ نے تکیے کی مسجد کے راستے اور گھاٹ کے لئے پتھر خریدے، نیز غریب ہمسایوں کے لئے بہت سی چکیاں تحفے کے طور پر لے لیں۔ الٰہ آباد تک قافلے کی ہر ضرورت شیخ غلام علی نے پوری کی۔ ان کے اجارے کے گاؤں دریا کے کنارے کنارے تھے، ہر گاؤں سے دال، چاول، گھی، مسالہ اور دوسری چیزیں دریا پر پہنچ جاتی تھیں۔ الٰہ آباد میں کئی روز قیام رہا۔ اس مرتبہ بھی شیخ صاحب کے ہاں پرتکلف کھانوں کی وہی بہتات تھی، جس کا نقشہ ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔

مرزا پور یا الٰہ آباد میں سید صاحب نے ایک روز نہایت مؤثر وعظ فرمایا، جس میں کہا: حج و عمرہ اور زیارتِ حرمین کی سعادت نصیب ہوئی، اب صرف یہ تمنا ہے کہ جان

ومال جہاد فی سبیل اللہ میں صرف کردوں۔ حاضرین بھی زار زار رو رہے تھے اور خود سید صاحب کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

الٰہ آباد سے رائے بریلی

الٰہ آباد سے آپ نے زنانہ سواریوں، بچوں اور ضعیفوں کو کشتیوں میں بیٹھا کر دریا کے راستے دلمؤ بھیج دیا، خود گھوڑے پر سوار ہو کر رائے بریلی کا راستہ لیا۔ چنانچہ آپ شیخ غلام علی کے وطن مہروندا میں ایک رات ٹھہرے، ایک منزل اہلادگنج میں کی، مصطفیٰ آباد وغیرہ سے بھی گذرے۔ اس سفر میں طالب علی عظیم آبادی نے گھوڑے کی رکاب تھام رکھی تھی۔ سوئے اتفاق سے ان کے پاؤں میں لیموں یا کھٹے کا کانٹا چبھ گیا، ایک رفیق نے اپنی سواری کا گھوڑا ان کی خدمت میں پیش کیا تاکہ آرام سے منزل کٹ جائے، لیکن وہ بولے کہ کوئی صاحب تختِ رواں بھی دیں تو قبول نہ کروں گا۔

بہ راہِ عشق گر دریا خلد خار — نباید از رہش پرہیز کردن
کہ از خارش بسے گلہا شگوفہ — قدم بر خار باید تیز کردن

۲۹ رشعبان ۱۲۳۹ھ (۲۹ راپریل ۱۸۲۴ء) کو سید صاحب وطن پہنچے، گویا اس سفر میں دو سال اور دس مہینے صرف ہوئے۔ سید ابوالحسن علی لکھتے ہیں کہ اعزا اور اہل خاندان استقبال کے لئے موجود تھے:

> اکثر عزیزوں نے اہل قافلہ میں سے بہت سے لوگوں کو اسلئے نہ پہچانا کہ چہروں پر تازگی تھی، لباس عمدہ تھا۔ یہاں سے گئے تھے تو بالکل بے سروسامانی کی حالت میں۔(۱)

زنانہ سواریوں کے لئے دلمؤ بہلیاں، میانے اور ڈولیاں بھیج دی گئیں، پورے

(۱) سیرت سید احمد شہید طبع سوم ص: ۲۸۵

سفرِ حج میں ستر اسّی ہزار روپے سے کم رقم صرف نہ ہوئی ہوگی، بلکہ مختلف چیزوں کی خرید اور مساکین کی امداد کی رقمیں شامل کی جائیں تو پوری رقم شاید ایک لاکھ تک پہنچ جائے۔ واپس آئے تو مہمانوں کی بہت بڑی جماعت ساتھ تھی، عام زائرین کا بھی تانتا بندھا رہتا تھا، سید صاحب سب کو کھانا کھلاتے تھے، کچھ مدت بعد بیت المال کا جائزہ لیا تو دس ہزار روپے موجود تھے۔

قصیدہ

سید صاحبؒ حج سے واپس آئے تو مولانا سید ابوالحسن نے ایک لمبا قصیدہ آپ کی خدمت میں پیش کیا، جس کے اکثر اشعار تواریخ عجیبہ میں نقل ہوئے۔ یہ سید صاحبؒ کے خلفاء میں سے تھے اور میوات میں رہتے تھے۔ ذیل میں اس کے منتخب اشعار درج کئے جاتے ہیں۔(۱)

تشبیب

رہے اس نور سے پُر گنبدِ چرخِ اخضر — جسکے لمعان سے ہے کند فرشتوں کی نظر
نہ اسے روشنیٔ شمس وقمر سے نسبت — نہ ملے برق اسے اور نہ کوئی اختر
جلوۂ طور کہوں یا کہ شبِ قدر کا نور — یا ترقی پہ ہوئی روشنیٔ تازہ سحر

....

کیا عجب ہے کہ اگر ہند کے نظارے کو — حور جنت سے چلی آئے نکل کر باہر

....

(۱) تواریخ عجیبہ میں اس کے کچھ اشعار چھوڑ دیے گئے تھے، مجھے پورا قصیدہ جناب محمد سلیم صاحب (پرنسپل شاہ ولی اللہ کالج منصورہ) کی مہربانی سے مل گیا۔

گُریز

تھا تہِ دل سے میں تفتیشِ سبب کے در پے
کس کے انوار سے یارب ہے زمین رشکِ قمر

یک بہ یک غیب سے آئی یہ ندائے ہاتف
گوش سے پنبۂ غفلت کو ذرا باہر کر

اب تلک پہنچا نہیں مژدۂ جاں بخش تجھے؟
جس سے شاداں ہیں ملک خوش ہے ہر اک جن و بشر

آیا ہے قافلہ حج کر کے وہ اس ملک کے بیچ
جس میں ہر اک ہے ولی، عارف نیکو منظر

سید صاحب کے ساتھی

انکے انوار سے روشن ہے زمیں تا بہ فلک
انکی ہمت سے ہوئی دین کو سوزینت وفر

ہے ہر اک شخص وہاں آمرِ امرِ معروف
قامع بدعت وناہیٔ اصولِ منکر!

ماحیٔ کفر ز دل، قاتل کفار ز جاں
قاطعِ رسمِ زبوں، تابعِ حکمِ داور

ان میں ہر اک ہے، فرید اور وحید آواں
حافظ وعالم وعادل، سخی ونیک نظر

ظاہر آراستہ بر ملتِ بیضائے نبیؐ!
باطن اس طور کا پاکیزہ ہو جیسا گوہر

کدو کاوش نہ کسی میں نہ ریا وکینہ
نہ حسد دل میں، تکبر نہ کسی کے اندر

سید صاحب

کیا کروں قافلہ سالار کا اسکے میں بیاں
جسکے اوصاف ہیں تحریر و بیاں سے باہر

عادل وعالم وعابد، شہِ والا ہمت
اشجع وافصح وابلغ، سخی ونیک نظر

عاقل وفاضل وراحم، زکی وعالی طبع
زاہد و متقی و صابر و زیبا منظر

ترک وتجرید وتوکل میں فریدِ دوراں
حلم اور خلق ودیانت میں وحیدِ اکبر

معدنِ لطف وحیاء مجمعِ جود وہمت
مخزنِ عفت والفت، شرفِ نوعِ بشر

بحر جود وکرم وگلشنِ عرفانِ نبیؐ
مشعلِ راہِ طریقت بہ حقیقت رہبر
صدق میں ثانی اثنینؓ کی مانند قوی!
جد اور جہد میں اسلام کے ثانی عمرؓ
شرم میں حضرت عثمانؓ سا جوں بحرِ حیا
اور صفِ جنگ میں ہم طرزِ علیؓ صفدر
سید صفدر وعالی نسب وزینتِ دیں
زیبِ اسلام وامامِ حق وعاجز پرور
سید احمد وعالی حسب وفخرِ زماں
رہبر راہِ شریعت خلفِ پیغمبرؐ
جس طرف دیکھئے تعمیر مساجد ہوگی
ہے ہر اک شخص کی تحقیقِ مسائل پہ نظر

کارِ اصلاح

آتی ہر سمت سے ہے بانگِ موذن کی صدا
جس کو سنئے یہی کہتا ہے کہ اللہ اکبر
اس قدر عصر میں تیرے ہوئی افراطِ نماز
لاکھوں تیار ہوئے ملک میں چھوٹے منبر
قطعِ بدعات ہوئی فیض سے تیرے ایسی
ہند سے رسمیں بری اُٹھ گئیں ساری یکسر
دیکھئے جس کو سو کرتا ہے، کلام اللہ یاد
باندھی ہر شخص نے تہذیب وہدایت پہ کمر

مولوی عبدالحئی اور شاہ اسماعیل

رکنِ دین مولوی عبدالحئی وشہ اسماعیل
فیض سے تیرے ہوئے کاملوں کے سر دفتر
تیری صحبت نے ملائک کی کری خاصیت
گو کہ ظاہر میں نظر آتے ہیں ہم شکل بشر

سید صاحب

حق میں کفار کے ضیغم کی طرح ہے خونخوار
مومنوں کیلئے شفقت میں پدر سے بہتر
فخر ابنائے زماں، قبلۂ اربابِ صفا
کعبۂ اہل یقیں داد رسِ ہر مضطر
ذات سے تیری یتیموں کو بہت تقویت
زنِ بیوہ کے تو حق میں ہے سحاب مطر
تھا غضب ظلم کہ بیوہ نہ کرے عقدِ نکاح
کھوئی یہ رسمِ زبوں رحمتِ حق ہو تجھ پر
جس میں راضی ہو خدا ہے وہی انکو منظور
آبرو کا نہ انہیں خوف نہ کچھ جی کا ڈر

اکیسواں باب:

جہاد کے لئے دعوت و تنظیم

دعوتِ عام

حرمین شریفین سے مراجعت کے بعد سید صاحب ہمہ تن جہاد کے سروسامان میں شغول ہوگئے، جس کیلئے وہ اپنی حیاتِ گرانمایہ وقف فرما چکے تھے۔ اس دور کی شغولیتوں کا کوئی مرقع مجھے نہیں مل سکا، لیکن یقین ہے کہ ان کے داعی شہر بہ شہر اور قریہ بہ ریہ دورے کرتے رہے ہوں گے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو غازی ان کی عوت پر لبیک کہتے ہوئے سرفروشانہ میدانِ عمل میں آئے، وہ سیکڑوں مختلف مقامات کے شندے تھے، پھر سید صاحب سرحد چلے گئے تو اس کے بعد بھی جگہ جگہ سے لوگ تیار وہوکر پہنچتے رہے، روپیہ بھی فراہم ہوتا رہا، یہ سب کچھ وسیع ترتیبات کے بغیر کیوں کر عمل یں آسکتا تھا؟

داعیوں کے سرخیل مولانا شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحیٔ تھے، یقین ہے کہ وہ صلاحِ عقائد واعمال کے لئے وعظ بھی کہتے ہوں گے، اور یہ اندازہ بھی کرتے ہوں گے کہ کون کون سی سعید ہستیاں عزم وہمت سے دین حق کیلئے جاں بازی کی بھی تڑپ رکھتی یں۔ سیر وگشت کا حال صرف اس واقعے سے منکشف ہوسکتا ہے کہ شاہ اسماعیل کی کتاب "تقویۃ الایمان" پر کچھ اعتراضات سید عبداللہ بغدادی نے بھی کئے تھے۔ یہ اعتراضات اہ صاحب تک پہنچے تو انہوں نے ۱۲۴۰ھ میں ایک جوابی خط بغدادی صاحب کو بھیجا، اس

وقت شاہ صاحب کان پور میں تھے۔(۱)

جہاد کا مفہوم

''جہاد'' جہد سے ہے جس کے معنی ہیں محنت، مشقت، تعب اور کسی کام کیلئے سخت تکلیف برداشت کر لینے پر ہمہ تن آمادگی۔ اصطلاحِ شریعت میں جہاد کی تعریف یہ ہے:

استفراغ الوسع فی مدافعة العد و ظاهرًا و باطنًا.

دشمن کے حملے کی روک تھام کے لئے اپنی پوری قوت و طاقت کے ساتھ ظاہراً و باطناً بے دریغ سعی کرنا۔

''ظاہراً'' یہ کہ دشمن لشکر لے کر چڑھ آئے تو شمشیر بکف ہو کر اس کی مدافعت میں لگ جانا اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لینا جب تک ہر خطرہ اور ہر خرخشہ بالکل محو نہ ہو جائے۔ اس کارِ حق میں جان بھی دینی پڑے تو اس کیلئے بے پروایانہ تیار ہو جانا، باطل کو مٹانے اور حق کو سر بلند کرنے میں شب و روز لگے رہنا۔ ''باطناً'' یہ کہ اپنے نفس کو تمام ابلیسی قوتوں کی فسوں سازیوں اور معصیت و عدوان کی زیاں کاریوں سے بچائے رکھنا۔

اس سے ظاہر ہے کہ راہِ حق میں فرد یا جماعت کی طرف سے جو سعی ہوتی ہے، سچائی کی سر بلندی کیلئے جو قربانیاں کی جاتی ہیں، صداقت کی خاطر جو صعوبتیں اور اذیتیں صابرانہ برداشت کر لی جاتی ہیں، وہ سب جہاد ہیں۔ ظلمت زارِ باطل میں جن سرفروشوں نے حق کے نعرے لگائے، قیدیں کاٹیں، جائدادیں ضبط کرائیں، گولیاں کھائیں،

(۱) ملاحظہ ہو مجموعہ تقویۃ الایمان و تذکیر الاخوان مطبوعہ مطبع احمدی لاہور صفحہ ۱۶۷- اس مجموعے میں شاہ صاحب کا عربی مکتوب بھی بنام سید عبداللہ بغدادی موجود ہے جس کے آخری الفاظ یہ ہیں: ''کتم هذا المكتوب حين كنت نزيلاً في الكانفور سنة الف ومائتين واربعين'' شاہ اسماعیل اور مولانا عبدالحئی کے دوروں میں صرف تھوڑے دنوں کے لئے توقف ہوا، اس لئے کہ ۷ر شوال ۱۲۳۷ھ (۵ر جون ۱۸۲۴ء) کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے وفات پائی اور دونوں صاحبوں کو بہ سلسلہ تعزیت دہلی میں ٹھہرنا پڑا۔

پھانسیاں پائیں، گھر بار ترک کئے، عزیزوں اور قریبوں سے دائمی مفارقت گوارا کی، وہ سب مجاہد تھے۔

سید صاحب کا اختصاص

سید صاحب بدوِ شعور سے زندگی کے آخری لمحے تک ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے لئے وقف رہے، ان کی زبان برابر دین حق کی سر بلندی کے لئے متحرک رہی، وہ جہاں پہنچے یہی آرزو لے کر پہنچے کہ اسلام صحیح شکل میں پوری عظمت وشان سے جلوہ گر ہو۔ انہوں نے لاکھوں گمراہوں کو طریق شریعت کے پابند بنایا اور ان کے سینوں میں عشقِ حق کے چراغ روشن کئے۔ بعض ارکانِ اسلام میں گونا گوں اوہام ووساوس کی بناء پر جو رخنے پیدا کر دیے گئے تھے، انہیں عزم وہمت سے بند کیا، پھر بلادِ اسلام کو اغیار کی دستبرد سے بچانے کے لئے وطن چھوڑا۔ عزیزوں سے دوری گوارا کی، راحت وآسائش کی زندگی کو ٹھکرا کر غربت کی مصیبتیں خوشی خوشی قبول کر لیں، زہرہ گداز صعوبتوں اور مشقتوں کے پہاڑ اس بے تکلفی سے اٹھا لئے گویا مقصودِ حیات یہی تھا، آخر اسی راہ میں جانِ عزیز قربان کر دی۔

وہ ہر مسلمان کے سینے میں دینِ حق کیلئے ایثار وقربانی کی یہی روح پیدا کر دینا چاہتے تھے، ہر کلمہ گو کو حقیقی معنی میں مجاہد فی سبیل اللہ بنا دینے کے آرزومند تھے۔ ان کی آغوشِ تربیت میں جو جماعت تیار ہوئی اس کی ممتاز ترین خصوصیت یہی تھی کہ ایک ایک فرد زندگی کی ہر شئے کو قربان کر دینا اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتا تھا اور جب کوئی غازی شہادت پاتا تھا تو سب کہتے تھے کہ وہ مراد کو پہنچ گیا۔ اس سرزمین کی پوری اسلامی تاریخ میں شیفتگیٔ حق کی ایسی مثال شاید ہی مل سکے۔ سید صاحب اس باب میں بالکل یگانہ نظر آتے ہیں۔ واللّٰہ یختص برحمتہ من یشآء.

مسلمانوں کی حالت

سید صاحب کی پیدائش سے پہلے ہی اس سرزمین میں مسلمانوں کی سلطنت کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مغل حکومت کے کھنڈروں پر جن مسلمانوں نے نئی فرمانروائیوں کی بنیادیں رکھی تھیں، وہ بھی یا تو مٹ چکی تھیں، یا ضعف واضمحلال کے آخری درجے پر پہنچ چکی تھیں۔ غیر مسلموں کے اقتدار کا سیل ہر سمت سے بڑھا چلا آرہا تھا اور مسلمانوں کی کوئی سلطنت ایسی نہ تھی، جس کی رُوحِ حیات میں بالیدگی کی کوئی جھلک نمایاں ہوتی۔

مسلمان دینِ حق کے صراطِ مستقیم سے بہت دور جا پڑے تھے، عقائد واعمال کی تمام خرابیاں ان پر مسلط تھیں، اُمراء ورؤسا کے پیش نظر اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان کی کامرانیوں اور عیش پسندیوں کیلئے ضروری وسائل فراہم ہوتے جائیں۔ ان مشاغل کے انجام سے وہ بالکل بے پروا تھے۔ عوام میں سے بیشتر کی حالت ایسی تھی، گویا بجلی گری اور وہ ہوش وحواس کھو بیٹھے یا خوفناک زلزلہ آیا اور وہ دہشت کے مارے بت بن کر رہ گئے۔ جنہیں کچھ احساس تھا انہیں تدارک کی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی تھی، مستقبل کی تاریکی کو تقدیر کا اٹل فیصلہ مان کر اس انتظار میں معطل بیٹھ گئے تھے کہ جو کچھ ہونے والا ہے وہ اپنے وقت پر ہو کر رہے گا۔ جب سفینہ بھنور میں پہنچ جائے، اس کے بادبان پھٹ جائیں، لنگر ٹوٹ جائے، ناخدا ناپید ہو تو اہل سفینہ کیلئے بظاہر بچاؤ کی کونسی امید باقی رہ سکتی ہے؟ مسلمانوں پر یاس وناامیدی کی یہی حالت طاری تھی۔

سید صاحب سے پیشتر جتنے مجاہد پیدا ہوئے، ان میں سے دو نے دورِ زوال کی تاریکی کو روشنی سے بدلنے کی زبردست کوششیں کی تھیں: ایک حیدر علی، دوسرا اس کا فرزند ٹیپو سلطان، لیکن مخالف اسباب اس افراط سے فراہم ہو گئے تھے کہ ان مجاہدوں کی کوششیں کوئی مستقل نتیجہ پیدا نہ کر سکیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ آنے والی نسلوں کے لئے عزم وہمت اور ایثار وقربانی کی دو شمعیں روشن ہو گئیں۔

تین راستے

یاس و ناامیدی کی اس تیرگی میں سید صاحب نے ہوش کی آنکھ کھولی، ان کے سامنے عمل کے تین راستے تھے:

۱۔ حق کو چھوڑ کر باطل سے رشتہ جوڑ لیا جائے۔

۲۔ حق کو چھوڑا نہ جائے، اور اس سلسلے میں جو مصیبتیں پیش آئیں انہیں صبر واستقامت سے برداشت کرلیا جائے۔

۳۔ باطل کا مقابلہ مردانہ وار کر کے ایسی صورتِ حال پیدا کرنے کی سعی کی جائے کہ حق کے لئے غلبۂ عام کی فضا آراستہ ہو جائے۔

پہلا راستہ زندگی نہیں موت کا راستہ تھا، دوسرے کا نتیجہ یہ ہوسکتا تھا کہ آہستہ آہستہ سِسک سِسک کر اور تڑپ تڑپ کر جان دی جائے۔ صرف تیسرا راستہ غیرت وحمیت اور ہمت وعزیمت کا راستہ تھا۔ سید صاحب کو خدا نے غیرت وعزیمت کی دولت بدرجۂ وافر عطا کی تھی، انہوں نے آخری راستے ہی کو اپنے لئے زیبا سمجھا، اسی کو اختیار کیا، یہی ان کے وعظ وتلقین کا محور تھا، اسی کو ان کی دعوت وتبلیغ کا نصب العین سمجھنا چاہئے۔

روحِ دعوت

سید صاحب کے نزدیک مسلمانوں کی تمام مصیبتوں اور زیاں کاریوں کی علت العلل یہ تھی کہ وہ اسلام کے صراطِ مستقیم سے منحرف ہوچکے تھے، ان میں خدا کے دین کی سربلندی کیلئے کوئی تڑپ اور کوئی بے تابی باقی نہ رہی تھی، وہ روحِ جہاد سے خالی ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے سیاسی عظمت وبرتری کو اپنا نصب العین نہ بنایا۔ صرف احیاءِ اسلامیت پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی اور وہ مدعیانِ اسلام کو سچے مسلمان بنانا چاہتے تھے، اور ان میں خدمتِ دین اور تکمیلِ مقاصدِ اسلامیت کی سچی لو لگانے کے

خواہاں تھے۔ دورِ اول میں مسلمانوں کو جو عالمگیر برتری حاصل ہوئی تھی، وہ صرف خدمتِ دین کا ایک ثمرہ تھا، جن چیزوں کو ہم آج کل اسبابِ قوت سمجھنے کے عادی ہیں، ان میں سے کون سی چیز دورِ اول کے مسلمانوں کو حاصل تھی؟ لیکن اسلامیت کے لئے جذبۂ جہاد نے ان میں استحکام واستقامت کی وہ روح پیدا کردی تھی کہ وقت کی پُر شکوہ سلطنتیں، اسبابِ حرب وضرب کی ہولناک فراوانیوں کے ساتھ مسلمانوں سے ٹکرائیں اور مٹی کے کھلونوں کی طرح یوں ریزہ ریزہ ہوگئیں کہ زمانے کو ان کے ٹکڑوں کا سراغ بھی نہ مل سکا۔ سید صاحب اسی عہدِ مسعود کی برکات زندہ کرنا چاہتے تھے۔ احیاء وتجدیدِ اسلامیت کا یہ مقامِ رفیع بہت کم خوش نصیبوں کو حاصل ہوا، اور اس کے لئے بے باکانہ قربانیاں بہت کم نیک بختوں سے بن آئیں ۔

یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

راہِ مراد

سید صاحب اکثر عالمِ شوق میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے ۔

اے آنکہ زنی دم از محبت از ہستیٔ خویشتن بہ پرہیز
بر خیزد بہ تیغ تیز بنشیں یا از سرِ راہِ دوست برخیز

ان کا سازِ وجود مدت العمر اسی ترانے کیلئے وقف رہا، مسلمان آج جن پسپائیوں اور نگونساریوں پر پریشان ہیں، ان کا سبب بجز اس کے کیا ہے کہ ان میں اسلامیت کا جذبۂ صادقہ اور اس کیلئے پُرخلوص جہاد کا ذوق وولولہ باقی نہیں رہا۔ اگر محض سروں اور جسموں کی گنتی کی جائے تو وہ روئے زمین کی کسی دوسری بھیڑ سے کم نہ ہوں گے۔ جب وہ راہِ خدا کے سچے مجاہد تھے تو زیادہ سے زیادہ چند لاکھ ہونے کے باوجود دنیا کی تمام بڑی بڑی

طاقتوں پر بھاری تھے۔ ان کا نام سن کر باطل کے آہنی حصاروں میں زلزلہ پڑ جاتا تھا، قوموں کی زندگی کا انحصار نیک ترین نصب العین کیلئے ولولۂ ایثار اور داعیۂ قربانی پر ہے، خوشا وہ قوم جس کا نصب العین صرف اعلائے حق اور رضائے خدا ہو، اور وہ اس کے لئے ہر ایثار و قربانی کے ولولوں سے معمور ہو۔

سید صاحب اسی راستے کے داعی تھے، ہر مسلمان میں یہی روح پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے۔

گر نثار قدم یارِ گرامی نہ کنم
گو ہرِ جاں بچہ کارے دگرم باز آید

حرمین سے واپسی کے بعد ہجرت تک ایک برس اور دس مہینے کی مدت انہوں نے اسی نصب العین کی اشاعت میں گزاری اور اسی کی بناء پر مجاہدین فی سبیل اللہ کی قدوسی جماعت تیار کی۔

بائیسواں باب:

سکھ اور انگریز

جہاد کس کے خلاف؟

اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سید صاحب کس کے خلاف جہاد کی دعوت دے رہے تھے؟ آیا وہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے، اور وہ بھی محض اس بناء پر کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی تھی۔ سید صاحب کا جو دعویٰ ان مکتوبات و اعلانات کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے، تو وہ یہ ہے:

> ہر گاہ بلاد اسلام در دستِ کفار لیام افتد بر جماہیر اہلِ اسلام عموماً و مشاہیر حکام خصوصاً واجب و مؤکد می گردد کہ سعی و کوشش در مقابلہ و مقاتلہ آنہا بجا آرند تاوقتیکہ بلاد مسلمین را از قبضہ ایشاں بر آرند و اِلاّ آثم و گنہ گار می شوند و عاصی و ستمگار از درگاہِ قبول مردود می گردند و از ساحتِ قرب مطرود۔(۱)
>
> **ترجمہ** : جب اسلامی بلاد پر غیر مسلم مسلط ہو جائیں تو عام مسلمانوں پر عموماً اور بڑے بڑے حکمرانوں پر خصوصاً واجب ہو جاتا ہے کہ ان غیر مسلموں کے خلاف مقابلہ و مقاتلہ کی کوششیں اس وقت تک جاری رکھیں جب تک اسلامی بلاد ان کے قبضے سے واپس نہ لے لئے جائیں، ورنہ مسلمان گنہ گار ہوں گے۔ ان کے اعمال بارگاہِ باری تعالیٰ میں مقبول نہ ہوں گے اور وہ خود قربِ حق کی برکتوں سے محروم رہیں گے۔

اگر سید صاحبؒ کے عملِ جہاد کی بناء یہی اصل تھی تو کیا عالمگیر اعظم کی وسیع سلطنت

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۵۔ مکتوب بنام شاہ بخارا

میں سے صرف وہی حصہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر غیر مسلمانوں کے قبضے میں گیا تھا، جو دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے درمیان تھا، اور جس پر رنجیت سنگھ حکمراں تھا؟ کیا باقی پورے ملک پر مسلمان بدستور فرمانروا تھے؟ اس کا جواب ہر شخص نفی میں دے گا، اس سے بدرجہا بڑے اور اہم تر علاقے پر بلاواسطہ یا بالواسطہ انگریز مسلط تھے اور انہوں نے سب کچھ یا تو مسلمانوں سے چھینا تھا یا ان لوگوں سے لیا تھا جو کچھ مدت پیشتر مسلمانوں سے چھین چکے تھے۔ یہ تمام علاقے بے شائبہ ریب ''بلادِ اسلام'' تھے۔ پھر کتنے تعجب کی بات ہے کہ اس واضح اساسِ عمل کے ہوتے ہوئے سمجھا گیا اور سمجھایا گیا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے۔

سکھ حکومت کی حقیقی حیثیت

سید صاحبؒ کے سوانح جن اصحاب نے لکھے، چونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ آپ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، اس لئے پس منظر کے طور پر ان سوانح نگاروں نے سکھوں کی تعدیاں جزواً جزواً بیان کیں۔ مثلاً یہ کہ اذان بند تھی، ذبیحہ گاؤ ممنوع تھا، مساجد کی بے حرمتی ہو رہی تھی، جان، مال اور آبرو کی حرمت مٹ چکی تھی۔

سب مقامات پر نہیں تو پنجاب کے بعض مقامات پر یقیناً یہی حالت تھی اور غیر جانبدار مؤرخوں کی شہادتیں اس صورتِ حال کی مصدق ہیں۔ میں تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ پنجاب میں رنجیت سنگھ کے ماتحت جو ''نظام'' قائم ہوا تھا، اُسے حقیقتاً حکومت کا نام دیا ہی نہیں جا سکتا، وہ زیادہ سے زیادہ ایک فوجی غلبہ اور ایک عسکری تسلط تھا اور ایسے غلبہ و تسلط میں کبھی کوئی کام قاعدے اور ضابطے کی بناء پر انجام نہیں پاتا۔ حکومت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان کم یا زیادہ ربط و تعلق ہو، جو ایک دوسرے کے لئے ہمدردی یا باہمی حقوق کی پاسداری پر مبنی ہو۔ زیرِ غور معاملہ میں نہ ربط

و تعلق تھا، نہ ہمدردی یا حقوق کی پاسداری کا کوئی ثبوت ملتا ہے، بلکہ حاکم و محکوم میں حد درجہ نفرت اور بے اعتمادی موجود تھی۔ حاکموں کو یقین تھا کہ محکوم ہمیں کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتے، اس لئے وہ غصے اور غیظ میں محکوموں کو زیادہ سے زیادہ تنگ کرتے تھے، محکوم حاکموں کو اپنے اعمال کی شامت اور کفرانِ نعمت کی سزا سمجھتے تھے، نہ حاکموں کے دل و دماغ میں یہ سوچنے کی صلاحیت تھی کہ حلم و بردباری اور لطف و محبت کے ذریعے سے دہکتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کیا جا سکتا ہے، نہ محکوم اتنے بے حس تھے کہ رات دن آگ کے شعلوں میں زندگیاں بسر کرنے کے باوجود سمجھ لیتے کہ وہ پھولوں سے کھیل رہے ہیں۔

رنجیت سنگھ کی آرزو ممکن ہے یہ ہو کہ اس فوجی غلبے کو ایک باقاعدہ حکومت کی ہیئت مل جائے، لیکن تنہا ایک شخص اس پورے ڈھانچے کی ذہنیت کیوں کر بدل سکتا تھا، جس کا ہر پُرزہ جوشِ انتقام کے سانچے میں ڈھلا تھا؟ پھر رنجیت سنگھ کی آرزو عمر بھر یہ رہی کہ اس کے دائرۂ اقتدار کی حدیں جلد سے جلد دُور دُور تک پھیل جائیں، یہ آرزو عسکریت کو بے لگام رکھے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تھی۔

غرض ہم کہہ سکتے ہیں کہ بندہ بیراگی کے ماتحت جن غارت گر اور خونریز جتھوں نے پنجاب کی مختلف آبادیوں پر آفات کے سیل بہا دیے تھے، ان میں رنجیت سنگھ نے اک گونہ تنظیم پیدا کر دی تھی اور ان کے لئے ایک مرکز کا بندوبست ہو گیا تھا، لیکن ان جتھوں کے عادات و خصائل نہیں بدلے تھے، جبر و تصرف اور تصادم کی انہیں لت پڑ چکی تھی، جب باہر کسی ہدف تک نہ پہنچ سکے تو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگے۔ پھر انگریزوں سے ٹکرا گئے، اور رنجیت سنگھ نے چالیس برس کی محنت سے جو کچھ بنایا تھا، اُسے چار پانچ برس میں تہس نہس کر کے بیٹھ گئے۔

پنجاب میں سکھوں کی تعدیوں کے متعلق جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ فی الجملہ درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ ظلم نہ ہوتے تو کیا سید صاحب اپنی پیش کردہ اصل کی بناء پر

سکھ حکومت سے تعاون کر لیتے ؟ جب کہ وہ بلادِ اسلامیہ پر غیر مسلموں کے نفسِ تسلط کو موجب جہاد مانتے تھے، اور اس میں کوتاہی کو اثم و معصیت سے تعبیر کرتے تھے؟ نیز کیا وہ بلادِ اسلامیہ پر انگریزوں کے قبضے کو گوارا کر سکتے تھے؟ ان سوالوں کا جواب غیر مشتبہ طور پر نفی میں ہے، پھر یہ خیال کہاں سے پیدا ہوا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے؟

افسانہ طرازیاں

میں جہاں تک تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے سید صاحبؒ کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' چھپی تھی تو سر سید نے اس کی تہمت طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلۂ مضامین ''پایونیر'' میں چھپوا دیا تھا، جو بعد میں الگ بھی چھپ گیا تھا، ان جوابی مضامین میں یہ بھی کہا گیا کہ سید صاحبؒ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہارِ برأت کر دیا تھا۔(۱)

سر سید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظروں سے گذرا ہوگا، مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے اسے پھیلا کر پیش کیا۔ فرماتے ہیں کہ جب سید صاحبؒ حج پر جا رہے تھے تو کلکتہ میں ایک روز شاہ اسماعیل نے وعظ کہتے ہوئے جہاد کا ذکر بھی کیا، ایک شخص نے بر سر مجلس پوچھا کہ سرکار انگریزی کے خلاف جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ مولانا نے فرمایا:

> ایسی بے ریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے، اس وقت پنجاب کے سکھوں کا ظلم اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ ان پر جہاد کیا جائے۔(۲)

(۱) مجھے اصل رسالہ نہ مل سکا، اس کا اردو ترجمہ محمد حسین مرحوم بٹالوی نے اپنے رسالے ''اشاعت السنۃ النبویہ'' میں شائع کر دیا تھا۔ ملاحظہ ہو اشاعت السنۃ جلد ۱۱ نمبر ۴۔

(۲) تواریخ عجیبہ ص: ۵۷- یہ بیان سر سید مرحوم کے بیان کا چربہ ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ (سید صاحبؒ) سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے، کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہو؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا۔ سید صاحبؒ نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے، سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی کے ادا کرنے کے مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبے کے بعد ان حرکاتِ مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو ان سے بھی لڑنے کی ضرورت نہ رہے گی۔

سرکار انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو عبادتِ لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں علانیہ وعظ کہتے اور ترویج مذہب کرتے ہیں وہ کبھی مانع اور مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الٰہی اور احیاءِ سننِ سید المرسلینؐ ہے، سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں، پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں۔(۱)

سید صاحب کا عقیدہ کیا تھا؟

مجھے اس ''صحیح روایت'' کا سراغ اب تک نہ مل سکا اور نہ اس کے فضولیات پر گفتگو کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے مولوی محمد جعفر صاحب مرحوم کے نزدیک معاملے کی شرعی صورت وہی ہو جو انہوں نے بیان کی اور خود ہمارے زمانے میں اس فکر و عقیدہ کو بعض مدعیانِ

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۳

تجدیداپنے امتیازی وصف کی حیثیت میں پیش کرتے رہے، لیکن سید صاحب کا عقیدہ یہ نہ تھا جیسا کہ اس باب کے آغاز میں پیش کردہ اقتباس سے ظاہر ہے، اور آپ کے متعلق جو مکتوب ذخیرہ میری نظر سے گذرا ہے، اس میں مولوی محمد جعفر کے بیان کی تائید کے لئے بعید سا اشارہ بھی موجود نہیں۔

بلاشبہ ''اعلاءِ کلمۂ رب العالمین'' اور ''احیاءِ سنت سید المرسلین'' سید صاحب کے اہم ترین مقاصد تھے، لیکن ساتھ ساتھ وہ ''استخلاص بلاد المسلمین از دست کفرۂ متمردہ'' کے بھی داعی تھے۔ جس شخص کا نصب العین یہ ہو کہ اسلامی بلاد غیر مسلموں کے تصرف سے آزاد ہو جائیں وہ اشاعتِ توحید اور احیاءِ سنن کی آزادی پر اغیار کے تسلط کو کیوں کر قبول کر سکتا ہے؟ جب کہ جانتا ہے کہ جو آزادی اسے ملی ہے، وہ حاکموں کے رحم پر موقوف ہے۔

انگریزوں کے بارے میں سید صاحب کی رائے

محض یہی نہیں، سید صاحب کے مکاتیب میں صاف مذکور ہے کہ انگریز ہندوستان کو مسلمانوں کے قبضے سے نکالنے میں سب سے بڑھ کر ذمہ دار تھے۔ شاہ بخارا کے نام جو خط بھیجا تھا اس میں لکھتے ہیں:

> نصارائے نکوہیدہ خصال و مشرکین بدمآل بر اکثر بلاد ہندوستان از لب دریائے اباسین تا ساحلِ دریائے شور کہ تخمیناً شش ماہ راہ باشد، تسلط یافتند و دام تشکیک و تزویر بناء بر اخمال دین رب خبیر بر یافتند و تمامی آں اقطار بہ ظلمات ظلم و کفر مشحون گردانیدند۔(۱)

ترجمہ : نصاریٰ اور مشرکین ہندوستان کے بلاد پر دریائے سندھ سے ساحل بحر تک قابض ہو گئے، یہ اتنا بڑا ملک ہے کہ انسان پیدل چلے تو ایک سرے سے دوسرے سرے پر پہنچنے میں چھ مہینے لگ جائیں۔ انہوں نے

---

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۳

(نصاریٰ اور مشرکین نے) خدا کے دین کو ختم کرنے کیلئے تشکیک وتزویر کا جال پھیلایا ہے اور ان تمام خطوں کو ظلم وکفر کی تیرگی سے بھر دیا ہے۔

مشرکین سے مراد مرہٹے اور سکھ ہو سکتے ہیں، لیکن نصاریٰ سے انگریزوں کے سوا کون مراد ہے؟

سید صاحب مومن تھے اور مومن کی فراست کیلئے خدا کا نور مشعلِ راہ کا کام دیتا ہے۔ وہ انگریزوں کی تدابیر تسلط کا صحیح اندازہ کر چکے تھے، اور جانتے تھے کہ کس طرح ہوشیاری اور عیاری سے وہ قدم جما کر اپنے تسلط کا جال پھیلاتے ہیں۔ شاہِ بخارا کو لکھتے ہیں:

کفارِ فرنگ کہ برسر ہندوستان تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار وہوشیار وحیلہ باز ومکار اند، اگر براہل خراسانِ بیایند بہ سہولت تمام جمیع بلاد آنہارا بہ دست آرند۔ باز حکومت آنہا بولایت آنجناب (یعنی بخارا) متصل گردد واطراف دارالحرب بہ اطراف دارالاسلام متحد شود۔(۱)

ترجمہ: جو فرنگی ہندوستان پر قابض ہوئے ہیں وہ بے حد تجربہ کار، ہوشیار، حیلہ باز اور مکار ہیں۔ اگر اہلِ خراسان (افغانستان) پر چڑھائی کردیں تو سہولت سے ان کے ملک پر قابض ہوجائیں گے۔ پھر ان کی حکومت کی حدیں آپ کی حکومت سے مل جائیں گی، دارالحرب اور دارالاسلام کے اطراف متحد ہوجائیں گے۔

سید صاحب نے انگریزوں کے سوا کسی دوسرے غیر مسلم کو اس درجہ خطرناک رنگ میں پیش نہ کیا اور گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ کے اوراق سید صاحب کے فکر ونظر کی اصابت ومحکمیت پر علی الاعلان گواہی دے رہے ہیں۔ پھر کس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، یا استخلاصِ بلادِ اسلام کے سلسلے میں سکھوں کو انگریزوں پر ترجیح دے سکتے تھے؟

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۵

سید صاحب کے نیاز مندوں کا یقین

سید صاحب کے نیاز مندوں میں سے مجھے ایک بھی نہیں ملا جس کے نزدیک آپ کا مطمح نظر پورے ہندوستان کا استخلاص نہ تھا۔ میں صرف تین مثالیں پیش کروں گا:

۱۔ ہندوستان میں بعض افراد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ سید صاحبؒ کے پاس جمعیت بہت کم ہے، یہ وسوسہ اور بعض دوسرے اعتراضات شاہ اسماعیل کے کانوں تک پہنچے تو آپ نے ایک مفصل مکتوب میں حقیقتِ حال واضح کی۔ اس میں لکھتے ہیں:

''کس شخص نے آپ کو بتایا کہ امامِ ہمام اسی قلیل جمعیت سے لاہور اور کلکتہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ وہ تو رات دن مسلمانوں کی جمعیت بڑھانے کی کوششیں فرمارہے ہیں۔'' لاہور سکھوں کا مرکز تھا، مگر کلکتہ سے سکھوں کا کوئی تعلق نہ تھا۔ شاہ صاحب جانتے تھے کہ انگریزوں سے جنگ مسلمہ مقاصد میں داخل ہے۔

۲۔ سید صاحبؒ کے ایک خلیفہ سید قطب علی نقوی ساکن مجھوامیر (ضلع گورکھپور) تھے، ان کے فرزند سید جعفر علی نقوی سید صاحب کے منشی خانے میں کام کرتے تھے، بالاکوٹ کے بعد وطن واپس آئے تو ایک روز سید قطب علی نے اپنے فرزند سے کہا:

> آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ سید صاحب کے ذریعے سے اس سرزمین (ہندوستان) کو کفار نگونسار سے پاک کردے گا، وہ اب دنیا میں باقی نہ رہے تو مجھے زندگی کی تمنا نہیں رہی۔ (۱)

۳۔ شیخ غلام علی الہ آبادی سید صاحب کے خاص ارادت مند تھے۔ سید جعفر علی نقوی جہاد کے لئے جاتے ہوئے شیخ صاحب سے ملے تو انہوں نے فرمایا:

> اب ہماری نظر لشکر اسلام (سید صاحب کے لشکر) کی فتح پر جمی ہوئی ہے، اور ہماری معاش کی اصلاح بھی اسی پر موقوف ہے۔ (۲)

---

(۱) منظورۃ السعداء (۲) منظورۃ السعداء

الٰہ آباد اور مجھوا میر کے نیاز مندوں کی تمنائیں تنہا سکھوں کی شکست سے پوری نہ ہوسکتی تھیں، جن کی حکومت دریائے ستلج پر پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ تمام نیاز مندوں کو یقین تھا کہ سید صاحب پورے ہندوستان کے استخلاص کیلئے کھڑے ہوئے ہیں، اور انگریزوں سے جنگ ان کے مقاصد میں داخل ہے۔

مبنیٰ کیا تھا؟

پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ سید صاحب کے نزدیک ہندوستان اسلامی حکومت کے زوال کے بعد دارالحرب بن چکا تھا، وہ اسے از سرِ نو دارالاسلام بنانا چاہتے تھے۔ نہ انگریزوں کی بے تعصبی یا بے ریائی کو اس سلسلے میں وجہ استثناء بنا سکتے تھے اور نہ سکھوں کی نادانیوں اور ضبطِ تعصب میں ناکامیوں کو ابھار کر پیش کرنے سے اصل حقیقت پر کوئی اثر پڑسکتا تھا۔ جس شئے کو انگریزوں کی بے تعصبی کہا جاتا ہے، وہ ملک داری کی ایک مناسب تدبیر تھی۔ سکھ تدبیر و تدبر سے ناآشنا تھے، اس لئے اپنا تعصب انتہائی بدوضعی سے نمایاں کرتے رہے، انگریز مدبرانہ حکمرانی کے اصول سے آگاہ تھے، انہوں نے صرف انہیں امور کو اپنے ڈھنگ پر چلانا کافی سمجھا جو براہِ راست حکومت کے استحکام سے تعلق رکھتے تھے، باقی امور میں عوام کو آزاد چھوڑ دیا۔ لیکن یہ آزادی عوام کی قوت و طاقت کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ انگریزوں کی رضامندی و اجازت پر مبنی تھی۔

پھر سید صاحب اہل وعیال کو ساتھ لے کر وطن سے نکلے تھے، اگرچہ انہیں سندھ میں چھوڑنا پڑا، آخری دور میں تاکیداً لکھ دیا کہ اگر ہماری زندگی خدا کی راہ میں ختم ہو جائے تو اہل وعیال کو ہندوستان نہ بھیجا جائے بلکہ حرمین پہنچا دیا جائے۔

بہر حال سید صاحب کا جہاد نہ صرف پنجاب کیلئے تھا، نہ صرف سکھوں کے خلاف تھا، بلکہ پورے ہندوستان کیلئے تھا، اور اس میں انگریز بطور خاص آتے تھے۔ باقی رہا یہ

امر کہ جہاد سرحد سے کیوں شروع کیا، جس کے ضمن میں سکھ پہلے آگئے، تو اس کے وجوہ ومصالح الگ بیان ہوں گے۔

روشن شہادتیں

پھر سید صاحب کی تحریرات میں ایسی روشن شہادتیں موجود ہیں جنہیں دیکھ لینے کے بعد اصل نصب العین کے متعلق شبہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ مثلاً:

۱۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ دور کے ملک سے آنے والے بیگانے اور سامان بیچنے والے تاجر مالکِ سلطنت بن گئے۔ جب ہندوستان کا میدان غیروں اور دشمنوں سے خالی ہوجائے گا، تو میں مناصبِ ریاست وسیاست دوسروں کے حوالے کر کے الگ ہوجاؤں گا۔(۱)

۲۔ شہزادہ کامران والیٔ ہرات کو قیامِ جہاد کی تاکید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان چلا جاؤں گا، میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے، یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کرلوں۔(۲)

ظاہر ہے کہ سکھ نہ دور سے آئے تھے، نہ انہیں وطنیت کے لحاظ سے بیگانے قرار دیا جاسکتا تھا اور نہ تجارت ان کا پیشہ تھا۔ یہ تینوں خصوصیتیں صرف انگریزوں میں تھیں۔ پھر ہندوستان کو غیروں سے پاک کرنے یا اسے اصل مقصود قرار دینے کا مطلب بجز اس کے کیا تھا کہ سید صاحبؒ انگریزوں کے خلاف جہاد کو بدرجہا زیادہ اہم سمجھتے ہیں، بلکہ ان کا نصب العین ہی یہ تھا۔ سکھوں سے جنگ اس لئے پیش آگئی کہ سرحد سے جہاد شروع ہوا تھا، وہاں سے انگریزی حکومت کے حدود تک پہنچنا سکھوں سے فیصلہ کئے بغیر ممکن نہ

(۱) مکاتیب شاہ اسمٰعیل ص:۱۷۰

(۲) مکاتیب شاہ اسمٰعیل ص:۱۴۰-۱۴۱۔ یہ بھی عرض کردوں کہ مکاتیب میں یہ مضمون بار ہا مختلف صورتوں میں آیا ہے، میں صرف بطور مثال ہی چند حوالے دے سکتا ہوں۔

تھا، بلاشبہ وہ بھی اسلامی بلاد پر متصرف تھے اور ان سے جنگ ضرور پیش آئی۔

مولوی محمد جعفر کی لغزش

مولوی محمد جعفر تھانیسری سید صاحب کے خاص معتقدین سے وابستہ تھے، اس وابستگی کے باعث انہوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار لٹایا اور کم و بیش اٹھارہ سال کالے پانیوں میں بسر کیے۔ ان قربانیوں کے سامنے ہر شخص کی گردن احتراماً جھک جانی چاہیے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ سید صاحب کے نصب العین کو سمجھنے میں ان سے سخت لغزش سرزد ہوئی، اور حد درجہ افسوس اس بات پر ہے کہ اس غلطی کی توثیق کیلئے انہوں نے سید صاحب کی عبارتوں کو بدلا۔ یہ حقیقت اس باب کے ضمیمے سے واضح ہو گی۔

آخر میں اتنا عرض کر دینا چاہیے کہ جس زمانے میں سید صاحب مصروف جہاد تھے، اسی زمانے میں ایک انگریز سیاح، جس کا نام میسن تھا، سرحد، افغانستان اور بلوچستان کے علاقوں میں پھر رہا تھا، اس نے سید صاحب کا نصب العین یہ بتایا:

> ''سکھوں کا استیصال اور پنجاب پر قبضہ، پھر ہندوستان اور چین پر تسلط۔''

گویا اس انگریز سیاح کو سید صاحب کے مقاصد کا اندازہ ان مسلمانوں سے بہتر تھا جو سید صاحب کے خاص معتقدین شمار ہوتے تھے۔

ضمیمہ

میرزا حیرت

میرزا حیرت کی کتاب ''حیاتِ طیبہ'' اصلاً شاہ اسمٰعیل کے حالات میں ہے، آخر میں سید صاحب کے حالات بھی اختصاراً درج کئے ہیں۔ میں اس کتاب کی تاریخی حیثیت کے متعلق الگ ذکر کر چکا ہوں، اس میں شاہ اسمٰعیل کے دورۂ پنجاب کے حالات بڑی تفصیل سے مرقوم ہیں۔(۱) لیکن میں نے جب کبھی انہیں پڑھا، تاریخ سے کہیں زیادہ افسانے کا رنگ ان میں نمایاں نظر آیا۔ یہ دورہ اس زمانے میں ہوا جب سید صاحب امیر خاں کے لشکر کو چھوڑ کر دہلی نہیں پہنچے تھے۔ جہاں تک میں تحقیق کر سکا ہوں، سید صاحب کے ساتھ وابستگی سے پیشتر شاہ اسمٰعیل یا مولانا عبدالحئی یا کسی دوسرے بزرگ کو تنظیم جہاد یا تحقیق احوالِ مسلمین کا چنداں خیال ہی نہ تھا، میرزا حیرت نے ان تفصیلات پر خاص زور اس لئے دیا کہ سید صاحب کے جہاد کا رخ کاملاً سکھوں کی طرف پلٹ جائے، وہ نواب امیر خاں اور انگریزوں کی صلح کو بھی سید صاحب ہی کی وساطت کا کرشمہ سمجھتے تھے۔ مجھے ادب کے ساتھ عرض کرنا چاہئے کہ مرزا حیرت کا مرتبہ دورۂ پنجاب سراسر افسانہ ہے، جو اسلئے تیار کیا گیا کہ سید صاحب کے موقفِ جہاد میں تحریف کیلئے اچھا سامان فراہم ہو جائے۔

مولوی جعفر

مولوی محمد جعفر مرحوم نے تواریخ عجیبہ کے آخر میں سید صاحب کے جو منتخب مکاتیب شائع کئے ان کی عبارتیں بدل دیں۔ یہ حقیقت اصل مکاتیب اور مولوی محمد جعفر کے شائع کردہ مکاتیب کی عبارتیں سامنے رکھ لینے سے واضح ہو سکے گی۔

(۱) حیاتِ طیبہ ص: ۱۰۷-۱۳۴

اصل عبارت		تواریخ عجیبہ میں منقولہ عبارت
(۱) نصاریٰ نکوہیدہ خصال ومشرکین بدمآل بر اکثر بلاد ہندوستان از لبِ دریائے اباسین تا ساحل دریائے شور کہ تخمیناً شش ماہہ راہ باشد ، تسلط یافتند (مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۳)		(۱) سکھان نکوہیدہ خصال و مشرکین بدمآل بر اکثر اقطاع غربی ہندوستان از لب دریائے اباسین تا دارالسلطنت دہلی ، تسلط یافتند۔ (تواریخ عجیبہ ص:۱۸۹،۱۹۰)

اصل عبارت		تواریخ عجیبہ میں منقولہ عبارت
(۲) نہ با کسے از امرائے مسلمین منازعت داریم ونہ بایکے از روسائے مومنین مخالفت۔ با کفار لئام مقابلہ داریم، نہ بامدعیانِ اسلام۔ بادراز مویاں بلکہ سائر کفر جویاں مقاتلہ خواہیم نہ با کلمہ گویاں واسلام جویاں، چنانچہ ایں معنی خاص وعام است۔ (مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۱۹)		(۲) نہ با کسے از اُمرائے مسلمین، نہ باسر کار انگریزی مخاصمت داریم ونہ ہیچ راہ منازعت کہ از رعایائے اوہستیم وبہ حمایتش از مظالم برایا ، چنانچہ ایں معنی معلوم خاص وعام است۔ (تواریخ عجیبہ ص:۱۷۵)

اصل عبارت		تواریخ عجیبہ میں منقولہ عبارت
(۳) کفار فرنگ کہ بر ہندوستان تسلّط یافتہ اند نہایت تجربہ کار وہوشیار اند وحیلہ ساز ومکار۔ (مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۹)		(۳) کفار دراز مویاں کہ بر ملک پنجاب تسلط یافتہ اند نہایت تجربہ کار و ہوشیار اند و حیلہ باز ومکار۔ (تواریخ عجیبہ ص:۱۹۲)

اصل عبارت		تواریخ عجیبہ میں منقولہ عبارت
(۴) آیا ایں قوم از جملہ نصاریٰ ویہود یا مجوس وہنود اند کہ بالمت محمدیہ عداوت می دارند۔		(۴) بے شک آں قوم از جملہ مجوس یا سکھ یا ہنود اند کہ بالمت محمدیہ عداوت دارند۔
(مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۱۶۵)		(تواریخ عجیبہ ص: ۲۱۲)

اصل ونقل کا فرق

اب آپ دونوں بالمقابل عبارتوں کے خط کشیدہ الفاظ سامنے رکھ کر اصل ونقل کا فرق ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ پہلے اقتباس کے ابتدائی الفاظ میں ''نصاریٰ نکوہیدہ خصال'' کی جگہ ''سکھانِ نکوہیدہ خصال'' لکھا گیا، پھر ''اکثر بلا دِہند وستان'' کی جگہ ''اکثر اقطاع غربی ہندوستان'' بنایا گیا اور آخر میں ''ازلب دریائے اباسین تا ساحل دریائے شور'' کی جگہ ''از لب دریائے اباسین تا دار السلطنت دہلی داخل کیا گیا۔ ''شش ماہہ راہ باشد'' حذف کر دیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ مولوی صاحب مرحوم کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ سکھوں کی سلطنت دہلی تک نہیں جاتی تھی بلکہ اس سے دوسو میل شمال میں دریائے ستلج پر ختم ہو جاتی تھی، اور دہلی پر انگریز ۱۸۰۳ء سے قابض چلے آتے تھے۔

۲۔ دوسرے اقتباس میں ''نہ باسرکار انگریزی مخاصمت داریم...... برایا'' والا پورا فقرہ اپنی طرف سے بڑھا دیا گیا اور یہ الفاظ ''تواریخ عجیبہ'' کے پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشنوں میں جلی لکھوائے گئے۔

۳۔ تیسرے اقتباس میں ''کفار فرنگ'' کی جگہ ''کفارِ دراز مویاں'' بنایا گیا۔

۴۔ چوتھے اقتباس میں ''آیا'' کی جگہ ''بے شک لکھا اور ''نصاریٰ ویہود'' کو حذف

کر دیا۔

مبادا کسی کو شبہ ہو کہ یہ ترمیمات مکاتیب کے ناقل اول نے کیں، مولوی صاحب ان کے ذمہ دار نہ تھے، میں نے مکاتیب کے چھ قلمی نسخے بہم پہنچائے جو مختلف اوقات میں مکتوب ہوئے۔ ان سب میں اصل عبارت اسی طرح درج پائی، جس طرح میں نے بطور متن نقل کی، نیز ترمیمات میں صرف ''نصاریٰ'' اور ''کفارِ فرنگ'' کو حذف کرنے کا اہتمام بالکل واضح ہے۔ یہ اسی شخص کا کام ہوسکتا تھا جو سید صاحب کے جہاد کو ہر طرف سے ہٹا کر صرف سکھوں تک محدود کر دینے کا تہیہ کئے بیٹھا تھا۔

سید صاحب کے متعلق قلمی ذخیروں تک چند افراد کے سوا کسی کو دسترس حاصل نہ تھی، تواریخ عجیبہ چھپی تو اس میں سید صاحب کے مقاصدِ جہاد کا حلیہ بالکل بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ عام اصحاب نے اسے مستند شئے سمجھ کر قبول کر لیا، اس طرح اس پاک نفس مجاہد کبیر کے مقاصد ایک نہایت افسوس ناک غلط فہمی کا ہدف بنے۔ میں مانتا ہوں کہ جس زمانے میں ''تواریخ عجیبہ'' لکھی گئی سید صاحب کی تحریک انگریزوں کے عتاب کا مورد بنی ہوئی تھی، لیکن مولوی محمد جعفر صاحب مکاتیب کو چھوڑ سکتے تھے، انہیں تحریف شدہ شکل میں شائع کرنے کی کون سی مجبوری پیش آ گئی تھی؟ اور یہ حرکتیں ان لوگوں سے سرزد ہوئیں جو سید صاحب کے عقیدت مند تھے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْ قَبْلِنَا.

تیئیسواں باب:

سلطنت یا اعلاءِ کلمۂ حق؟

ریاست طلبی کا وسوسہ

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سید صاحب نے جہاد کے لئے مسلمانوں کی تنظیم شروع کی، وہ تمام مسلمانوں کو اسلامی جہاد کی روح سے معمور کر دینا چاہتے تھے، ان کی آرزو یہ تھی کہ خدا کا کلمہ بلند ہو، سید المرسلینؐ کی سنتیں تازہ ہو جائیں، تمام اسلامی بلاد غیروں کے تصرف سے آزادی حاصل کر لیں۔ وہ صرف سکھوں سے نہیں بلکہ ان تمام غیر مسلم قوتوں سے لڑنا چاہتے تھے جو بلادِ اسلامی پر قابض ہو چکی تھیں، اور ان کے نزدیک انگریزوں کا خطرہ سب سے بڑا تھا۔ اب غور کرنا چاہئے کہ آیا وہ بلادِ اسلامی کو آزاد کرا کے اپنی حکومت کی طرح ڈالنا چاہتے تھے؟ اپنی فرماں روائی کی مسند آراستہ کرنے کے خواہاں تھے؟

ان سے پہلے جتنے آدمی معمولی حیثیت سے اُٹھ کر لاؤ لشکر کے مالک بنے تھے، وہ ملک یا ریاستیں سنبھال کر بیٹھ گئے تھے۔ ایک قریبی مثال نواب امیر خاں مرحوم کی تھی، جس کے ساتھ سید صاحب سات آٹھ برس گزار چکے تھے۔ اس مرحوم کا قدم بھی طلبِ جاہ وحشم سے آگے نہ بڑھ سکا۔ ان مثالوں کی بناء پر مختلف قلوب میں وسوسہ پیدا ہونا بعید از قیاس نہ تھا کہ سید صاحب بھی ملک و ریاست کے طلب گار ہیں۔ اس زمانے میں للّٰہیت اس درجہ کم یاب تھی کہ عام لوگ اس کا صحیح تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، جس طرح ہمارے زمانے میں نہیں کر سکتے۔ فکر و نظر کا پیمانہ ایسا بن گیا تھا کہ کسی شخص کی کوئی سرگرمی اور کوئی جدوجہد ذاتی اغراض کے لوث سے پاک نہیں سمجھی جا سکتی تھی۔

پھر سب لوگ جانتے تھے کہ سید صاحب امیر خاں کے رفیق رہے، یہ بھی جانتے تھے کہ امیر خاں ٹونک کا مالک بن کر بیٹھ گیا، اکثر نے یہی سمجھا ہوگا کہ سید صاحب بھی اپنے لئے ایک جداگانہ ریاست پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے آپ کو اپنا مطمحِ نظر واضح کرنے کی ضرورت بار بار پیش آتی رہی، اور یہ مضمون آپ کے مکاتیب میں بیسیوں مرتبہ دہرایا گیا ہے۔

صرف اعلاءِ کلمۃ الحق

میں پچھلے باب میں مکاتیب سے ایک اقتباس نقل کر چکا ہوں کہ سید صاحب کی آرزو کلمۂ حق کی سربلندی، سننِ سید المرسلینؐ کے احیاء اور استخلاصِ بلادِ اسلامیہ کے سوا کچھ نہ تھی۔(۱)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں کہ اگر اسلامی ملک آزاد ہو جائیں، ریاست و سیاست اور قضا و عدالت میں شرعی قوانین کو مدارِ عمل بنالیا جائے، تو میرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ خود مالک سلطنت بننے کے بجائے مجھے یہ پسند ہے کہ تمام اقطاع میں عادل فرمانرواؤں کی حکمرانی کا سکہ جاری ہو جائے۔

> سلطنت ہفت کشور را بہ خیال ہم نمی آرم وقتیکہ نصرتِ دین و استیصالِ کفر و متمردین محقق گردید تیر سعی من ہدفِ مراد رسید۔(۲)
>
> **ترجمہ**: میں ہفت اقلیم کی سلطانی کو پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا، جب نصرتِ دین کا دور شروع ہو جائے گا اور سرکشوں کے اقتدار کی جڑ کٹ جائے گی تو میری سعی کا تیر خود بخود نشانۂ مُراد پر جا بیٹھے گا۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں کہ تمام عبادتوں کی بنیاد، تمام طاقتوں کی اصل اور تمام جاودانی سعادتوں کا مدار یہ ہے کہ خالقِ برتر کے ساتھ رشتۂ عبودیت استوار ہو جائے۔

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۵ (۲) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۹

استواری کا نشان یہ ہے اللہ تعالیٰ کی محبت عزیز داری کے تمام رشتوں پر برتری حاصل کر لے۔سوال کیا جا سکتا ہے کہ پتہ کیوں کر چلے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت واقعی تمام رشتوں پر برتر ہوگئی ہے؟ فرماتے ہیں، اس محبت کی سب سے بڑی امتحان گاہ میدانِ جہاد ہے، جہاں کسی بندۂ خدا کے لئے اہل وعیال کے ترک، اخوان واوطان سے علیحدگی اور جان ومال کی قربانی کئے بغیر پہنچنا ممکن ہی نہیں۔

> پس اقدام درا قامت ذروۂ سنام اسلام (جہاد) اقویٰ علامت غلبہ محبت حضرت خالق است برجمیع مخلوقات لہٰذا درآیۂ کریمہ: قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآءُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ الخ جہاد را با محبت خدا ورسولؐ دریک سلک منسلک گردانیدہ۔(۱)

> **ترجمہ** : پس جہاد کے لئے قدم اٹھانا، جسے حدیث میں ذروۂ سنام اسلام کہا گیا ہے، اس بات کی قوی ترین علامت ہے کہ حضرت خالق کی محبت تمام مخلوقات کی محبت پر غالب ہوگئی ہے۔اسی وجہ سے آیۂ کریمہ قل ان کان اباؤ کم الخ میں جہاد کو خدا ورسولؐ کی محبت کے ساتھ ایک لڑی میں منسلک کیا گیا ہے۔

سید صاحب کی پوری زندگی اسی حقیقت کی زندہ دستاویز ہے کہ ان کے دل میں خالق کی محبت دنیا کے ہر رشتے پر ہمیشہ غالب رہی۔

طلبِ دنیا سے کامل براءت

سید صاحب نے وقت کے بادشاہوں یا ریاستوں کے مالکوں کو جتنے دعوت نامے

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۷۵

بھیجے ان میں صاف صاف لکھ دیا کہ میری آرزو رضائے باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہیں، نہ کوئی علاقہ لینا چاہتا ہوں نہ حکومت و جاگیر کا طلب گار ہوں، نہ جاہ و مال کا خواہاں ہوں، صرف ایک غرض، ایک مطلب اور ایک نصب العین میرے سامنے ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کا کلمہ سر بلند ہو اور رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تازہ ہو جائے:

> سو زبان سے خدائے تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں کہ مالکِ حقیقی کی اطاعت میں مشغول ہوں اور صرف اسی کی رضا مطلوب ہے۔ خدا کے سوا ہر چیز کی طرف سے آنکھیں اور کان بند کر لئے ہیں، دنیا و مافیہا سے ہاتھ اٹھالیا ہے اور محض لوجہ اللہ علمِ جہاد بلند کیا ہے۔ مال و منال، جاہ و جلال، امارت و ریاست اور حکومت و سلطنت کی طلب سے کاملاً الگ ہو چکا ہوں، خدا کے سوا کسی کی جستجو نہیں رہی۔ (۱)

امامت و سلطنت کا فرق

ایک مکتوب میں امامت و سلطنت کا فرق واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں: امام کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ جہاد قائم کرے اور بغی و فساد کو مٹائے۔ امام یا اس کے ساتھیوں کو شہروں اور ملکوں پر تسلط بالذات مقصود نہیں ہوتا بلکہ وہ مستحقوں کو حکومت کی گدی پر بٹھا دیتے ہیں، اس کے برعکس منصبِ سلطنت کا مقصود ہی یہ ہوتا ہے کہ حکومت ملے، سلطنت بنے، علاقے اور ملک فتح ہوتے رہیں۔ (۲)

> عالم السرائر و الخفیات گواہ است بریں معنی کہ بر دل اخلاص منزل اے جانب آرزوئے حصولِ خزائن بے شمار و تسلط بلاد و امصار یا طلب عزت و وجاہت و ریاست یا فرمانروائی بر اقران و اخوان یا اہانت رؤسا عالی مقدار از سلب سلطنتِ سلاطین والا تبار گاہے خطور ہم نہ کردہ، وسوسہ آں ہم بہم نہ رسیدہ۔ (۳)

---

(۱) مکاتیب سید صاحب ص:۱۸ (۲) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۳۸ (۳) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۴۰

ترجمہ : خفیہ باتوں کو جاننے والا خدا اس حقیقت پر گواہ ہے کہ میرے دل میں کبھی یہ خیال بھی نہیں گذرا کبھی وسوسہ بھی پیدا نہیں ہوا کہ بے شمار خزانوں کا مالک بن جاؤں، شہر اور ولایتیں میرے قبضے میں آجائیں، عزت ووجاہت یا امارت وریاست مل جائے، اپنے بھائیوں اور ہمسروں پر حکمراں بن جاؤں، یا اونچے خاندان والے باشاہوں کی سلطنتیں چھین کران کے لئے اہانت کا باعث بنوں۔

صرف احیاءِ دین

غرض سید صاحب کا مدعا اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ کلمۂ حق سر بلند ہو، رسولِ پاکؐ کی سنتیں تازہ ہو جائیں۔ اسی مدعا کے لئے انہوں نے وطن چھوڑا، اہل وعیال اور عزیزوں سے جدائی قبول کی، زندگی کے بہترین لیل ونہار جدال وقتال کی مصیبتوں میں گزارے اور یہ مدعا دنیا و مافیہا کی کسی غرض سے ملوث نہ ہونے دیا۔(۱) للّٰہیت کی یہ شان تھی کہ اس مدعا کی بھی محض تکمیل کے لئے مضطرب تھے، یہ غرض نہ تھی کہ ان کے ہاتھ سے پورا ہوتا ہے یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے:

> تاجِ فریدوں وتختِ سکندر بہ جوے نمی شمارم ومملکت قیصر وکسریٰ بہ خیال ہم نمی آرم، آرے ایں قدر آرزو دارم کہ در اکثر افراد بنی آدم بلکہ در جمیع اقطار عالم احکام حضرت رب العالمین کہ مسمّٰی بہ شرع متین است، بلا منازعت احدے نافذ گردد، خواہ از دستِ من، خواہ از دستِ کسے دیگر، پس ہر حیلہ کہ باعث حصول دین معین باشد، برروئے کارمی آرم وہر تدبیرے کہ مفید ایں مقدمہ باشد بجامی آرم۔(۲)

ترجمہ: تاجِ فریدوں اور تختِ سکندر میری نظروں میں جو کے

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۴۹-۵۰ (۲) مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۵۰

برابر نہیں ہے، قیصر و کسریٰ کی مملکت کا خیال تک دل میں نہیں لاتا، صرف یہ آرزو ہے کہ اکثر افراد بنی آدم بلکہ دنیا کے تمام خطوں میں رب العالمین کے احکام جاری ہو جائیں، جنہیں ہم شریعت کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس بارے میں کسی کی طرف سے کشمکش کا امکان باقی نہ رہے۔ صرف اس کام کی تکمیل مقصود ہے، خواہ یہ میرے ہاتھ سے پورا ہو یا کسی دوسرے کے ہاتھ سے، جو حیلہ اس مدعا کے حصول کا باعث ہوسکتا ہے اسے بروئے کار لاتا ہوں اور جو تدبیر اس مقدمے کے لئے مفید نظر آتی ہے اس سے کام لیتا ہوں۔

صحیح اسلامی نصب العین

مادی اغراض کی تیرگی کے موجودہ دور میں یہ باتیں یقیناً اجنبی معلوم ہوں گی، ہم لوگ انہیں ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لینے کی صلاحیت بھی کھو چکے ہیں، لیکن سچے مسلمان کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کی نظریں صرف خدا کے احکام پر جمی ہوئی ہوں۔ وہ زندگی کی ہر متاع کو ان احکام کے پورا کرنے میں لگا دے اور اس غرض کے لئے طریقے بھی وہی اختیار کرے جو خدا کے نزدیک پسندیدہ ہوں۔ اسلام یہ نہ تھا کہ چند مخصوص کلمے وقتاً فوقتاً دہرا دیے، چودہ سو برس کی اسلامی تاریخ کے درخشاں واقعات کو اپنے لئے سرمایۂ فخر کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے اور عام اعمال میں صرف ذاتی اغراض کو محور بنائے رکھا، اسلام یہ تھا کہ ہر مدعیٔ اسلام کی ہر حرکت و جنبش صرف رضائے باری تعالیٰ کے تابع ہو، اس کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، سونا جاگنا محض اللہ کے لئے ہو۔ وہ جیئے تو اس لئے کہ اس کے حسنِ عمل سے خدا کے دین کی محبت و الفت لوگوں کے دلوں میں بڑھے، مرے تو اس لئے کہ دنیا اس پاک مسلک پر چلنے لگے، جو خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا۔

سید صاحب کا نصب العین یہی تھا جو اسلام کے ابتدائی دور کے بعد کہیں قائم نہ رہ

سکا، اس لئے کہ محض ملک گیری اور کشور کشائی مقصودِ حقیقی بن چکی تھی۔ صرف اسی بات کو خدمتِ اسلام سمجھ لیا گیا تھا کہ بڑے بڑے خطوں پر قبضہ جما لیا جائے، اگرچہ کوئی بھی عمل خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے عین مطابق نہ ہو۔

غور فرمایئے کہ کیا یہ نصب العین صرف سکھوں کے خلاف جہاد سے پورا ہو سکتا تھا؟ یا سکھ پنجاب کے مسلمانوں پر تعدیاں نہ کرتے تو یہ نصب العین خود بخود پورا ہو جاتا؟ یا انگریزوں نے اپنے مقبوضات میں اک گونہ رواداری برتی تو کیا ہم معاذ اللہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نصب العین پورا ہوتا رہا؟

کود ذوقاں داستانہا ساختند وسعتِ ادراکِ او نشناختند

للّٰہیت کا یہ ایسا مقام ہے، جس میں سید صاحب کے امتیاز واختصاص کو کوئی دوسرا قائد نہ پہنچ سکا۔

چوبیسواں باب:

شبہات واعتراضات کی حقیقت

جہاد فرضِ کفایہ ہے

خود سید صاحب کے زمانے میں ان پر جو اعتراضات ہوئے یا ان کے موقف کی تضعیف کے لئے جو شبہات پیش کئے گئے، ان پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینی چاہئے۔

ایک گروہ نے اس بات کو لے لیا کہ جہاد فرضِ کفایہ ہے، اگر مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کام کیلئے کھڑی ہو جائے تو تمام مسلمانوں کی گردن سے بارِ فرض اتر جاتا ہے، اور سب میدانِ جہاد میں نکلنے کے مکلّف نہیں رہتے۔ لیکن سوچئے کہ کفایت کا مطلب کیا ہے، کفایت کے معنی ہیں "کافی ہونا" اس سے مراد یہ ہے کہ جس قوت سے جہاد درپیش ہو، اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی جماعت عقلِ سلیم کی بناء پر بظاہر کافی ہو، نہ یہ کہ ضرورت مثلاً دس ہزار مجاہدوں کی ہو اور صرف دو چار سو یا ہزار بارہ سو مسلمانوں کا میدانِ جہاد میں پہنچ جانا کافی سمجھ لیا جائے، باقی تمام مسلمان فرضِ کفایہ کو دستاویز بنا کر اطمینان سے گھروں میں بیٹھے رہیں۔

ملتان کے ایک غازی نے خود سید صاحب سے ایک مرتبہ یہی کہا تھا کہ ہمارے علماء جہاد کو فرضِ کفایہ قرار دیتے ہیں، سید صاحب نے یہی جواب دیا کہ کفایت سے مراد ہے مجاہد مسلمان موقع اور مقام کے لحاظ سے کافی ہوں، نہ یہ کہ صرف چند سو مسلمانوں کے قیام کو بلا لحاظ موقع ومحل کافی تصور کر لیا جائے۔

پھر معاملے کی صورت یہ نہ تھی کہ بلادِ اسلام محفوظ تھے اور سرحدوں پر اغیار کی متفرق

ٹولیوں سے جھڑپیں پیش آرہی تھیں۔ معاملے کی صورت یہ تھی کہ بلادِ اسلام اغیار کے قبضے میں جا چکے تھے، اس موقع پر "فرضِ کفایہ" کا عذر کیا کام دے سکتا تھا؟ خود صحابہ کرامؓ کی مثالیں سامنے تھیں، جب اسلامی فتوحات کے علم جا بجا گڑ چکے تھے اور جہاد کی دعوت دی جاتی تھی، تو وہ بوڑھے بھی تلواریں لے کر نکل پڑتے تھے جن کی بھنویں ضعفِ پیری کے باعث آنکھوں پر گر رہی تھیں۔ ان سے جب کوئی کہتا کہ بڑھاپے میں مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟ تو وہ جواب دیتے: انفروا خفافاً و ثقالاً کہ فرمانِ خداوندی کے بعد بڑھاپے کا عذر کون پیش کر سکتا ہے؟

جامع الشروط امام کا معاملہ

دوسری ضروری بات جس پر بطور خاص زور دیا گیا، یہ تھی کہ جہاد کے لئے امام جامع الشروط ہونا چاہئے۔ بے شک امام کو بہتر سے بہتر اوصاف کا مالک ہونا چاہئے، لیکن ہمارے علماء نے شروط کی اہمیت میں مبالغہ کرتے کرتے معاملہ یہاں تک پہنچا دیا کہ بعض اربابِ علم نے بے تکلف فرما دیا کہ ہمارے زمانے میں جامع الشروط امام ناپید ہے، لہٰذا جہاد ہو ہی نہیں سکتا۔ گویا فریضۂ جہاد کی بجا آوری صرف جامع الشروط امام کے میسر آجانے پر منحصر ہے ورنہ اسے ساقط العمل سمجھنا چاہئے۔ اِنا للہِ و انا الیہ راجعون.

غور کیجئے کہ امام کے لئے جو شرطیں تجویز ہوئی تھیں، ان کی غرض و غایت کیا تھی؟ محض یہ کہ امامت کے وظائف احسن طریق پر پورے ہوں۔ حالتِ امن و جنگ میں مسلمانوں کے تمام انتظامی و دفاعی کام بہتر سے بہتر صورت میں پورے ہوتے رہیں۔ گویا شرطوں کا مقصود اصل وظائف کی بہتر بجا آوری تھی، نہ کہ انکے جوشِ اہتمام میں حقیقی فرائض ہی کو ختم کر کے بیٹھ جانا؟ پھر جب مسلم ہے کہ جہاد میں کفار و فساق سے بھی مدد لی جا سکتی ہے، غیر مسلم دشمن کے مقابلے میں غیر مسلم معاہد کو رفیق بنایا جا سکتا ہے، تو جامع

الشروط امام کے انتظار میں مسلمانوں کا معطل بیٹھے رہنا کس بناء پر جائز مانا جا سکتا ہے؟

دَورِ انحاط کی مصیبتیں

حقیقت یہ ہے کہ جیسے جیسے مسلمان انحطاط کا شکار ہوتے رہے، ان کے فکر وعمل پر بھی انحطاط طاری ہو گیا۔ اس دور میں انہوں نے شاید ہی یہ کوشش کی ہو کہ حالات کو ہمت وقوت سے اپنے مطابق بنائیں، خود اپنے آپ کو حالات کے مطابق بناتے رہے۔ علماء کی پوری سعی وکاوش رخصتوں اور اجازتوں کی تلاش میں صرف ہوتی رہی، جو اُن کی بے چارگی کے لئے تسکین کا سہارا بن سکتی تھیں۔ معذرتیں اس لئے تراشی گئیں، شرائط امامت کی سختی اور سنگینی میں اس وجہ سے مبالغہ کیا گیا کہ خود ان لوگوں میں اٹھنے اور بروئے کار آنے کی ہمت نہ تھی۔ بس انہیں یہی مناسب معلوم ہوا کہ سب کو بٹھائے رکھیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر اس طرح سلا دیں کہ اُٹھنے کا خیال بھی دلوں میں باقی نہ رہے۔ جو کچھ ہونا چاہئے تھے، اس پر کسی کی نظر نہ تھی، جو کچھ پیش آ رہا تھا اس پر بے تکلف قناعت کر لینے کے وعظ فرماتے اور اسے مطابق شریعت ثابت کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حالات میں بگاڑ کی رفتار تیز تر رہی، پہلے پہل ہمارے علماء نے اصل مسئلے کو قائم رکھتے ہوئے شرطوں کو غیر ممکن ظاہر کرنے پر زور دیا، اس کے بعد جو لوگ آئے انہوں نے اصل مسئلے ہی کو ختم کر دینے کی بنیاد رکھ دی۔

حوصلے کے اضمحلال اور اہمیت کی نگونساری کے اس اندھیرے میں جس بزرگ ہستی نے عزیمت کا چراغ ہر مسلمان کے دل میں روشن کرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اپنی جان بے دریغ قربان کر ڈالی، وہ سید احمد بریلوی تھے، اور احیاء وتجدید اسلامیت کا یہ درخشاں ترین کارنامہ ہے، جو اس بے نوا سید کے ہاتھوں انجام پایا۔ مسند درس پر معارف شریعت بیان کرنے والے بہت ہوئے، منبروں پر دین کے وعظ کہنے والوں کی بھی ہماری

ملت میں کمی نہ رہی، لیکن جان ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ عمل میں بے پروایانہ کھڑے ہونے کا شرف سید احمد کے سوا کس کے حصے میں آیا؟

تو نظیری ز فلک آمده بودی چو مسیح
باز پس رفتی وکس قدرِ تو نشناخت دریغ

تحریکِ جہاد کی تضعیف

سید صاحب اور ان کی جماعت پر ہندوستان میں جو اعتراضات ہوئے تھے وہ سرحد بھی پہنچ گئے تھے جب سید صاحب جہاد میں مشغول تھے۔ ان میں سے بعض کی کیفیت یہ تھی:

۱۔ سید صاحب اور انکے رفیقوں پر ذاتی اعتراضات، جنکی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

۲۔ سید صاحب کے پاس ساز و سامان کم ہے اور جس قوت سے مقابلہ درپیش ہے اس جیسی طاقت میسر نہیں۔

۳۔ بعض لوگ بیعت کر چکنے کے بعد منحرف ہو گئے، اس بناء پر باقی لوگوں کی استقامت بھی مشتبہ ہو گئی۔

ان اعتراضات کا مدعا بظاہر یہ نہ تھا کہ سید صاحب راہِ خدا میں جو کوششیں فرما رہے تھے، اسے تقویت پہنچے تا کہ اصل مقصد جلد سے جلد پورا ہو جائے۔ بظاہر محض یہ تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی کم ہو جائے۔

شاہ اسماعیل نے ایک مفصل مکتوب میں ان اعتراضات کا جواب لکھا، جسکے بعض مطالب اس غرض سے یہاں پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سے بھی جہاد کی ضرورت و اہمیت اور سید صاحب کے موقف پر روشنی پڑتی ہے۔

امام کے ساتھ قبائح کا انتساب

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اعتراضات کا جواب بھی اگرچہ جہاد کی ایک شکل ہے، لیکن ہمارے پاس تحریر و تقریر کے لئے وقت کہاں ہے؟ نماز کی تعلیم یقیناً ضروری ہے، لیکن جو شخص خود ادائے نماز میں مشغول ہو، تعلیم کیونکر دے سکتا ہے؟ پھر پہلے اعتراضات پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> امام صاحب سے جن قبائح کا انتساب کیا جاتا ہے وہ سراسر باطل ہیں، ان میں سے ایک کا بھی انتساب درست نہیں۔ اور آپ کے ساتھیوں سے جو قبائح منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں سے بھی بیشتر خلافِ حقیقت ہیں، لیکن اگر رفقائے امام کے متعلق ان قبائح کو بہ فرضِ محال تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے امامت میں کیا نقص واقع ہوسکتا ہے؟ اس کی مثال یہ ہے کہ امتیوں کے اعمال کی خرابیاں کبھی بھی نبی کی نبوت پر اثر انداز نہیں ہوئیں۔
>
> جو کچھ سید صاحب سے منسوب کیا جاتا ہے، اُسے بھی اگر درست مان لیا جائے تو امامت کے ثبوت و بقا میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ باتیں زیادہ سے زیادہ مراتبِ ولایت پر اثر انداز ہوتی ہیں اور مراتبِ ولایت، امامت کی شرطوں میں داخل ہی نہیں، بلکہ امامت قائم ہو جائے تو فسق بھی اس کے زوال کا موجب نہیں ہوسکتا، اگلے پچھلے فقہاء و متکلمین کی تحریرات اس کی شاہد ہیں۔

قوت میں مماثلت کا مسئلہ

دوسرے اعتراض یعنی منافقوں کی قوت کے برابر قوت نہ ہونے پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بقدرِ استطاعت سامان فراہم کرنا بلاشبہ ضروری ہے، خواہ مخالفوں کے برابر قوت ہو یا نہ ہو۔ قرآن مجید میں اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ فرمایا گیا ہے، (یعنی

جتنی قوت تمہارے بس میں ہو فراہم کرو) یہ نہیں کہا گیا کہ اَعِدُّوْا لَھُمْ مَا اَعِدُّوْا لَکُمْ (یعنی جتنی قوت تمہارے مقابلے پر لائیں، اتنی ہی قوت تم بھی لاؤ) امام کے لئے ''وجودِ شوکت'' ضروری ہے، لیکن:

> اس کا مطلب یہ نہیں، امام کے جسم میں ایسی قوت پیدا ہو جائے کہ وہ ایک لمحے میں مخالفوں کی سلطنتیں درہم برہم کر ڈالے اور یکہ وتنہا ان کے جنود وعساکر کو بکھیر کر رکھ دے۔ مطلب یہ ہے کہ امام کے پاس ساتھیوں کی ایسی جماعتیں فراہم ہو جائیں جن کے بل پر وہ ظاہر عقل کے اعتبار سے مخالفوں کی روک تھام کر سکے۔ سلاطین میں صاحب شوکت وہ ہوتا ہے جسکے ہمراہ نوکروں کا کثیر گروہ ہو، افغانوں کی اصطلاح میں صاحبِ شوکت اسے سمجھا جاتا ہے، جسکی قوم اور برادری وسیع ہو۔ شریعت کے نزدیک اسی امام کو صاحب شوکت سمجھا جائے گا جسکے ہاتھ پر مسلمانوں کا کثیر گروہ بیعت امامت کر چکا ہو اور شریعت میں بیعت کا رشتہ ملازمت وقرابت کے رشتوں سے زیادہ قوی ہے۔

سید صاحب کی کیفیت

باقی رہا دشمنوں کی شوکت سے مماثلت کا معاملہ تو اس سے شرق وغرب کے تمام دشمنوں کی شوکت مراد نہیں ہو سکتی، اگلے پچھلے اماموں میں سے کسی کی بھی امامت بحال وبرقرار نہ رہے گی، صرف اتنا کافی ہے کہ بالفعل جن اعدا سے مقابلہ درپیش ہے، ان کے برابر شوکت حاصل ہو جائے:

> اتنی شوکت البتہ حاصل ہے جو پکھلی، ہزارہ اور چھچھ کے ناظموں کی شوکت کے برابر ہو، اگرچہ رنجیت سنگھ اور کمپنی کی شوکت کے برابر نہ ہو۔ (۱)
>
> اور کس شخص نے آپ لوگوں کو بتایا کہ امام ہماری اسی قلیل جمعیت سے

(۱) کمپنی سے مراد ایسٹ انڈیا کمپنی ہے، جس کے ہاتھ میں اس وقت ہندوستان کے بیشتر حصوں کی باگ ڈور تھی۔

لاہور اور کلکتہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ وہ تورات دن مسلمانوں کی جمعیت بڑھانے اور شوکت کو ترقی دینے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ انہیں امید ہے کہ آہستہ آہستہ اسلامی شوکت عروج پائے گی اور یہ بات وقوع سے بعید نہیں، بلکہ ملتوں کے انقلاب میں اللہ کی یہی سنت جاری ہے کہ معمولی لوگوں میں سے ایک بے سروسامان آدمی اٹھتا ہے، آہستہ آہستہ رفیقوں کی جماعت فراہم کرتا ہے، تدریجاً اپنی شوکت کو اس حد تک بڑھا لیتا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہوں اور ذی حشم خانوں کی مملکتیں توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ مثلاً نادر شاہ وغیرہ۔ کتنی بے انصافی ہے کہ جو شخص محض طلب دنیا کیلئے کمر باندھتا ہے اس کے متعلق تو فتح ونصرت کا گمان کیا جاتا ہے اور اسی گمان کی بناء پر اس کا ساتھ دیا جاتا ہے، لیکن جو مردِ حق محض للہ، فی اللہ اور ابتغاءً لوجہ اللہ دین کی حمایت کے لئے کھڑا ہوتا ہے اس کے لئے فتح ونصرت کو مستبعد سمجھا جاتا ہے۔

حصولِ شوکت کا طریقہ

پھر فرماتے ہیں کہ مان لیجئے قوت والوں کے خلاف جہاد کیلئے زبردست قوت لازم ہے اور سید صاحب کو فی الحال یہ قوت حاصل نہیں، لیکن اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

آیا کوئی امام ماں کے پیٹ سے بھی عساکر وجنود لے آیا ہے؟ آیا یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اقامتِ جہاد کی تیاری کرتا ہے تو فی الفور غیب سے اس کے لئے لاؤ لشکر اور اسبابِ حرب مہیا ہو جاتے ہیں؟ یہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ طریقہ یہی ہے کہ امام مقرر ہو، یہ کام تمام مسلمانوں کیلئے ذمے فرض ہے اور اس میں سستی یا اس سے پہلو تہی معصیت ہے۔ پھر امام وقت کے لئے قوت بہم پہنچانا مسلمانوں ہی کا فرض ہے، چاہئے کہ ہر مسلمان جماعت ہر سمت سے دوڑتی ہوئی اس کے پاس پہنچ جائے اور جس شخص کو جو سامان مل سکے اُسے لا کر امام کی خدمت میں پیش کردے۔ ''اعدّوا لھم ما استطعتم'' اور ''جاھدوا

باموالکم وانفسکم“ میں مخاطب عام مسلمان ہیں، نہ کہ محض امراء ورؤسا۔

نمازِ جمعہ کی مثال

معترضین کو چاہئے کہ بقدر استطاعت سامان لے کر امام کے پاس پہنچ جائیں، کسی کے لئے دوسرے کا انتظار جائز نہیں۔ مثال کے طور پر نمازِ جمعہ کو لیجئے جو سب پر واجب ہے، جماعت کے بغیر یہ نماز ادا نہیں ہوسکتی اور انعقادِ جماعت امام کے بغیر ممکن نہیں:

> لیکن اگر سب لوگ گھروں میں بیٹھے انتظار کرتے رہیں کہ جب امام آجائے گا، جماعت صورت پذیر ہوجائے گی، ہم بھی شامل ہوجائیں گے تو آیا اس حالت میں نمازِ جمعہ فوت نہ ہوجائے گی اور ہر شخص معصیت میں گرفتار نہ ہوگا؟ اس لئے کہ نہ ارواحِ مقدسہ میں سے امام اترے گا، نہ فرشتوں کا گروہ اقامتِ جمعہ کے لئے جماعت مہیا کرے گا۔ طریقہ یہی ہے کہ اگر کوئی فرد تنہا بھی ہے تو گھر سے نکل کر مسجد میں پہنچے، جماعت موجود ہو تو اس میں شریک ہوجائے، موجود نہ ہو تو مسجد میں بیٹھ کر دوسروں کا انتظار کرے۔ اگر وہ مسجد کو خالی پاکر گھر لوٹ جائے گا تو نہ جماعت بنے گی اور نہ جمعہ قائم ہوگا۔

یہی حالت جہاد میں تہیۂ قوت کی ہے۔ امام دعوت دے رہا ہے، مسلمانوں کا فرض ہے کہ بے تامل اس کے پاس پہنچیں اور جتنی قوت درکار ہے، پوری کردیں۔ یہ کون سی صورت ہے کہ مسلمان اپنے گھروں میں بیٹھے بیٹھے امام پر قلتِ قوت کا اعتراض کرتے رہیں، درآنحالیکہ قوت کی فراہمی خود ان کے ذمے ہے۔

مسلمان کیا تھے کیا ہوگئے

آخر میں شاہ صاحب کس دلسوزی سے لکھتے ہیں:

> سبحان اللہ! کیا اسلام کا حق یہی ہے کہ اس کے رکنِ اعظم کو جڑ سے اکھاڑا جارہا ہو اور جس شخص کے سینے میں ضعف وناتوانی کے باوجود اسلامی

حمیت نے جوش مارا، اُسے طعن و ملامت کا ہدف بنایا جائے؟ آیا یہ لوگ نصرانی یا یہودی یا مجوسی یا ہنود ہیں کہ ملتِ محمدیہ کے ساتھ دشمنی کر رہے ہیں؟ محمدیت کا مقتضا یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ہنسی مذاق میں بھی جہاد کا نام لیتا تھا، تو مسلمانوں کے دل پھول کی طرح کھل جاتے تھے اور سنبل کی طرح تر و تازہ ہو جاتے تھے۔ اگر دور دست مقامات سے بھی جہاد کا آوازہ غیرت مندانِ اسلام کے کانوں میں پہنچتا تھا تو وہ دیوانہ وار دشت و کہسار میں دوڑ پڑتے بلکہ شہباز کی طرح اڑنے لگ جاتے، آیا جہاد کے معاملے کو عظمتِ شان کے باوجود حیض و نفاس کے مسائل پڑھنے پڑھانے سے بھی کم تر سمجھ لیا گیا؟

بیعت کرنے کے بعد اس سے انحراف کرنے والوں کے مسئلے پر بحث کی ضرورت نہیں، اسلئے کہ یہ امر خود انحراف کرنے والوں کیلئے موجبِ گناہ ہوگا۔ امام کی امامت کو اس سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ کیا یہ معلوم نہیں کہ محض نوکروں کی بے وفائی یا صوبیداروں اور سپہ سالاروں کی غداری کی بناء پر کسی بادشاہ یا فرمانروا کی بادشاہی ختم نہیں ہو جاتی؟

خلاصۂ مطالب

جہاد کے متعلق ہم نے جو کچھ لکھا، اسکے مرکزی نکات پر پھر ایک مرتبہ نظر ڈال لیجئے:

۱۔ سید صاحب کے نزدیک اسلامی قوت کے زوال و اضمحلال کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں روحِ اسلام اور روحِ جہاد باقی نہیں رہی تھی، یہی روح دوبارہ پیدا کرنا سید صاحب کا اصل مقصد تھا۔

۲۔ ان کا نصب العین یہ تھا کہ کلمۃ اللہ سر بلند ہو، سید المرسلینؐ کی سنتیں تازہ ہو جائیں اور بلادِ اسلامی کو غیر مسلموں کے تصرف سے آزاد کرا لیا جائے۔ انہیں اغراض کے پیش نظر انہوں نے جہاد کے لئے دعوتِ عام دے کر مسلمانوں کی تنظیم شروع کی تھی۔

۳۔ وہ صرف سکھوں سے نہیں بلکہ انگریزوں سے بھی لڑنا چاہتے تھے، اس لئے کہ

بلادِ اسلامی کا بدر جہا بڑا حصہ انگریزوں کے قبضے میں تھا، نیز وہ انگریزوں کو زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔

۴۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ سارے ہندوستان میں شریعتِ حقہ کی حکومت قائم کریں پھر اس نظام کو اقطارِ عالم میں پھیلائیں۔

۵۔ وہ اس کام کو صرف رضائے باری تعالیٰ کے لئے پورا کرنا چاہتے تھے، دنیوی مال و دولت یا جاہ و منصب یا حکومت و ریاست کا وسوسہ بھی ان کے دل میں نہیں گذرا تھا۔

۶۔ مسلمانوں نے سید صاحب کی تحریکِ جہاد سے اختلاف کیلئے جو عذر تراشے وہ ان کی بے ہمتی یا مقاصدِ دین سے نا آشنائی یا احکامِ دین کی تحریف پر مبنی تھے، اس لئے سراسر بودے اور بے بنیاد تھے۔

اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ سید صاحب نے کن وجوہ سے سرحد کو مرکزِ جہاد بنایا اور اس طرح سکھوں کے ساتھ سب سے پہلے ٹکر ہوئی؟ اس معاملے پر آئندہ باب میں روشنی ڈالی جائے گی۔

پچیسواں باب:

سرحد کو کیوں مرکز بنایا؟

سید صاحب کا بیان

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ سید صاحب نے مرکزِ جہاد کے لئے صوبہ سرحد کو کیوں منتخب کیا؟ میرا خیال ہے کہ انہوں نے اپنے دوستوں اور رفیقوں سے طویل مشوروں کے بعد یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ ایک مرتبہ اہل سرحد کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم آپ کے ملک میں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے آئے اور یہ سمجھ کر یہاں اترے کہ اس ملک میں مسلمان آباد ہیں ان سب کے اتفاق سے دین کا کام درست کریں۔

میں نے ہندوستان میں خیال کیا کہ کوئی ایسی مامون جگہ ہو کہ وہاں مسلمانوں کو لے جاؤں اور تدبیر جہاد کروں۔ باوجود اس وسعت کے کہ صدہا کروہ میں ملک ہند واقع ہے، کوئی جگہ لائق ہجرت میرے خیال میں نہ آئی، کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اس ملک (یعنی ہندوستان) میں جہاد کر، جو کچھ مال، خزانہ، سلاح وغیرہ درکار ہوں ہم دیں گے، مجھ کو منظور نہ ہوا، اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے چاہئے، بلوا کرنا منظور نہیں۔

آپ کے اس ملک کے ولایتی بھائی (اہل سرحد) بھی وہاں حاضر تھے، انہوں نے کہا کہ ہمارا ملک اس کام کے لئے خوب ہے، اگر آپ وہاں چل کر کسی جگہ مقام پکڑیں تو لاکھوں مسلمانوں دل و جان سے آپ کے شریک ہوں گے، خصوصاً اس سبب سے کہ رنجیت سنگھ والی لاہور نے وہاں کے مسلمانوں کو تنگ کر رکھا ہے، طرح طرح کی اذیتیں پہنچاتا ہے۔ میں نے کہا سچ ہے بہتر یہ

ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کر کے وہیں چل کر ٹھہریں اور سب مسلمانوں کے اتفاق سے جہاد کریں۔

ہندوستان کی حالت

اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب اولاً اس وجہ سے سرحد کی طرف متوجہ ہوئے کہ ہندوستان میں انہیں کوئی آزاد مامون مقام نظر نہ آیا، جسے مرکز بنائیں۔ اگرچہ ان کے ہندوستانی دوست چاہتے تھے کہ اسی ملک میں کسی جگہ بیٹھ کر جہاد شروع کیا جائے اور وہ ہر قسم کی امداد دینے کے لئے تیار تھے۔ ثانیاً اس وجہ سے سرحد کو پسند فرمایا کہ وہاں مسلمانوں کی بھاری جمعیت موجود تھی، اور وہ لوگ رزم و پیکار میں اونچی شہرت کے مالک تھے، نیز سکھوں کے حملوں کے باعث وہ تنگ تھے، اس لئے جلد سے جلد جہاد میں شمولیت پر آمادہ ہو سکتے تھے اور خود ان کو مدد دے کر اغیار کے حملوں سے محفوظ کر دینا بہت ضروری تھا۔

اس وقت کے ہندوستان کا نقشہ سامنے رکھا جائے تو سید صاحب کے بیان کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ ہندوستان یا تو براہِ راست انگریزوں کے ماتحت تھا یا ان ریاستوں پر مشتمل تھا جو سید صاحب کے ایامِ طفلی ہی میں اپنی آزادی کھو کر انگریزوں کی دستِ نگر بن چکی تھیں، ان علاقوں میں سے کسی ایک کو مرکز بناتے تو اسلامی جہاد نہ رہتا، بلکہ بلوا بن جاتا، نیز بیسیوں الجھنیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ مثلاً انگریز اپنی عیاری سے مختلف طبقات میں تفرقہ پیدا کر کے سید صاحب کی تحریک کو ختم کرا سکتے تھے، اردگرد کی قوتوں کو ابھار کر خلاف کھڑا کر دیتے تو سید صاحب کا مرکزِ جہاد ہندوستان کے سمندر میں ایک بے حقیقت جزیرہ بن کر رہ جاتا، جسے باہر سے کوئی کمک نہ پہنچ سکتی۔

جن حکومتوں کو ایک حد تک آزاد سمجھا جاتا تھا، ان میں بھی انگریز اپنے دخل کا دروازہ کھول چکے تھے، مثلاً امیرانِ سندھ کی حکومت اور ان میں سے کوئی شخص صاحب ہمت نہ تھا، کہ بے باکانہ سید صاحب کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ

اس وقت تک سید صاحب کے پاس اتنی قوت فراہم نہ ہوئی تھی کہ براہِ راست انگریزی قوت سے ٹکر لے سکتے، اس غرض کے لئے وسیع ترتیبات ضروری تھیں اور ان کے لئے وقت درکار تھا۔

سرحد کی کیفیت

صرف سرحد ہی ایک ایسا علاقہ تھا جسے سید صاحب تحریکِ جہاد کے ابتدائی دور میں بہترین امیدوں کے ساتھ مرکز بنا سکتے تھے، اس لئے کہ:

۱۔ سرحد کی پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی، ہندوستانیوں کا عام تصور یہ تھا کہ اہل سرحد بڑے جنگجو اور جانباز ہوتے ہیں، وہ لوگ خلوص کے ساتھ حمایت پر آمادہ ہو جاتے اور سید صاحب کے بتائے ہوئے اصول کے مطابق جہاد کرتے تو نہ محض ان کا ملک اغیار کی دستبرد سے محفوظ ہو جاتا، بلکہ پنجاب کو بھی آزاد کرایا جا سکتا تھا اور ہندوستان کی آزادی کے لئے نہایت مؤثر تدابیر اختیار کی جا سکتی تھیں۔

۲۔ وہ لوگ سکھوں کے ظلم و جور اور ہجوم و یورش کا ہدف بنے ہوئے تھے، ان کے جذبات مجروح تھے اور ایسے لوگوں کو بہ آسانی دفاع و ہجوم کے لئے منظم کیا جا سکتا تھا۔

۳۔ ان کی آزادی چھنی نہ تھی، چھن رہی تھی، لہٰذا انہیں غیروں کی دستبرد سے بچانا، ان لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ضروری تھا، جن کی آزادی بہت پہلے چھن چکی تھی۔

۴۔ سرحد کے شمال اور مغرب میں دور دور تک اسلامی آبادیاں تھیں، ان سے پوری امداد کی امید ہو سکتی تھی یا کم از کم مخالفت کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

۵۔ سرحد کے مرکز کی جغرافیائی حیثیت ایسی تھی کہ دشمن صرف اسی حصے میں حملہ کر سکتا تھا، جسے سید صاحب نے محاذِ جنگ بنایا تھا، اطراف و جوانب یا عقب سے حملے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔

۶۔ سید صاحب پنجاب میں پیش قدمی کرتے تو وہاں کے مسلمانوں کی اکثریت کے علاوہ مظلوم ہندو آبادی بھی خیر مقدم کرتی، نیز دائیں جانب سے بہاول پور، سندھ اور بلوچستان کی حکومتیں معاون بن سکتی تھیں۔

یہ تمام حقائق ہر شخص پر بہ ادنیٰ تامل واضح ہو سکتے ہیں، اگرچہ افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ سید صاحب کی توقعات پوری نہ ہوئیں، اہل سرحد کی نبرد آزمائی اور جنگجوئی کی شہرت بھی محض سراب ثابت ہوئی، ان کی اسلامی حمیت بھی چنداں پائدار نہ نکلی اور سید صاحب کی عزیمت، جو اسلامیانِ ہند کی دوازدہ صد سالہ تاریخ میں بہترین متاع کی حیثیت رکھتی تھی، اہل سرحد کے قبائلی اوضاع واطوار کی نذر ہو گئی۔ لیکن ظاہر عقل کی بناء پر سید صاحب کا فیصلہ ہر اعتبار سے محکم اور صائب و پختہ تھا، جو کچھ بعد میں پیش آیا، اس کا علم قبل از وقت علام الغیوب کے سوا کسی کو نہ ہو سکتا تھا۔

مولوی محمد جعفر تھانیسری کا بیان

مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے:

> براہ دور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الٰہ آباد کے، نواب لفٹنٹ گورنر جنرل بہادر اضلاع شمالی و غربی کو بھی اسی تیاری جہاد سکھوں کی اطلاع دی گئی تھی، جس کے جواب میں صاحب ممدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو، ہم ایسی تیاری کرنے کے مانع نہیں ہیں۔(۱)

جو کچھ اوپر بیان ہو چکا ہے اُسے پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی اطلاع کے لئے کونسی گنجائش تھی؟ یہ افسانہ بھی اسی غرض سے تیار کیا گیا جس غرض سے سید صاحب کے مکاتیب میں تحریفات کی جسارت کی گئی۔ لطف کی بات یہ ہے کہ سید صاحب کا وطن رائے

(۱) تواریخ عجیبہ ص: ۷۰

بریلی اس وقت انگریزی سلطنت میں شامل نہ تھا بلکہ سلطنتِ اودھ میں شامل تھا۔

جدید نظریہ

ہمارے زمانے میں ایک نیا نظریہ پیدا ہوا اور وہ یہ کہ انگریزوں نے حسنِ تدبیر سے کام لے کر سید صاحب کے جہاد کا رُخ سکھوں کی طرف پھیر دیا تھا، یہ رائے اسی صورت میں درست مانی جاسکتی ہے کہ سید صاحب پہلے ہندوستان میں بیٹھ کر عازمِ جہاد ہوتے، حالانکہ ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں بیٹھ کر شرعی جہاد کے آغاز کی کوئی صورت نہ تھی، اور انہوں نے خود تمام پہلوؤں پر طویل وعمیق غور وفکر کے بعد مرکز کیلئے علاقہ سرحد تجویز کیا تھا۔ اس سلسلے میں سکھوں سے ٹکرنا گزیر ہوگئی، یہاں انگریزوں کے حسنِ تدبر یا حسنِ تدبیر کا موقع کہاں سے نکل آیا؟

حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب کے مقاصد وعزائم ہی نہیں بلکہ احوال وظروف سے بھی ناواقفی کے باعث لوگ نئی نئی قیاس آرائیاں کرتے رہے، اگرچہ سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ سید صاحب کے احوال سے آگاہی حاصل کی جاتی۔

چھبیسواں باب:

سفرِ ہجرت (۱)

از رائے بریلی تا اجمیر

غافل مرو کہ تا دربیت الحرام عشق صد منزل است و منزلِ اول قیامت است

مالوفات کی قربانی

ایک برس اور دس مہینے دعوت و تہیہ جہاد میں بسر ہوئے۔ ۷ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (مطابق ۱۷ر جنوری ۱۸۲۶ء) کو دوشنبہ کے دن سید صاحب نے راہِ ہجرت میں قدم رکھا اور اس سرزمین سے ہمیشہ کے لئے مفارقت اختیار فرمائی جس کے محبت پرور ماحول میں زندگی کی چالیس بہاریں گزاری تھیں، اور جس کے چپے چپے کے ساتھ قلبی وابستگی کے بیسیوں رشتے قائم تھے، یہ فریضہ جہاد کی بجا آوری کا پہلا مرحلہ تھا۔

انسان کا دل مالوفات کی زنجیرں میں جکڑا ہوا ہے، ماں باپ کی محبت، بال بچوں کی محبت، گھر بار اور مال و دولت کی محبت، احباب و اقربا کی محبت، ان میں سے کون سا رشتہ ہے جسے بے تکلف بہ طیبِ خاطر توڑا جا سکتا ہے؟ لیکن ایک رشتہ اور بھی ہے جو اِن سب پر فائق و برتر اور مومنِ صادق کیلئے سب سے بڑھ کر جاذب و گہرا ہے۔ وہ ہے مرضاتِ الٰہی کا رشتہ، جس کی خاطر تمام دوسرے رشتہ ہائے محبت کو ایک لمحے کا توقف کئے بغیر توڑ دینا چاہئے۔ سرفروشانِ حق اس دشوار امتحان گاہ سے ہمیشہ کامگار و فائز المرام گذرے ہیں، ان کا دامنِ عبودیت راستے کے کانٹوں میں کبھی نہ اُلجھا، ان کے قلبِ صافی کے

آئینے پر علائقِ دنیا کی کوئی گرد کبھی نہ جمنے پائی۔

سید صاحب کی حالت

سید صاحب سراپا محبت تھے، ایک سلیم الفطرت انسان کی طرح ان کے دل میں بھی وطن اور اقربا کے لئے بڑی سے بڑی تڑپ موجود تھی، اگر چہ ان کا گھرانا دنیوی مال و جاہ کا کبھی طلب گار نہ ہوا، اور اس متاعِ کاسد کے لئے اس کے ہاتھ کبھی کسی کے سامنے نہ پھیلے، تاہم دینی و روحانی دولت مندی نے اس گھرانے کے لئے رفعتِ ذکر اور پذیرائیٔ عامہ کے ایسے دروازے کھول دیے تھے، جو علم و فضل اور امر و حکم کی اونچی مسندوں پر بیٹھنے والوں کے لئے بھی باعث رشک تھے۔ خصوصاً سید صاحب کے لئے ارادت کا تو یہ عالم تھا کہ اکابر عز و عظمت اپنی ہر متاعِ عزیز اخلاص مندی سے دامن میں ڈالے ہوئے اس بات کے منتظر رہتے تھے کہ یہ بزرگ ہستی التفات و قبول سے اسے مشرف فرمائے۔

سید صاحب گھر بیٹھے راحت و فراغت کی ایسی زندگی بسر فرما سکتے تھے، جو اکثر حکمرانوں کو بھی نصیب نہ تھی۔ پھر کیوں انہوں نے یہ سب کچھ ٹھکرا دیا اور کس وجہ سے اپنے لئے حد درجہ تکلیفوں، مشقتوں اور پریشانیوں کا راستہ پسند فرمایا؟ یہ سلطان فرض کا حکم تھا، یہ خدائے پاک کی خوشنودی کا عشق تھا، جس کی خاطر کنارہ کش ہوئے، گویا ان سے کبھی جان پہچان ہی نہ تھی:

آں کس کہ ترا بخواست جاں را چہ کند　　فرزند و عیال و خان و ماں را چہ کند
دیوانہ کنی، ہر دو جہاں می بخشی　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآءُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ.

(اے پیغمبر) کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت، جس کے مندا پڑ جانے سے ڈرتے ہو، تمہارے رہنے کے مکان جو تمہیں پسند ہیں، غرض یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیاری ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے، وہ تمہارے سامنے لے آئے۔

سید صاحب عزم وہمت کا پیکر تھے، وہ اپنی زندگی رضائے باری تعالیٰ کیلئے وقف کر چکے تھے، انہوں نے وہی راہ اختیار کی جو خدائے پاک کی رضا کے مطابق تھی، اگر اس میں مالوفات کا خون کئے بغیر قدم نہیں رکھا جا سکتا تھا تو سید صاحب خون کے اس دریا میں سے یوں گذر گئے گویا یہ فصل بہار کا طوفانِ رنگ تھا۔

زادِ راہ

راوی کہتے ہیں کہ روانگی سے پیشتر خادمہ کی معرفت تہ خانے میں سے رقم نکلوائی گئی تو دس ہزار روپے نکلے۔ سید صاحب نے ان میں سے پانچ ہزار بیبیوں کے حوالے کر دیے اور پانچ ہزار اپنے لئے رکھے۔ چھوٹی چھوٹی رقمیں تھیلیوں میں سلوائیں اور یہ تھیلیاں مختلف غازیوں کی کمروں میں باندھ دیں۔ جن غازیوں کو ساتھ لیا، ان کی تعداد پانسو اور چھ سو کے درمیان تھی۔ دیکھی شانِ عزیمت کہ پانچ ہزار روپے اور پانچ ساڑھے پانسو غازی لے کر اس ارادے سے گھر بار چھوڑ کر ہندوستان کی تطہیر کو پایۂ تکمیل پر پہنچایا جائے؟ اربابِ دانش وتدبیر کی نگاہوں میں یہ سروسامان کیا وقعت حاصل کر سکتا ہے؟ لیکن قوتِ عزم وایمان کے کرشمے دیکھئے کہ سرحد پہنچ کر کام شروع کیا تو ساڑھے چار برس تک پنجاب کی طاقتور حکومت کو معرضِ اضطراب میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ وہ ایک موقع پر پورا سرحدی علاقہ دے کر صلح کر لینے کے لئے تیار ہوگئی تھی۔ اگر اپنوں کی غرض

پرستیاں رخنہ انداز نہ ہو جاتیں تو معاملہ اسی زمانے میں تکمیل کی آخری منزل پر پہنچ جاتا، سازو برگ کی فرومائیگی اربابِ عزیمت کی عناں گیر کبھی نہ ہوئی، انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ ساتھی کتنے ہیں، اور سامان کی مقدار کا درجہ کیا ہے، وہ ہمیشہ فرض کی پکار سن کر میدانِ عمل میں پہنچ جاتے ہیں، پھر جو کچھ پیش آتا ہے اسے صبر و شکر سے قبول کر لیتے ہیں۔

نہ برگ وساز کی پروا، نہ انتظارِ رفیق　　یہی رہا ہے، ازل سے قلندروں کا طریق
اگر خدا پہ بھروسا ہے، ہو یگانہ رواں　　خدا سے بڑھ کر نہیں برگ وساز کی توفیق

اہل وعیال

سید صاحبؒ نے ہجرت کی تھی، اس لئے اہل وعیال کو بھی وطن سے نکال لینے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن انہیں اس وجہ سے ساتھ نہ لیا کہ راستے کے احوال ومشکلات کا کوئ انداز نہ تھا، نہ یہ معلوم تھا کہ جس مقام پر پہنچنا ہے، اس کی کیفیت کیا ہے۔ یہ طے ہو چکا تھا کہ کوئی موزوں امن دستیاب ہوتے ہی اہل وعیال کو بلا لیں گے۔ اس وقت غالباً خیال نہ ہوگا کہ دونوں بیبیوں اور بچوں سے یہ آخری ملاقات ہے، قضاوقدر کا حکم یہی تھ کہ ۷/ جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ کو بچھڑنے کے بعد پھر اس دنیا میں یکجائی نصیب نہ ہو۔ ی سب کچھ ایک سرگزشت کی حیثیت میں پڑھ لینا شاید چنداں شاق نہ گذرے، لیکن انداز کر لینا چاہئے کہ اس مردِ حق کے حساس قلب کی کیا حالت ہوگی جو سراپا محبت تھا، مگر ایک ایک محبوب رشتے کو خدا کی راہ میں بے تکلف توڑ توڑ کر پھینک رہا تھا۔

یہاں یہ بھی بتا دینا چاہئے کہ سید صاحب پانچ ہزار روپے اس غرض سے ازواج ک دے گئے تھے کہ ان کے گزارے کا اور کوئی ذریعہ نہ تھا اور انہیں بھی وطن چھوڑ کر غربت میں زندگی کے دن بسر کرنے تھے۔ سید صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد نیا مندوں نے ازواج کی خدمت میں بطورِ خود بھی رقمیں پیش کی ہوں گی، جب ازوا

سندھ پہنچ گئیں اور انہیں لشکرِ اسلام کی عسرت کا علم ہوا تو بڑی بی بی صاحبہ نے دس ہزار روپے کی رقم ہنڈیوں کی شکل میں عیسیٰ خیل اور کالا باغ کے راستے حاجی بہادر شاہ خاں کے ہاتھ سید صاحب کے پاس بھیج دی، گویا پورا خاندان ایثار و قربانی میں سید صاحب کے نقشِ قدم پر چلتا رہا۔

جذبۂ ایثار و خدمت

ہجرت کی خبر روانگی سے بہت پہلے مشہور ہو چکی تھی، ہندوستان میں یہ اقدام اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل یگانہ تھا۔ ممکن ہے پہلے مختلف لوگوں نے وطن کی سکونت ترک کر کے اجنبی سرزمین میں سکونت اختیار کی ہو، لیکن جہاد کی نیت سے ہجرت کا عزم کسی نے نہ کیا تھا، اس لئے جہاں جہاں یہ اطلاع پہنچتی رہی، لوگ جوق جوق زیارت کے لئے تکیہ شریفہ میں آنے لگے۔ وہ سب، کچھ نہ کچھ بطور ہدیہ لاتے ہوں گے، لیکن ہمیں اس بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں۔ شیخ فرزند علی رئیس غازی پور، سید صاحب کے قدیمی نیاز مند تھے، وہ آئے تو دو خوبصورت گھوڑے، وردی کے بہت سے کپڑے اور چالیس جلد خوبصورت قلمی قرآن لے کر آئے، ساتھ اپنے فرزند عزیز شیخ امجد علی کو لائے، جو سید صاحب کے ساتھ گئے، جنگ اوتمان زئی میں ''زندہ شہید'' کا خطاب پایا، بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ شرف یابِ شہادت ہوئے۔

شیخ غلام علی رئیس الٰہ آباد کی شانِ عقیدت کے بعض واقعات سفرِ حج کے سلسلے میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ ہجرت کے موقع پر وہ آئے تو قسم قسم کے اسلحہ، خیمے، گھوڑے، کپڑوں کے تھان، کتابیں، قلمی قرآن مجید، برتن سید صاحب کیلئے پوشاکیں اور نقد روپیہ لائے، ایک خیمہ مسجد کی شکل کا خاص سید صاحب کیلئے تیار کرایا تھا، اُسے مع فرش نذر کیا۔ جب سنا کہ سید صاحب راجپوتانہ اور سندھ کے راستے سرحد جائیں گے اور اس راستے کے

کنوؤں میں پانی بہت گہرا ہوتا ہے تو شیخ صاحب نے بیسیوں چھوٹے چھوٹے ڈولچے بنوائے، ان کیلئے لمبی رسیوں کا انتظام کیا اور یہ سب چیزیں غازیوں میں تقسیم فرمادیں۔

تاریخ ہجرت

جہاد کی غرض سے سید صاحب کی روانگی کی دو تاریخیں حکیم مومن خاں نے کہی تھیں:

جو سید احمد امامِ زماں واہلِ زماں ۔۔۔ کرے ملاحدِ بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحہ عالم پہ لکھے سالِ دغا ۔۔۔ ''خروجِ مہدی کفار سوز'' کلکِ تفنگ

۱۲۴۲ھ

گلاب ناب سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ ۔۔۔ کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیمِ کوثر ہے
وہ کون امامِ جہان و جہانیاں احمد ۔۔۔ کہ محض مقتدئ سنتِ پیمبر ہے
زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعوائے نوری ۔۔۔ کہ اس کا رایتِ اقبال سایہ گستر ہے
زبسکہ کام نہیں اسے سوائے جہاد ۔۔۔ جو کوئی اس سے مقابل ہے سو وہ کافر ہے
وہ بادشاہِ ملائک شاہِ کوکبِ دیں ۔۔۔ کہ نورِ شمس وقمر جس کی گردِ لشکر ہے
وہ شعلہ خصلت وحُسّاد سوز وکفر گداز ۔۔۔ کہ جس کا نقش قدم مہرِ روزِ محشر ہے
وہ برقِ خرمن اربابِ شرک واہل ضلال ۔۔۔ کہ شعلہ خوشئہ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ قہر مان فلک توسن ونجوم حشم ۔۔۔ کہ تُرک چرخ غلام اسکا مہر چاکر ہے
وہ شاہ مملکتِ ایماں کہ جسکا سالِ خروج ۔۔۔ ''امام برحق مہدی نشاں، علی فر'' ہے

ایک اور شاعر نے بھی روانگی کی تاریخ کہی تھی، اس کے شعر اچھے نہ سہی، لیکن یادگار کے طور پر اس کے شعر بھی محفوظ رہنے چاہئیں:

بہ عزمِ جہاد آں شہِ ملک و دیں ۔۔۔ کہ شد احمدِ عصر نامش غریب
چو بر بست رختِ سفر شد سوار ۔۔۔ گرفت از پس وپیش فوجِ حبیب

بہ بحر تفکر شدم غوطہ زن درسالِ آں تاکہ گردد نصیب
بریدہ سرِ کفر و پائے عدو بہ آہنگ راحت فزائے عجیب
سرو شئے ندارد از بامِ چرخ
کہ نصر من اللہ فتحٌ قریب

"نصرٌ من اللہ فتحٌ قریب" کے اعداد میں سے کفر کا سر "یعنی کاف" اور عدو کے پاؤں یعنی "واؤ" کے اعداد منہا کر دیے جائیں تو صحیح تاریخ نکل آئے گی۔

روانگی

سید صاحب نے ۷/ جمادی الثانی کو خیمہ سئی ندی کے کنارے لگوایا، دن بھر دوستوں اور عزیزوں سے ملاقاتیں ہوتی رہیں، رات کے وقت کشتی میں بیٹھ کر ندی کو عبور کیا اور دوسرے کنارے پہنچ کر شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ شکرانے کا اس سے بڑا موقع کیا ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا وخوشنودی کے راستے میں قدم رکھنے کی توفیق عطا فرمائی اور مالوفات کی کوئی شئے اس عزم کے سلسلے میں دامن گیر نہ ہوسکی۔ قرابت داروں میں سے عورتیں اور مردرات بھر ندی کو عبور کر کے ملاقات کے لئے پہنچتے رہے، مفارقت سب پر شاق گذر رہی تھی، لیکن سید صاحب سکون واطمینان کے ساتھ سب سے باتیں کرتے رہے، اگر چہ جانتے تھے کہ اس دنیا میں دوبارہ ملنے کی صورتیں صرف دو ہیں: اول یہ کہ تمام قرابت دار خود سید صاحب کی طرح ہجرت کی راہ اختیار کریں، دوم یہ کہ سرحد سے رائے بریلی تک ہندوستان اغیار سے پاک ہو جائے۔

جو مجاہدین ساتھ جا رہے تھے، انہیں سرسری طور پر چار جماعتوں میں بانٹ لیا تھا، پہلی جماعت خود سید صاحب کے ساتھ روانہ ہوئی۔ چار روز بعد دوسری جماعت نے اللہ بخش خاں مورانوی کے زیر قیادت سفر اختیار کیا۔ پھر تیسری جماعت کچھ وقفے کے بعد نکلی

اور آخر میں چوتھی جماعت، اس طرح تھوڑے تھوڑے وقفے سے مجاہدین روانہ ہوئے۔

۸- جمادی الثانی کو دلموؤ میں قیام فرمایا اور ۹- کو فتح پور میں اترے۔ شیخ غلام علی اور شیخ فرزند علی تکیے سے رخصت ہو کر چلے گئے تھے، لیکن شوق کی بیتابی چین نہیں لینے دیتی تھی۔ دوبارہ زیارت کیلئے فتح پور پہنچ گئے اور شیخ غلام علی نے پورے قافلے کی مہمانداری کا انتظام اپنے ذمے لے لیا۔

فتح پور سے چلے تو بہوا میں منزل کی، چلہ تارا کے گھاٹ سے جمنا کو عبور کیا پھر دوسر منڈا میں تین روز ٹھہرے، بعد ازاں جلال پور اور جالون ہوتے ہوئے گوالیار پہنچ گئے۔ (۱)

غالباً جالون میں یہ خبر پہنچی تھی کہ سید صاحب کے بھانجے سید حمید الدین کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے جس کا نام محمد سعید رکھا گیا اور سید حمید الدین سید صاحب کے ساتھ تھے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مردانِ راہِ حق رضائے باری تعالیٰ کے عشق میں کس اونچے مقام پر پہنچ گئے تھے، اور انہوں نے دنیوی علائق کے عزیز ترین رشتوں کو بھی بے تکلف اس عشق کی تابعیت میں دے دیا تھا۔

گوالیار

گوالیار میں سید صاحب کے کئی عقیدت مند موجود تھے، ان میں سے غلام حیدر خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جو پہلے نواب امیر خاں کے ساتھ تھے، اور اسی زمانے میں سید صاحب کے گہرے دوست بن گئے تھے۔ جب نواب کا کارخانہ درہم برہم ہو گیا تو غلام حیدر خاں مہاراجا سندھیا کے لشکر میں اونچے عہدے پر مامور ہو گئے۔ ان کے نام سید صاحب کا ایک مکتوب بھی مجموعۂ مکاتیب میں موجود ہے۔ راجا ہندو راؤ بھی سید صاحب کا بہت معتقد تھا، یہ دولت راؤ سندھیا کی مہارانی کا بھائی تھا، اس زمانے میں

(۱) اس سفر میں کالپی سے قریب ایک مقام ''آٹا'' میں بھی ٹھہرنے کا ذکر بعض روایات میں آیا ہے۔

ریاست کا سارا انتظام ہندو راؤ ہی سے متعلق تھا، دولت راؤ بیمار تھا۔(۱)

گوالیار میں سید صاحب کو فتح علی خاں کے باغ میں ٹھہرایا گیا، مہاراجہ کی طرف سے مہمانداری کا پورا انتظام تھا۔ کئی مرتبہ ہندو راؤ نے دعوتیں کیں، ایک دعوت کی تفصیل راویوں نے یوں بیان کی ہے کہ مرہٹی کھانا پکوایا، شیر مال، پراٹھے، پلاؤ، متنجن، قلیہ، فیرینی، یاقوتی، کباب، پسندے، مرغ بریاں وغیرہ بھی تیار کرائے۔ سید صاحب اور بعض بلند پایہ ساتھیوں کے ہاتھ ہندو راؤ نے خود دھلوائے، کھانے کے بعد جو پان پیش کئے وہ سب ورقِ طلا میں ملفوف تھے، بہت سے تحائف خوانوں میں لگا کر نذر کیلئے لائے گئے، ان میں موتیوں کا ایک بیش بہا ہار اور دو چغے بھی تھے، جن پر زری کا نہایت عمدہ کام تھا۔

مہاراجا سے ملاقات

دولت راؤ بیماری کے باعث خود حاضر خدمت نہیں ہوسکتا تھا، اس وجہ سے سید صاحب کو محل میں بلایا۔ جو غازی آپ کے ساتھ گئے، انہیں محل کے ایک بڑے کمرے میں بٹھایا گیا، پھر ہندو راؤ سید صاحب کا دستِ مبارک اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے آپ کو مہاراجا کے کمرے میں لے گیا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں، جن کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ راوی صرف اتنا بتاتے ہیں کہ مہاراجا نے عرض کیا: حضرت! سنا ہے آپ کی توجہ میں بڑی تاثیر ہے، لطفاً مجھے بھی اس سے سرفراز فرمایئے۔ سید صاحب نے بے توقف فرمایا کہ توجہ تقرب الی اللہ کی بناء پر مؤثر ہوتی ہے، کفر اور تقرب یکجا نہیں ہوسکتے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک قوت بخش غذا ہے، اگر تندرست اور صحیح البدن آدمی کھائے گا تو اس

(۱) دولت راؤ سندھیا ریاست کا مالک تھا، وہ بعارضۂ استقاء ۲۷/جون ۱۸۲۷ء کو فوت ہوا۔ اس کی بیوی مہارانی بیجا بائی سرجے راؤ گھاٹکے کی بیٹی تھی، اور اپنے زمانے کی مشہور مہارانی تھی۔ ہندو راؤ بیجا بائی کا بھائی تھا، جس کے نام سے دہلی میں ہندو راؤ کا باڑہ مشہور ہے۔ رانی کی ذاتی جائداد تین کروڑ کی بیان کی جاتی ہے، اس کے بچہ کوئی نہ تھا، اور دستور کے مطابق اس نے جنکو جی سندھیا کو متبنیٰ بنالیا تھا۔ ۱۸۶۲ء میں رانی فوت ہوئی۔

کی قوت بڑھے گی، لیکن اگر وہ ایک بیمار اور ضعیف الہضم آدمی کو دی جائے گی تو اسے سازگار نہ ہوگی۔

مہارانی پردے کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھی، اس نے عرض کیا کہ آپ ایک سال گوالیار میں قیام فرمائیں، تمام ساتھیوں کی مہمانداری ہمارے ذمے ہوگی۔ سید صاحب نے فرمایا: یہ ہو نہیں سکتا۔ پھر مہارانی نے کہا کہ اچھا اتنی مدت کے لئے ٹھہر جایئے کہ آپ کے لشکر کے لئے پورا سامان فراہم کیا جا سکے۔ سید صاحب یہ بات بھی نہیں مان سکتے تھے، اس اثناء میں نمازِ عصر کا وقت آ گیا، شیخ باقر علی نے اذان کہی، ہندو راؤ کے حکم سے فوراً سقے آ گئے، جنہوں نے سب غازیوں کو وضو کرایا، سید صاحب نے نماز پڑھائی، پھر مہاراجا سے رخصت ہو کر چلے آئے۔

افغانستان کے شاہی خاندان کا ایک شہزادہ گوالیار میں ٹھہرا ہوا تھا، سید صاحب نے اس کیلئے مہاراجا سے پرزور سفارش کی۔ شہزادے نے درخواست کی کہ میری لڑکی کو نکاح میں لے لیجئے سید صاحب نے فرمایا مجھے نکاح کی ضرورت نہیں، البتہ میرے بھانجوں یا بھتیجے میں سے کسی کے ساتھ نکاح منظور ہو تو قبول کرتا ہوں۔ شہزادے نے یہ بھی قبول کر لیا، جب ٹونک سے سید صاحب نے اپنے بھانجے سید عبدالرحمٰن کو اس غرض سے رائے بریلی بھیجا تھا کہ اہل وعیال کو ساتھ لے آئے تو ایک خط اس شہزادے کے نام بھی لکھ دیا تھا، یہ خط راستے میں بھیگ کر خراب ہو گیا اور سید عبدالرحمٰن شہزادے سے ملے بغیر پہلے ٹونک پھر سندھ چلے گئے۔

غازیوں کی جماعتیں

غازیوں کی سرسری جماعت بندی روانگی سے پیشتر رائے بریلی میں کر لی گئی تھی، گوالیار پہنچ کر انہیں باقاعدہ پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا۔ قیام وسفر میں ہر جماعت کو اس

تقسیم کے مطابق عمل پیرا ہونے کا حکم ہو گیا، پانچوں جماعتوں کے الگ الگ سر عسکر مقرر فرما دیے، تقسیم یوں ہوئی:

۱۔ جماعتِ خاص: یہ جماعت قیام و سفر میں قلب لشکر سمجھی جاتی تھی اس کے سر عسکر مولوی محمد یوسف پھلتی قرار پائے، جو سید صاحب کے ساتھ شیفتگی میں سب پر فائق اور تمام امور کے مہتمم خاص تھے۔ خود سید صاحب بھی اسی جماعت کے ساتھ چلتے اور ٹھہرتے تھے۔

۲۔ مقدمۃ الجیش: یہ جماعت سب سے آگے رہتی تھی، اس کے سر عسکر شاہ اسماعیل مقرر ہوئے۔

۳۔ میسرہ: اس جماعت کے اصل سر عسکر سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب تھے، چونکہ انہیں بعض ضروری کاموں کے سرانجام کیلئے ٹونک میں چھوڑ دیا تھا، اس لئے شیخ بڈھن ان کی جگہ نیابۃً سر عسکر بن گئے۔

۴۔ میمنہ: اس جماعت کے سر عسکر امجد خاں رئیس کتنہ تھے۔

۵۔ ساقۃ الجیش: یہ جماعت چھکڑوں اور گاڑیوں کے ہمراہ چلتی تھی، سب سے پہلے روانہ ہو کر عموماً سب کے بعد منزل پر پہنچتی تھی، اسکے سر عسکر اللہ بخش خاں مورانوی تھے۔

سید صاحب نے یہ بھی ارشاد فرمادیا تھا کہ بار برداری کا انتظام شاہ اسماعیل اور سید محمد یعقوب باری باری کرتے رہیں، بعد میں جماعتوں کی تعداد بڑھ گئی۔ جو متفرق اصحاب شامل ہوتے تھے، انہیں امجد خاں کی جماعت میں رکھا جاتا تھا۔ جماعتوں کے چھوٹے چھوٹے دستوں کو بہیلے کہا جاتا تھا۔

گوالیار سے ٹونک تک

سید صاحب نے جمعہ کی دو نمازیں گوالیار میں ادا کیں، یعنی کم از کم دس بارہ دن

ضرور ٹھہرے۔ سندھیا نے جو نذر پیش کی، اس کی پوری کیفیت معلوم نہیں، روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ تین گٹھے کپڑوں کے تھے، جنہیں دو دو آدمی اُٹھاتے تھے، اور تین خریطے نقدی کے تھے۔ وہاں سے روانہ ہوئے تو ایک ہفتے میں قرولی پہنچے، قیام کا ارادہ نہ تھا، لیکن کسمنڈی کے رئیس جلال الدین وہاں مقیم تھے، انہوں نے بہ اصرار ایک رات کے لئے روک لیا اور پورے لشکر کو کھانا کھلایا۔ پھر خوش حال گڑھ، دانتوبی، ٹھاڑی جھلائی ہوتے ہوئے چھ روز میں ٹونک پہنچ گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ رائے بریلی سے ٹونک تک پورے سفر میں تقریباً ایک مہینہ صرف ہوا، اس لحاظ سے سید صاحب رجب کے آس پاس ٹونک پہنچے ہوں گے۔

ننڈاڑی میں ایک فقیر نہایت نامناسب انداز میں لوگوں سے سوال کر رہا تھا، سید صاحب نے اسے بٹھا کر ایسے پُر تاثیر انداز میں نصیحت فرمائی کہ اس نے فوراً بیعت کر لی اور مجاہدین میں شامل ہو گیا۔ پہلا نام معلوم نہیں، سید صاحب نے اس کا نام عبداللہ رکھا، اور محمد سعید خاں جہان آبادی کے بہلیے میں داخل کر دیا۔ سرحد ہی میں اس نے شہادت پائی۔

قیامِ ٹونک

سید صاحب راجپوتانہ کے راستے سرحد جانے کا فیصلہ پہلے کر چکے تھے، یہ سنتے ہی نواب امیر خاں اور ان کے فرزند ارجمند نواب وزیر الدولہ نے بڑے اہتمام سے دعوت دے دی تھی، کہ ٹونک ضرور ٹھہریں۔ نظر باغ قیام کے لئے مقرر ہوا، سید صاحب کے پہنچتے ہی نواب صاحب اور ان کے فرزند گھوڑوں پر سوار ہو کر زیارت کے لئے آئے، عصر اور مغرب کی نمازیں سید صاحب کے ساتھ ادا کیں اور ایک مہینے سے زائد اپنے ہاں ٹھہرائے رکھا۔ سید صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں ایک نہات عمدہ عربی گھوڑا نواب کو تحفے کے طور پر دیا۔

اس وقت تک اہل وعیال کو ٹھہرانے کے لئے کوموزوں مقام تجویز نہیں ہوا تھا، نواب امیر خاں کے اصرار پر فیصلہ کیا گیا کہ جب تک کوئی بہتر اور مستقل جائے سکونت تجویز ہو، اہل وعیال ٹونک میں ٹھہریں۔ چنانچہ سید صاحب نے سید عبد الرحمٰن (خواہر زادۂ سید صاحب) سید محمد یعقوب (برادرزادۂ سید صاحب) اور سید زین العابدین (ابن سید احمد علی خواہر زادۂ سید صاحب) کو وطن روانہ کردیا کہ مستورات کو لے آئیں۔ یہ لوگ شوال تک رائے بریلی میں ٹھہرے رہے اور غالباً ذی قعدہ میں بریلی سے نکل کر اوائل ذی الحجہ میں ٹونک پہنچے۔ جب سید صاحب کا موکب شکار پور کے قریب تھا۔

یقین ہے کہ نواب امیر خاں نے اسلحہ اور دوسرے ساز وسامان کے علاوہ نقد روپیہ بھی خاصی مقدار میں سید صاحب کی نذر کیا ہوگا، مکاتیب سے ظاہر ہوتا ہے کہ روانگی کے وقت سید صاحب سے یہ اقرار بھی لے لیا تھا کہ ضرورت پیش آنے پر مصارف کے لئے مجھے (نواب کو) اطلاع نہ دی گئی تو یگانگی کا معاملہ باقی نہ رہے گا۔(۱)

ہر مقام پر لوگ ذوق وشوق سے بیعت کرتے تھے، ٹونک کے بارے میں نواب وزیر الدولہ لکھتے ہیں:

> زمانے کہ آنحضرت بہ عزمِ جہاد توجہ فرمودند در دار الریاست والدم رونق افزا بودند، والدم ودیگر خلائق لاتعداد ولاتحصی بہ شرفِ بیعت مشرف گشتند۔(۲)

> **ترجمہ**: جب سید صاحب جہاد پر جاتے ہوئے میرے والد کے دار الریاست میں رونق افزا تھے تو میرے والد اور دوسرے بے شمار لوگ بیعت سے مشرف ہوئے۔

ٹونک سے نکل کر دریائے بناس کو عبور کیا اور گلوگھاٹ میں منزل ہوئی، پھر جھلانہ میں ٹھہرے۔ وصایا سے معلوم ہوتا ہے کہ رخصت کے وقت نواب امیر خاں اور نواب

(۱) مکاتیب سید صاحب ص:۲۰۸ (۲) وصایا نصف ثانی ص:۱۱۰

وزیر الدولہ چار کوس تک ساتھ گئے۔(۱)

رسالدار عبدالحمید خاں

جھلانہ میں رسالدار عبدالحمید خاں کو ہدایت نصیب ہوئی، یہ بڑے بہادر اور جوانمرد تھے، ٹونک میں اچھا عہدہ مل گیا، بری صحبت میں بیٹھ کر فسق وفجور میں غرق ہو گئے، جھلانہ میں اپنے ایک اوباش رفیق کے ساتھ سید صاحب کا لشکر دیکھنے کیلئے راستے پر آ کھڑے ہوئے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ لشکر کی عام حالت پر نظر پڑی تو استہزاء بھی کیا، سید صاحب نے انہیں دیکھا تو مسکرا کر فرمایا: ''خان جیو! آپ بھی بیعت کر لیجئے۔'' ساتھ ہی اپنا دست مبارک آگے بڑھا دیا۔ عبدالحمید خاں اور ساتھی پر ان چند لفظوں کا اتنا اثر ہوا کہ فوراً بیعت کر لی، اسی لمحے سے پوری زندگی بدل گئی۔ ان کے ندیموں نے گمراہ کرنے کی ہر چند کوششیں کیں، لیکن عبدالحمید خاں راہِ حق پر جمے رہے، اور فیصلہ کر لیا کہ سید صاحب کا ساتھ دیں گے۔ ساتھیوں نے بہت روکا، لیکن وہ ملازمت چھوڑ کر سرحد پہنچے، تین برس سید صاحب کے ساتھ رہے، جنگ زیدہ کے بعد لشکر اسلام کے رسالدار بنا دیے گئے، مایار کی جنگ میں سخت زخم لگے، جن سے جانبر نہ ہو سکے، تورو میں انہیں دفن کیا گیا۔

ٹونک سے اجمیر تک چار منزلیں ہوئیں۔ نواب امیر خاں نے ایک بلند بالا گھوڑا چلتے وقت سید صاحب کو دیا تھا، آپ نے کئی مرتبہ کہا کہ یہ سفر کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکے گا، لیکن نواب صاحب فرماتے رہے کہ جو چیز نذر کر چکا ہوں اسے واپس نہ لوں گا۔ یہ گھوڑا اجمیر سے اگلی منزل پر پہنچ کر مر گیا۔

دادا ابوالحسن اور سید ابو محمد

اجمیر میں سید صاحب یقیناً چند روز ٹھہرے ہوں گے، وہاں مولوی سراج الدین اور

(۱) وصایا نصف ثانی ص:۱۱۰

دوسرے عمائد نے بیعت کی۔

تکیہ شریف سے چلے تھے تو سید صاحب کے اقربا میں سے دو آدمی ساتھ تھے، ایک دادا ابوالحسن، دوسرے سید ابو محمد، جو سید صاحب کی زوجۂ اولیٰ زہرہ بی بی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ یہ دونوں نصیر آباد کے باشندے تھے، دلموٗ پہنچے تو لوگوں نے پوچھا کہ کیا آپ بھی جہاد کیلئے ساتھ جا رہے ہیں؟ دونوں نے جواب دیا کہ نہیں، ہم تو صرف میاں صاحب(۱) کو چھوڑنے آئے ہیں۔ ایک دو منزل کے بعد پھر پوچھا تو اس وقت بھی یہی جواب دیا، ٹونک میں پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ اب اجمیر قریب ہے، خیال ہے کہ اسے دیکھتے چلیں، لیکن اجمیر سے بھی واپس نہ ہوئے تو آشکارا ہوا کہ معیت کا پختہ ارادہ کر کے نکلے تھے، دونوں سرحد میں شہید ہوئے۔

مولانا عبدالحئیؒ

اجمیر سے سید صاحب نے مولانا عبدالحئیؒ کو بعض خاص کاموں کیلئے دہلی بھیج دیا۔ وہ کچھ مدت ٹھہر کر بلاوے پر دہلی سے پانی پت، کرنال، تھانیسر، ممدوٹ، بہاول پور وغیرہ کے راستے سرحد گئے۔ مولوی محمد جعفر مرحوم نے مولانا عبدالحئیؒ کے اس سفر اور سید صاحب کے سفرِ ہجرت کو مخلوط کرتے ہوئے لکھ دیا کہ سید صاحب اجمیر سے دہلی آئے، پھر پانی پت، کرنال وغیرہ کے راستے گئے، (۲) یہ صحیح نہیں ہے۔ سید صاحب نے اجمیر، مارواڑ اور سندھ کا راستہ اختیار کیا، جیسا کہ اگلے ابواب سے ظاہر ہوگا۔

منازل کے بارے میں ایک تحریر

سنی اوقاف دہلی کے ناظر سید محمد جعفر کے کتب خانے سے ایک تحریر ملی، جو حاجی صابر علی کے ذریعے سے شیخ غلام علی الٰہ آبادی کو بھیجی گئی تھی، وہ ذیل میں درج ہے:

(۱) خاندان کے لوگ سید صاحب کو میاں صاحب ہی کہتے تھے۔ (۲) تواریخ عجیبہ ص:۳۷

ہر کہ خواہد کہ بہ لشکر سید احمد برسد ہمیں منازلہا اختیار کند انشاء اللہ تعالیٰ بہ آرام تمام خواہد رسید:

اول منزل ٹونک، مال پور (۱۲)، بھبولہ (۹)، کشن گڑھ (۹)، اجمیر (۸)، بریان (۱۲)، میرٹھا (۸)، کھجوانہ (۱۰)، ناگور (۱)، علی (۷) از بکوشش (کذا) برمکان چوبدار سنبولہ (۹)، بیکانیر برمکان دیدار بخش (۸) کاناسر جلال سر (۸)، کیلتی (۸)، چھتر گڑھ، ویسلی (۹)، بھوکرہ (۱۲)، بر مکان الٰہی بخش، اسیر گڑھ بہ مسجد، مڑوہ (۸) خیر پور (۵)، بہاول پور (۱۲) از آنجا بہ ڈیرہ غازی خاں، از آنجا معلوم خواہد شد۔

> نوٹ: مقامات کے سامنے جو اعداد ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ پہلے مقام سے یہ دوسرا مقام کتنے فاصلے (کوس) پر ہے۔
> محمد عمران قاسمی بگیانوی

گویا ٹونک سے اجمیر تک ۳۸ کوس اور پورا فاصلہ ۱۸۸ کوس ہوا۔ بعض مقامات میں قیام کی جگہیں بتادی گئیں۔ یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ بہاول پور سے ڈیرہ غازی خاں پہنچ جانا چاہیے، آگے کا راستہ بتانے والے لوگ وہاں موجود ملیں گے۔ لیکن واضح رہنا چاہیے کہ نہ یہ تحریر سید صاحب کی ہے اور نہ اسے سید صاحب کے منازلِ سفر میں شمار کیا جا سکتا ہے، ممکن ہے کہ کسی موقع پر کسی نیاز مند نے عازمین جہاد کی سہولت کیلئے یہ تحریر ہندوستان بھیج دی ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی ترتیب و ارسال میں سید صاحب کا ایماء شامل ہو۔

ستائیسواں باب:

سفرِ ہجرت (۲)

از اجمیر تا شکار پور

دررہِ منزلِ جاناں کہ خطرہاست بجاں　　شرطِ اول قدم آں است کہ مجنوں باشی

اجمیر سے پالی

اجمیر سے پالی غالباً اڑتالیس کوس ہے۔(۱) اس زمانے میں سفر کی منزلیں یہ تھیں: ناگیلہ، گولی، چھوڑہ، کھوکھرہ، جاؤن اور پالی۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ سید صاحب نے کونسا راستہ اختیار کیا اور کہاں ٹھہرے، صرف اتنا معلوم ہے کہ وسطِ رمضان میں آپ پالی میں تھے۔

پالی راجپوتانہ کا ایک بڑا تجارتی مرکز تھا، سید صاحب وہاں چار روز ٹھہرے رہے اور ۱۵-۱۶ رمضان کو روانہ ہوئے، وہاں دور نزدیک کے ہزاروں مردوں اور عورتوں نے بیعت کی تقریباً ایک سو آدمی روزے کی حالت میں گھروں سے چل پڑے کہ پالی پہنچ کر بیعت کریں۔ سید صاحب روانہ ہو چکے تھے، انہوں نے اگلی منزل پر پہنچ کر بیعت کی، سات آدمی دوسرے روز بھی ساتھ رہے۔

ایک بڑھیا اپنے گاؤں سے لمبی مسافت طے کر کے پالی پہنچی، سید صاحب نہ ملے تو وہ اپنے نواسے کو ساتھ لے کر پیچھے روانہ ہوگئی۔ کھٹیا گڑھ پہنچ کر بیعت کی اور پچاس روپے لشکر کی دعوت کے لئے پیش کئے۔

(۱) ایک روایت میں ہے: اجمیر از ٹونک چہل کردہ پالی از اجمیر پنجاہ کردہ۔

پالی سے روانگی کے وقت پندرہ اونٹ اور تین چھکڑے (دو نواب امیر الدولہ کے اور ایک جماعت کا) کریم بخش گھاٹم پوری کے ہمراہ ٹونک بھیج دیے تھے، اسلئے کہ ریگ زار میں انہیں ساتھ لے جانا ممکن نہ تھا، ایک ٹھیکہ دار ساتھ ہو گیا، جو ہر منزل پر مجاہدین کے لئے رسد کا انتظام کر دیتا اور ایک پیسہ فی روپیہ کمیشن لیتا۔

پالی سے سوراہا

پالی سے سوراہا تک یہ منزلیں ہوئیں:

۱۔ کھٹیا گڑھ

۲۔ سلاباس: یہ مقام جودھپور شہر سے چار کوس جنوب میں واقع ہے۔

۳۔ روپاباس: راستے میں خاردار جنگل سے گذرے، یہاں پانی کی بے حد قلت تھی، تین ہاتھ چوڑا ایک کنواں تھا، جس کا پانی ایک سو ہاتھ گہرا تھا اور سخت نمکین، لیکن چھ چھ کوس سے لوگ پانی کے لئے یہیں آتے تھے۔(۱)

۴۔ ارابو: سلاباس سے آٹھ کوس آگے، سید حمید الدین والیٔ جودھپور کی غفلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس علاقے میں پانی کمیاب ہے، ایک کنواں تیار کرانے پر کم وبیش ایک ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں، لیکن جو کنوئیں موجود ہیں ان کی دیکھ بھال نہیں کی جاتی اور صاف نہیں کرایا جاتا۔

۵۔ برسکری: ارابو سے آٹھ کوس پر ہے، یہاں ایک جھیل کے کنارے ٹھہرے، جو نصف کوس چوڑی اور پانچ کوس لمبی تھی اور اس کا پانی میٹھا تھا۔

۶۔ پانچ پودڑہ: ایک چھوٹے سے تالاب کے کنارے قیام کیا، یہاں بازار اور حویلیاں پختہ ملیں۔

(۱) ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی رات روپاباس کے بعد لوناباس میں گذاری۔

۷۔ تروڑ: راستے میں بالوترہ کو تین کوس پر بائیں ہاتھ چھوڑا اور ندی کے بہاؤ میں ٹھہرے، جس کا پانی اتنا نمکین تھا کہ جانوروں نے بھی اسے منہ نہ لگایا، مجبور ہو کر بہاؤ میں جا بجا دو دو تین تین ہاتھ گڑھے کھودے، تو بعض میں شیریں پانی نکل آیا۔

۸۔ چاندڑہ: راستے میں وحشت ناک خاردار جنگل سے گذرے، ریت اتنی زیادہ تھی کہ اس میں ایک کوس چلنے سے عام مسافت کے چار کوس کے برابر تکان ہوتی تھی۔ اس ریت کو مقامی اصطلاح میں "تھلی" (۱) کہتے ہیں یہاں بھی پانی بہت خراب ملا۔

۹۔ یامو: یہاں ایک پختہ کنواں مل گیا، جس پر حوض بنا ہوا تھا۔

۱۰۔ کوٹھدا بار: اس منزل کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۱۱۔ باندرا: یہاں ایک گہرے تالاب کے عین کنارے پر ٹھہرے۔

۱۲۔ برسالہ: یہاں ایک گہرا کنواں تھا اور اس پر پختہ حوض بنا ہوا تھا، پانی نکالنے کیلئے ایک اجیر مقرر ہوا، آبادی پہاڑ پر تھی، ایسا پہاڑ سلا باس کے بعد پہلی مرتبہ نظر آیا تھا۔

۱۳۔ سوراہا: سوراہا میں شوال کا چاند دیکھا اور عید کے لئے ایک دن ٹھہرنا ضروری ہو گیا۔ ویسے بھی پالی سے آگے سوراہا تک مسلسل مسافت کے باعث لوگ بہت تھک گئے تھے اور انہیں ایک دن کیلئے آرام کا موقع دیدینا مناسب تھا، مجاہدین نے اس جگہ سید صاحب کے دستِ مبارک پر بیعتِ جہاد کی، نیز حاضرین وغائبین کیلئے دعاء مانگی گئی۔

کھوسا بلوچ

مارواڑ کے اس حصے میں ڈکیتیوں اور غارت گریوں کا بڑا زور تھا، بلوچوں کے ایک قبیلے کو "کھوسا" کہتے تھے، یہ لوگ مختلف گروہ بنا کر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے جب امیرانِ سندھ سے معاہدہ کیا تو اس میں ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ کھوسا بلوچوں

(۱) اس "تھلی" کو سندھ میں تھر (تھر پارکر) اور پنجاب میں "تھل" کہتے ہیں۔

اور دوسرے قزاقوں کے انسداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں گے۔ سید صاحب ۲ر شوال ۱۲۴۱ھ (۱۰ر مئی ۱۸۲۶ء) کو سوراہا سے بڑے تڑکے نکلے تو حفاظت کا پورا انتظام کرلیا تھا دو چار کوس پر جا کر نمازِ فجر کے لئے کھڑے ہوگئے تو پہریداروں نے دیکھا کہ تقریباً بائیس سوار اور چند پیادے دُور سے نمودار ہوئے۔ رہبر نے بتایا کہ یہ قزاق معلوم ہوتے ہیں اور ان کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے صرف تھوڑے سے آدمی سامنے آتے ہیں، باقی آس پاس چھپے رہتے ہیں، جب کسی قافلے سے لڑائی پیش آجائے تو دوسرے لوگ بھی کمین گاہوں سے اچانک نکل آتے ہیں۔ سید صاحب نے حفاظت کے خیال سے سارے لشکر کو جنگی ترتیب میں آراستہ کرلیا، سواروں اور پیادوں کو دائیں بائیں ایک ایک تیر کے فاصلے پر متعین کر کے اونٹوں اور ضعیف آدمیوں کو بیچ میں لے لیا، اسی طریق پر پوری منزل طے کی۔

پاڑیوا سے کٹھیار

ظہر کے وقت پاڑیوا پہنچے، جسے مالیوا بھی کہتے ہیں، یہاں سخت ہراس پھیلا ہوا تھا، اس لئے کہ چند ہی روز پیشتر قزاق چراگاہ سے مویشی ہانک کر لے گئے تھے۔

اگلی منزلیں یہ تھیں۔

۱۔ برسالی: یہاں کے لوگوں نے لشکر کو دیکھ کر سمجھا کہ غارت گر آگئے، اس پر وہ بہت پریشان ہوئے اور جنگ کی تیاریاں شروع کردیں، نیز خاردار جھاڑیاں کاٹ کر کنوؤں میں ڈال دیں۔ سید صاحب نے آدمی بھیج کر انہیں مطمئن کردیا۔ اس موضع میں کچے اور کم آب کوئیں تھے یہاں کی زبان کوئی نہیں سمجھتا تھا اور ساری باتیں ترجمانوں کی وساطت سے ہوتی تھیں۔

۲۔ کِھنسر: یہاں کے لوگ بھی لشکر کو قزاقوں کا جتھا سمجھ کر جنگ پر آمادہ ہوگئے، سید صاحب دو گولی کے فاصلے پر ٹھہر گئے اور شیخ باقر علی کو ترجمان کے ساتھ اظہارِ حقیقت

کیلئے بھیجا وہ لوگ بالکل مطمئن ہو گئے تو لشکر نے آگے بڑھ کر قیام کیا، یہاں تھوڑے فاصلے پر تقریباً پندرہ کنوئیں تھے، لیکن حالت یہ تھی کہ دو تین ڈول کھینچے جاتے تو پانی ختم ہو جاتا۔ پھر اسکے جمع ہونیکا انتظار کرنا پڑتا، آدمیوں نے گدلا پانی پیا، جانور پیاسے رہے۔

۳۔ کوارسر: اس منزل کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔

۴۔ اولون: یہاں بھی پانچ چھ کچے کنوے تھے، جو تھوڑا سا پانی نکالنے پر خشک ہو جاتے۔ غازیوں نے سید صاحب کے حکم سے نیا کنواں کھودنا شروع کیا، رات کے وقت پانی نکلا۔ آدمی پانی پی چکے تو جانوروں کو پلایا۔

۵۔ بڑاڑہ: یہاں بھی لوگ مستعدِ جنگ ہو گئے، بلکہ تین چار مرتبہ بندوقیں بھی چلیں، پھر شیخ باقر علی کو بھیج کر انہیں مطمئن کیا گیا، یہاں پانی کافی تھا، چونکہ آگے بارہ کوس تک کہیں پانی ملنے کی امید نہ تھی، اس لئے یہاں ایک روز قیام کیا۔

۶۔ کٹھیار: تیسرے روز چار گھڑی رات گذر جانے پر روانہ ہوئے، ساری رات بے آب زمین پر چلتے رہے، چھ گھڑی دن چڑھے کٹھیار پہنچے۔

کٹھیار میں بھی پانی کی سخت تکلیف تھی، کچے کنوؤں کی وہی حالت کہ چند ڈول کھینچتے اور پانی ختم، آدمی اور جانور پیاس سے مضطرب، ہر لحظہ اندیشہ کہ کہیں کھینچ تان میں باہم لڑائی نہ ہو جائے۔ اگر چہ دھوپ بہت تیز تھی، لیکن سید صاحب خود کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھ گئے اور اپنی نگرانی میں آدمیوں اور جانوروں کو باری باری پانی پلوایا۔

سندھ میں داخلہ

کٹھیار پر جودھپور کی سرحد ختم ہو گئی اور امیرانِ سندھ کی عملداری کا آغاز ہو گیا۔ سید حمید الدین (خواہرزادۂ سید صاحب) لکھتے ہیں: سندھ میں اتنے درویش دیکھے کہ شاید ہی کسی دوسرے اسلامی خطے میں ہوں۔ ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ سادات و فقرا کی جیسی

قدر و منزلت یہاں دیکھی، اس کی مثال شاید ہی کسی اسلامی مملکت میں مل سکے۔ ایک شخص نے عقیدت مندی سے گائے پیش کی، اسے ذبح کر کے گوشت لشکر میں تقسیم کیا گیا، ایک رات چھکا میں گزاری، جہاں پانی بہ افراط ملا، عمر کوٹ وہاں سے صرف تین کوس پر تھا، اور سید صاحب وہیں جانا چاہتے تھے۔

چنانچہ حاجی عبد الرحیم کو اجازت نامہ حاصل کرنے کیلئے قلعہ دار کے پاس بھیجا، سوءِ اتفاق سے قلعہ دار خود حیدر آباد گیا ہوا تھا، جو شخص اس کی جگہ کام کر رہا تھا اس نے حاجی صاحب سے ملاقات بھی گوارا نہ کی، اندر سے پیغام بھیج دیا کہ تمہارا سردار سید اور مسافر ہے، تو سیدھا حیدر آباد چلا جائے، اور قلعے سے کم از کم دو کوس دور رہے۔

اس بے اعتمادی اور خشک مزاجی کی اصل وجہ یہ ہوئی کہ بارہ برس حکومتِ سندھ اور حکومتِ جودھپور کے درمیان عمر کوٹ کے بارے میں جھگڑا چلا آتا تھا، کئی مرتبہ باہم لشکر کشی ہو چکی تھی، جودھپور کی طرف سے ہر آنے والے قافلے کو سخت شبہات کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا اور انگریزوں کے بارے میں بھی فوجیوں کی رائے اچھی نہ تھی۔ سید صاحب کو بے سبب ان تمام شبہات کا ہدف بننا پڑا۔

قلعہ دار کا یہ پیغام ملا تو سید صاحب نے عمر کوٹ کو دو اڑھائی کوس بائیں ہاتھ چھوڑتے ہوئے کھاوڑہ میں قیام کیا، وہاں پھر قلعہ دار کا پیغام آیا کہ کوئی آدمی ہتھیار پہنے ہوئے شہر میں نہ آئے، نیز ایک رات سے زیادہ مقام نہ کیا جائے۔ سید حمید الدین چند غازیوں کو لے کر خالی ہاتھ عمر کوٹ دیکھنے کے لئے گئے، جب قلعہ کے دروازے کے پاس پہنچے تو گولہ اندازوں اور بندقچیوں نے شور مچا دیا، انہیں تسلی تشفی دے کر شہر دیکھا اور واپس ہو گئے۔

پریشان کن حالات

پالی سے جو اونٹ کرائے پر لئے تھے، ان کی میعاد ختم ہوگئی، غلطی سے تین سرکاری اونٹ گم ہوگئے، ان کی بازیافت کے انتظار میں پورے لشکر کو ٹھہرانا قلعہ دار کے حکم کے منافی تھا، لہٰذا مولانا شاہ اسماعیل کو چالیس آدمیوں کے ساتھ کھاوڑہ میں چھوڑا اور باقی لشکر اگلے روز دومانہ میں قیام پذیر ہوا۔ پھر سالہ میں منزل کی جہاں مولانا شاہ اسماعیل بھی آ ملے، سالہ سے نکلے تو کارد میں ٹھہرے۔ یہاں اگرچہ کھیتی باڑی اور سرسبزی خاصی تھی، لیکن کوئی مکان نظر نہ آیا۔ مرد، عورتیں، بچے سب جنگلی درختوں کے سایے میں زندگیاں گزار رہے تھے۔

کارد میں سید چورن شاہ ایک ممتاز بزرگ تھے، سید صاحب کے حکم سے سید حمید الدین اور سید اولاد حسن (والد ماجد نواب صدیق حسن خاں مرحوم) نے ان سے ملاقات کی، وہ سید صاحب سے ملاقات کیلئے آئے اور ایک بڑا بھینسا بطور نذر پیش کیا۔ انہیں سے معلوم ہوا کہ لوگ عام طور پر سید صاحب کو انگریزوں کا جاسوس سمجھتے ہیں، اسی لئے بدکتے ہیں۔ سید صاحب نے ایک بڑا بیل سید چورن شاہ کو اور ایک سلہٹی ڈھال اس کے لڑکے کو دی۔

سید چورن شاہ کو اندیشہ تھا کہ میرپور کا حاکم کہیں غلط فہمی میں سید صاحب کے ساتھ آمادۂ جنگ نہ ہو جائے، چنانچہ انہوں نے خود آگے جا کر حاکم کو بتادیا کہ یہ غازی ہندوستان سے ہجرت کر کے سندھ کو دارالاسلام سمجھتے ہوئے آئے ہیں، ان کو شبہ کی نظروں سے دیکھنا سراسر نامناسب ہے۔

کارد سے چل کر راستے میں ایک مقام کیا، پھر میرپور میں ٹھہرے، علی مراد حاکم میرپور کو اگرچہ سید چورن شاہ نے سید صاحب کے صحیح حالات بتادیے تھے، لیکن اس کے دل

سے وسوسے دور نہ ہوئے، اس وجہ سے خود ملاقات کیلئے نہ آیا، البتہ شیرینی کی دس ہانڈیاں بطور نذر سید صاحب کی خدمت میں بھیج دیں اور دو سوار رہبری کیلئے ساتھ کر دیے۔

میر پور سے تیسرے روز چل کر ٹنڈ والہ یار میں ایک گھڑی ٹھہرے، یہاں خربوزے نہایت عمدہ اور بہ کثرت ملے، وہاں امیرانِ سندھ کی طرف سے دو آدمی آئے اور پورے حالات دریافت کر کے حیدرآباد اطلاع بھیجی، وہاں سے حکم آیا کہ سید صاحب شوق سے تشریف لائیں، یہ گھر انہیں کا ہے۔ چنانچہ وہاں سے چل کر ایک منزل ٹنڈو جام ہالہ میں کی، دوسری پھلیلی ندی کے مشرق کنارے پر، جسکے مغربی کنارے پر حیدرآباد واقع تھا۔

حیدرآباد میں استقبال

سید صاحب نے اطلاع کی غرض سے حاجی رحیم بخش اور سید عبد الرحیم ولایتی کو امیرانِ سندھ کے پاس بھیج دیا تھا، ان کی طرف سے سید صبغۃ اللہ ولایتی استقبال کے لئے آئے، وہ مکہ معظمہ میں سید صاحب کی بیعت کر چکے تھے، اور میر کرم علی امیر سندھ کے مصاحب بن گئے تھے۔ دریا اور شہر کے درمیان شہر سے تقریباً دو تیر کے فاصلے پر لشکر اسلام کو ٹھہرایا گیا، امیرانِ سندھ کی طرف سے شیرینی پیش ہوئی اور مہمانداری کی ہر ضروری جنس لشکر میں پہنچ گئی۔ (۱) آم اور خربوزے بھی بڑی مقدار میں آئے۔

تیسرے روز جمعہ تھا۔ (۲) حکامِ سندھ نے کہلا بھیجا کہ سید صاحب جمعہ کی نماز قلعہ میں ہمارے ساتھ ادا کریں۔ چنانچہ آپ آٹھ آدمیوں کے ساتھ قلعہ میں گئے، میر صاحبان آپ سے مل کر بے حد خوش ہوئے، ہجرت و جہاد کا عزم دیکھ کر متحیر رہ گئے۔ کہنے

(۱) تفصیل یہ بتائی گئی ہے دو خوانچے مصری اور قند کے دونوں بیس بیس سیر، چند برتن گھی، دس گوسفند جنس خوردنی نفیس، دانہ و کاہ دو تین پشتارے، آم اور خربوزے۔

(۲) سید صاحب ۵ / ذی قعدہ کو اتوار کے دن حیدرآباد سے روانہ ہوئے، گویا دو جمعے حیدرآباد میں گزارے، اس حساب سے وہ غالباً ۲۲ / شوال کو بدھ کے دن حیدرآباد پہنچے۔

لگے کہ اہل وعیال کو حیدر آباد میں ٹھہرا دیجئے اور خود بھی کچھ مدت ٹھہریئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اگر اب ٹھہر جاؤں گا تو سردیوں کا آغاز ہوجائے گا، اور اگلے سفر میں برف باری کی وجہ سے مشکلات پیش آئیں گی۔ امیروں نے ایک ہزار روپیہ، ایک بندوق اور ایک جوڑی طپنچوں کی پیش کی۔

یہ میر ٹالپور خاندان میں سے تھے، جو کلہوڑوں کے بعد ۱۷۸۳ء میں حکمرانیٔ سندھ کے منصب پر پہنچا تھا۔ ان میں سے بڑا امیر فتح علی خاں تھا، جس نے زمان شاہ درانی سے فرمانِ سلطنت حاصل کیا تھا، پھر اپنے بھائیوں میر غلام علی، میر کرم علی اور میر مراد علی کو بھی شریکِ سلطنت کرلیا۔ یہ چاروں بھائی ''چار یار'' کہلاتے تھے، میر فتح علی خاں کا انتقال ۱۸۰۱ء میں ہوا، اور میر غلام علی کا ۱۸۱۰ء میں۔ ان کے بیٹے خالی مسندوں پر بیٹھ گئے۔

حیدر آباد میں بھی ہزار ہا لوگوں نے بیعت کی، ان میں سے بطور خاص قابلِ ذکر یہ ہیں۔

۱۔ میر اسماعیل شاہ جو حاکمانِ سندھ کے تحت نائب وزیر کے عہدے پر مامور تھا۔

۲۔ حافظ مولوی محمد یوسف جو گورنر بمبئی کی طرف سے دربار سندھ میں وکیل تھا، اس نے کئی مرتبہ دعوت کی اور گراں بہا ہدایا پیش کئے۔

۳۔ محمد یوسف خاں جو امرائے سندھ میں سے تھا۔

والیٔ بہاولپور کو دعوتِ جہاد

سید صاحب حیدر آباد میں تیرہ روز ٹھہرے، اس اثناء میں آپ نے دعوتِ جہاد کا ایک خط سید دین محمد قندھاری کے ہاتھ بہاول خاں والیٔ بہاول پور کے پاس بھیجا۔ والیانِ بہاول پور کے اجداد پہلے شکار پور کے پاس رہتے تھے، ان کے جد امجد کا نام داؤد تھا، اس وجہ سے پورا خاندان داؤد پوترہ کہلاتا تھا۔ ان میں سے بہاول خاں نے ہمت کر کے ایک خاصی بڑی ریاست پیدا کرلی، اس کا بیٹا سعادت خاں تھا، جس نے انگریزوں اور رنجیت

سنگھ سے معاہدے کیے۔ سعادت خاں کا بیٹا بہاول خاں تھا جس کے پاس سید صاحب نے دعوت نامہ بھیجا۔ میسن نے لکھا ہے کہ اس کی عمر میں پچیس برس کی تھی، اور بڑا خوبرو تھا، سید صاحب کے عزمِ جہاد کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ میسن کہتا ہے، مجھ سے رحمت خاں نے کہا کہ تم سید صاحب کے پاس چلے جاؤ۔(۱)

سید صاحب کی دعوتِ جہاد کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا، لیکن اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ ان کے سینے میں حمیتِ اسلام کی کتنی حرارت تھی اور وہ اس سے ہر فرزندِ توحید کے قلب وروح کو گرما دینے کے لئے کتنے بے تاب تھے۔ ان حالات کے سامنے آتے ہی مولانا روم کے یہ شعر بے اختیار یاد آجاتے ہیں:

من بہ ہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

حیدرآباد ہی میں میرزا امیر بیگ فرخ آبادی پانچ چھ آدمیوں کے ساتھ سید صاحب کی خدمت میں پہنچ گیا، اور ایک گھوڑا بطور نذر پیش کیا۔(۲) میرزا صاحب نواب امیر الدولہ والیٔ ٹونک کے پاس ملازم تھے، ملازمت چھوڑ کر غازیوں میں شامل ہوگئے۔

حیدرآباد کے متعلق تأثرات

سید صاحب کو امید تھی کہ امیرانِ سندھ جہاد میں معیت کیلئے تیار ہوجائیں گے، لیکن اس عہد کی دوسری انجمن ہائے میری وسلطانی کی طرح یہ انجمن بھی افسردہ و بے روح نکلی۔ اس حالت میں انہیں حیدرآباد سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی؟ وہ خیل وخدم کے پھیلاؤ یا

(۱) میسن کی کتاب India (ہندوستان) جلد اول ص:۱۴۰

(۲) روایت میں ہے کہ میرزا امیر بیگ فرخ آبادی ٹونک سے دو گھوڑے، ایک اونٹ، ایک یابو اور پانچ چھ ملازم لے کر پہنچا اور حیدرآباد میں سید صاحب سے آملا۔

امر و حکم کے داب و تمکنت کی تلاش میں نہیں نکلے تھے، ان زندہ و غیور قلوب کو جستجو کر رہے تھے، جن میں اسلامیت وحقہ کی تڑپ موجود ہو، جو دینی برتری کی خاطر میدانِ جہاد کی صعوبتوں کو حاصلِ حیات سمجھنے کیلئے بیتاب ہوں۔ یہ متاعِ عزیز دستیاب نہ ہوئی تو امیرانِ سندھ کی مہمانداری میں ان کے لئے کونسی کشش باقی رہ گئی تھی؟ چنانچہ ۵/ ذی قعدہ کو حیدر آباد سے روانہ ہو گئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ حکامِ حیدر آباد کی ملاقات سید صاحب کیلئے اس درجہ افسردگی زا ثابت ہوئی کہ اہل وعیال کو بھی حیدر آباد میں ٹھہرانے پر طبیعت راضی نہ ہوئی۔ چنانچہ سید حمید الدین اپنے ایک مکتوب میں جو حیدر آباد سے لکھا گیا تحریر فرماتے ہیں کہ اہل وعیال کو آنے کا حکم ابھی نہیں دیا جا سکتا، ممکن ہے شکار پور سے کوئی ہدایت بھیجی جائے۔

حیدر آباد سے پیر کوٹ

سید صاحب نے حیدر آباد سے دو کشتیاں اسی روپے کرایے پر لیں، ایک بجرہ امیرانِ سندھ نے عاریۃً دے دیا، سارا مال واسباب ان کشتیوں میں رکھا، کمزور آدمیوں کو بھی ان میں بٹھا دیا۔(۱) توانا غازی گھوڑوں اور اونٹوں کے ساتھ خشکی کے راستے روانہ ہوئے اور شمالی سمت میں سفر شروع ہو گیا۔ سید صبغۃ اللہ شاہ ولایتی اور مولوی محمد یوسف مشایعت کی غرض سے ساتھ ہو گئے، اگلی منزل یہ ہیں:

۱۔ کاٹھڑی: یہ مقام حیدر آباد سے تقریباً گیارہ میل ہے، اسی کے قریب ۱۸۴۳ء میں میانی کی جنگ ہوئی تھی جس میں سندھ کی عنانِ تقدیر انگریزوں کے ہاتھ آئی۔ مولوی محمد یوسف یہاں سے واپس ہو گئے، اس سفر میں سید صاحب کبھی فرزند علی غازی پور کے دیے ہوئے یابو پر سوار ہوتے اور کبھی سانڈنی پر۔

(۱) ان آدمیوں کی تعداد ایک سو چالیس بتائی گئی ہے۔ یقیناً وہ سب کمزور نہ ہوں گے، غالباً یہیں سے حاجی رحیم بخش کو خانگی خطوط دے کر ٹونک بھیجا۔

۲۔ کھہڑ: اس کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

۳۔ ہالہ(۱): اس جگہ سید نوحؒ کا مزار تھا جو ۱۰۷۰ھ میں فوت ہوئے۔ امیرانِ سندھ کا خاندانی مقبرہ بھی اسی جگہ تھا۔

۴۔ کوٹ سید: یہ آج کل سید آباد کے نام سے مشہور ہے، ہالہ سے تقریباً گیارہ میل کے فاصلے پر ہے۔

۵۔ لبا کا کھمبا۔

۶۔ آن حتری: یہاں ٹھہرنا چاہتے تھے، لیکن دریا میں پانی تیزی سے بڑھ رہا تھا، اس لئے لالوکوٹ میں ٹھہرے۔

۷۔ ملا کابٹ: لالوکوٹ اور ملا کابٹ کی منزل کو ایک سمجھنا چاہیے، دونوں میں تقریباً چھ سات میل کا فاصلہ ہے۔ سید صاحب نے پیادوں کو لالوکوٹ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی اور ملا کابٹ بھیج دیا۔ یہاں دھوپ اتنی تیز تھی کہ بعض ہمراہی ہلاکت کے قریب پہنچ گئے۔

۸۔ ہنگورجہ: پیادے یہاں ٹھہرے، لیکن اونٹ اور گھوڑے محراب پور بھیج دیے۔ ہنگورجہ میں سید ناصر الدین نے بیعت کی اور دو روز لشکر کو ٹھہرائے رکھا، دونوں دن کھانا اپنے پاس سے کھلایا۔

۹۔ رانی پور: یہاں سید صالح شاہ بغدادی ایک مشہور پیرزادے تھے، انہوں نے سارے لشکر کو کھانا کھلایا۔ اتفاق سے پیر سید صبغۃ اللہ راشدی بھی ایک سوارادت مندوں کے ساتھ رانی پور آئے ہوئے تھے، سید صاحب ان سے ملنے کے بڑے مشتاق تھے، اس لئے کہ ان کے جذبۂ دینی کا عام شہرہ تھا۔ ملاقات ہوئی، سید صبغۃ اللہ شاہ کو ایک ضروری

(۱) ہالہ حیدر آباد سے ۳۶ میل کے فاصلے پر ہے اب یہ دو قصبے ہیں، ہالہ قدیم اور ہالہ نو۔ نیا ہالہ ۱۸۰۸ء میں بنا تھا، جب دریا کی طغیانی کے باعث پرانے قصبے کی ہستی خطرے میں پڑ گئی تھی۔

کام کے لئے ایک دن رانی پور میں ٹھہرنا پڑا، سید صاحب اور غازیوں کو انہوں نے اپنے بھائی کے ہمراہ آگے بھیج دیا۔

۱۰۔ ٹنڈو مستی خاں۔

۱۱۔ پیر جو گوٹھ یا پیر کوٹ: یہ سید صبغۃ اللہ شاہ راشدی کا وطن اور مرکز تھا۔

سید صبغۃ اللہ شاہ

پیر سید صبغۃ اللہ شاہ کے اجداد اسلام کے ابتدائی دور ہی میں حجاز سے نکل کر بغداد پھر سندھ پہنچ گئے تھے، ان میں سے پیر محمد مکی بہت مشہور ہوئے۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ ابتداء سے اس خاندان کا نشانِ امتیاز تھا، اس وجہ سے ہر دور میں یہ مرجعِ خلائق رہا۔ سید صبغۃ اللہ شاہ کے والد پیر محمد راشد کے عہد میں مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی، ان کے متعدد فرزند تھے، جن میں سجادہ نشینی کے متعلق منازعت شروع ہوگئی۔ سید صبغۃ اللہ شاہ چونکہ سب میں ممتاز تھے، اس لئے وہی پیر بنے۔

اس خاندان کو عملی سیاسیات سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا، اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی تھی، لیکن سید صبغۃ اللہ شاہ صاحب مسند نشین ہوئے تو ملکی حالات بہت بدل چکے تھے، انہیں اللہ تعالیٰ نے حساس دل، عاقبت اندیش دماغ اور بصیر آنکھیں عطا کی تھیں، دیکھ رہے تھے کہ مسلمانوں کی دینی حمیت اور جماعتی تنظیم میں ضعف پیدا ہوتے ہی ان کی سیاسی قوت بھی معرضِ انحطاط میں آگئی ہے۔ ہندوستان کے ہر حصے میں مخالف عناصر مضبوطی سے جم چکے تھے اور سلطنتِ اسلامیہ کا ایک ایک عضو کٹ رہا تھا۔ پنجاب پر سکھ چند ہی برسوں میں چھا گئے تھے، سندھ کے لئے بھی سکھوں اور انگریزوں کی طرف سے شدید خطرہ پیدا ہو چکا تھا، پھر سندھ کی حکومت حقیقتاً طوائف الملوکی تھی، بعید سی بھی امید نہ تھی کہ یہ سفینہ زیادہ دیر تک طوفان کے ہولناک تھپیڑوں سے محفوظ رہے گا۔ لہٰذا انہوں

نے اپنے مریدوں کو ایسے طریق پر منظم کرنا شروع کر دیا کہ موقع پیش آتے ہی ان سے جانباز مجاہدین کے جیش تیار کیے جا سکیں۔ یہی ''حر'' تحریک کی ابتداء تھی۔

پیر سید صبغۃ اللہ کے ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سکھ حکومت سندھ کی جانب پھیلنے لگی تو پیر صاحب نے جہاد کا پختہ ارادہ کر لیا، جو وعظ فرماتے، اس میں جہاد کی فضیلتیں ضرور بیان کرتے، کچھ اور لاڑ کے مرید وعظ میں شامل نہیں ہو سکتے تھے، انہیں جہاد کے لئے تحریری دعوت نامے ارسال کئے۔

بہر حال پیر صبغۃ اللہ شاہ بڑی سلامت روی اور احتیاط سے دینی تحریک کے سلسلے میں سیاسی کام کی داغ بیل ڈال چکے تھے۔ ایک مخلص ناصر حق کی حیثیت سے پیر صبغۃ اللہ شاہ کیلئے یہی مناسب تھا کہ حتی الامکان سید صاحب کی حمایت و نصرت کیلئے تیار ہو جاتے، یہی انہوں نے کیا۔(۱)

سید حمید الدین کی شہادت

سید حمید الدین نے پیر صبغۃ اللہ شاہ کے متعلق لکھا ہے:

در تمام مملکت سندھ ہمچو او شیخ و مرشدے در زعم مردمانِ ملک نیست۔ قریب سہ لک مریدانش از قوم بلوچ ہستند و بہ کمال جاہ و جلال و رجوعات خلائق خوش می گزرانند۔ در جود و کرم و اخلاص و مروت ہم شہرۂ آفاق۔

درخانہ سید مذکور کتب خانہ عجیب و غریب بہ نظر آمد کہ ہرگز در خانہ سلاطین و امراء نبودہ باشد۔ پانزدہ ہزار جلد نامی از کتب معتبرہ دراں موجود است۔ از آنجملہ صد دیوان فارسی بہ خط ولایت مطلاّ۔ شصت و پنج جلد تفاسیر معتبرہ، پنج جلد مکرر از شاہ نامہ فردوسی سہ مع تصاویر و مطلاّ، احادیث ہر قدر کہ مشہور اند مع

(۱) پیر سید صبغۃ اللہ شاہ کے خاندان کے حالات میں نے اس باب کے آخر میں بطور ضمیمہ شامل کر دیے ہیں۔ رانی پور میں سید صاحب سے ملاقات کا ذکر سید صبغۃ اللہ شاہ کے ملفوظات بھی موجود ہے۔

شروح وجامع الاصول وتیسیر الوصول سہ جلد مکرر احیاء العلوم وسہ جلد مکرر فتوحاتِ مکیہ وہر جلد شاہانہ۔

ترجمہ : باشندگانِ سندھ کے نزدیک سارے ملک میں اس جیسا شیخ ومرشد کوئی نہیں، تقریباً تین لاکھ بلوچ مرید ہیں، رجوعِ خلقِ عام ہے، جاہ وجلال میں زندگی گزار رہے ہیں۔ جود وکرم اور اخلاص ومروت میں بھی شہرۂ آفاق ہیں۔

ان کا کتب خانہ بڑا عجیب وغریب تھا، سلاطین اور امرا کے پاس بھی ایسا کتب خانہ نہ ہوگا۔ پندرہ ہزار جلد کتب معتبرہ اس میں موجود ہیں، سو دیوان فارسی کے ایرانی خط میں مطلّا، پینسٹھ جلدیں معتبر تفسیروں کی، شاہنامہ فردوسی کے پانچ نسخے جن میں سے تین مصور ومطلّا تھے۔ حدیث کی تمام مشہور کتابیں مع شروح، جامع الاصول، تیسیر الوصول، احیاء العلوم اور فتوحاتِ مکیہ کے تین تین نسخے اور سب جلدیں (حسنِ کتابت واہتمامِ صحافت کے اعتبار سے) شاہانہ۔

پیر کوٹ میں قیام

سید صاحب ۱۷/ ذی قعدہ (۲۴/ جون ۱۸۲۶ء) کو پیر کوٹ پہنچے تھے، پیر صبغۃ اللہ شاہ کے بھائیوں اور مریدوں نے لوازمِ مہمانداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ دو گھڑی کے بعد خود پیر صاحب تشریف لے آئے، تین روز تک سارے لشکر کو خود کھانا کھلایا، پھر سید صاحب نے بہ اصرار انہیں روک دیا اور رسد بٹنے لگی۔ وہاں کشتیوں کے انتظار میں کم و بیش تیرہ روز ٹھہرے رہے، اسی مقام کو اہل وعیال کے قیام کیلئے پسند فرمایا۔(۱) وہیں سے دریائے سندھ کو کشتیوں کے ذریعہ سے عبور کر کے شکار پور کا قصد فرمایا۔

۲۶/ ذی قعدہ کو پیر صبغۃ اللہ شاہ کے حکم کے مطابق کشتیاں فراہم ہوگئیں اور ساز

(۱) سید صاحب کے اہل وعیال صفر ۱۲۴۲ھ (ستمبر ۱۸۲۶ء) میں سندھ پہنچے تھے۔

وسامان دریا سے اتارا جانے لگا۔ ۳۰/ ذی قعدہ تک سارا لشکر دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ اسی روز سید صاحب بھی پیر صاحب سے رخصت ہوئے۔ ۲۶/ ذی قعدہ سے عبورِ دریا کا سلسلہ شروع ہوا، جو لوگ پہلے پار ہوئے وہ مدہجی میں خیمہ زن ہو گئے۔ سید صاحب نے ۳۰/ ذی قعدہ (۶/ جولائی) کو بروز جمعہ دریا عبور کیا اور اپنے ہمراہیوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔(۱) پیر کوٹ سے گاڑھے کے دو سو تھان مجاہدین کے کپڑوں کے لئے خریدے گئے تھے۔

پیر صاحب کے ساتھ سید صاحب کا سلسلۂ مکاتبت برابر جاری رہا۔ غالباً باہم یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جب اچھے مرکز کا بندوبست ہو جائے تو پیر صاحب بھی وہاں پہنچ جائیں۔ بعد میں ایسے حالات پیش آئے کہ افغانستان و پشاور کا راستہ ایرانی سرداروں کے عناد کے باعث مخدوش ہو گیا۔ اس اثناء میں پیر صبغۃ اللہ شاہ بالکل تیار ہو گئے اور سید صاحب کو اس باب میں اطلاع بھیج دی گئی۔ ایک خط میں سید صاحب نے انھیں لکھا کہ آپ تمام مسلمانوں کو دعوت دیں۔ مخلصین کی ایک جماعت ساتھ لے کر سکھوں کی سرحد سے متصل محفوظ مقام پر بیٹھ جائیں اور جہاد شروع کر دیں۔ اپنے اہل وعیال کے ساتھ میرے اہل وعیال کو بھی کسی ایسی جگہ بٹھا دیں جو دشمن کی دسترس سے باہر ہو۔(۲)

جب سرحد میں سید صاحب کی بیعتِ امامت ہو چکی تو مختلف علاقوں میں نائب بھیجے گئے تھے، جو نیابۃً بیعت لینے کے مجاز تھے۔ محمد قاسم کو سندھ سے بھیجا گیا تھا۔ پیر صبغۃ اللہ شاہ کو لکھتے ہیں کہ سندھ میں نیابۃً بیعت لینے کے اہل صرف آپ تھے، لیکن چونکہ آپکے بھائی رقابت کے مرض میں مبتلا ہیں اسلئے اندیشہ ہے کہ وہ شاید اسی باعث امر مسنون کی بجا آوری سے محروم رہ جائیں۔ لہٰذا میں نے نیابت کیلئے دوسرے آدمی کو بھیج دیا۔(۳)

(۱) سید حمید الدین کا خط

(۲) ملاحظہ ہو مکتوب سید صاحب بنام پیر صبغۃ اللہ شاہ جو تواریخ عجیبہ کے ص: ۲۱۸-۲۱۹ پر چھپ چکا ہے۔

(۳) منظورۃ السعداء ص: ۶۳۹

سید صاحب جب پنجتار سے راج دواری جانے والے تھے تو پیر صبغۃ اللہ شاہ کے نام ایک خط بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا کہ اگر ہماری زندگی جہاد ہی میں تمام ہو جائے تو ہمارے اہل وعیال کو حرمین شریفین پہنچا دیں۔

پیر کوٹ ہی میں مولوی امام الدین بنگالی اور نواب امیر الدولہ کے بھیجے ہوئے ہرکارے پہنچے تھے، نیز سید صاحب نے غازیوں کے لئے گاڑھے کے دو سو تھان خریدے تھے، یہیں سے سید صبغۃ اللہ شاہ کابلی کو پندرہ روپے اور ایک دوشالہ دے کر رخصت کیا، نیز قاصد کو ٹونک بھیجا۔

پیر کوٹ سے شکار پور

عبورِ دریائے سندھ کے بعد پہلی منزل مدیجی میں ہوئی، آگے راستے میں چھوٹی چھوٹی نہریں آتی تھیں اور لدے ہوئے اونٹوں کا ان سے گذرنا مشکل تھا، لہٰذا دو کشتیاں کرائے پر لیکر بھاری سامان ان کے ذریعے سے شکار پور پہنچا۔ مدیجی کے بعد راکھا میں منزل ہوئی، اس دن بھی نہروں کے باعث سفر میں بڑی تکلیفیں پیش آئیں۔ تیسری منزل جیب کوٹ میں شاہ غلام محی الدین پیرزادہ سرہندی کے مہمان کی حیثیت میں ہوئی۔

پیر غلام محی الدین کے والد پشاور میں رہتے تھے، جب سکھوں نے پشاور کو خراب کیا تو وہاں سے نکل کر اہل وعیال کے ساتھ نواحِ شکار پور میں آگئے۔ یہاں حکامِ سندھ نے انہیں بڑی جاگیر دے دی۔ پیر صاحب حیدر آباد میں بھی سید صاحب سے مل چکے تھے، اسی وقت سے آرزو تھی کہ ان کو بھی مہمانداری کا شرف حاصل ہو، چنانچہ انہوں نے اپنے بیٹوں پیر نظام الدین اور پیر فدا محی الدین کو لکھ دیا تھا، وہ دونوں منتظر بیٹھے تھے، بہ اصرار گھر لے گئے اور لشکر کی خاطر داری کے علاوہ جانوروں کیلئے بھی چارہ دانہ مہیا کیا۔ چنانچہ سید

صاحب ایک رات حبیب کوٹ میں گزار کر شکار پور گئے۔(۱)

شکار پور میں قیام

یہ شہر پہلے شاہ شجاع بادشاہ افغانستان کے قبضے میں تھا جو اپنے بھائی محمود شاہ کے مقابلے میں شکست کھا کر پنجاب ہوتا ہوا انگریزوں کے پاس پہنچ چکا تھا، اور لدھیانہ میں مقیم تھا۔ سید صاحب کے پہنچنے سے تین برس پیشتر امیرانِ سندھ نے اس پر قبضہ جمالیا۔ سید صاحب پہنچے تو اہل شہر میں خدا جانے کس بناء پر افواہ پھیل گئی کہ شاہ شجاع نے ایک دستۂ فوج اس غرض سے بہ تبدیلِ لباس بھیج دیا ہے کہ خفیہ شکار پور پر قبضہ کر لے۔ اس پر اضطراب پیدا ہوا، حاکم شہر کو حکم دینا پڑا کہ سید صاحب کے غازی شہر میں داخل نہ ہوں۔

سید صاحب نے سید حمید الدین اور سید اولاد حسن قنوجی کو حاکمِ شکار پور کے پاس بھیج کر اطمینان کرا دینا ضروری سمجھا کہ ہمیں شاہ شجاع سے کوئی تعلق نہیں اور ہمارے متعلق دشمنی کا وسوسہ سراسر بے اصل ہے۔ حاکم نے جواب دیا کہ رعایا خوفزدہ ہے، لہٰذا جو شخص بازار میں آئے، اسے ہتھیار ساتھ نہ لانے چاہئیں۔ خوف جاتا رہے گا تو یہ پابندی دور کر دی جائیگی۔ سید صاحب نے یہ پابندی قبول کر لی، سب سے پہلے علماء وفضلاء ملاقات کے لئے آئے۔

حاکم میر اسماعیل کا بیٹا میر کاظم تھا، وہ بھی حاضر ہوا اور بڑی عقیدت ومدارات سے پیش آیا۔ روزانہ سید صاحب کے لئے پر تکلف کھانے بھیجتا جو دس بارہ آدمیوں کیلئے کافی ہوتے۔ جس چیز کی ضرورت ہوتی اپنے آدمیوں کے ذریعہ سے خرید کر دیتا۔ جب لوگوں

(۱) شکار پور ۱۶۱۷ء میں آباد ہوا تھا، اور اپنی جائے وقوع کے اعتبار سے بہت جلد مشہور تجارتی منڈی بن گیا۔ خشکی کے راستے جو مال ہندوستان آتا تھا اور ہندوستان سے باہر بھیجا جاتا تھا، عموماً اسی منڈی سے گذرتا تھا۔ اس وجہ سے وہاں ہر ملک اور خطے کے لوگ آباد ہو گئے تھے، پشتو، سندھی، پنجابی، فارسی، اردو اور بلوچی زبانیں وہاں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھیں۔

کا شک رفع ہو گیا تو شہر میں داخلے کی ممانعت بھی اٹھ گئی۔ سید صاحب کے ساتھی بھی شہر میں جانے لگے اور شہر کے شرفاء و عوام بھی کثرت سے سید صاحب کے پاس آنے لگے۔

سید صاحب عیدِ اضحیٰ کی نماز کے لئے نکلے تو دو تین سو مجاہدین ہم رکاب تھے، اہل شہر نے خود درخواست کی کہ نماز میں امام سید صاحب ہوں۔ مجمع بیس ہزار سے کم نہ ہوگا، سید صاحب نے جو خطبہ پڑھا وہ بے حد پُر تاثیر تھا، خطبے کے بعد دعاء، مصافحہ اور معانقہ کے بعد آپ اس شان سے قیامگاہ کی طرف لوٹے کہ سعید الدین لکھتے ہیں کہ اس کا بیان مشکل ہے۔ سید صاحب نے عید کے دن تیرہ دنبے ذبح کئے۔

میر کاظم سید صاحب سے اس درجہ متاثر ہوا کہ خود بیعت کی اور ملازمت چھوڑ کر ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا، لیکن سید صاحب نے اس وقت اسے ساتھ لینا خلافِ مصلحت سمجھا، البتہ پختہ عہد لے لیا کہ عند الطلب بہ دل و جان حاضر ہو جائے گا۔

شکار پور ہی میں سید صاحب نے غازیوں کو گاڑھے کے کپڑے بنوا دیے، سبحان اللہ! یہ اس قدوسی لشکر کی وردی تھی، جس میں وقت کے تاجدارانِ علم و فضل اور بڑے بڑے اربابِ جاہ و ثروت شریک تھے۔

شکار پور سے روانگی کے وقت سید صاحب نے ایک عمدہ گھوڑا میر کاظم کو دیا۔ میر نے ایک سانڈنی پیش کی، جو کابل تک سید صاحب کی سواری میں رہی۔

میرزا عطا محمد خاں کا بیان

سندھ کے سلسلے میں صرف ایک چیز رہ گئی اور وہ میرزا عطا محمد خاں کا روزنامچہ ہے، اس میں مرقوم ہے:

> سید صاحب جماعت مسلمین کے ساتھ آئے، امراء و مشائخ اور خواص و عوام کو دعوتِ جہاد دی، لیکن دوں ہمتی کے باعث کوئی تیار نہ ہوا، بلکہ مجاہدین کی

قلتِ تعداد اور فرومائیگیٔ سامان کے پیش نظر وہ لوگ اس سارے معاملے کو محض ایک فریب سمجھتے رہے۔ کوئی یہ کہہ دیتا کہ سید صاحب انگریزوں کے جاسوس ہیں۔

میرزا نے صرف پیر صبغۃ اللہ شاہ کی بہت تعریف کی ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب نے اہل وعیال کو انہیں کے ہاں ٹھہرانے کا انتظام کیا۔

میر کاظم کے متعلق لکھا ہے کہ بیعت کی، عندالطلب حاضری کا عہد بھی کیا، لیکن شکار پور کی حکمرانی بے طرح دامن گیر ہوگئی اور کئی مرتبہ بلانے کے باوجود میر کاظم جہاد میں شرکت کی سعادت حاصل نہ کرسکا۔(۱)

(۱) روزنامچہ میرزا عطا محمد خاں ص: ۲۰۷-۲۰۸

ضمیمہ

راشدی خاندان کا شجرہ نسب ذیل میں درج ہے:

(جن ناموں کے سامنے نمبر لگے ہوئے ہیں، وہ ترتیب وار پیر پگاڑو یعنی اصحابِ دستار بنے)

- پیر محمد بقا
  - پیر مرتضیٰ
  - پیر محمد سلیم
  - پیر عبدالاول
  - پیر محمد راشد
    - پیر محمد شاہ
    - پیر محمد یٰسین
    - (۱) پیر صبغۃ اللہ شاہ بانی تحریک ''حر'' (جد خاندان پیر جھنڈا)
      - پیر علی محمد
      - پیر شاہ مراد
      - پیر حیدر علی
      - پیر علی ذوالفقار
      - (۲) پیر گوہر اول
        - (۳) پیر حزب اللہ شاہ
          - پیر عنایت شاہ
          - پیر محمود شاہ
          - پیر علی سرور
          - پیر غلام مصطفیٰ شاہ
            - پیر احمد شاہ
          - پیر علی اصغر
          - (۴) پیر علی مظفر
          - پیر علی گوہر ثانی
            - (۶) پیر صبغۃ اللہ ثانی
              - (۷) پیر سکندر شاہ عرف شاہ مردان ثانی سجادہ نشین حال
              - پیر نادر شاہ
          - (۵) پیر شاہ مردان اول
      - پیر عبدالقادر
    - پیر ہدایت اللہ

- پیر تجل شاہ، پیر شاہ، پیر سلطان شاہ، پیر حسام الدین، پیر احمد شاہ
  (انکی شادی پیر حزب اللہ شاہ کی ہمشیرہ سے ہوئی تھی)
  - پیر چاند شاہ
    - پیر احمد شاہ
    - پیر حسام الدین راشدی
    - پیر علی محمد راشدی

- پیر فتح علی شاہ، پیر علی شاہ، پیر مہدی شاہ
  (اسے حروں نے شہید کر ڈالا)

پیر صبغۃ اللہ شاہ اول پیر محمد راشد کے بعد سجادہ نشین ہوئے اور دستارِ وراثتِ روحانی ان کے سر پر باندھی گئی، اس وجہ سے وہ ''پیر پگاڑو'' یعنی ''صاحب دستار'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کے بھائی پیر محمد یاسین جھنڈا یا علم لے کر دوسری جگہ چلے گئے اور ''پیر جھنڈا'' کے تلقب سے زبان زدِ خواص وعام ہوئے۔ ان کے اخلاف کو جمع وفراہمیٔ کتب کا خاص اہتمام رہا، چنانچہ ''پیر جھنڈا'' کا کتب خانہ سندھ کا نہایت نادر علمی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، ان کے جانشینوں میں سے پیر رشید الدین، پیر مرشد اللہ، پیر ضیاء الدین شاہ قابل ذکر ہیں۔

پیر صبغۃ اللہ شاہ کے بعد دستارِ وراثت پیر علی محمد کے سر پر بندھنے والی تھی، لیکن وہ علمی مذاق کے آدمی تھے اور خود اپنے ہاتھ سے اپنے بھائی پیر علی گوہر اول کو وارث بنا دیا۔ پھر پیر حزب اللہ شاہ ''پیر پگاڑو'' [۳] بنے۔ بعد ازاں پیر علی گوہر ثانی، پھر شاہ مردان یکے بعد دیگرے سجادہ نشین ہوئے۔ پیر شاہ مردان کی وفات پر پیر صبغۃ اللہ شاہ ثانی کم عمر تھے، وہی سجادہ نشین قرار پائے، یہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن طبیعت کے بڑے سخت ودرشت تھے، پہلے ان کے خلاف ایک مرتبہ مقدمہ بنا اور قید کی سزا ہوئی، رہائی کے بعد انکے عہد میں حروں نے بدامنی شروع کی، جسکی وجہ سے پیر صبغۃ اللہ شاہ کو پہلے نظر بند کر کے وسطِ ہند بھیجا گیا، پھر انکے خلاف حیدر آباد میں مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا دی گئی۔

سید صاحب کے زمانے کا پیر کوٹ دریا کی دستبرد میں آ گیا تو تقریباً پانچ میل ہٹ کر نیا کوٹ آباد ہوا، جہاں پیرانِ عظام کی میتیں بھی لا کر دفن کی گئیں، یہاں کا کتب خانہ بھی بڑا نادر تھا، لیکن اب معلوم نہیں اس کا کیا حشر ہوا، صرف مسجد اور مقبروں والا احاطہ رہ گیا باقی ساری عمارتیں مسمار کر دی گئیں، اب نئے سرے سے عمارتیں بنی ہیں۔

دس برس گذر جانے کے بعد پیر صبغۃ اللہ شاہ ثانی کے فرزند اکبر پیر سکندر شاہ مردانِ ثانی کے لقب سے زینت آرائے سجادہ نشین ہوئے۔ انہوں نے جماعت میں عظیم الشان

اصلاحی کاموں کا آغاز کر دیا۔

ان پیروں کے ساتھ عوام کی عقیدت کے حالات بڑے حیرت انگیز ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے تھے تو عقیدت مند اپنی ساری دنیوی متاع ان کے قدموں میں ڈال دیتے تھے، اگر یہ ریل میں سفر کرتے تھے تو ہر جگہ کے مرید ریلوے لائن پر سارے اندوختے لے کر جمع ہو جاتے تھے۔

پیر صبغۃ اللہ شاہ اول کے صاحبزادوں میں سے پیر علی محمد بہت بڑے طبیب اور صاحبِ علم و فضل تھے۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں انہیں سجادہ نشین بنایا جا رہا تھا، لیکن وہ اپنے بھائی کے سر پر دستار باندھ کر الگ ہو گئے اور املاک میں زمینیں اور کتابیں لے کر بیٹھ گئے۔ انہیں مطالعہ اور طب کے ذریعہ سے خدمتِ خلق کے سوا کوئی کام نہ تھا، اپنے ایثار اور علم و فضل ہی کے باعث دستار بند خاندان میں انہیں خاص اعزاز حاصل تھا۔ پیر حزب اللہ نے اپنی بہن کی شادی ان کے بیٹے پیر شاہ سے کر دی تھی، جن سے حامد شاہ پیدا ہوئے، یہ پیر حزب اللہ کے حقیقی بھانجے اور شاہ مردان و پیر علی گوہر ثانی کے عمہ زاد بھائی تھے۔ پیر حامد شاہ کے تین فرزند ہوئے، ان میں سے پیر محمد علی راشدی ابتدا سے پبلک کاموں میں سرگرم حصہ لیتے رہے ہیں، انگریزی بہت اچھی لکھتے ہیں، سیٹھ عبداللہ ہارون مرحوم کی رفاقت میں لیگ کی مجلس امور خارجہ کے سکریٹری تھے، اس زمانے میں انہوں نے لیگ کی قرارداد لاہور کے اصول کی بناء پر تقسیم ہند کی ایک اسکیم تیار کی تھی، نیز سندھ کی آزادی کے لئے بڑا ہی قابل قدر کام کیا۔ پاکستان بننے کے بعد سندھ میں وزیر بھی رہے، پاکستان کی طرف سے فلپینس اور چین میں خدماتِ سفارت بھی انجام دیں۔

پیر حسام الدین کو مطالعہ کا خاص شوق ہے اور قلمی و مطبوعہ کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ انہوں نے جمع کر لیا ہے۔ پیر احمد شاہ زمینوں کی دیکھ بھال کا کام کرتے ہیں۔

اٹھائیسواں باب:

سفرِ ہجرت (۳)

از شکار پور تا کوئٹہ

صد بیاباں بگزشت ودگرے درپیش است

شکار پور سے جاگن

شکار پور سے آگے سارا سفر بلوچستان کے صحرائی اور پہاڑی علاقوں میں سے تھا، ان علاقوں سے گذرنا امن کی حالت میں بھی جان جوکھوں کا کام تھا اور جس زمانے میں سید صاحب جانے والے تھے، قزاقیوں کی گرم بازاری کے باعث حالت اتنی مخدوش ہو چکی تھی، کہ زیادہ سے زیادہ کرایہ دینے پر بھی اونٹ نہیں ملتے تھے۔ سید صاحب کے ساتھ جو اونٹ بار برداری کے لئے تھے، ان میں سے نصف سفر کی صعوبتوں کے باعث بے بس ہو چکے تھے۔ خاصی تگ ودو کے بعد بارہ اونٹ بہ مشکل مل سکے، جو کافی نہ تھے، اس لئے بہت سا سامان شکار پور میں فروخت کر دیا یا غریبوں میں بانٹ دیا۔ ان میں زیادہ تر تانبے اور پیتل کے برتن تھے۔

تیز گرمی شروع ہو چکی تھی، حدت وتپش بے پناہ، پانی اور سایہ کوسوں تک ناپید، پھر ہر لحظہ سموم کا خطرہ، ارادت مندوں نے بار بار التجائیں کیں کہ برسات تک سفر ملتوی رکھا جائے، وہ سب زیادہ سے زیادہ مدت تک مہمانداری کے لئے تیار تھے، لیکن مصیبت یہ تھی کہ اگر بلوچستان کے صحرائی علاقے میں سے گذرنے کیلئے موسم کی خنکی کا انتظار کیا جاتا تو

کوئٹہ اور اس کے آگے کے کوہستانی علاقے میں برف پڑنے لگتی، جس میں بعض اوقات ہفتوں راستے بند رہتے، لہٰذا اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ سموم اور لو کا خطرہ برداشت کیا جائے۔ خدا کی رحمت کہ روانگی سے ایک روز پیشتر خلافِ امید اور خلافِ موسم اچانک غیر معمولی بارش ہوگئی، جس سے موسم کی حدت میں خاصی کمی آگئی۔

۱۴ر ذی الحجہ ۱۲۴۱ھ (۲۰ر جولائی ۱۸۲۶ء) کو سید صاحب شکار پور سے روانہ ہوئے، شہر کے اکابر، علماء، لشکری اور عوام چار کوس تک ساتھ گئے۔ چھ کوس پر جاگن (۱) میں پہلی منزل ہوئی۔ بارش روانگی سے ایک دن پہلے بھی ہوگئی تھی، راستے میں بھی ہوئی، جاگن پہنچنے کے بعد اس زور سے مینہ برسا کہ روجھان، برشوری اور مکھن بیلہ کے راستے میں سفر غیر ممکن ہوگیا، اس وجہ سے یہ سیدھا راستہ بیس کوس بائیں ہاتھ چھوڑ کر خان گڑھ کا رخ کرنا پڑا۔

سید انور شاہ امرتسری

سید صاحب جاگن میں اس وجہ سے چار روز ٹھہرے کہ سید انور شاہ امرتسری کا انتظار تھا، جن کی آمد کی اطلاع شکار پور ہی میں مل چکی تھی۔

سید انور شاہ امرتسر کے ساداتِ عظام میں سے تھے، رنجیت سنگھ کے دربار میں بھی بہت محترم تھے، سکھ امرا اور عام لوگ بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ سکھوں کے کسی مذہبی پیشوا کا ایک عزیز ان کے پاس آتا جاتا تھا، اس نے مسلمان ہونا چاہا، سید انور شاہ

(۱) بمبئی کی انگریزی فوج کے کوارٹر ماسٹر جنرل نے سندھ، گجرات، کچھ، جودھپور وغیرہ کے راستوں اور منزلوں کے متعلق ایک مجموعۂ معلومات ۱۸۴۶ء میں، یعنی سید صاحب کے سفر سے بیس برس بعد شائع کیا تھا۔ بعض منازل بلوچستان کے سلسلے میں اس کا حوالہ آگے بھی آئے گا، اس میں بتایا گیا ہے کہ جاگن میں صرف ساٹھ گھر ہیں اور چند دکانیں، پانی کے لئے پانچ کنوئیں ہیں، گھوڑوں اور اونٹوں کے لئے چارہ بہ کثرت مل جاتا ہے، قافلے کے ٹھہرنے کی جگہ گاؤں کے جنوب مغرب میں ہے۔ (مجموعۂ مذکورہ ص: ۱۱۷)

نے بے تکلف اسے کلمہ پڑھا دیا، کسی مفسد نے انور شاہ کی ناک کو بھی نقصان پہنچایا۔(۱) سید صاحب موصوف نے اس ظلم و جبر کے خلاف جہاد آرائی کا فیصلہ کرلیا، مفسدوں نے حکمراں طبقے کی امداد سے ان کے لئے گھر ہی میں اک گونہ نظر بندی کا بندوبست کرادیا۔

تکیہ شریفہ میں جب جہاد کی تیاریاں ہورہی تھیں تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے اربابِ ہمت وحمیت کے متعلق خبریں منگائی جارہی تھیں، اس سلسلے میں سید انور شاہ کے حالات بھی معلوم ہوئے اور غالباً کسی ذریعے سے ان کے ساتھ ربط و تعلق بھی پیدا کرلیا گیا۔ جب سید صاحب نے ہجرت کی تو فتح پور سے حاجی یوسف کشمیری کو امرتسر روانہ کردیا کہ سید انور شاہ کو ساتھ لے کر سندھ پہنچ جائے۔

حاجی یوسف امرتسر پہنچا تو معلوم ہوا کہ جو افسر سید انور شاہ کی نگرانی پر متعین تھا، وہ کسی بات پر ناراض ہوکر کام چھوڑ بیٹھا ہے، اور اس کی جگہ نیا آدمی مقرر نہیں ہوا۔ ممکن ہے حکومت نے نیا افسر مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی ہو، سید موصوف نے اس فرصت کو غنیمت سمجھا، اپنے پندرہ خادموں کو تین گھوڑے اور بار برداری کے اونٹ دے کر خفیہ آگے بھیج دیا۔ پھر خود بھی چپ چاپ نکل کر ان سے مل گئے، اور ریاست بہاول پور کی سرحد میں داخل ہوگئے۔ بہاول پور میں ان کی ملاقات سید دین محمد قندھاری سے ہوئی، جنہیں سید صاحب نے دعوت نامۂ جہاد دے کر نواب بہاول خاں کے پاس بھیجا تھا، پھر یہ اکٹھے منزلِ مقصود کی طرف چلے۔ سید صاحب خود شکار پور میں زیادہ دن انتظار نہ کرسکے، البتہ اکبر خاں کو دس غازیوں کے ساتھ سید انور شاہ کے استقبال کے لئے چھوڑ گئے اور جاگن میں یہ لوگ سید صاحب سے ملحق ہوئے۔(۲)

(۱) ''منظورہ'' میں ہے: حسنِ چہرۂ زیبائش بہ نقصان سر بینی متغیر ساختند (ص:۳۶۵)

(۲) سید انور شاہ جہاد میں شریک رہے، پھر معلوم نہیں کس کام کے لئے انہیں واپس بھیج دیا گیا۔ سید صاحب کے رفیقوں میں سے جو لوگ اکا دکا پنجاب کے راستے آتے جاتے رہے، ان میں سے بعض کے حالات سفر میں سید انور شاہ کا بھی ذکر آیا ہے۔

خان گڑھ سے بھاگ

سید صاحب جاگن سے براہ جانی درہ خان گڑھ گئے (۱) اور وہاں سے شاہ پور کا راستہ اختیار کر لیا، جو روجھان، برشوری وغیرہ کے سیدھے راستے سے بیس بائیس کوس دائیں جانب تھا۔ یہ سارا راستہ صحرائی تھا، پہلی منزل آٹھ کوس کا فاصلہ طے کر کے ایک جوہڑ کے کنارے ہوئی جس میں برسات کا پانی جمع ہو گیا تھا، مزید دس کوس کا فاصلہ طے کر کے دوسری منزل بھی صحرا میں ہوئی، تیسرے روز شاہ پور پہنچے، اس سفر میں خان گڑھ کے زمیندار کا بھائی رہبر کے طور پر ساتھ رہا۔

شاہ پور میں محسن شاہ نام ایک سید رہتے تھے، جو بلوچوں کے بڑے محترم پیر تھے، انہوں نے رہبری کے لئے اپنے دو فرزند ساتھ کر دیے، شاہ پور سے بھاگ تک منزلوں کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ چھتر: یہ مقام شاہ پور سے آٹھ کوس شمال میں ہے، اس کے پاس ہی ایک مقام **پھلیجی** ہے، آج کل ان دونوں مقاموں کا نام عموماً اکٹھا لیا جاتا ہے، یعنی **چھتر پھلیجی**، چھتر میں محراب خاں فرمانروائے بلوچستان کی طرف سے ملا محمد حاکم تھا، وہ بڑے تپاک سے ملا، اسی کی وساطت سے سید صاحب نے دعوت نامۂ جہاد محراب خاں کے پاس بھیجا، اگرچہ اہل وعیال کو پیر کوٹ میں ٹھہرانے کا ارادہ فرما چکے تھے لیکن خیال تھا کہ اگر اس سے بھی بہتر اور موزوں تر مقام مل جائے تو وہاں ٹھہرائیں، اس لئے محراب خاں کو بھی لکھا کہ ہمارے اہل وعیال کو اپنے پاس ٹھہرا لیں، تو بہ فراغت بال کاروبارِ جہاد

(۱) خان گڑھ اب نہیں رہا، یہاں ایک کچی گڑھی تھی جس کے اندر کھاری پانی کا کنواں تھا، باہر تین چار کنوئیں میٹھے پانی کے تھے۔ جنرل جان جیکب جب یہاں پہنچا تو اس نے اسے ایک اہم سرحدی مقام سمجھتے ہوئے چوکی بنائی، جلد وہاں ایک قصبہ آباد ہو گیا، جس کا نام جیکب آباد رکھا گیا۔ آج کل یہ سندھ کے ایک ضلع کا صدر مقام ہے، جیکب نے ۱۸۵۸ء میں وفات پائی اور وہ جیکب آباد ہی میں دفن ہوا۔ شکار پور سے یہ ۳۶ میل شمال میں ہے۔

میں مشغول ہوں۔

۲۔ کھنہ بار: چھتر سے نکلے تو کھنہ بار میں ٹھہرے، ملا محمد ساتھ آیا اور لشکر کی ضرورت کی تمام چیزیں مہیا کرادیں۔

۳۔ کھنہ بار سے نکلے تو دو کوس پر ندی آگئی، اونٹوں کو ندی میں سے گزارنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں اور سارا دن اسی کام میں گذر گیا، مجبور ہو کر رات وہیں گزاری۔

۴۔ شور: شور چودہ کوس پر تھا۔ اس کے پاس بھی ایک ندی بہتی تھی۔ سید صاحب نے کھنہ بار والی ندی کے تجربات کو پیش نظر رکھتے ہوئے شور کی ندی کے گھاٹ میں جھاڑ کٹوا کر بچھوا دیے، اس طرح اونٹ سہولت سے گذر گئے۔

۵۔ بھاگ: ۲۶/ ذی الحجہ (یکم اگست) کو سید صاحب بھاگ پہنچ گئے۔

بھاگ سے ڈھاڈر

بھاگ اس زمانے میں کچھی علاقے کا بہت بڑا قصبہ تھا، دو ہزار کے قریب مکان تھے اور کم و بیش ایک سو دس دکانیں تھیں، اب بھی اس کی آبادی خاصی بڑی ہے، لیکن سفر کے ذرائع بدل جانے کے باعث اسے پہلے کی سی اہمیت حاصل نہیں رہی۔

سید صاحب قصبے کے مشرق میں دروازے کے باہر ٹھہرے تھے، اور دو روز وہاں مقام رہا۔ حاکم علاقہ، قاضی، شرفاء، علماء اور عوام بڑی عقیدت سے ملے، حاکم نے سید صاحب کو پچاس ساٹھ غازیوں کے ساتھ دعوتِ طعام دی، خربوزے یہاں اتنے سستے تھے کہ ایک پیسے میں پندرہ بیس مل جاتے تھے۔ (۱)

۲۹/ ذی الحجہ کو بھاگ سے نکلے تو حاجی (۲) میں ٹھہرے۔ راستے کا ایک رئیس سید

(۱) روایتوں میں بتایا گیا ہے کہ بھاگ میں ہر قسم کے میوے ملتے ہیں، اور نہایت عمدہ باغ ہیں۔ انار بے حد شیریں ہوتا ہے اور اتنا ہی بڑا جتنا قندھار کا انار ہوتا ہے، نیز ویسا ہی آبدار۔ انگور اور تربوز بھی بہت عمدہ ہوتے ہیں۔

(۲) بعض نقشوں میں اسے ''حاجی شہر'' یا ''حاجی کا شہر'' لکھا ہے، سید صاحب کے ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

صاحب کو انتہائی اصرار سے اپنے مکان پر لے گیا اور پرتکلف کھانا کھلایا۔ حاجی سے نکلے تو ایڑی میں قیام کیا، یکم محرم الحرام ۱۲۴۲ھ کو سید صاحب ڈھاڈر پہنچ گئے، جو درۂ بولان کے جنوبی دہانے کا مشہور مقام ہے۔ قافلے پیدل جاتے آتے تھے تو ڈھاڈر کی اہمیت بہت بڑھی ہوئی تھی، جب ریل بن گئی تو ڈھاڈر کی جگہ سبی نے لے لی، اب وہاں خان قلات کا ایک محل ہے، جہاں وہ کچھ وقت گزارتا ہے۔

درۂ بولان کا سفر

ڈھاڈر سے درۂ بولان شروع ہو جاتا ہے، یہ سفر دو وجہ سے نہایت صعب اور خطرناک تھا، ایک تو راستے میں کھانے کی کوئی جنس میسر نہیں آتی تھی، دوسرے دونوں جانب بلند پہاڑوں کی دیواریں کھڑی تھیں، چور اور ڈاکو اُن پہاڑوں کی کمین گاہوں سے نکل کر اچانک مسافروں پر حملے کر دیتے تھے۔ ڈھاڈر میں لوگ مہینوں اس انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ بڑا قافلہ بن جائے تو حفاظت کا پختہ انتظام کر کے قدم آگے بڑھائیں۔

سید صاحب نے چار روز کے لئے اشیائے خوردنی ساتھ لے لیں اور ۴ محرم الحرام کو درۂ بولان میں داخل ہو گئے۔ حفاظت کی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قافلے کی ترتیب یوں رکھی، سب سے آگے بندوقچیوں کا دستہ، ان کے پیچھے اونٹ، پھر ضعیف آدمی، ان کے بعد باقی غازیوں کے دستے۔ سب سے آخر میں سید صاحب خود سواروں کے ساتھ چلے۔ درے کے پورے سفر میں یہ ترتیب برابر قائم رکھی۔

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... زمانے میں اسی کے گرد فصیل تھی اور اڑھائی تین سو مکانات تھے، یہاں سے مڑ جائیں تو سبی کے قریب پہنچ جاتے ہیں، ڈھاڈر جانا ہو تو ایڑی کا راستہ زیادہ موزوں ہے، حاجی اور بھاگ کے درمیان دس کوس کا فاصلہ ہے، بھاگ کے نزدیک فرزوایانِ بلوچستان کے خاندان میں سے مصطفیٰ خاں اور رحیم خاں کے مقبرے ہیں نیز ایک پیر کا مقبرہ ہے جو وزیر فتح خاں بارک زئی کا مرشد تھا۔

درۂ بولان کی منزلیں

اب درۂ بولان کی منزلوں کا نقشہ ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ ندی کے کنارے ببول کے ایک پرانے درخت کے آس پاس جس حد تک اندازہ کر سکا ہوں یہ مقام کھنڈلائی کے قریب ہوگا۔

۲۔ کیرتا: اس نام کے دو مقام آس پاس واقع ہیں: ایک شمالی کیرتا، دوسرا جنوبی کیرتا۔ سید صاحب کی منزل شمالی کیرتا میں ہوئی ہوگی، جو کھنڈلائی سے گیارہ میل ہے، اسے ایک چھوٹے سے قصبے کی حیثیت حاصل ہے، کھیتی باڑی بھی خوب ہوتی ہے، اس لئے کہ پانی یہاں مستقل طور پر جاری رہتا ہے۔

۳۔ بی بی نانی: یہاں کوئی آبادی نہیں، بلند ٹیلے کے دامن میں ایک سیدہ کی قبر ہے، کہتے ہیں کہ یہ بی بی صاحبہ اپنے بھائی کے ساتھ درے میں سے گذر رہی تھیں، آس پاس کے بلوچوں نے حملہ کر دیا، بھائی حملہ آروں سے لڑتا ہوا تھوڑی دور نکل گیا، پیچھے سے بلوچوں کے دوسرے دستے نے بی بی صاحبہ پر یورش کر دی، وہ تنہا کیا کر سکتی تھیں؟ خدا سے دعاء کی کہ میری عفت کو بچا، اچانک پہاڑ میں شگاف پیدا ہوا سیدہ اس میں سما گئیں، پہاڑ پھر مل گیا، بلوچوں نے پاس ہی قبر بنالی۔ سیدہ کا نام معلوم نہیں، مقام کا نام بی بی نانی اس وجہ سے پڑا کہ بلوچ یہاں عام طور پر نان تقسیم کرتے ہیں۔ یہ مقام کیرتا سے نو دس میل کے فاصلے پر ہے، یہاں مغرب کی طرف سے ایک چشمہ آکر درۂ بولان میں ملا ہے۔ آج کل بی بی نانی کے قریب حکومت نے ایک چوکی بھی بنادی ہے، جس میں پانچ سات سپاہی رہتے ہیں۔

۴۔ مچھ قدیم: سید حمید الدین نے اپنے خط میں اس مقام کا نام ''سرآب'' اور

''سرکھجور'' لکھا ہے۔(۱) ممکن ہے پرانے زمانے میں اس مقام کو''سرآب'' اور''سرکھجور'' بھی کہتے ہوں، مچھ قدیم موجودہ مچھ سے دو میل شمال میں ہے اور بی بی نانی سے تقریباً سولہ میل ہوگا۔ سر بولان جہاں سے درے کا شمالی دہانہ شروع ہوتا ہے، مچھ قدیم سے پانچ میل ہے۔

۵۔ دشت بے دولت: اس مقام کو محض''دشت'' (۲) بھی کہتے ہیں اور بعض اوقات''دروازہ'' بھی، اس لئے کہ درۂ بولان کے شمال دروازے سے بالکل متصل ہے، اور پورے سفر کا یہی سب سے بڑھ کر دشوار گزار حصہ تھا، کیونکہ آخری چار پانچ میل کے علاقے میں دونوں طرف کے پہاڑ بالکل قریب آگئے ہیں اور بیچ میں ایک تنگ گلی رہ گئی ہے، اوپر سے اگر کوئی شخص پتھر بھی لڑھکا تا جائے تو بڑی فوج کو پریشان کرسکتا ہے، خود اسے کوئی گزند اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا، جب تک کوئی دستہ گلی سے باہر آکر پہاڑ پر نہ چڑھ جائے۔

درے کی اہمیت

سید حمید الدین اس درے کی جغرافیائی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بالائے آں کوہ ہائے ہر دو جانب اگر صد کس با ساز جنگ بر سر مخالفت بنشیند، لشکر لک سوار و پیادہ بہ ہر سامان کہ بودہ باشد، مجال گذر کردن ازاں راہ

(۱) ''سرآب'' کوئٹہ کے ریلوے لائن کا ایک اسٹیشن ہے، جو درۂ بولان سے گذر کر آتا ہے۔''سرکھجور'' بی بی نانی سے تین چار میل مغرب میں راستے سے ہٹا ہوا ہے۔ کوئٹہ جانے والے کے لئے بی بی نانی سے''سرکھجور'' جانا خارج از بحث ہے۔ مچھ سے چند میل شمال مشرق میں ایک مقام''سریات'' ہے۔ یہ بھی راستے سے الگ ہے۔ بلوچی میں مچھ کے معنی ہیں کھجور اور یہاں ایک بڑے پتھر سے شیریں اور مصفّٰی پانی کے کئی چشمے پھوٹے ہیں جن پر لوہے کا ٹینک بنا دیا گیا ہے اور یہیں سے پانی موجودہ مچھ میں لایا گیا ہے، اس وجہ سے مچھ قدیم کو''سرآب'' اور''سرکھجور'' کہنا تعجب انگیز نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بی بی نانی کے بعد سید صاحب نے یہیں قیام فرمایا۔

(۲) اس مقام کو دشت بے دولت اس وجہ سے کہتے ہیں کہ وہاں نہ پانی ہے نہ سبزی۔

نتواند۔(۱)

ترجمہ : اگر دونوں جانب کے پہاڑوں پر سو آدمی بھی سامانِ جنگ لے کر بیٹھ جائیں تو ایک لاکھ کے لشکر سوار و پیادہ کے لئے گذرنے کی کوئی شکل نہ رہے، اگر چہ وہ کتنے ہی سامان سے لیس ہو۔

اس کی تصدیق بعد کے انگریز مبصروں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ریورنڈ ایلن، جو ۱۸۴۲ء میں شاہ شجاع کے معاون انگریزی لشکر کے ساتھ اس راستے سے گذرا تھا لکھتا ہے:

یہ لوگ (یعنی بلوچستان والے) بڑے ہی نادان تھے، جنہوں نے ایسے درے کے ہوتے ہوئے ہمیں اپنے ملک میں آنے دیا۔(۲)

کنولی لکھتا ہے:

اس درے کی ہر چھوٹی بڑی چیز کو تفصیلاً بیان کر دینے سے بھی اسکے استحکام کا صحیح نقشہ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک ایسی گھاٹی ہے جہاں بہادر آدمیوں کی ایک رجمنٹ کو بٹھا کر بڑی فوج کو کامیابی سے روکا جاسکتا ہے۔(۳)

کوئٹہ

درۂ بولان کی شمالی سمت میں نکلے تو بہت بلندی پر پہنچ گئے، ڈھاڈر میں گرمی کا یہ عالم تھا کہ دن کے وقت سایے سے باہر قدم رکھنا بھی مشکل تھا۔ درے کے اندر صرف اتنی سردی تھی کہ ایک چادر یا اس سے ذرا موٹے کپڑے کی ضرورت پڑتی تھی، دشت میں پہنچے تو سردی کے مارے سب کے جسموں پر لرزہ طاری ہوگیا، مچھ سے ظہر کے وقت چلے

(۱) منظورہ ص:۶۴۵

(۲) مارچ تھرو سندھ اینڈ افغانستان (سندھ اور افغانستان میں سے کوچ) ص:۱۰۶

(۳) مارچ تھرو سندھ اینڈ افغانستان (سندھ اور افغانستان میں سے کوچ) ص:۱۱۲

تھے، دشت میں پہنچے تو رات قریب الختم تھی، صبح کی نماز سب نے تیمّم کر کے پڑھی، وہاں سے چلے تو سرآب میں ٹھہرے، جو دشت سے سولہ میل تھا۔ سرآب سے کوئٹہ(۱) صرف آٹھ میل رہ گیا، اسی روز یا اگلے روز کوئٹہ پہنچ گئے۔

حاکم کوئٹہ نے سید صاحب اور غازیوں کی مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، دورانِ قیام میں روزانہ پر تکلف کھانے اور میوے بھیجتا رہا، بیعت بھی کی اور ساتھ جانے کے لئے بھی تیار ہوگیا۔ سید صاحب نے اسے روک دیا، اس لئے کہ اکا دُکا مامورین کو ساتھ لینا خلافِ مصلحت تھا، اس طرح حاکموں کے دلوں میں وسوسے پیدا ہونے کا احتمال تھا اور سید صاحب خود حاکموں کو ساتھ ملانا چاہتے تھے۔ سید حمیدالدین لکھتے ہیں:

درفرقہ اُمراء ورؤسا ایں چنیں مرد دیندار و نیک کردار کمتر بہ نظر آمدہ۔

ترجمہ: امراء ورؤسا میں ایسا نیک کردار اور دیندار آدمی بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔

کوئٹہ سے دو کوس پر سادات کا ایک گاؤں تھا، ایک روز وہ لوگ آئے اور سید صاحب کو ایک سو غازیوں کے ہمراہ اپنے ہاں لے گئے۔

بلوچستان کی سرگزشت

بلوچستان پہلے افغانستان کے غلزئی بادشاہوں کے ماتحت تھا، جو صفویوں کے آخری دور میں ایران پر بھی قابض ہو گئے تھے، ان کی سلطنت کو نادر شاہ افشار نے ختم کیا۔ نادر کے قتل پر افغانستان و بلوچستان کو احمد شاہ درانی نے سنبھال لیا۔

بلوچستان کے حکمراں خاندان کا جدامجد میر عبداللہ غائیوں کا خاص رفیق تھا، اس کے تین بیٹے تھے، جن میں سے نصیر خاں اول بہت مشہور ہوا، اسی نے بلوچستان کو ایک

(۱) سید حمیدالدین نے اس مقام کا نام "شال" لکھا ہے، اصل نام شال کوٹ تھا مخففاً اسے شال کہتے تھے، جو اس وادی کا بھی نام ہے جس میں کوئٹہ واقع ہے۔ انگریزوں نے اسے کوئٹہ بنا دیا، وادئ شال بارہ میل لمبی اور تین چار میل چوڑی ہے۔

مستقل دولت بنایا۔ ۱۷۹۴ء میں نصیر خاں کی وفات پر اس کا بیٹا میر محمود خاں مسند نشین ہوا، اس کے عہد میں نصیر خاں کے بھائیوں کی اولاد نے بڑے فتنے بپا کیے، برسوں خانہ جنگی جاری رہی۔ اس دور میں اخوند ملا فتح محمد نے، جو نصیر خاں کا مشیر خاص تھا، بڑے خلوص و دیانت سے محمود خاں کا ساتھ دیا۔ ۱۸۱۶ء میں محمود خاں فوت ہوا تو محراب خاں حاکم بنا۔

سید صاحب محراب خاں کے پاس جہاد کا ایک دعوت نامہ چھتر سے بھیج چکے تھے، اس اثناء میں قندھار و بلوچستان کے درمیان حالتِ جنگ پیدا ہوگئی۔ عبداللہ خاں درانی قندھاری فوج لے کر مے زئی پہنچ گیا، جو کوئٹہ سے تقریباً تیس کوس پر ہے۔ بلوچستان کی فوج اخوند فتح محمد کی سرکردگی میں مستورنگ پہنچ گئی۔ دعوت نامے کے جواب میں دیر ہوگئی، تو سید صاحب نے ''دشت بے دولت'' سے ایک وفد اخوند فتح محمدؒ کے پاس بھیج دیا، جو سید اولاد حسن قنوجی، حاجی بہادر شاہ خاں رامپوری، مولوی نظام الدین چشتی اور سید حمیدالدین پر مشتمل تھا۔

اخوند نے بڑی گرم جوشی سے وفد کا استقبال کیا، دعوت نامے کے جواب میں تاخیر کی وجہ یہ بتائی کہ صورتِ جنگ درپیش ہے، اسی وقت ایک خاص قاصد مملکت بھیج دیا۔ وفد چونکہ فوری مراجعت کا متقاضی تھا، اس لئے اخوند نے خود ایک خط سید صاحب کے نام لکھ دیا کہ تین روز میں جواب کوئٹہ پہنچ جائے گا۔ دو سوار رہنمائی کے لئے وفد کے ساتھ کر دیے، ایک بار شتر سردے، تربوز اور خربوزے بھیجے۔

اخوند فتح محمد

سید حمیدالدین اخوند فتح محمد کے متعلق فرماتے ہیں:

ایں چنیں کمتر کسے را عمر و اقبال دیانت و تقویٰ باہم یاری کنند۔

ترجمہ : ایسی مثالیں بہت کم دیکھی گئی ہیں کہ ایک شخص کو عمر و اقبال اور دیانت و تقویٰ بیک وقت اس پیمانے پر نصیب ہوئے ہوں۔

ایک سو بیس برس کی عمر ہو چکی تھی لیکن قویٰ ضعف و انحطاط سے محفوظ تھے۔ اس عمر میں بھی اخوند صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کی سرداری کرتے تھے۔ نادر شاہ کے پاس ملازم ہوئے تھے، پھر نصیر خاں اول کے وزیر رہے، میر محمود خاں کے زمانے میں تمام امور ملک داری کے کفیل بن گئے۔ محراب خاں نے بھی ان کا عہدۂ وزارت بحال رکھا۔(۱)

محراب خاں کی طرف سے یہ جواب کوئٹہ پہنچا:

شما بہ مہمے کہ می روید تشریف ببرید در مقدمہ مطلوبۂ شما، بعد تصفیہ جنگ با مردم قندھار، ہر چہ مناسب متصور خواہد شد، بروئے کار خواہد آمد۔

ترجمہ : آپ جس مہم پر جا رہے ہیں، تشریف لے جائیں۔ قندھاریوں کے ساتھ جنگ کا تصفیہ ہو جانے کے بعد جو کچھ مناسب سمجھا جائے گا، بروئے کار آ جائے گا۔

(۱) چند برس بعد اخوند فتح محمد کو محراب خاں کے دوسرے مشیر داؤد محمد نے بڑی بیدردی سے قتل کرا دیا، پھر اخوند کے بیٹے ملا حسن نے عجیب و غریب فتنہ انگیزیاں شروع کر دیں جن کے ضمن میں محراب خاں ناحق مارا گیا، لیکن یہ تفصیلات ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہیں۔

انتیسواں باب:

سفرِ ہجرت (۴)

از کوئٹہ تا پشاور

ایں راہ بہ پائے تن بہ پایاں نہ رسد تا جاں نہ زند قدم بہ جاناں نہ رسد

کوئٹے سے روانگی

محراب خاں کا جواب موصول ہو جانے کے بعد کوئٹہ میں ٹھہرے رہنے کی کوئی وجہ نہ تھی، چنانچہ سید صاحب ۱۵/محرم الحرام ۱۲۴۲ھ (۲۲/اگست ۱۸۲۶ء) کو چل پڑے، حاکم کوئٹہ پچاس ساٹھ سواروں کو لے کر تین کوس تک ساتھ گیا، عام لوگ بھی ساتھ تھے۔ رخصت کے وقت حاکم پر رقت طاری ہوگئی، اخوند فتح محمد نے زبانی پیغام بھیجا تھا کہ سید صاحب قندھار و بلوچستان کے درمیان مصالحت کیلئے دعاء فرمائیں، اسی مقام پر سید صاحب نے عجز والحاح سے دعاء کی اور سب کو رخصت فرمایا۔

کوئٹہ سے قندھار تک کی منزلیں یہ تھیں:

(۱) کیتر (۲) حیدر زئی (۳) سدوزئی، جسے بعض نقشوں میں شادی زئی بھی لکھا ہے، (۴) مے زئی (۵) کوژک تیر (۶) چوکی (۷) کاریز ملا فتح اللہ خاں (۸) ایک ویرانے میں منزل (۹) قلعہ حاجی یادہ حاجی (۱۰) کاریز ملا عبداللہ (۱۱) خوشاب (۱۲) قندھار۔

کوئٹہ تک کے سفر کا بیشتر حصہ عام مسافروں ہی کی حیثیت میں طے ہوا تھا۔ زیادہ تر

لوگوں کی یہ کیفیت رہی کہ یا تو سید صاحب کے ساز وسامان اور لشکر کی قلت کو دیکھتے ہوئے عزمِ جہاد کے متعلق وسوسوں میں مبتلا ہو جاتے تھے، یا انہیں انگریزوں کا جاسوس سمجھ لیتے تھے۔ کوئٹہ سے قدم آگے بڑھا تو عوام کے جوشِ پذیرائی کا رنگ بالکل دوسرا ہو گیا، دور دور سے لوگ خربوزے وغیرہ لے کر راستے پر آبیٹھتے تاکہ اس قدوسی لشکر کی زیارت سے برکت حاصل کریں۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، عورتیں تبرکاً بچوں کے سروں پر ہاتھ پھراتیں، ہر طرف سے سلام علیک، مرحبا اور "ستڑے موشے" کی صدا بلند ہوتی، سید صاحب سب کے لئے دعاء فرماتے۔

سید صاحب کا دستور یہ تھا کہ ہر مملکت میں داخل ہوتے ہی قریب کے ذمہ دار افسر کو اپنے مقاصد سفر سے آگاہ کر دیتے تاکہ کوئی اور وسوسہ نہ گذرے۔ عبداللہ خاں سپہ سالار عساکر قندھار کو بھی اطلاع بھیج دی، سید صاحب حیدرزئی پہنچے تو لوگوں نے اہتمام سے دعوت کی، وہیں عبداللہ خاں کا خط پہنچا کہ مے زئی آئیں، چنانچہ سید صاحب کو راستہ چھوڑ کر ادھر جانا پڑا۔ عبداللہ خاں بڑے تپاک سے ملا اور تین روز اپنے پاس ٹھہرائے رکھا، اس اثناء میں قندھار سے اجازت آگئی، پھر سید صاحب روانہ ہوئے۔

مے زئی سے دس کوس پر کوہِ توبہ کا درہ ہے، جسے کوژک تیر کہتے ہیں۔ عشاء کے وقت اس کے دامن میں پہنچے، پہاڑ کی چڑھائی بڑی سخت تھی، صعود وہبوط کا کل فاصلہ اگرچہ چار کوس سے زیادہ نہ تھا، لیکن پورا دن اس میں لگ گیا اور شام کے وقت چوکی پہنچے۔ وہاں پانی کے دو تین چشمے تھے، اس مقام سے ایک راستہ سیدھا کابل جاتا تھا، دوسرا قندھار، سید صاحب نے قندھار والا راستہ اختیار کیا، اس لئے کہ حاکمانِ قندھار۔ سے مل کر کابل جانا چاہتے تھے، مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں بھی جہاد کی دعوت پہنچا دیں۔

افغانستان کی سیاسی کیفیت

اب آگے بڑھنے سے پہلے افغانستان کی سیاسی حالت کا سرسری نقشہ سامنے رکھ لینا

چاہیئے۔ افغانستان میں نئی حکومت کا آغاز احمد شاہ درانی سے ہوا، پھر اس کا بیٹا تیمور بادشاہ بنا، تیمور کے کئی بیٹے تھے، جن میں سے بعض کو مختلف علاقوں کی حکومتیں دے دی گئی تھیں، زمان شاہ نے تاج وتخت پر قبضہ کرلیا، وہ بڑا جوانمرد اور غیور تھا، اس کے بھائیوں میں سے محمود نے مخالفانہ چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔

زمان شاہ کے مشیروں میں سے پائندہ خاں بارک زئی بہت معزز ومقتدر تھا۔ اسے سرفراز خاں کا خطاب حاصل تھا۔ شاہ کے وزیر رحمت خاں (جسے بعد میں وفا دار خاں کا خطاب دیا گیا) کو پائندہ خاں اور بعض دوسرے قدیمی سرداروں سے بے وجہ کاوش پیدا ہوگئی، اس نے غلط بیانیوں سے شاہ کو سب کا مخالف بنا دیا، اور ایک مرتبہ غصے میں شاہ نے پائندہ خاں اور بعض دوسرے قدیمی سرداروں کو قتل کرادیا۔ پائندہ خاں کا قبیلہ بہت بڑا تھا، اور اس کے بائیس بیٹے تھے۔ وہ سب شاہ کے دشمن بن گئے۔ سب سے بڑا بیٹا فتح خاں بڑا بہادر اور زیرک تھا، اس نے شاہ محمود کے ساتھ ہوکر کابل پر چڑھائی کردی، زمان شاہ شکست کھا کر ہندوستان کی طرف بھاگا، جلال آباد کے قریب عاشق شنواری کے قلعے میں ستانے کیلئے ٹھہر گیا۔ عاشق نے اسے گرفتار کرادیا، محمود نے زمان شاہ کی آنکھوں میں سلائی پھرادی اور اسے قید کردیا۔

محمود بادشاہ بنا تو اس نے فتح خاں کو تمام امور کا کفیل بنا دیا۔ زمان شاہ کا ماں جایا بھائی شاہ شجاع مدت تک لڑتا رہا اور اسے اطمینان سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ بالآخر پنجاب ہوتا ہوا لدھیانہ پہنچ گیا۔ زمان شاہ ایران چلا گیا۔ پھر حج کیلئے حجاز پہنچا، آخر وہ بھی لدھیانہ آ گیا۔ انگریز اسے دو ہزار روپے وظیفہ دیتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں وفات پائی۔

ادھر محمود کے بیٹے کامران کو فتح خان کا اقتدار پسند نہ آیا۔ اس نے موقع پا کر فتح خان کو قتل کرادیا۔ اس کے بھائی مختلف علاقوں کے حاکم تھے، وہ سب خودمختار بن گئے۔ صرف ہرات محمود و کامران کے پاس رہ گیا۔

بارک زئیوں کی حکومت

پایندہ خاں کے قتل نے زمان شاہ کی سلطنت کا تختہ الٹ دیا تھا، فتح خاں کے قتل نے سدوزئیوں کی بساط حکومت لپیٹ دی اور بارک زئی افغانستان کے بڑے حصے کے مالک بن گئے، انہوں ے سلطنت کو یوں تقسیم کیا:

قندھار:	پردل خاں، شیر دل خاں، رحمدل خاں، مہردل خاں، کہن دل خاں، یہ پانچوں بھائی ایک ماں کے بطن سے تھے۔
غزنی	میر محمد خاں
کابل	دوست محمد خاں
پشاور	یار محمد خاں
کوہاٹ	سلطان محمد خاں
ہشت نگر	سید محمد خاں

فتح خاں کے بعد عظیم خاں سب میں بڑا تھا اور اسی کو سب سے افضل مانا جاتا تھا، اس نے ۱۸۲۳ء میں نوشہرہ میں سکھوں سے سخت جنگ کی تھی، وہ فوت ہوا تو اس کا بیٹا حبیب خاں جانشین بنا، آخر دوست محمد خاں سب پر غالب آیا اور اس نے آہستہ آہستہ پورے افغانستان پر قبضہ جمالیا۔ یار محمد خاں اور سلطان محمد خاں پشاور میں رہتے تھے، کبھی کبھی کابل بھی چلے جاتے تھے، سید صاحب کے ساتھ کشمکش یار محمد خاں ہی نے پیدا کی، یہی شخص ہے جسکی رخنہ اندازیوں کے باعث سید صاحب کیلئے قدم قدم پر خوفناک مشکلات پیدا ہوئیں۔ تمام بھائیوں میں سخت اختلافات تھے، سید صاحب نے ان اختلافات کو دور کرنے کی بے حد کوششیں کیں، لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ سید صاحب قلعہ حاجی پہنچے تو

پردل خاں کے بھائی شیر دل خاں (۱) کے انتقال کی خبر ملی، اسی وجہ سے بلوچستان کے ساتھ بھی صلح ہوگئی۔

قندھار میں قیام

کاریز ملا عبداللہ خاں میں پُر دل خاں کی طرف سے ایک سردار پندرہ سواروں کے ساتھ استقبال کے لئے پہنچ گیا تھا، اسی کی معیت میں سید صاحب ۲۸/محرم (یکم ستمبر ۱۸۲۶ء) کو قندھار پہنچے۔ شہر پناہ کی جنوبی دیوار سے ہوتے ہوئے ایک باغ میں پہنچے جو ہراتی دروازے کے باہر شہر سے آدھ کوس کے فاصلے پر تھا، وہیں انہیں ٹھہرایا گیا۔ مہمانداری کے تمام انتظامات پہلے سے کردیے گئے تھے، کھانے پینے کی جنسیں موجود تھیں، شرفاء، علماء اور عوام نے کئی میل باہر نکل کر استقبال کیا اور وہ قیامگاہ پر پہنچنے تک ساتھ رہے۔ دوسرے روز سید صاحب شیر دل خاں کی تعزیت کیلئے پُر دل خاں کے پاس گئے، وہ بڑے تپاک سے ملا، بے سروسامانی کے باوجود سید صاحب کے عزمِ جہاد پر بے حد متحیر ہوا۔

اس اثناء میں لوگ جوق جوق سید صاحب کے پاس پہنچ کر جہاد میں ساتھ لیجانے کی درخواستیں کرنے لگے۔ رجوعِ خلق کا یہ رنگ دیکھ کر پُر دل خاں پر سراسیمگی طاری ہوگئی، پہلے اس نے کوشش کی کہ شہر کے دروازوں پر لوگوں کو روکا جائے، یہ تدبیر کارگر ثابت نہ ہوئی تو سید صاحب کے پاس پیغام بھیج دیا کہ لوگ شوقِ جہاد میں آپ کے ساتھ جانے کیلئے خاص جوش سے تیار ہو رہے ہیں، اور ہمارے انتظام میں خلل پیدا ہوگیا ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ جلد سے جلد کابل روانہ ہوجائیں، ورنہ ہمارے اور آپکے درمیان بے لطفی پیدا ہوجائیگی۔ یہ بھی کہلا بھیجا کہ جو لوگ جانے کیلئے تیار ہیں، انہیں روک دیجئے اور ساتھ

(۱) شیر دل خاں نے شدید تپ میں مبتلا ہو کر ۲۵/محرم الحرام ۱۲۴۲ھ (۲۹/اگست ۱۸۲۶ء) کو وفات پائی۔ سید صاحب تین روز بعد قندھار پہنچے۔

نہ لے جائیے۔ اس وجہ سے سید صاحب کو چھٹے روز قندھار سے نکلنا پڑا، اگر پُر دل کی طرف سے رکاوٹ پیدا نہ ہوتی تو قندھار ہی سے سید صاحب بہت بڑا لشکر تیار کر لیتے۔

قندھار سے غزنی

قندھار سے غزنی تک کی منزلیں یہ تھیں:

(۱) کاریز حاجی عبداللہ (۲) قلعہ اعظم خاں (۲) دہ ملا نور محمد (۳) شہر صفا (۴) جلوگیر (۵) توت (۶) قلعہ رمضان خاں (۷) جلدک (۸) کوڑم (۹) خاکہ (۱۰) بشمل زئی (۱۱) قلعہ ملا نور محمد (۱۲) قلعہ ملا تاج محمد (۱۳) کاریز اٹک (۱۴) مشکئی (۱۵) نانی (۱۶) غزنی۔

اگرچہ سید صاحب نے پُر دل خاں کی خواہش کے مطابق سب لوگوں کو محبت سے سمجھا بجھا کر روک دیا تھا، لیکن جب آپ قلعہ اعظم خاں میں پہنچے تو چار سو آدمی جہاد کے لئے تیار ہو کر آ گئے، ان میں علماء و شرفاء بھی تھے۔ ناچار سید صاحب نے اخوند ظہور اللہ کو پُر دل خاں کے پاس بھیجا کہ سارے حالات بتا کر کہیں، اجازت ہو تو انہیں ساتھ لے جاؤں۔ پُر دل خاں کو یہ اندیشہ کھائے جا رہا تھا کہ اگر سید صاحب ٹھہر گئے تو مزید لوگ تیار ہو جائیں گے، اس نے کہا کہ ان لوگوں کو بیشک لے جایئے، لیکن جلد سے جلد چلے جایئے۔ چنانچہ سید صاحب نے دوسو ستر آدمی چن کر ساتھ لے لئے اور سید دین محمد قندھاری کو ان کا سالار بنایا۔ یہ سید صاحب کے لشکر کی قندھاری جماعت تھی جس کے سالار بعد میں ملا لعل محمد قندھاری بنے۔ توت کے قریب شاہراہ پر دو فریقوں میں جنگ ہو رہی تھی، سید صاحب تھوڑا سا چکر کاٹتے ہوئے اس مقام سے بچ کر نکل گئے۔

خوانین غلزئی

قلعہ رمضان خاں سے جلدک جا رہے تھے کہ خوانین غلزئی کی جانب سے دعوت

نامہ ملا، انہیں سرداروں کے اجداد نے افغانستان کو پہلے پہل آزاد کرا کے ایک مستقل حکومت کی بنیاد رکھی تھی، پھر انہوں نے ایران کے بڑے حصے کو بھی مسخر کر لیا تھا، نادر شاہ افشار نے انہیں شکستیں دے کر پہلے ایران سے نکالا، پھر قندھار و کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔ نادر کے قتل پر قومی حکومت کی عنان درانیوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ سید صاحب نے غلزئی خوانین کی دعوت قبول نہ کی اور معذرت میں کہلا بھیجا کہ اگر دعوت قبول کر لوں تو غزنی، کابل اور پشاور کے حاکم خواہ مخواہ وسوسوں میں مبتلا ہو جائیں گے، ان لوگوں کو غلزئیوں پر بالکل بھروسا نہ تھا، اور ان سے جو ملتا تھا اسے بھی شک وشبہ کی نگاہوں سے دیکھنے لگتے تھے۔ جلدک پہنچے تو غلزئی سرداروں کی طرف سے دو سوار نیا دعوت نامہ لے آئے، سید صاحب نے دوبارہ معذرت کی اور مصلحتیں تفصیل سے لکھ بھیجیں، اس پر انہوں نے لکھا کہ ہم خود حاضر ہونے کا ارادہ کر رہے تھے، تاکہ اگر آپ ہمارے مہمان نہیں بن سکتے تو کم از کم ہم بیعت سے تو محروم نہ رہیں۔ گرامی نامہ پڑھ کر یہی فیصلہ کیا کہ ہماری حاضری سے آپ کے کارِ خیر میں بے وجہ الجھنیں پیدا ہوں گی۔ ساتھ ہی عرض کیا کہ آغازِ جہاد کی اطلاع جب ہمیں ملے گی چالیس پچاس ہزار سوار پیادے لے کر کوہستان کے راستے خدمتِ والا میں حاضر ہو جائیں گے۔(۱)

کوڑم پہنچے تو شہاب الدین خاں ملا جس کے اجداد غلزئیوں کی بادشاہی کے زمانے میں وزارت پر فائز تھے، اس نے بھی سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ بلاوا آتے ہی جہاں حکم ہوگا، پہنچ جاؤں گا۔

(۱) خانخاناں ان خوانین میں سے ممتاز تھا۔ یہ عبدالرحیم کا فرزند اور شاہ حسین غلزئی کا پوتا تھا جس سے نادر شاہ نے قندھار چھینا تھا۔ شاہ حسین غلزئی شاہ محمود کا بھائی تھا، جس نے ایران کو فتح کیا تھا۔ خانخاناں کے نام سید صاحب کے مجموعہ مکاتیب میں کئی مکتوب ہیں۔

حکامِ کابل وغزنی کے نام خطوط

مشکئی سے سید صاحب نے حاکم غزنی اور حاکم کابل کے نام خط بھیجے، جنہیں پہنچانے کے لئے ملا ظہور اللہ جہانگیر اولاً تجویز ہوا، وہ ہندوستان میں رہ چکا تھا، اور ٹونک سے ساتھ آیا تھا۔ بیس آدمی اس کے ساتھ کر دیے، مضمون یہ تھا:

ما زمرۂ مومنین ہندی در کفرستان ہندوستان بہ تنگ آمدہ بہ عزمِ جہاد وہجرت از وطن گزیدہ برائے دعوتِ مسلمین بناء بر اقامت آں رکن رکین جہت تائید ملتِ بیضاء حضرت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ابتغاءً لمرضات اللہ ایں قدر مسافت دور و دراز طے نمودہ، در بلادِ شما رسیدہ ہمیں طور منتہائے سر خود تا بہ دیار یوسف زئی کہ در حوالیٔ پشاور است پیش نہاد خاطر ساختہ از راہ شہر ہائے شما خواہیم رفت۔ لازمہ دانائی و مروت ایں کہ چیزے توحش بہ خاطر نیاوردہ اجازت نامہ قبل از رسیدن ما فرستید کہ بلا وسوسہ ازاں حدود بہ سمتِ مقصود بگزریم۔

ترجمہ : ہم ہندی مسلمانوں نے ہندوستان کے کفرستان سے تنگ آکر جہاد کے ارادے سے ہجرت کی، مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دیتے اور حضرت سید المرسلینؐ کی ملت بیضا کی تائید پر آمادہ کرتے ہوئے رضائے باری تعالیٰ کے شوق میں لمبی مسافت طے کر کے آپ کے بلاد میں پہنچ گئے ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اسی طرح یوسف زئی میں پہنچ جائیں جو پشاور کے حوالی میں ہے، مروّت و دانائی کا لازمہ یہ ہے کہ دل میں کسی قسم کا وسوسہ نہ لائیں، ہمارے پہنچنے سے پہلے اجازت نامہ بھیج دیں تا کہ ہم کھٹکے کے بغیر ان حدود سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں۔

میر محمد خاں حاکم غزنی کو خط ملا، وہ دورہ کرتا ہوا ایک روز سید صاحب کی منزل کے قریب پہنچ گیا، پھر ضروری کام پیش آ گیا اور اسے ملے بغیر واپس جانا پڑا۔ لہٰذا معذرت

کیساتھ لکھ بھیجا کہ تشریف آوری ہمارے لئے انتہائی سعادت اور خوشی کا باعث ہوگی۔(۱)

سید صاحب غزنی پہنچے تو لوگوں نے جوش وخروش سے استقبال کیا، وہ دور دور تک راستے کے دونوں طرف کھڑے تھے، پہلے سے روضہ (۲) میں سید صاحب کے قیام کے لئے جگہ مقرر ہو چکی تھی، میر محمد خاں کا بیٹا باوجود آشوبِ چشم سید صاحب کے استقبال میں شریک ہوا، خود خان نے روضہ میں سید صاحب سے ملاقات کی۔

سید صاحب صرف دو روز غزنی میں ٹھہرے، اس اثناء میں کابل سے خیر مقدم کا خط آ گیا۔ ۲۵ رصفر ۱۲۴۲ھ (۲۸ رتمبر ۱۸۲۶ء) کو غزنی سے روانہ ہو کر ہفت آسیاب، شیخ آباد اور میدان ٹھہرتے ہوئے قلعہ قاضی پہنچے، جس کے بعد اگلی منزل کابل تھی۔ قلعہ قاضی میں مصلحتاً قیام رہا۔ ۲۹ رصفر کو وہاں ربیع الاول کا چاند دیکھا، یکم ربیع الاول کو قاضی قلعہ سے روانہ ہوئے۔ حاکم کابل کی طرف سے پہلے حاجی ملا علی استقبال کے لئے آیا، جو سلطان محمد خاں کی فوج میں سردار تھا، اور بڑے سرداروں میں محسوب تھا، پھر سلطان محمد خاں نے اپنی طرف سے امین اللہ خاں کو وکیل بنا کر بھیجا۔ (۳) شہر ایک کوس رہ گیا تو خلقت کا ہجوم اس قدر بڑھ گیا کہ چلنا بھی مشکل ہو گیا۔ سلطان محمد خاں اپنے بھائیوں اور پچاس سواروں کے ساتھ شہر کے دروازے پر منتظر کھڑا تھا، سید صاحب نمودار ہوئے تو خان اور

---

(۱) یہ بھی معلوم ہوا کہ ملا نور محمد شاغاثی سید صاحب کا پرانا معتقد تھا، سفر حج میں ساتھ تھا، وہ مدینہ منورہ سے بیت المقدس گیا اور بغداد ہوتا ہوا واپس آیا۔ ملاقات کے لئے بریلی جا رہا تھا کہ خبر ملی کہ سید صاحب ہجرت فرما گئے، چنانچہ وہ گوالیار کی طرف پلٹا، آنا میں ملاقات ہوئی، ٹونک تک ساتھ رہا، وہاں سے وطن آ گیا، جو نانی کے متصل تھا۔ چنانچہ وہ مع پسر و برادر ملاقات کے لئے حاضر ہو گیا۔ ملا مومن، عبدالرحمٰن خاں قندھاری کے مصاحبوں میں تھا، مدت تک لکھنؤ میں رہا، خیر آباد میں اس نے شادی کی تھی، ملاقات کے لئے پہلے تکیہ پھر قندھار پہنچا۔ بشمل زئی سے دو تین کوس پر راستے میں بیٹھا تھا، سید صاحب چالیس سواروں کے ساتھ اس کے مکان پر گئے۔

(۲) روضہ اس مقام کو کہتے ہیں جہاں سلطان محمود غزنوی کا مقبرہ ہے، اس کے ساتھ ایک وسیع باغ ہے اور پاس آبادی ہے۔ یہ مقام موجودہ غزنی سے تین میل مشرق میں ہے۔

(۳) سلطان محمد خاں اس وقت کابل میں تھا۔

اس کے بھائی احتراماً گھوڑے سے اتر گئے اور معانقہ کیا۔ پہلے سید صاحب کو سوار کرایا، پھر خود سوار ہوئے۔

کابل میں قیام

سید صاحب کے قیام کے لئے پہلے سے وزیر فتح خاں کا باغ تجویز ہو چکا تھا اور آپ شہر سے گذر کر باغ میں پہنچ گئے۔

قیامِ کابل کی تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں، سید صاحب کے ایک مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کم و بیش پینتالیس روز کابل میں ٹھہرے رہے (از یکم ربیع الاول تا ۱۵ ربیع الثانی) ایک کام یہ تھا کہ امرائے کابل کو جہاد میں ہرگونہ اعانت پر آمادہ کریں۔ دوسرا کام یہ تھا کہ بھائیوں میں اتفاق پیدا کردیں، ان میں سخت اختلافات بپا تھے، جن کی وجہ سے ان کی قوت ایک دوسرے کے خلاف ہورہی تھی اور سلطنت کا شیرازہ بکھرا جارہا تھا۔ سید صاحب خود فرماتے ہیں:

> فقیر بنا بر امید ایں معنی کہ شاید بہ سعی من رفع منازعت و وقوع مصالحت صورت بندد، چہل و پنج روز تخمیناً در آں بلدہ اقامت نمود، آخر الامر چوں سعی خود را مفید نہ دید رختِ اقامت از بلدۂ مذکورہ بر کشید۔ (۱)
>
> **ترجمہ:** میں اس امید پر پینتالیس رز کابل میں بیٹھا رہا کہ شاید میری کوشش سے جھگڑا رفع ہوجائے اور مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ آخر جب دیکھا کہ میری سعی سودمند نہیں ہوسکتی تو وہاں سے رختِ قیام اٹھا کر نکل پڑا۔

(۱) منظورہ ص: ۳۱۶۔ ایک عجیب و غریب بیان میری نظر سے گذرا یعنی سلطان محمد خاں اور دوست محمد خاں کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت نہ بنی تو سلطان محمد خاں، غلزئیوں اور بعض دوسرے سرداروں نے یہ تجویز پیش کی کہ دوست محمد خاں کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جائے اور سید صاحب کو حکمراں بنا کر سکھوں سے جنگ کی جائے۔ سید صاحب نے یہ تجویز منظور نہ کی۔

سلطان محمد خاں کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کابل میں وعدہ کیا تھا کہ سید صاحب کو ایک خاص رقم برابر پہنچتی رہے گی۔(۱) سید محمد خاں نے بھی ایک خط میں ذکر کیا ہے کہ پشاور تک سید صاحب کو اسی نے پہنچایا تھا اور زرِ نقد کے علاوہ گھوڑے بھی پیش کئے تھے۔(۲)

سید صاحب کے عزمِ جہاد نے لوگوں میں خاص جوش اور شیفتگی پیدا کر دی تھی، لیکن وہ سامان ولشکر کی قلت دیکھ کر افسردہ ہو جاتے تھے۔ ایک روز دیوان حافظ سے فال نکالی گئی تو یہ شعر نکلا:

تیغے کہ آسمانش از فیض خود دہد آب تنہا جہاں بگیرد بے منت سپاہی

یہی شعر ایک مرتبہ رائے بریلی میں بھی نکلا تھا، جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

منزلِ مقصود

میرے اندازے کے مطابق سید صاحب ۲/اکتوبر کو کابل پہنچے تھے، اگر پینتالیس روز وہاں ٹھہرے تو ۱۵ یا ۱۶ نومبر کو نکلے ہوں گے۔ پانچ روز میں پشاور پہنچ گئے، غالباً جلال آباد اور ڈکہ کا راستہ اختیار کیا ہوگا، اس راستے میں بھی لوگوں کا جوشِ پذیرائی انتہا پر پہنچا ہوا تھا جیسا کہ خود سید صاحب کے بیان سے واضح ہوتا ہے۔(۳)

پشاور میں سید صاحب صرف تین دن ٹھہرے، پھر چارسدہ چلے گئے۔ بعد ازاں جہاد کا آغاز ہو گیا۔ اس کے حالات آئندہ ابواب میں بیان ہوں گے۔

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۱۱۳

(۲) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۳۱۴

(۳) منظورہ ص: ۳۱۶ سے سید صاحب کا بیان یہ ہے: در اثنائے ایں راہ ہم مثل سابق بلکہ زائد ازاں از دعام مومنین مخلصین و اجتماع مسلمین صادقین پیش آمد۔

هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ

اب آپ اس سفر پر ایک نظر پھر ڈال لیں جس میں کم و بیش دس مہینے بسر ہوئے، اور مسافت اڑھائی تین ہزار میل سے کم نہ ہوگی۔ رائے بریلی سے بندیل کھنڈ ہوتے ہوئے گوالیار اور ٹونک پہنچے، پھر راجپوتانہ کے بے آب و گیاہ ریگ زار طے کئے، جنوب مشرق سے سندھ میں داخل ہوئے تو شمال مغرب سے باہر نکلے، اس کے بعد بلوچستان کا صحرائی علاقہ، قیامت خیز گرمی، پھر خشک پہاڑ، خطرناک درے، دشوار گزار گھاٹیاں، اکثر کھانے کی تکلیف، پانی کی قلت، زیادہ تر متواتر سفر، بیشتر غازی پیدل، ان تمام مقامات میں سے سفر کی مشکلات کا اندازہ آج کے حالات کی بناء پر نہیں، بلکہ سوا سو سال پیشتر کے حالات کی بناء پر کرنا چاہئے۔

تاریخ ہند کے اوراق کو خوب کھنگال لو، پھر بتاؤ کہ کیا کوئی ایسی جماعت مل سکتی ہے جس نے احیاءِ دین، اعلاءِ کلمۃ الحق اور آزادیٔ بلادِ مسلمین کے لئے ایسی صعوبتیں دلی عشق و شیفتگی کے ساتھ قبول کی ہوں، جس طرح سید صاحب کی جماعت نے قبول کیں؟

اس ساری مدت میں ایک شخص کی زبان پر کبھی حرفِ شکایت نہ آیا، راحت و آسایش کو چھوڑ کر اذیتوں کے مواج سمندر میں کود پڑنے پر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی کو پشیمانی نہ ہوئی۔ یہ تھی وہ قدوسی جماعت جسے سید صاحب نے چند برسوں میں تیار کیا، یہ تھی وہ جماعت جسے ہم سوا سو برس تک یا تو مجانین کا گروہ سمجھتے رہے یا دینداری کی رگ جوش میں آئی تو تکفیر کے تیر اس پر برسانے لگے، یا بہ درجۂ آخر اسے ناقابل توجہ قرار دے لیا، حالانکہ اس متاعِ عزیز کو ہزار سالہ اسلامیت ہند کا سر جوش سمجھنا چاہئے۔ اگر یہ متاع اپنے دامن سے نکال پھینکیں تو تاج و تخت یا مادی عظمت و جبروت کے لئے ایک ہنگامۂ مسلسل کے سوا ہمارے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ اسی ہنگامے کی ہمہ سوز آگ آخر ہمارے تاج و تخت اور عظمت و جبروت کو بھی خاکستر بنا گئی۔

تیسواں باب:

پنجاب و سرحد کا دَورِ مصائب

مغلوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب

اب آگے بڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ جس قوت سے سید صاحب کو سابقۂ جنگ پڑا، وہ کیوں کر معرضِ وجود میں آئی اور کن حالات میں پنجاب پر مسلط ہو کر اس نے سرحدی علاقوں پر تر کتازیں شروع کیں؟ نیز اس وقت سرحدی علاقوں کا نقشہ کیا تھا؟ یہ داستان اس وجہ سے بھی اختصاراً بیان کر دینی چاہئے کہ اس کے بغیر سید صاحب کے کام کی عظمت اور مشکلات کی وسعت و شدت کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے بھی خاص توجہ کی مستحق ہے کہ اس میں عبرت و موعظت کا ذخیرۂ وافر موجود ہے۔

ہندوستان میں مغلوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ خانہ جنگی تھی جس کے جراثیم ابتدا ہی سے موجود تھے۔ عالمگیر اعظم کی وفات کے بعد یہ اس درجہ عام ہو گئی تھی کہ کسی شہزادے کیلئے دریائے خون سے گذرے بغیر تخت تک پہنچنا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ امراء نے بھی مختلف شہزادوں کی پاسداری کو اپنے عروج کی سیڑھی بنا لیا تھا، اس طرح وہ خود بھی یکے بعد دیگرے خانہ جنگی کی آگ کا ایندھن بنتے رہے اور سلطنت کی عظمت و شوکت کو بھی بے پروائی سے اسی بھٹی میں جھونکتے گئے۔

اس مسلسل رزم و پیکار نے مرکز کو بالکل بیدم کر دیا اور سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ بعض صوبیداروں نے اپنے اپنے علاقوں میں خود مختاری کی بنیاد رکھ دی، نئی نئی قوتوں نے ابھر کر جگہ جگہ پاؤں جمانے کا بندوبست کر لیا۔ دکن میں مرہٹوں کا زور ہوا، پھر وہ

ہندوستان کے بڑے حصے پر چھا گئے۔ پنجاب میں سکھوں نے جتھے بنا کر قتل و غارت کا سلسلہ جاری کر دیا، انگریزوں نے کرناٹک، بنگال، بہار اور اڑیسہ کو اپنے زیرِ اثر لانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

بندا بیراگی

سکھوں کی منظم غارت گری کا آغاز بندا بیراگی سے ہوا۔ یہ شخص پونچھ کا رہنے والا تھا، بیراگی بن کر پھرتا پھراتا سکھوں کے دسویں اور آخری مذہبی پیشوا گرو گوبند سنگھ سے وابستہ ہو گیا۔ گرو جی ۱۷۰۸ء میں ناندیڑ (حیدر آباد دکن) میں فوت ہوئے تو بندا سکھوں کا ایک گروہ ساتھ لے کر شمالی ہند میں آ گیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ اس وقت راجپوتانہ کے فتنہ انگیزوں کی سرکوبی کر رہا تھا، بیراگی نے دہلی کے شمالی و مغربی علاقے میں جمعیت فراہم کی اور سرہند پر چڑھائی کر دی، جہاں عام روایت کے مطابق گرو گوبند سنگھ کے دو صاحبزادوں کو زندہ دیواروں میں چن دیا گیا تھا۔ سرہند کا حاکم وفوجدار مقابلے کے لئے نکلا، اتفاق سے ایک تیر اس کے حلق میں لگا اور وہ مارا گیا۔ فوج بکھر گئی، بیراگی نے شہر کے ساتھ جو سلوک کیا وہ لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ قتل عام شروع ہو گیا، یہاں تک کہ بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی نہ چھوڑی گئیں اور شہر کو آگ لگا دی گئی۔ صاحبزادوں پر ظلم کا ذمہ دار کوئی ہو، مگر بدلہ بے گناہ لوگوں یا مکانوں اور اینٹوں سے لیا گیا، جو کسی بھی صورت میں اصل فعل کے ذمہ دار نہ تھے۔

جان میلکم کا بیان

پھر یہ سیلِ ظلم وستم دریائے ستلج کو عبور کر کے شمالی سمت میں بڑھا، قتل و غارت اور آتش زنی کے سوا اس کا کوئی مشغلہ نہ تھا، جان میلکم نے لکھا ہے:

ہمیشہ یاد رہنے والی اس یورش کی تفصیلات بیان کرنا غیر ضروری ہے۔

تمام روایتوں کے مطابق یہ بدترین لعنت تھی، جو کبھی کسی ملک کے لئے سرچشمۂ آزار بنی۔ نہایت درجہ وحشیانہ بربریت جن تعدیوں کی مرتکب ہوسکتی تھی، اور انتقام کی بھڑکتی ہوئی آگ جن بے دردیوں کی جانب رہنمائی کرسکتی تھی، وہ سب اس صوبے (پنجاب) کے تمام بدنصیب باشندوں پر پوری شدت سے نازل ہوئیں۔ جہاں جہاں ان یورشیوں کے قدم پہنچے صرف ان لوگوں کو زندہ چھوڑا گیا جنہوں نے سکھ دھرم قبول کرلیا اور سکھوں کی سی وضع قطع کے پابند ہوگئے۔(۱)

بادشاہ کی آمد

پھر بربریت کا یہ طوفان دریائے بیاس سے گذر کر بٹالہ جا پہنچا، وہاں کے لوگوں نے مردانگی سے بیراگی کا مقابلہ کیا، مگر شکست کھا گئے، اور سرہند کی داستانِ ظلم بٹالہ میں بھی پورے اہتمام سے دہرائی گئی۔ بٹالہ سے بیراگی کے لشکریوں نے لاہور کا رُخ کرلیا، اگرچہ وہ لاہور کو فتح نہ کرسکے لیکن شالامار باغ تک ہر خطے کو برباد کرڈالا۔ بہادر شاہ کو یہ حالات معلوم ہوئے تو راجپوتانہ سے بجلی کی تیزی کے ساتھ پنجاب پہنچا، بیراگی کو بادشاہ کی آمد کا علم ہوا تو پہاڑوں میں جا چھپا، تعاقب میں فوج بھیجی گئی، جس نے بیراگی کو کئی شکستیں دیں۔ ایک مقام پر وہ شاہی فوج کے نرغے میں آگیا، لیکن بھیس بدل کر بچ نکلا، بادشاہ نے لاہور میں ٹھہر کر سارے برباد شدہ علاقے کو ازسرنو آباد کرایا۔ ۱۷۱۲ء میں لاہور ہی میں وفات پائی، ساتھ ہی اس کے بیٹوں میں تاج وتخت کے لئے جنگ شروع ہوگئی۔ معزالدین اپنے تین بھائیوں کو مار کر جہاندار شاہ کے لقب سے بادشاہ بنا، اس کا بھتیجا

(۱) میں نے شہادتیں پیش کرتے وقت اس امر کا خاص خیال رکھا کہ زیادہ تر ان لوگوں کے بیانات درج کروں جن کے متعلق جانبداری کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ جو ہندوستانی اقوام میں سے مسلمانوں کو سب سے برا سمجھتے تھے، کیوں کہ مسلمانوں کو دبائے بغیر ان کی حکومت استوار نہیں ہوسکتی تھی۔

فرخ سیر بن عظیم الشان عظیم آباد پٹنہ کا گورنر تھا۔ اس نے ساداتِ بارہہ (عبداللہ خاں حسن علی اور امیر الامراء حسین علی) کو ساتھ ملا کر جہاندار شاہ سے بدلہ لینے کی ٹھان لی، اس خانہ جنگی نے بندا بیراگی کو پھر لوٹ مار شروع کرنے کا موقع دے دیا۔

عبدالصمد خاں دلیر جنگ

جہاندار شاہ صرف ایک برس بادشاہ رہا اور فرخ سیر سے شکست کھا کر مارا گیا۔ فرخ سیر نے بادشاہ بنتے ہی بیراگی کی گوشمالی پر خاص توجہ مبذول کی۔ اس مقصد کے لیے عبدالصمد خاں دلیر جنگ کو پنجاب کا گورنر بنایا، جو تورانی امیروں میں بڑا قابل اور دلیر تھا۔ دلیر جنگ نے تھوڑے ہی دنوں میں بیراگی اور اس کے سات آٹھ سو آدمیوں کو گرفتار کرلیا۔ یہ قیدی پہلے لاہور لائے گئے، پھر انھیں دہلی بھیجا گیا۔ عام لوگ بیراگی کے ظلم وستم سے اس درجہ غیظ وغضب میں آئے ہوئے تھے کہ جہاں سے ان قیدیوں کے گذرنے کی خبر پہنچتی، مرد، عورتیں اور بچے سنگ وخشت لے کر راستوں پر آ بیٹھتے۔ دہلی پہنچنے کے بعد یہ سب کیفر کردار تک پہنچے۔

بیراگی کو سزائے موت دینے سے پہلے پوچھا گیا کہ تو نے اتنے ظلم کیوں کئے اور بے گناہوں کو کس وجہ سے موت کے گھاٹ اتارا؟ اس نے جواب دیا کہ جب بندگانِ خدا کی سرکشی حد سے بڑھ جاتی ہے:

> منتقم حقیقی در مکافاتِ اعمال آنہا چوں من ظالمے رامے گمارد تا جزائے هر یکے در کنارش نہد، بعد ازاں مثل شما مقتدراں را بر وتسلط دادہ اورا بہ سزائے کردارش مے رساند۔(۱)

ترجمہ: منتقم حقیقی سرکشوں کو ان کی بدعملیوں کی سزا دینے کے لئے مجھ ایسے ظالم کو مقرر کر دیتا ہے۔ پھر تم ایسے طاقتوروں کو اس ظالم پر مسلط کر دیتا

(۱) سیر المتاخرین ص:۴۰۲

ہے، تاکہ اسے کیفر کردار کو پہنچائیں۔

مرکزی حکومت کی ابتری اور پنجاب کی حالت

فرخ سیر کی بادشاہی کا ابتدائی دور بہت اچھا تھا، پھر ساداتِ بارہہ سے اختلافات شروع ہو گئے، جن کی وجہ سے وہ مارا گیا اور سید برادران سلطنت کے مختارِ کل بن گئے۔ وہ جس شاہزادے کو اپنے ڈھب کا پاتے شاہی تخت پر بٹھا دیتے، آخر شاہ عالم اول کے پوتے اور جہاں شاہ خجستہ اختر کے بیٹے روشن اختر کو محمد شاہ کے لقب سے بادشاہ بنایا گیا، اس کے عہد میں مختلف امیروں نے مل کر سید حسن علی اور سید حسین علی کو ختم کیا۔

اس ساری مدت میں پنجاب نواب عبدالصمد خاں دلیر جنگ کے زیر نگرانی ہر آفت سے محفوظ رہا۔ نواب نے ۱۷۳۷ء میں وفات پائی تو اس کا قابل فرزند زکریا خاں گورنر بن گیا۔ ۱۷۳۹ء میں ایران سے نادر شاہ آندھی کی طرح آیا، اس کی یورش نے مغلوں کی مرکزی حکومت کا رہا سہا وقار بھی تباہ کر ڈالا اور جو نوادر دو سو برس سے دہلی کے خزانے میں جمع ہو رہے تھے، انہیں بھی جھاڑو سے سمیٹ کر ساتھ لے گیا۔ مرکزی حکومت کی ابتری نے فساد و انتشار کی رفتار بہت تیز کر دی اور مخالف قوتوں نے مغل سلطنت کو بازی گاہِ عام بنا دیا۔

پنجاب میں زکریا خاں کے بعد عبدالصمد خاں دلیر جنگ کا بھتیجا معین الملک گورنر بنا، اس نے سکھوں کا فتنہ بھی دبایا اور ابدالیوں کی ترکتازوں کے باوجود صوبے کا امن بھی بحال رکھا۔ وہ مرا تو آخری بند ٹوٹ گیا جو فتنوں کے سیل کو روکے کھڑا تھا، مرکز میں نظام الملک آصف جاہ کا پوتا عماد الملک مختارِ کل بن گیا اور پنجاب میں آدینہ بیگ برسرِ اقتدار آ گیا۔ آخری دور میں مغلوں کی تباہی کے یہ دو سب سے بڑے عامل تھے۔ عماد الملک نے مرہٹوں اور جاٹوں کو ذاتی اغراض کی پیش بُرد کے لئے سہارا دے کر کھڑا کیا، آدینہ

بیگ نے سکھوں کے غارت گر جتھوں کی تربیت و پرورش کو اپنا نصب العین بنا لیا، احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں پر کاری ضرب لگائی۔ ۱۷۶۲ء میں سکھوں کو خوفناک سزا دی۔ سکھ اس تادیب کو ''گھلو گھاڑا'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، یعنی نادیدہ آفت، مگر فتنوں کی آگ ایک مرتبہ سلگی تو پھر نہ بجھی۔

تھوڑی دیر بعد سکھوں کے غارت گر جتھے جنہیں مسلیں کہتے تھے، پنجاب میں جگہ جگہ قدم جما کر بیٹھ گئے، وہ عوام کو بھی لوٹتے اور آپس میں بھی لڑتے۔ ان میں سے تین مسلوں کے سردار لاہور پر قابض ہو گئے، شہر اور اس کے حوالی کو تین حصوں میں بانٹ لیا، جنوبی سمت میں نیاز بیگ تک سوبھا سنگھ کی حکومت تھی، مشرقی سمت میں کابلی مل کی حویلی تک کا علاقہ گوجر سنگھ کے ماتحت تھا، جس کے نام سے قلعہ گوجر سنگھ کا علاقہ منسوب ہے، باقی سارا شہر جس میں قلعہ اور شاہی مسجد وغیرہ شامل تھے، لہنا سنگھ کی تحویل میں آ گیا۔ یہی تین سکھ سالار تھے، جنہوں نے شالامار میں سے سنگ یشب کا قیمتی سائبان اُٹھوایا اور چوبیس ہزار میں لاہور کے سنگ تراشوں کے ہاتھ بیچا۔

رنجیت سنگھ

اس عہد میں پنجاب کے باشندوں پر جو مصیبتیں نازل ہوتی رہیں ان کی داستان بڑی دردناک ہے۔ سکھوں کی ایک مسل شکور چکیہ مسل کہلاتی تھی، اس کے سالاروں میں چڑھت سنگھ اور مہاں سنگھ نے خاصی شہرت حاصل کر لی۔ مہاں سنگھ کا بیٹا رنجیت سنگھ تھا ۱۷۸۰ء میں پیدا ہوا، ابھی لڑکا ہی تھا کہ باپ کے مرنے پر مسل کا سردار بن گیا، عقلمند اور دور اندیش نوجوان تھا، احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ کی توپیں دریا میں گر گئی تھیں، انہیں نکلوا کر شاہ کی خدمت میں پیش کیا اور خوشنودی کا پروانہ لیا۔ پھر اہل لاہور سے خفیہ خفیہ ساز باز کر کے ۱۷۹۹ء میں نواں کوٹ کے چودھری محکم دین کی مدد سے لاہور پر

قابض ہوگیا۔ بعد ازاں آہستہ آہستہ حسنِ تدبیر سے اپنا اختیار بڑھانے لگا۔ ۱۸۰۹ء میں انگریزوں کے ساتھ عہد نامہ کرلیا، جس میں دریائے ستلج رنجیت سنگھ اور انگریزوں کے درمیان پکی حد بن گیا۔ جنوبی و مشرقی جانب سے بے فکر ہوکر رنجیت سنگھ نے شمال و مغرب میں پیش قدمی شروع کردی۔ پنجاب میں کوئی قابل ذکر قوت تھی نہیں، چھوٹے چھوٹے رئیس یا زمیندار تھے، رنجیت سنگھ ایک ایک کرکے سب کو کھا گیا۔ افغانستان میں بھی خانہ جنگی کی آگ شعلہ زن تھی، جس کا ذکر ہم پہلے ذکر چکے ہیں، اس کی وجہ سے بھی رنجیت سنگھ کو بڑا فائدہ پہنچا۔ کشمیر اور اٹک اسی خانہ جنگی کے باعث اسے ملے، یہ کہانی بڑی عبرت انگیز ہے۔

عطا محمد خاں اور اسکا بھائی جہاں داد خاں حکومت افغانستان کی طرف سے علی الترتیب کشمیر اور اٹک کے گورنر تھے، دونوں سرکشی پر آمادہ تھے، وزیر فتح خاں نے انہیں سزا دینی چاہی، جہاں داد خاں مطیع بنا رہا، فتح خاں نے پنجاب کے راستے کشمیر پر حملے کا ارادہ کیا اور رنجیت سنگھ سے بھی مدد مانگی۔ وعدہ یہ کیا کہ کشمیر کے مالِ غنیمت سے تیسرا حصہ سکھوں کو دیا جائے گا، سکھ اور افغان فوجیں پیر پنجال کے دامن میں پہنچیں تو راستے برف سے اٹے پڑے تھے، سکھ آگے نہ بڑھ سکے اور افغانوں نے بے تکلف پیش قدمی کرکے کشمیر لے لیا۔ چونکہ سکھ فوج سے کوئی مدد نہیں ملی تھی، اس لئے اسے حصہ بھی نہ دیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے یہ بات دل میں رکھی، وزیر فتح خاں واپس چلا گیا تو جہاں داد نے خفیہ خفیہ رنجیت سنگھ سے ساز باز کرکے پنجاب میں جاگیر لے لی اور اٹک کا قلعہ سکھوں کو دے دیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر فتح خاں مارا گیا تو رنجیت سنگھ نے کشمیر پر بھی قبضہ کرلیا۔

صوبہ سرحد کی حالت

فتح خاں کے بعد عظیم خاں بارک زئیوں کا سردار بنا، اس کے بھائی یار محمد خاں، پیر

محمد خاں، سلطان محمد خاں اور سید محمد خان پشاور میں رہتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اٹک سے آگے بڑھ کر پیش قدمی شروع کی تو یار محمد خاں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور خراج دینے لگا، عظیم خاں کو اس پر سخت غصہ آیا وہ لڑائی کے ارادے سے نکلا، لیکن سوءِ اتفاق سے نوشہرہ کے پاس شکست کھائی اور صوبہ سرحد کو سکھوں نے پامال کر ڈالا۔

چاروں بارک زئی سردار سکھوں کے فرمانبردار بن گئے، متفرق خوانین کی حالت عجیب تھی وہ سکھوں کو دل سے پسند نہیں کرتے تھے، لیکن مقابلے کی ہمت نہ تھی، اور کہیں سے انہیں امداد مل نہیں سکتی تھی، سکھ عام طور پر گھوڑے اور باز خراج میں وصول کرتے تھے۔ جو خراج گزار تھے وہ اطمینان سے اپنے علاقے میں بیٹھے رہتے تھے، سکھ فوج آتی تو اس کے لئے رسد کا انتظام کر دیتے، جو خراج پر راضی نہ تھے وہ سکھوں کی یورش کے وقت اپنی جگہیں چھوڑ کر بال بچوں کے ساتھ پہاڑی علاقوں میں جا بیٹھتے، سکھ ان کے دیہات کو آگ لگا دیتے اور واپس چلے جاتے۔

خوانین میں سے جن لوگوں کو سید صاحب کے ساتھ براہِ راست سابقہ پڑا، ان کے حالات یہاں الگ بیان کرنے کی ضرورت نہیں، صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ ان کی حیثیت ذرا اونچے درجے کے بااثر زمینداروں کی تھی۔ جہاں ان کا ذکر آئے گا وہیں ان کے مختصر حالات بیان کر دیے جائیں گے۔ ہزارہ کے عام حالات اور وہاں سکھوں کے داخلے کی سرگزشت اس موقع پر عرض کی جائے گی، جب سید صاحب نے مجاہدین کے جیش ہزارہ بھیجے تھے۔

سکھ راج کی کیفیت

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ سکھ راج درحقیقت کوئی باقاعدہ اور منظّم راج نہ تھا بلکہ ایک نوع کا عارضی فوجی غلبہ تھا، جسے رنجیت سنگھ نے منظّم حکومت کی شکل دینے کا ارادہ

ضرور کیا ہوگا، لیکن نہ اُسے موقع مل سکا اور نہ وہ اپنی زندگی میں تصرفات سے باز رہ سکا۔ تصرفات کی آرزو اسی صورت میں پوری ہو سکتی تھی کہ عسکریت کو زیادہ سے زیادہ بے لگام رکھا جاتا۔

یہاں میں ان لوگوں کی تحریرات سے چند اقتباس پیش کروں گا جو مسلمان نہ تھے کہ ان پر طرف داری کا الزام عائد ہو سکتا، بلکہ فرنگی تھے، جنھوں نے سکھوں کے دوستداروں کی حیثیت میں پنجاب کو دیکھا تھا۔

جنرل فین انگریزی فوج کا سپہ سالار تھا، اسے کنور نونہال سنگھ کی شادی کے موقع پر نمائندے کی حیثیت میں لاہور بھیجا گیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

> سکھ فوجیں جب نقل و حرکت میں ہوتی ہیں تو کھیتی باڑی کا کچھ خیال نہیں کرتیں، ان کا توپ خانہ اور رسالہ کھڑی فصلوں سے بے تکلف گذرتا ہے۔(۱)

کیا یہ ان لوگوں کی کیفیت ہو سکتی ہے جو عوام کے محافظ اور ہمدرد ہوں؟ اس کے برعکس شاہ جہاں کا عہد سامنے لاؤ، جب اس کی سواری نکلتی تھی تو دو رویہ فوجی کھڑے ہو جاتے تھے، تاکہ کسی فصل کو خفیف سا نقصان بھی نہ پہنچے۔ جہاں سے اتفاقیہ نقصان کی اطلاع ملتی تھی فوراً اس کا معاوضہ ادا کیا جاتا تھا۔

انگریزوں سے سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد لاہور میں انگریز ریزیڈنٹ مقرر ہو گیا تھا، اس نے انگریز کارکنوں کی مدد سے انتظام کو بہتر بنانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ ہربرٹ ایڈورڈس مَروت گیا جہاں دیوان دولت رائے حاکم تھا، دیوان کے بارے میں ایڈورڈس لکھتا ہے:

> یہ شخص چاہتا ہے کہ دریائے سندھ کی اس سمت میں مختارِ کل رہے، لوگوں کو جتنا چاہے لوٹے، نہ کوئی غیر جانبدار ناظر موجود ہو اور نہ اس کی رپورٹ کی

(۱) فین: ہندوستان میں پانچ سال Five years in india

جائے۔ مروت میں جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کی بناء پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ حکومت بے پروایانہ غارت گری کا ایک منظم سلسلہ ہے۔

۱۸۱۶ء میں محمد خاں حاکم لیہ و بھکر فوت ہوا، سکھوں نے اس کے جانشین احمد خاں سے خراج مانگا، اس نے انکار کیا تو سکھوں نے خان گڑھ اور محمود کوٹ کے قلعے لے لئے۔ تھوڑی دیر کے لئے مان لیجئے کہ خراج کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی بناء پر پیش قدمی اور تصرف جائز تھا، لیکن معاملہ یہاں پر ختم نہ ہوا، بلکہ:

> پھولا سنگھ اکالی کو اجازت دے دی گئی کہ وہ مسلمان آبادی پر نہایت گھناؤنے ظلم کرے اور انہیں حد درجہ مکروہ بے عزتیوں اور ذلتوں کا ہدف بنائے۔(۱)

پھولا سنگھ اکالی نہنگ گروہ کا لیڈر تھا، جو لرزہ خیز ظلم و ستم کی وجہ سے بے حد رسوا تھا۔ رنجیت سنگھ اسے اپنی فوج میں سب سے آگے رکھتا تھا تا کہ باقاعدہ فوج کے پہنچنے سے پیشتر آبادی پھولا سنگھ کے بے پناہ ظلم و جور سے مرعوب ہو جائے۔ یہ شخص ۱۸۲۳ء میں نوشہرہ کی جنگ میں مارا گیا۔

اکثر لوگوں کی روایتوں کے مطابق لاہور اس درجہ تباہ ہو چکا تھا کہ بہ مقابلہ سابق اس کی آبادی دسواں حصہ رہ گئی تھی۔ پشاور برباد ہو چکا تھا، اس کے عالی شان باغ ویران ہو چکے تھے۔

مزید بیانات

مورکرافٹ نے ۱۸۲۰ء میں سفر کیا تھا، وہ کشمیر کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

> اس وقت کشمیر میں رنجیت سنگھ کی حکومت حد درجہ ظالمانہ ہے، کشمیریوں کے پاس جو کچھ ہے وہ انتہائی بے دردی سے چھینا جاتا ہے۔ درانی بھی سخت

(۱) پنجاب گورنمنٹ ریکارڈ جلد پنجم ص:۱۰۶

لیٹرے تھے، لیکن ان کی غارت گری غیر منظم تھی، بہت سے لوگ ان کی بے پروائی کے باعث لوٹ مار سے بچ جاتے تھے۔ مگر رنجیت سنگھ نہایت منظم طریقے پر سب کو ظلم و غضب کی چکی میں پیستا ہے۔(۱)

عین اسی قسم کے خیالات وکٹر جیکماں نے اپنے خطوط میں ظاہر کئے ہیں۔ آرچ نے ۱۸۴۰ء میں سفر کیا تھا، وہ لکھتا ہے:

سکھوں کے مذہبی پیشواؤں یا اکالیوں میں (جن کی حیثیت جنونی قسم کے مذہبی فقیروں کی ہے) رواداری اور اعتدال بالکل ناپید ہے، اور مسلمان مجبور ہیں کہ اپنے مذہبی فرائض چھپ چھپ کر ادا کریں۔(۲)

بالکل یہی نقشہ آپ کو ہزارہ گزیٹر اور پشاور گزیٹر میں نظر آئے گا۔ مثلاً یہ کہ حکومت صرف دہشت انگیزی پر مبنی تھی۔(۳) یا دریائے اباسین یعنی سندھ سے وادیٔ لوند خوڑ تک شاید ہی کوئی گاؤں ہو، جسے سکھوں نے لوٹا یا جلایا نہ ہو۔(۴)

یہ حکومت تھی جس سے سید صاحب کو جنگ پیش آئی، وہ نظم و نسق کے اعتبار سے کتنی ہی ناکام رہی ہو، لیکن فوجی طاقت و قوت اور وحشت و بربریت میں اپنی مثال آپ تھی۔ رنجیت سنگھ نے کئی فرنگیوں کو ملازم رکھ کر زبردست دستے تیار کئے تھے، ان فرنگیوں میں سے ونتورا اور ایلارڈ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ ہو، مور کرافٹ حالاتِ قیامِ کشمیر۔

(۲) ہندوستان میں سفر (Travels in india) جلد اول ص:۱۶۴

(۳) ہزارہ گزیٹر ص:۱۳۱

(۴) پشاور گزیٹر ص:۷

اکتیسواں باب:

چارسدہ میں قیام

چارسدہ کا قصد

سید صاحب نومبر ۱۸۲۶ء کے اواخر میں پشاور پہنچے تھے، وہاں تین یا چار دن ٹھہرے، وہ ہزاروں میل کی دشوار گزار مسافتیں طے کر کے اس غرض سے سرحد نہیں گئے تھے کہ کسی ایک مقام پر پڑاؤ ڈال کر بیٹھ جائیں اور انتظار کریں کہ حالات کس کروٹ بیٹھتے ہیں، پھر اپنے طریق عمل کا فیصلہ فرمائیں۔ وہ سارے علاقے کا دورہ کر کے عوام کو جہاد کے لئے جلد سے جلد منظم کر دینا چاہتے تھے، اسی لئے پشاور میں زیادہ قیام گوارا نہ کیا اور چارسدہ (۱) کا قصد فرمایا۔ چمکنی کے گھاٹ سے دریائے لنڈے (۲) کو عبور کیا۔

عزمِ جہاد کی خاصی شہرت ہو چکی تھی، عام اہل سرحد آج بھی مجاہدانہ اوصاف وعزائم

---

(۱) راویوں نے اس مقام کا نام "ہشت نگر" لکھا ہے، جسے بول چال میں تخفیفاً "اشنغر" بھی کہتے ہیں، یہ دراصل اس پرگنے کا نام ہے جو نوشہرہ سے ابازئی تک دریائے سوات کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، اور آج کل کی طرح سید صاحب کے زمانے میں بھی صوبہ سرحد کا ایک نہایت زرخیز خطہ تھا۔ اس میں آٹھ بڑی بستیاں تھیں، جن کی وجہ سے خطے کا نام ہشت نگر پڑا۔ ان میں سے پرانگ، چارسدہ، اوتمان زئی، ترنگ زئی اور تنگی زیادہ ممتاز تھیں۔ سید صاحب کا لشکر چارسدہ میں اترا تھا، میں نے اسی وجہ سے چارسدہ کا نام لیا کہ ہشت نگر کے نام سے غلط فہمی کا اندیشہ تھا، پرانے زمانے میں اس مقام کا نام پشکلاوتی تھا اور علاقے کو گندھارا کہتے تھے۔

(۲) "ل" مضموم اور "ڈ" مفتوح۔ اس سے مقصود دریائے کابل ہے۔ پشتو میں لنڈے کے معنی ہیں چھوٹا اور مختصر۔ دریائے کابل کے کئی مقامی نام ہیں، پہاڑیوں سے نکلنے کے بعد دریائے سوات سے اتصال تک اسے "ناگمان" کہتے ہیں۔ نستا پر دریائے سوات اس میں مل جاتا ہے، وہاں اس کا نام لنڈے مشہور ہے۔ یہ اٹک کے سامنے دریائے اباسین یعنی سندھ میں مل جاتا ہے۔

کو خاص قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کی دینی حیثیت آج کل کے مقابلے میں ضرور بہتر ہوگی پھر اجنبیوں کی متواتر یورشوں کے باعث جینا ان کے لئے دوبھر ہو چکا تھا، اور وہ انتہائی بیتابی سے منتظر تھے کہ خدا کا کوئی بندہ عزیمت کا جھنڈا اٹھا کر سامنے آئے تو اس کے ساتھ ہو کر مصیبتوں سے نجات کی کوئی صورت پیدا کریں۔

سید صاحب کے سفر چارسدہ کی خبر ملی تو گذرگاہ کے حوالی کی بستیوں کے لوگ گروہ در گروہ زیارت کی غرض سے جمع ہوتے رہے، ان میں خواتین کی بھی کثیر تعداد تھی۔ سید صاحب اُونٹ پر سوار تھے، اس پر جھالر والا زین پوش پڑا ہوا تھا۔ راویوں کا بیان ہے کہ زائرین زین پوش کے تار نکال نکال کر بطور تبرک لے گئے، بلکہ اونٹ کی دُم کے بال بھی محفوظ نہ رہے۔ جنہیں ان تبرکات میں سے کوئی حصہ نہ مل سکا وہ اونٹ کے نقش ہائے پا کی خاک اُٹھا اٹھا کر سر اور آنکھوں پر ملتے رہے۔

رات کے وقت یہ قدوسی لشکر چارسدہ پہنچا اور قصبے سے باہر قیام پذیر ہوا۔ مولوی محمد یوسف پھلتی سید صاحب کے داروغہ خاص، خزینہ دار اور رسد کے ناظم اعلیٰ تھے، ان کے ماتحت دو کارکن تھے۔ اجناس کی خرید میاں عبداللہ کے سپرد تھی، جو لشکر میں عبداللہ ''والیا'' کے لقب سے مشہور تھے۔ اجناس کی تقسیم شیخ باقر علی عظیم آبادی (۱) کے حوالے تھی۔

لشکر کی معیشت و معاشرت

راویوں کا بیان ہے کہ چارسدہ پہنچنے پر کھانے کا کوئی انتظام نہ تھا، نہ غلہ موجود تھا اور نہ خریدنے کے لئے روپیہ پاس تھا۔ اس لئے سید صاحب کے ارشاد کے مطابق چند مسی ظروف ایک بنئے کے پاس بطور کفالت رکھ کر جنس خریدی گئی۔ لشکر میں تقسیم رسد کا پیمانہ ایک تاملوٹ تھا، جس میں تین پاؤ غلہ آٹا سماتا تھا۔ چارسدے میں پہلی رات جو جنس ملی وہ

(۱) شیخ باقر علی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے عم زاد بھائی تھے، سلسلہ نسب یہ ہے: باقر علی، ابن مولانا بشارت علی، برادر مولانا فتح علی (والد ماجد مولانا ولایت علی)

بہ سہم مساوی تقسیم ہوئی تو تین تین غازیوں کے حصے میں ایک ایک تا ملوٹ آیا، یعنی فی غازی ایک پاؤ جنس۔(۱) معیشت کی اس عسرت کے باوجود ہر فرد شاکر وشاد ماں تھا، جو لوگ گھروں کی راحت بارزندگیوں سے کنارہ کش ہو کر اس نیت سے دور دراز کی مسافت طے کر کے آئے تھے کہ اپنی جانیں راہِ خدا میں نثار کردیں اور اسے اپنی سب سے بڑی سعادت سمجھتے تھے، انہیں رسد کی قلت کیا پریشان کرسکتی تھی۔

کھانے سے فراغت ہوئی تو معمول کے مطابق پہریدار پہرے پر کھڑے ہو گئے، جن لوگوں کے ذمے رات کی گشت تھی وہ اپنے کاموں میں لگ گئے۔ دستور یہ تھا کہ ہر شب کے لئے کوئی لفظ دستک یا نشان (۲) کے طور پر مقرر ہو جاتا اور سب کو اس سے آگاہ کردیا جاتا۔ پہریداروں کے ٹوکنے پر اگر کوئی شخص مقررہ لفظ نہ دہراتا تو سمجھ لیا جاتا کہ اجنبی ہے۔

سید صاحب کے ارشادات سے مستفیض ہونے کے اشتیاق میں اکثر مجاہدین آپ کے پلنگ کے اردگرد بیٹھ جاتے اور وہیں زمین پر سو رہتے۔ مولوی فتح علی فرماتے ہیں:

> حضرت کے پلنگ کے اردگرد اکثر لوگ آپ کی باتیں سننے کو رہا کرتے تھے، اور اس کثرت سے رہا کرتے تھے کہ کسی کا سر، کسی کا پیر، کسی کا پیٹ اور کسی کی پیٹھ، کسی کو کسی بات کا کچھ تکلف نہ تھا۔ جس نے جہاں کہیں جگہ پائی وہیں

---

(۱) یہ بات قرینِ قیاس نہیں کہ سید صاحب کے قصد چارسدہ سے بستی والے آگاہ نہ تھے، یا چند من جنس کی خرید کے لئے بھی روپیہ موجود نہ تھا۔ میرا خیال ہے کہ لشکر رات کے وقت دیر سے پہنچا ہوگا، بستی والوں نے سمجھ لیا ہوگا کہ راستے میں منزل کرلی گئی اور صبح چارسدہ پہنچیں گے، اس لئے کھانے کا انتظام نہ کیا۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا وہ بھی پیچھے رہ گئے ہوں گے، سید صاحب کے ساتھ اس وقت سات سو کے قریب غازی تھے، اگر فی غازی ایک پاؤ جنس ہی تو کل جنس چار پانچ من سے زیادہ نہ ہوگی۔ قرینہ یہی ہے کہ دیر سے پہنچے، روپے والے لوگ پیچھے ہوں گے اور سید صاحب نے اس خیال سے کفالت پر جنس لے لینے کا حکم دے دیا کہ روپے والے آجائیں گے تو نقد روپیہ دے کر برتن واپس لے لئے جائیں گے۔

(۲) وقائع احمدی میں اسے "بلول" لکھا ہے۔

بے تکلف سو رہا۔ سو اس رات کو (یعنی چار سدہ میں قیام کی پہلی رات کو) بھی یہی حال تھا۔(۱)

نماز و دعاء

پورا لشکر تہجد خواں تھا، سید صاحب تہجد کے لئے اٹھتے تو سب اُٹھ جاتے۔ چار سدہ میں پہلی رات تہجد سے فارغ ہوئے تو سید صاحب نے فرمایا: قبولِ دعاء کا وقت ہے، میں دُعاء کرتا ہوں، سب بھائی مل کر آمین کہیں۔ پھر برہنہ سر ہو کر آپ نے دعاء کی، جس کے الفاظ راویوں کے بیان کے مطابق اس قسم کے تھے:

> اے پروردگار! تو بڑا قادر و بے نیاز ہے، ہم سب تیرے بندے محتاج و ناچار ہیں، سوا تیرے کوئی ہمارا حامی و مددگار نہیں، ہم سب تیری ہی رضا مندی کے واسطے اپنے شہر و دیار چھوڑ کر یہاں آئے ہیں، تو ہم سب پر اپنی رحمت کی نظر کر۔

سلسلۂ دعا دیر تک جاری رہا، ہمراہیوں کے حلقے سے محویت کے عالم میں برابر ''آمین'' کی صدا بلند ہوتی رہی۔

ذرا تصور فرمایئے، تہجد کا وقت، جہاد فی سبیل اللہ کا مقام، گھر بار چھوڑ کر ہزاروں میل پر بیٹھے ہوئے فدا کارانِ حق کا گروہ، جس میں ہر فرد جان قربان کرنے کا محکم عزم کئے بیٹھا تھا، اور اس امامِ ہمام کا خشوع و خضوع جس نے ظلمت زارِ ہند میں دینی حمیت کا چراغ از سر نو روشن کیا، پھر ''وقائع'' کے اس بیان پر تعجب کی کونسی گنجائش باقی رہ سکتی ہے کہ رحمتِ الٰہی نے ایسا جوش مارا، ہر شخص کا اور ہی حال ہو گیا، گویا سب پر ایک حالت فنا کی ساری و طاری تھی کہ بیان اس کا لکھنے میں نہیں آ سکتا۔(۲)

---

(۱) وقائع ص ۴۴۹۔ منظورہ میں ہے: از غایت بے تکلفی بستر جداگانہ و وضعے کہ اہل دنیا را باشد، نبود، بلکہ پائے یکے بہ سوئے سر دیگرے و پہلوئے کسے خلاف احدے گردیدہ۔

(۲) وقائع ص: ۴۴۹

سید صاحب کی عادت تھی کہ نماز تہجد کے بعد حاضرین کو کچھ دیر تک نصیحتیں فرماتے، پھر سو جاتے۔ چارسدہ میں بھی یہی ہوا، صبح کی نماز میں لشکریوں کے علاوہ بستی کے لوگ بھی شامل ہو گئے، سید صاحب نے پھر لمبی دعاء فرمائی۔

بیعت اور دعوتیں

ہشت نگر کا علاقہ اس وقت درانی سرداروں میں سے سید محمد خاں کی تحویل میں تھا، وہ چارسدہ کے بالا حصار میں رہتا تھا۔ صبح کی نماز کے بعد زیارت کے لئے آیا اور بیعت سے مشرف ہوا۔ پھر لوگ اس کثرت سے بیعت کے لئے جمع ہو گئے کہ ایک ایک سے بیعت لینا مشکل ہو گیا۔ سید صاحب اپنا دوپٹا پھیلا دیتے، ایک سرا اپنے دستِ مبارک میں رکھتے اور دوپٹے کو لوگ پکڑ لیتے، اس طرح بیعت سے فراغت پائی۔ بعد میں کھانے کی دعوتیں مختلف افراد کی طرف سے پے بہ پے آنے لگیں۔ سید صاحب نے غازیوں کو تیس تیس چالیس چالیس کی جماعتوں میں بانٹ دیا اور داعیوں کی باریاں مقرر کر دیں تا کہ کسی کو دعوت قبول نہ کرنے کی شکایت نہ رہے۔

آپ تقریباً دو ہفتے چارسدہ میں ٹھہرے رہے، دونوں وقت غازیوں کی مختلف جماعتیں مختلف داعیوں کے ہاں کھانے کھاتیں۔ سید صاحب نے پہلے دن دوپہر کا کھانا سید محمد خاں کے ہاں کھایا، باقی دنوں کے متعلق یقینی وحتمی اطلاع نہ مل سکی، اغلب ہے اور اصحاب کے ہاں بھی گئے ہوں، میرا خیال ہے کہ سید محمد خاں نے بھی ایک مرتبہ کی دعوت پر قناعت نہ کی ہوگی۔ اس اثناء میں سید صاحب آس پاس کے دیہات کا دورہ بھی فرماتے رہے اور تدابیر جنگ کے بارے میں مشورے کرتے رہے۔

حسن تربیت کا ایک واقعہ

چارسدہ ہی میں ایک واقعہ پیش آیا، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کے

فیضِ صحبت نے غازیوں کے مزاج وطبیعت کو کس درجہ بدل دیا تھا، اور وہ لوگ فضائل واخلاق واخوتِ اسلامی کے کس بلند مقام پر پہنچ گئے تھے، نیز سید صاحب کا طریق اصلاح کتنا دلکش تھا۔

غازیوں میں ایک شخص رسول خاں نام ملیح آباد کا باشندہ تھا اور نامی بانکوں میں شمار ہوتا تھا۔ عام بانکوں کی طرح طبیعت بڑی جوشیلی اور غصہ ور تھی، بات بات پر تلوار میان سے نکال لیتا تھا۔ سید صاحب کے ہاتھ پر بیعت کی تو جوش اور غصہ باقی نہ رہا، جہاد کے لئے نکلا تو اپنے ایک بھتیجے کو بھی ساتھ لے لیا جس کی عمر گیارہ سال کی تھی، اس بچے کو تعلیم وتربیت کی غرض سے اپنے ایک رفیق اکبر خاں کے حوالے کر رکھا تھا۔

چارسدہ میں جو لوگ بیعت کے لئے آتے تھے وہ عموماً مٹھائی ساتھ لاتے تھے۔ رسول خاں کے بھتیجے نے اس مٹھائی میں سے ایک دو لڈو اجازت کے بغیر کھا لیے، اکبر خاں کو یہ بات معلوم ہوئی تو تادیباً بچے کے ایک تھپڑ مارا۔ رسول خاں نے یہ سنا تو ایک دم طبیعت جوش پر آ گیا اور حالتِ غیظ میں اکبر خاں کو بہت سخت سُست کہا۔ ایک اور غازی نور خاں پاس کھڑا تھا، اس نے پورا واقعہ سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا، آپ نے فوراً رسول خاں کو بلایا، بڑی خاطر داری سے پاس بٹھایا، پہلے مزاج پوچھا پھر شفقت بھرے انداز میں فرمایا:

> ہم نے سنا ہے کہ اکبر خاں نے آپ کے بھتیجے کو دھول ماری، سو آپ کو اس کا بڑا رنج ہوا، یہ بات آپ کو نہ چاہئے۔ انہوں نے اپنا لڑکا سمجھ کر تعلیماً مارا ہوگا۔

رسول خاں کا غصہ تو پہلے ہی فرو ہو چکا تھا اور اپنی اضطراری حرکت پر پشیمان بھی تھا، سید صاحب کا ارشاد سن کر عرض کیا:

> حضرت! جیسا میرا مزاج ہے آپ بھی جانتے ہیں اور اکثر لوگ بھی

واقف ہیں کہ میں کسی کی سخت بات برداشت نہ کر سکتا تھا، جب سے میں نے آپکی باتیں سنیں اور آپکے ہاتھ پر توبہ کی، تب سے جہالت اور شورہ پشتی میری اللہ تعالیٰ نے دور کردی، واللہ وہ جہالت اور شیطانیت نعوذ باللہ منهما ، جو مجھ میں ہوتی تو باوجود اسکے کہ آپکے لشکر میں اتنے لوگ ہندوستانی اور قندھاری وغیرہ بہادر اور شجاعت میں یکتائے زمانہ ہیں، مگر میں کسی کو خیال میں نہ لاتا اور سخت بات کا تلوار ہی سے جواب دیتا۔ سو میں نے تو سچے دل سے آپ کے ہاتھ پر توبہ کی ہے اور اکبر خاں میرے بھائی ہیں، بھتیجے کو مارا تو خوب کیا۔(۱)

یہ سن کر سید صاحب بہت خوش ہوئے اور رسول خاں کے لئے دعاء فرمائی۔

ایک مشتبہ آدمی کی گرفتاری

اسلامی لشکر میں کچھ اوپر دوسو قندھاری تھے، ان کی جماعت کے چند افراد ایک روز شمشیر خاں نام ایک آدمی کو پکڑ لائے، اور کہا کہ یہ سکھوں کا جاسوس ہے، لہٰذا اسے قتل کردینا چاہئے۔ سید صاحب نے شمشیر خاں کو اپنے پاس ٹھہرالیا، نمازِ عشاء کے بعد تنہائی میں اس سے کہا کہ اپنا حال صحیح صحیح بتادو اور کسی بات کا اندیشہ نہ کرو۔ اس نے اقبال کرلیا کہ واقعی سکھوں نے مجھے جاسوسی کی غرض سے بھیجا ہے اور بدھ سنگھ بڑے لشکر کے ساتھ دریائے سندھ عبور کر کے خیر آباد میں داخل ہو چکا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بھائی! بدھ سنگھ سے جاکر کہہ دے کہ جس طرح تو اپنے آقا رنجیت سنگھ کا فرمانبردار ہے، اور اس کے حکموں کی تعمیل میں لگا ہوا ہے، اسی طرح ہم بھی اپنے مالکِ حقیقی کے فرمانبردار اور اس کے حکموں کے پابند ہیں۔ بدھ سنگھ کو خبر پہنچی کہ ایک سید ملک کو سکھوں کے تصرف سے نکالنے کا ارادہ لے کر ہندوستان سے آیا ہے، یہ بالکل درست ہے، ہم عنقریب اس سے جنگ کریں گے۔

---

(۱) وقائع ص:۴۵۱ و۴۵۲

شمشیر خاں سید صاحب کی صورت دیکھتے ہی گرویدہ ہو چکا تھا گفتگو سنی اور طرزِ سلوک دیکھا تو بے تابانہ بیعت کے لئے تیار ہو گیا۔ ساتھ ہی عرض کیا کہ خدا نے چاہا تو میں بدھ سنگھ کے لشکر کا پورا حال معلوم کر کے آؤں گا اور خدمتِ والا میں پیش کر دوں گا۔ سید صاحب نے شمشیر خاں کو اللہ بخش خاں مورانوی کے حوالے کر دیا اور فرمایا کہ پہر رات باقی رہے تو اسے حفاظت کے ساتھ تین چار میل باہر لے جا کر چھوڑ دینا، جہاں چاہے چلا جائے۔(۱)

بدھ سنگھ سے جنگ کا فیصلہ

یہ خبر مل ہی چکی تھی کہ بدھ سنگھ خیر آباد پہنچ گیا ہے اور وہاں سے آگے بڑھنے کی تدبیریں کر رہا ہے۔ اس اثناء میں امیر خاں خٹک رئیس اکوڑہ چارسدہ پہنچا اور سید صاحب سے مل کر بدھ سنگ کی آمد کی تصدیق کر دی، ساتھ ہی کہا کہ میرا بھتیجا خواص خاں سکھوں کے ساتھ مل گیا ہے، اگر بدھ سنگھ دریائے لنڈے کو عبور کر کے آگے نکل آیا تو سارے ملک سمہ (۲) میں قتل و غارت کا خوفناک طوفان امنڈ آئے گا، اور لوگ اپنے اہل و عیال کو بچانے کی سراسیمگی میں آپ کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ مناسب یہ ہے کہ آپ

(۱) یہ ''وقائع'' کا بیان ہے، منظورہ میں ہے: ایں را در ہر جماعت سیر کنانیدہ وقت ماندن پائے از شب بہ حفاظت تمام تا سہ میل از لشکر رخصت باید نمود۔ ممکن ہے اس سے کسی دل میں وسوسہ پیدا ہو کہ سید صاحب اپنی نیک طبعی کے باعث فوجی مصالح کا خیال نہیں رکھتے تھے، مگر شمشیر خاں کو مختلف جماعتوں میں پھرا کر باہر نکال دینا کسی بھی مصلحت کے خلاف نہ تھا، اس طرح لوگ اس کی صورت سے واقف ہو جاتے اور لشکر میں پھر کر اسے زیادہ سے زیادہ یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ سید صاحب کی جمعیت کم ہے، یہ حقیقت ہزاروں آدمیوں پر آشکارا تھی، سید صاحب کے ساتھ جو غازی آئے تھے ان کی تعداد ہر فرد کو معلوم تھی، لیکن کون خیال کر سکتا تھا کہ سید صاحب انہیں سات سو غازیوں کے بل پر سکھ حکومت سے لڑنے کا ارادہ کئے بیٹھے تھے؟ ان کی اسکیم تو یہ تھی کہ ایک موزوں مرکز مل جائے تو ہندوستان سے مجاہدین کو بلائیں، نیز سرحد کے مسلمانوں کو جلد سے جلد منظم کر کے میدانِ جنگ میں پہنچا دیں۔

(۲) سمہ پشتو زبان میں میدان کو کہتے ہیں اس سے مقصود وہ میدانی علاقہ ہے جو دریائے سندھ اور سرحدی پہاڑوں کے درمیان ہے۔

پیش قدمی کر کے بدھ سنگھ کو لنڈے کے پار ہی روک دیں۔ سید صاحب نے یہ مشورہ قبول فرمالیا اور ساتھ ہی فیصلہ ہو گیا کہ چارسدہ سے نکل کر نوشہرہ پہنچنا چاہئے جہاں سے بدھ سنگھ پر حملہ کر کے کاری ضرب لگائی جاسکتی تھی۔

مسلمانوں کے سیاسی زوال کی سرگزشت کا ایک نہایت المناک باب یہ ہے کہ وہ جماعتی و قومی مقاصد سے بے پروا ہو کر صرف انفرادی اغراض میں مبتلا ہو گئے تھے۔ صوبہ سرحد کے اکثر رئیس گھرانے بھی اسی مرض کا شکار ہو چکے تھے، امیر خاں اور اس کے بھتیجے خواص خاں میں جھگڑا تھا، بھتیجا بے تکلف سکھوں سے مل گیا، امیر خاں جماعتی مقاصد کی خاطر نہیں بلکہ بھتیجے کے ساتھ دشمنی کے باعث سید صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دل سے سید صاحب یا ان کے مقاصد کا حامی نہ تھا، جیسا آگے چل کر معلوم ہوگا۔ خواص خاں کے بارے میں صرف یہ کہہ دینا چاہئے کہ اگر وہ بدھ سنگھ کا خیر مقدم نہ کرتا اور اسے ہر ممکن امداد کا یقین نہ دلاتا تو سکھ لشکر بے تکلفی سے پیش قدمی نہ کرتا۔

نوشہرہ کا قصد

سید صاحب چارسدہ سے نکلے تو خویشگی (۱) پہنچے، جو چھوٹی سی بستی تھی، اور وہاں لشکر کے لئے کھانے کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ سید صاحب نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ نمازِ عشاء تک کلمہ توحید کا ورد جاری رکھیں، اطمینانِ قلب کے لئے ذکر الٰہی سے بڑھ کر کون سی چیز مفید ہو سکتی ہے؟ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ.

قدرت کی کرشمہ فرمائی ملاحظہ ہو، اس اثناء میں کنارِ دریا کی بعض بستیوں کے لوگوں کو علم ہو گیا کہ سید صاحب خویشگی میں ٹھہر گئے ہیں، انہوں نے آٹا فراہم کر کے ایک کشتی میں بھرا، غازی عشاء کی نماز سے فارغ ہوئے تو یہ کشتی خویشگی پہنچ گئی۔ اتنا سامان تھا کہ

(۱) خویشگی چارسدہ اور نوشہرہ کے درمیان ہے۔

غازیوں میں دو وقت کی رسد بانٹ کر بھی بچ رہا۔

اس وقت سید صاحب کے ہمراہی غازی پندرہ سو تھے: تقریباً پانسو ہندوستانی کچھ اوپر دو سو قندھاری کوئی آٹھ سو ملکی۔ اکثر ملکی اپنے گھروں سے کھانا کھا کر آئے تھے، بہت کم لوگ تھے جنہوں نے کچھ نہیں کھایا تھا، انہیں غازیوں کے برابر رسد دے دی گئی۔ سید صاحب کے ہندوستانی غازیوں کی اتنی ہی جماعتیں تھیں جو گوالیار میں مرتب ہوئی تھیں، قندھاریوں کی جماعت الگ بن گئی تھی۔ یہ تصریح اس لئے ضروری معلوم ہوئی کہ بعض سوانح نگاروں نے جنگِ اکوڑہ کے وقت جماعتوں کی تعداد زیادہ بتائی ہے، حالانکہ زیادہ جماعتیں آگے چل کر بنی تھیں، ان کا ذکر موقع پر آئے گا۔

سید صاحب ۱۸ر دسمبر ۱۸۲۶ء (۱۸ر جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ) کو خویشگی پہنچے تھے، ۱۹ر دسمبر کو ڈیڑھ پہر دن چڑھے نوشہرہ (۱) میں وارد ہوئے۔ بدھ سنگھ اس وقت خیر آباد سے آگے بڑھ کر اکوڑہ (۲) میں داخل ہو چکا تھا جو نوشہرہ سے سات آٹھ میل جنوب میں دریائے لنڈے کے مغربی کنارے پر ہے۔ دشمن کے قرب کو پیش نظر رکھتے ہوئے سید صاحب نے حکم دے دیا کہ غازی کمریں نہ کھولیں اور کھانا کھا کر تیار رہیں۔

(۱) اس سے مقصود موجودہ چھاؤنی اور اس سے ملحقہ آبادی نہیں جو لنڈے کے مغربی کنارے پر ہے، پشاور والی ریل کا اسٹیشن بھی اسی طرف ہے۔ سید صاحب جس نوشہرہ میں وارد ہوئے تھے، اس سے مقصود پرانا شہر ہے، جو دریا کے مشرقی کنارے پر ہے۔ آج کل اسے نوشہرہ کلاں کہتے ہیں۔ مقامات کی ترتیب یوں ہے، اٹک سے تین میل خیر آباد، وہاں سے چار پانچ میل جہانگیرا روڈ، جہانگیرا روڈ سے تین میل شیدو، اس سے آگے اکوڑہ، پھر نوشہرہ۔

(۲) اکوڑہ دریائے لنڈے کے مغربی کنارے پر ہے، یہ قبیلہ خٹک کے سردار اکوڑہ نے سولھویں صدی میں آباد کیا تھا، اس کے سامنے مشرقی کنارے پر مصری بانڈہ ہے، جو خوشحال خاں خٹک کا گاؤں تھا۔

بتیسواں باب:

جنگِ اکوڑہ

طریق جنگ کا فیصلہ

نوشہرہ پہنچتے ہی سکھ لشکر کے حالات معلوم ہو چکے تھے، اس کی تعداد کم از کم سات اور زیادہ سے زیادہ دس ہزار تک بتائی جاتی تھی (۱) اور مجاہدین کل ڈیڑھ ہزار تھے۔ سکھوں کے پاس ہر قسم کا ساز وسامان موجود تھا، کم از کم آٹھ توپیں تھیں، مجاہدین میں سے سب کے پاس بندوقیں نہ تھیں۔ پھر ہندوستانی مجاہدین کے بارے میں یقین تھا کہ وہ جانبازی میں دریغ نہ کریں گے، قندھاریوں کی شجاعت ومردانگی کا بھی ایک حد تک اندازہ ہو گیا ہوگا۔ سرحدی مسلمانوں کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا کہ امتحان وآزمائش کی حالت میں کس حد تک ثبات اور استقامت کا ثبوت دے سکیں گے۔

یہ تمام حالات سامنے رکھ کر مشورہ کیا گیا کہ جنگ کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ سید

(۱) سید صاحب نے جو خط ہندوستان بھیجا تھا، اس میں سکھ لشکر کی تعداد ہفت ہزار سوار و پیادہ بتائی تھی۔ ظفر نامہ کنہیا لال، ظفر نامہ دیوان امرناتھ اور لطیف کی تاریخ پنجاب میں جنگ اکوڑہ کا کوئی ذکر نہیں، میں جس حد تک مختلف ذرائع سے معلوم کر سکا ہوں تعداد سات ہزار سے کم اور دس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ یہ حقیقت سب تسلیم کرتے ہیں کہ سید صاحب کی آمد نے ایک عام سراسیمگی پیدا کر دی تھی۔ دیوان امرناتھ لکھتے ہیں کہ بدھ سنگھ سندھانوالہ، سرداران اٹاری، گلاب سنگھ اور سوچیت سنگھ پہلے وہاں بھیجے گئے تھے، بعد میں کنور شیر سنگھ، کنور کھڑک سنگھ اور جمعدار خوش حال سنگھ کو بھی ادھر ہی روانہ کر دیا گیا۔ (ظفر نامہ دیوان امرناتھ ص: ۱۸۲) مولوی محمد جعفر نے تعداد نو ہزار سے زیادہ لکھی ہے (ص: ۹۸) اور صاحب حیات طیبہ نے دس ہزار (ص: ۱۶۲) آخر الذکر نے شبخون کے لئے بھیجے جانے والے غازیوں کی تعداد دو ہزار بتائی ہے یہ بالکل غلط ہے، کیوں کہ سید صاحب کے پاس اس وقت کل ڈیڑھ ہزار آدمی تھے، اور ان میں سے شبخون کے لئے نو سو آدمی چنے گئے تھے۔

صاحب کی یہ پہلی جنگ تھی جس کے خوشگوار اور حوصلہ افزا نتائج پر سرحد میں کاروبارِ جہاد کی تنظیم موقوف تھی، اس لئے معاملے کے ہر پہلو کو خوب جانچا اور تولا گیا، آخر یہ رائے ٹھہری کہ سکھ لشکر پر شبخون مارا جائے۔ شبخون کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ اپنی قوت کو کم سے کم گزند پہنچے اور دشمن کی قوت پر اچانک فوری ضرب لگا کر اسے ہراس زدہ بنا دیا جائے۔ ہراس زدگی کے علاوہ یہ اندازہ بھی کر لیا جائے کہ منظّم جنگ کے لئے اس میں کتنی صلاحیت موجود ہے، سید صاحب کا فیصلۂ شبخون انہیں مقاصد پر مبنی تھا۔

اعلام وانتباہ

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب پیشتر ہی دربارِ لاہور کو ایک اعلام بھیج چکے تھے، اس میں تین صورتیں پیش کی گئی تھیں۔

۱۔ اسلام قبول کر لو تو ہمارے بھائی بن جاؤ گے اور برابر کا درجہ حاصل کر لو گے، لیکن اس باب میں ہماری طرف سے جبر نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ دین کا قبول یا عدمِ قبول ہر انسان کی مرضی پر موقوف ہے۔

۲۔ ہماری اطاعت اختیار کر لو اور جزیہ دو، اس حالت میں تمہارے اموال ونفوس کی حفاظت اسی طرح ہم پر واجب ولازم ہو جائے گی جس طرح ہم خود اپنے اموال ونفوس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

۳۔ دونوں باتیں منظور نہیں تو لڑائی کے لئے تیار ہو جاؤ، سارا یاغستان اور سارا اسلامی ہند ہمارے ساتھ ہے اور راہِ حق میں شہادت ہمیں اس درجہ عزیز ومحبوب ہے کہ تمہیں شراب اتنی عزیز ومحبوب نہ ہو گی۔

یہ روایت درست بھی مان لی جائے تو ظاہر ہے کہ لاہور کی حکومت ایک بے نوا سید کے انتباہ کو کب خاطر میں لا سکتی تھی؟ تاہم پورے یقین ووثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس پر

اضطراب طاری ہوگیا ہوگا، خصوصاً اس وجہ سے کہ کہیں سرحد کے عوام سید صاحب کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوکر یورشِ عام نہ کردیں۔ اس حالت میں پنجاب کی اسلامی آبادی بھی جا بجا مقابلے پر کھڑی ہوجاتی اور رنجیت سنگھ کیلئے ایسی مشکلات پیدا ہوجاتیں کہ ان سے شاید ہی عہدہ برآ ہوسکتا۔ دفاع کیلئے علاقہ سرحد میں پیش قدمی کی علت نظر بہ ظاہر یہ تھی کہ اگر سکھ فوج اٹک میں بیٹھی رہتی تو سید صاحب کا پہلا حملہ اٹک اور حضرو پر ہوتا۔

شبخون کے لئے مجاہدین کا انتخاب

بہرحال شبخون کا فیصلہ کرلینے کے بعد تمام جماعتوں کے سالاروں کو حکم دے دیا گیا کہ چست وتوانا غازیوں کی فہرست تیار کرکے پیش کریں تاکہ انہیں سامنے رکھ کر مناسب جیش منتخب کرلیا جائے۔ فہرستیں پیش ہوئیں تو سید صاحب نے نو سو آدمی چن لیے۔ بعض غازیوں کے نام قلم زد ہوگئے، ان میں جہان آباد (رائے بریلی) کا عبدالمجید خاں آفریدی بھی تھا، اسے اس وجہ سے منتخب نہ کیا گیا کہ ان دنوں بخار میں مبتلا تھا اور خاصا کمزور ہوگیا تھا۔ عبدالمجید خاں کو یہ خبر ملی تو بے تابانہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض پرداز ہوا: حضرت! میں کچھ ایسا بیمار تو نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو اور یہ پہلا محاربہ ہے، جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی، میرا نام ضرور شامل فرمالیجئے تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔ سید صاحب نے عبدالمجید خاں کا ذوق وشوق دیکھ کر اس کی خواہش پوری کردی اور دعاء فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے۔

اس واقعہ سے آپ پر اس قدوسی جماعت کے شرکاء کا جذبۂ سبقت بالخیرات واضح ہوسکتا ہے، جہاد کی فرضیت واہمیت کے معتقدوں کے نزدیک بھی رخصت واجازت کے عذر مسلم ہیں۔ جو شخص واقعتاً بیمار تھا، اتنا بیمار کہ امامِ وقت نے احیاناً اسے ادائے فرض کا مکلف نہ سمجھا، اس کی معذوری میں کیسے کلام ہوسکتا تھا؟ لیکن سید صاحب نے اپنے

ساتھیوں میں خدمتِ حق کی ایسی والہیت پیدا کر دی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی سہولتوں اور رخصتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے برعکس ہر شخص کے دل میں عزیمت وسبقت کی شیفتگی موجزن تھی، عبدالمجید خاں آفریدی نے شبخون اکوڑہ کی شام کو سید صاحب کے کمالِ تربیتِ اسلامی کا سچا نمونہ پیش کر دیا۔

اس شبخون کی سالاری کے لئے اللہ بخش خاں مورانوی تجویز ہوا۔ سبحان اللہ! کتنی قابل رشک سعادت تھی جو اس مردِ مجاہد کے حصے میں آئی۔ ہندوستان میں اسلام کی برتری وفرمانروائی کی متاعِ عزیز لٹ جانے کے بعد اس کی بازیافت کیلئے رائے بریلی کے پاک نفس سید نے مجاہدات کا جو سلسلہ شروع کیا، اس میں کے پہلے معرکے کی سالاری کا تاج اللہ بخش خاں کے سر پر رکھا گیا: یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ترتیبات وہدایات

سید صاحب نے نمازِ مغرب کے بعد اللہ بخش خاں سے فرمایا کہ آج جو شبخون مارا جا رہا ہے، اس کے قائد آپ ہوں گے۔ چند غازیوں کو لے کر دریا کے دوسرے کنارے پر چلے جایئے، باقی غازی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں آہستہ آہستہ وہاں پہنچتے جائیں گے۔ اللہ بخش خاں اسی وقت چند رفیقوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر لنڈے کے مغربی کنارے پر پہنچا اور اپنے ساتھیوں کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

نو سو آدمیوں میں سے ایک سو چھتیس ہندوستانی تھے، تقریباً اسی قندھاری، باقی اہل سرحد تھے۔ نمازِ عشاء کے بعد سید صاحب نے ان سب کو جمع کر کے فرمایا کہ آپ لوگ جس مقام پر جا رہے ہیں، وہاں پہنچنے میں سات آٹھ میل کا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔ جس بھائی میں اتنے سفر کی طاقت نہ ہو وہ رک جائے، اگر کسی کو بیماری وغیرہ کا عذر ہو تو بتا دے۔

جب تمام مجاہدین اللہ بخش خاں کے پاس پہنچ گئے تو خان ممدوح پھر چند رفیقوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر رخصتی ملاقات کے لئے خیمہ گاہ میں پہنچا، یقین ہے کہ اسے پہلے سے اس قسم کی ہدایت ہو چکی ہوگی۔ اس وقت سید صاحب نے برہنہ سر ہو کر انتہائی عجز والحاح سے دعاء فرمائی:

> اے کریم کار سازِ بندہ نواز! یہ تیرے بندے محض عاجز وخاکسار اور ضعیف وناچار ہیں۔ تیری ہی مدد کے امیدوار ہیں، تیرے سوا ان کا کوئی حامی ومددگار نہیں۔ یہ صرف تیری ہی رضامندی اور خوشنودی کو جاتے ہیں تو ہی ان کی مدد کرنا۔

آدھی رات (۱) کے قریب یہ جماعت دریائے لنڈے کے مغربی کنارے سے، جہاں آج کل نوشہرہ چھاؤنی ہے، منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوئی۔ ''منظورہ'' میں ہے کہ روانگی سے پیشتر سب نے ایک دوسرے سے کہا سنا معاف کرایا، ہر ایک کی زبان پر تھا کہ خدا زندہ لائے گا تو پھر ملیں گے، ورنہ جنت میں ملاقات ہوگی۔

گر بہ مانیم زندہ بر دو زیم — جامۂ کز فراق چاک شدہ
ور بہ میریم عذر ما بہ پذیر — اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

سید صاحب نے فرمایا تھا کہ روانگی سے پیشتر ہر شخص گیارہ گیارہ مرتبہ سورۂ قریش پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لے، پھر قدم اٹھایا جائے۔ (۲) اس ہدایت پر پورا عمل ہوا۔

لشکر گاہ کی کیفیت

سکھ لشکر اکوڑہ سے باہر کھلے میدان میں مقیم تھا، وقت کے عام رواج کے مطابق لشکر

(۱) روایات میں ہے ''پہر رات پر کچھ گھڑیاں بجی تھیں''۔
(۲) سید صاحب کے معمولات میں سے ایک خاص چیز یہ تھی کہ جنگ اور خطرے کے موقع پر سورۂ قریش گیارہ مرتبہ پڑھ کر دم کر لینے کی ہدایت فرماتے تھے۔ جن لوگوں کو سورۂ قریش یاد نہ ہوتی فرماتے کہ دوسرے پڑھ کر ان پر دم کر دیں۔

گاہ کے ارد گرد خاردار درختوں کی شاخوں سے سنگھر بنالیا گیا تھا۔(۱) خود سردار بدھ سنگھ سندھانوالہ (۲) جو سالار لشکر تھا، رات کے وقت اکوڑہ میں چلا جاتا تھا۔ اگر چہ اس کا خیمہ لشکر گاہ میں نصب تھا۔

غازی جب سکھ لشکر گاہ سے تھوڑے فاصلے پر رہ گئے تو ایک نالہ ملا، جو اس وقت خشک ہوگا، اس لئے کہ صوبہ سرحد کے اس حصے کے نالوں میں صرف برسات کے موسم میں پانی بہتا ہے، غازی نالے کے بہاؤ میں ٹھہر گئے اور ایک آدمی کو آگے بھیج دیا گیا تاکہ لشکر گاہ کی عام کیفیت معلوم کر آئے۔ (۳)

سید صاحب نے مولوی امیر الدین ولایتی کو مشیر کے طور پر ساتھ کر دیا تھا اور وہ بڑے صائب الرائے اور دانشمند بزرگ تھے، اور مقامی احوال و مصالح کو خوب سمجھتے تھے۔ انہوں نے اللہ بخش خاں سے کہا کہ اگلا لائحہ عمل ابھی سے طے کر لینا چاہئے۔ اگر

---

(۱) میں نے اکوڑہ میں سن رسیدہ اشخاص سے سکھ لشکر کے قیام کی جگہ معلوم کرنی چاہی، کوئی کچھ نہ بتا سکا، سب نے یہی کہا کہ سکھ لشکر گاہ گاؤں کے جنوب میں تھی۔

(۲) بدھ سنگھ کو بعض سوانح نگاروں نے رنجیت سنگھ کا چچیرا بھائی لکھا ہے، سید صاحب نے جو پہلا مکتوب ہندوستان بھیجا تھا اس میں بھی ''ابن عم رنجیت سنگھ'' کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ بیان تفصیل کا محتاج ہے، سندھانی والے خاندان کے دعوے کے مطابق، ان کے پانچویں جد کا نام بھی بدھ سنگھ تھا، جس کے دو بیٹے تھے، نودھ سنگھ اور چندا سنگھ۔ اول الذکر کے اخلاف میں رنجیت سنگھ تھا (رنجیت سنگھ، بن مہاں سنگھ، بن چڑھت سنگھ، بن نودھ سنگھ) چندا سنگھ کی اولاد میں سے بدھ سنگھ تھا (بدھ سنگھ بن امیر سنگھ، بن دیدار سنگھ بن چندا سنگھ) اس طرح اگر چہ پانچویں پشت میں رنجیت سنگھ اور بدھ سنگھ کا نسب مل جاتا تھا، لیکن ابن عم کا جو عام مفہوم ہے، اس سے اس رشتہ داری کا کوئی تعلق نہ تھا۔ سندھانوالے خاندان کے افراد میں سے بدھ سنگھ کے بھائی لہنا سنگھ اور بھتیجے اجیت سنگھ نے ۱۸۴۲ء میں مہاراجا شیر سنگھ اور اس کے بیٹے پرتاپ سنگھ کو قتل کیا اور خود بھی مارے گئے۔ ۱۸۲۷ء میں لاہور میں ہیضے کی وبا اس شدت سے پھیلی تھی کہ ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ اڑتالیس ہزار آدمی اس وبا کی نذر ہوئے۔ رنجیت سنگھ شہر سے نکل کر شاہدرہ میں جا بیٹھا، اس وبا میں بدھ سنگھ بیمار ہوا، مہاراجہ نے فقیر عزیز الدین اور بعض دوسرے اطبا کو علاج کیلئے بھیجا، لیکن بدھ سنگھ جانبر نہ ہوسکا۔ سکھ جرنیلوں میں وہ سب سے زیادہ شریف اور کاروان سمجھا جاتا تھا۔ راجہ سانسی کی جاگیر اسی کی اولاد کے قبضے میں ہے۔

(۳) وقائع میں ہے کہ یہ نالہ لشکر گاہ سے ''پاؤ کوس'' پر تھا، میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لئے کہ لشکر گاہ کی جگہ متعین نہ ہوسکی، اور اس مقام پر نالے کئی ہیں۔

ملکیوں کو آگے رکھا جائے تو ان کی استقامت کا ابھی تک تجربہ نہیں ہوا، اگر وقت پر طرح دے جائیں گے تو جماعتی مقاصد کو سخت نقصان پہنچے گا۔ اگر غازیوں کو آگے رکھا جائے تو وہ ہندوستانی ہوں یا قندھاری، سب مقامی حالات اور راستوں سے بالکل ناواقف ہیں۔

غور و فکر کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ غازی سب سے آگے رہیں، البتہ ملکیوں میں سے ایک باخبر آدمی ان کے ساتھ رہ کر رہبری کا فرض انجام دیتا رہے۔ وہیں مختلف گروہوں کے ذمے مختلف کام لگا دیے گئے تھے، مثلاً خیموں کی طنابیں کاٹنا، بندوقیں اور تلواریں چلانا، جنگی ضرورت کی چیزیں سمیٹنا یا تباہ کرنا۔

اس اثناء میں بھیجا ہوا آدمی حالات معلوم کر کے واپس آ گیا، پھر اسی کی رہبری میں مجاہدین آگے بڑھے اور تھوڑے عرصے میں لشکر کے اس حصے میں پہنچ گئے جہاں رہبر کے اندازے کے مطابق زیادہ تر سکھ لشکری غافل سوئے پڑے تھے۔

شبخون

راویوں کا بیان ہے کہ سکھ لشکر کے گھڑیال نے تین پہر تین گھڑیاں بجائیں، ساتھ ہی غازی اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے سنگھر کو پھاند کر لشکر گاہ میں گھس گئے۔ جن لوگوں کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ خیموں کی طنابیں کاٹیں، وہ تیزی سے خیموں کو گرانے لگے، جن لوگوں کا فرض یہ قرار دیا گیا تھا کہ جنگی ضرورت کی چیزیں سمیٹیں، وہ اپنے کام میں لگ گئے، باقی لوگوں نے تلواروں اور بندوقوں سے کام لینا شروع کر دیا۔ پوری لشکر گاہ میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ایک سکھ پہریدار نے تکبیر کی آواز سنتے ہی بندوق سر کی۔ اس کی گولی مولوی باقر علی عظیم آبادی کے لگی، زخم کاری تھا، وہ بیٹھ گئے اور بولے ''بھائیو! میرا کام تمام ہوا، اب مجھ سے ہتھیار لے لو، یہ اللہ کا مال ہے'' اس ساتھ ہی ان کی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ سید صاحب کی قدوسی جماعت میں وہ پہلے شہید تھے، گویا احیاء و تجدیدِ اسلامیت کی راہ میں سب سے پہلی جانی قربانی عظیم آباد کے اس جلیل المنزلت

خاندان کی طرف سے پیش ہوئی جو آگے چل کر سید صاحب کی جاری کردہ تحریک کا علمبردار بننے والا تھا، اور اس نے اپنی ہر متاع سبیلِ حق میں بے دریغ لٹادی۔

مولوی باقر علی کے پاس چار چیزیں تھیں: دو پستول، جن میں سے ایک کا نام "بسم اللہ" اور دوسرے کا نام عبداللہ تھا۔ ایک تلوار اور ایک بندوق، غازیوں نے دونوں پستول بھی لے لئے تلوار بھی لے لی، بندوق افراتفری میں ہاتھ نہ لگی۔

شبخون کی کامیابی میں کوئی شبہ باقی نہیں رہا تھا، لیکن اہل سرحد نے اپنی عادت کے مطابق اصل کام چھوڑ دیا اور متاع سمیٹنے لگے۔ کسی نے گھوڑا سنبھال لیا، کسی نے ہتھیار اٹھا لئے، کسی نے کپڑوں کی گٹھڑی باندھ لی۔ نہایت افسوس ناک امر یہ ہے کہ جس شخص کے پاس مالِ غنیمت بہ اندازہ حمل و برداشت فراہم ہوتا گیا، وہ چپ چاپ مال اٹھا کر لشکر گاہ سے باہر نکلتا گیا تا کہ جلد سے جلد سمیٹی ہوئی دولت گھر پہنچادے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یورش کی شدت و وسعت میں معتد بہ کمی آگئی۔

سکھوں نے پہلے سمجھا تھا کہ ہزاروں غازی بجلیاں بن کر آگرے ہیں۔ جب گولہ انداز نے رن مہتاب (۱) جلائی اور ڈور کھینچ کر اسے بلند کر دیا، تو دور دور تک میدان روشن ہو گیا، اس وقت سکھوں کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ حملہ آوروں کی تعداد بہت کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی اور قندھاری غازی ہی لشکر گاہ میں رہ گئے تھے، اہل سرحد میں سے زیادہ تر واپس جا چکے تھے۔

غازیوں کے کارنامے

غازیوں میں سے ایک ایک نے آٹھ آٹھ دس دس آدمیوں کو موت کی نیند سلایا۔ عبدالمجید خاں آفریدی نے کمزوری کے باوجود چودہ آدمی قتل کئے پھر اس کی تلوار ٹوٹ

(۱) اس کی صحیح کیفیت معلوم نہ کرسکا۔ قیاس یہ ہے کہ کوئی ایسی چیز ہوگی جس سے اندھیرے میں دور دور تک روشنی ہو جاتی تھی۔

گئی۔ مولوی امیر الدین ولایتی کے پاس دو تلواریں تھیں، انہوں نے جھٹ ایک تلوار عبدالمجید خاں کو دے دی، اس سے بھی کئی آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔(۱) پھر خود بھی جامِ شہادت پی کر "عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ" کے انعام یافتہ گروہ میں شامل ہو گیا۔ یہ وہی جوانمرد تھا جسے بیمار ہونے کے باعث شبخون مارنے والے گروہ میں شامل نہیں کیا گیا تھا اور اس نے بہ اصرار و الحاح اپنا نام شامل کرایا تھا۔

ہدایت اللہ کے پاس صرف برچھی تھا، اس نے برچھی سے سات آدمی گرائے۔ اللہ بخش خاں مورانوی امیر جیش، شمشیر خاں جمعدار، غلام رسول خاں، غلام حیدر خاں شیخ ہمدانی، علی حسن خاں، شیخ بڈھن، شیخ رمضانی، میرزا ھمایوں بیگ اور دوسرے غازیوں نے شجاعت کے حیرت انگیز جوہر دکھائے، یہاں تک کہ اکثر سکھ سراسیمہ وار بھاگ نکلے اور غازی توپوں کے قریب پہنچ گئے۔

بدھ سنگھ حملے کی اطلاع پاتے ہی لشکر گاہ میں پہنچا۔ نقارہ بجا کر بھاگتے ہوئے سکھوں کو جمع کر کے جوابی حملہ کیا تو غازی جو بہت تھوڑے رہ گئے تھے، ایک گوشے میں جمع ہونے پر مجبور ہو گئے۔ اس وقت تک زیادہ سے زیادہ پندرہ غازی شہید ہوئے ہوں گے، اور سکھ لشکر کو سخت نقصان پہنچ چکا تھا۔ اللہ بخش خاں امیر جیش نے اب سنگھر کی طرف ہٹنا شروع کر دیا تا کہ اپنے تمام ساتھیوں کو باہر نکال کر خود بھی نکل جائے۔ راستے میں شیخ ہمدانی اور علی حسن خاں ایک جگہ کھڑے بندوقیں چلا رہے تھے، انہوں نے قرائن سے امیر جیش کے عزمِ مراجعت کو بھانپ لیا اور پکار اُٹھے۔

امیر المومنین نے آپ کو ہمارا سردار بنا کر بھیجا ہے، آپ دشمن کے مقابلے میں پیچھے کیوں ہٹتے جا رہے ہیں؟

یہ آوازہ نہ جنگی مصلحتوں کے مطابق تھا نہ شبخون کے مفہوم سے اسے کوئی مناسبت

(۱) منظورہ میں ہے: "از اں ہم چند کس را کشتند"

تھی، بلکہ یہ محض تہور و حمیت کے بے پایاں طوفان کی ایک لہر تھی۔ اللہ بخش خاں کو یہ گوارا نہ ہوا کہ جس جیش کا سردار بنا کر اسے بھیجا گیا تھا، اس کے ایک حصے کو پیچھے چھوڑ کر سلامت نکل جائے، چنانچہ اس نے مراجعت کا خیال چھوڑ دیا اور جم کر اس لشکر سے باقاعدہ جنگ کرنے لگا جو اس کی پوری جماعت سے پچاس ساٹھ گنا تھا۔ جب تک دونوں گروہوں میں فاصلہ زیادہ تھا، بندوقیں چلتی رہیں، فاصلہ کم رہ گیا تو قرابینیں اور شیر بچے چلنے لگے، پھر تلواریں میانوں سے نکل آئیں، اللہ بخش خاں نے ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ لے کر ایسا شدید حملہ کیا کہ سکھ فوج دور تک پیچھے ہٹ گئی، اس حملے میں خود بھی ہمراہیوں کے ساتھ خلعتِ شہادت پا کر جنت الفردوس میں پہنچ گیا۔

واپسی

یہ دیکھ کر باقی غازی آگے بڑھے لیکن اکبر خاں بہیلہ دار نے انہیں یہ کہہ کر روک دیا کہ اسی میدان میں آخری فیصلہ نہ ہوگا، اب واپس چلو، انشاء اللہ پھر لڑیں گے۔ صبح نمودار ہو رہی تھی، سکھوں کی سراسیمگی اسی سے ظاہر ہے کہ کسی کو ان کے تعاقب کا حوصلہ نہ ہوا، جو لوگ پہلے نکلے تھے، انہوں نے دریا پر وضو کر کے صبح کی نماز پڑھی، بعد میں آنے والے لوگوں نے تیمّم کر کے فریضۂ صلوٰۃ ادا کیا۔

سید صاحب نے صبح ہی سے غازیوں کی ایک جماعت کو دریا کے مغربی کنارے پر کھڑا کر دیا تھا تاکہ اگر دشمن کی فوج غازیوں کے تعاقب میں آ رہی ہو تو اس کے مقابلے میں جم جائیں، اور شبخون مارنے والے غازی اطمینان سے دریا کو عبور کر لیں۔ زیادہ تر غازی صبح ہوتے ہی پہنچ گئے، باقی دو دو چار چار کی ٹولیوں میں عصر تک آتے رہے، جب تک سب جمع نہ ہو گئے، ان میں کسی نے دریا عبور نہ کیا۔ صرف زخمیوں کو لشکر گاہ میں پہنچا دیا گیا، جن کی مرہم پٹی کا فوری انتظام ضروری تھا۔

اکوڑہ کی جنگ ۲۰ / جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ (مطابق ۲۰ / دسمبر ۱۸۲۶ء) چہار شنبہ اور پنج شنبہ کی درمیانی رات میں سوا چار بجے سے چھ بجے صبح تک جاری رہی، سید صاحب نے تمام شہدا کے لئے دعائے مغفرت کی۔ شہدا کی فہرست اگلے دن مکمل نہ ہوسکی، اس لئے کہ کئی غازی راستہ بھول کر خدا جانے کہاں کہاں چلے گئے اور وہ پنج شنبہ اور جمعہ کی درمیانی رات میں نوشہرہ پہنچے۔

شہدا کے نام

اس جنگ میں چھتیس ہندوستانی غازی اور چھیالیس قندھاری غازی شہید ہوئے دونوں جماعتوں کے زخمیوں کی تعداد تیس اور چالیس کے درمیان تھی۔(۱) اہل سرحد میں غالباً کسی نے بھی شہادت نہ پائی اگر کوئی شہید ہوا تو اس کی کیفیت معلوم نہ ہوسکی، ہندوستانی شہدا کے نام یہ ہیں:

۱۔ اللہ بخش خاں، امیر ساقۃ العسکر و امیر شبخون (مورائین، ضلع اناؤ، یوپی)

۲۔ شمشیر خاں جمعدار (مورائیں، ضلع اناؤ، یوپی)

۳۔ شیخ رمضانی (مورائیں، ضلع اناؤ، یوپی)

۴۔ عبدالجبار خاں (مورائیں، ضلع اناؤ، یوپی)

۵۔ عبدالمجید خاں آفریدی (جہان آباد، رائے بریلی، یوپی)

۶۔ شیخ ہمدانی (خالص پور، ملیح آباد، یوپی)

۷۔ غلام حیدر خاں (خالص پور، ملیح آباد، یوپی)

۸۔ غلام رسول خاں (خالص پور، ملیح آباد، یوپی)

(۱) وقائع میں ہے: پینتیس چھتیس ہندوستانی اور چالیس پینتالیس قندھاری شہید ہوئے دونوں جماعتوں کے زخمی تیس چالیس تھے۔ میرے نزدیک منظورہ کا بیان درست ہے، جس میں ہندوستانی شہدا کی تعداد تعین کے ساتھ ''سی وشش'' بتائی گئی ہے، اس کی تصدیق دوسرے ذریعے سے بھی ہوتی ہے، تفصیل آگے چل کر معلوم ہوگی۔

۹۔ اکبر خاں	(خالص پور، ملیح آباد، یوپی)
۱۰۔ منور خاں	(خالص پور، ملیح آباد، یوپی)
۱۱۔ علی حسن خاں	(گتنی، ضلع پرتاپ گڑھ، یوپی)
۱۲۔ شیخ معظم	(جگدیش پور، ضلع پرتاپ گڑھ، یوپی)
۱۳۔ کریم بخش	(بڑھانہ، ضلع مظفر نگر، یوپی)
۱۴۔ میاں جی احسان اللہ	(بڑھانہ، ضلع مظفر نگر، یوپی)
۱۵۔ فہیم خاں	(حسین پور، ضلع مظفر نگر، یوپی)
۱۶۔ سید محمد	(لوہاری، ضلع مظفر نگر، یوپی)
۱۷۔ عبد الرحمٰن	(شاملی، ضلع مظفر نگر، یوپی)
۱۸۔ شادل خاں	(خیر آباد، ضلع سیتا پور، یوپی)
۱۹۔ امام خاں	(خیر آباد، ضلع سیتا پور، یوپی)
۲۰۔ دین محمد	(کورہرستانہ، ضلع سیتا پور، یوپی)
۲۱۔ عباد اللہ	(مئو، ضلع جھانسی، یوپی)
۲۲۔ اولاد علی	(ماڈھ، ضلع ہمیر پور، یوپی)
۲۳۔ میرزا ہمایوں بیگ	(لکھنؤ)
۲۴۔ جواہر خاں	(لکھنؤ)
۲۵۔ عبد الرزاق	(دیوبند، ضلع سہارن پور، یوپی)
۲۶۔ امام الدین	(رام پور، ضلع سہارن پور، یوپی)
۲۷۔ محمد کمال	(خرم پور، ضلع سہارن پور، یوپی)
۲۸۔ شیخ بڈھن	(وطن معلوم نہ ہو سکا غالباً یوپی)
۲۹۔ خدا بخش	(وطن معلوم نہ ہو سکا غالباً یوپی)

۳۰۔ قاضی طیب (وطن معلوم نہ ہو سکا غالباً یو پی)
۳۱۔ غلام نبی (گوالیار)
۳۲۔ شیخ مخدوم (مسجد فتح پوری، دہلی)
۳۳۔ کریم بخش (مسجد فتح پوری، دہلی)
۳۴۔ شیخ باقر علی قاسم غلہ (صادق پور، عظیم آباد، بہار)
۳۵۔ سید عبدالرحمٰن (سندھ)
۳۶۔ حسن خاں (سندھ)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام سوانح نگاروں نے ہندوستانی شہدا کی تعداد سینتیس بتائی ہے، جو صحیح نہیں۔ اس عدد کی ابتدا مولوی محمد جعفر تھانیسری نے کی، ان سے دو غلطیاں سرزد ہوئیں: اول وہ نمبر ۳۳ (کریم بخش مسجد فتح پوری) کا نام اصل فہرست میں سے چھوڑ گئے۔ وجہ غالباً یہ ہوئی کہ انہوں نے کریم بخش بڑھانوی اور کریم بخش دہلوی کو ایک شخص سمجھ لیا۔ دوسرے انہوں نے برکت اللہ بنگالی اور حیات خاں بریلوی کو شہدائے اکوڑہ میں شامل کر لیا، حالانکہ وہ دونوں جنگِ بازار میں شہید ہوئے تھے، جو قصبہ حضرو پر شبخون سے دوسرے دن دریائے اباسین کے کنارے پیش آئی تھی، اور مولوی صاحب نے ان کی شہادت کا ذکر جنگ بازار کے سلسلے میں بھی کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سید صاحب نے جنگ بازار کے بعد جو پہلا مکتوب ہندوستان بھیجا تھا اس میں اکوڑہ اور بازار کے شہدا کی فہرست یکجا درج کر دی ہوگی، یہی فہرست سوانح نگاروں نے جنگ اکوڑہ کے سلسلے میں نقل کر دی۔

بہر حال جنگ اکوڑہ کے ہندوستانی شہدا چھتیس تھے نہ کہ سینتیس، قندھاری شہدا کے نام اس لئے معلوم نہ ہو سکے کہ ہندوستان میں ان کے ناموں کی فہرست بھیجنی بے معنی تھی،

اور سید صاحب کے دفتر میں جو ریکارڈ تھا وہ جنگ بالاکوٹ میں نذرِ آتش ہو گیا۔ ہندوستانی غازیوں میں سے جو زخمی ہوئے ان میں سے مندرجہ ذیل کے نام معلوم ہو سکے۔

۱۔ سید رستم علی (چل گاؤں) ان کی پنڈلی میں گولی لگی تھی۔(۱)
۲۔ ابراہیم خاں خیر آبادی، ان کی کہنی پر گولی کا زخم تھا۔
۳۔ احمد (فتح پور ہسوہ) ان کے دونوں پاؤں مجروح ہو گئے تھے۔
۴۔ اکبر خاں، ان کی پشت پر تلوار کا زخم تھا۔
۵۔ امام الدین پانی پتی، ان کے سر پر تلوار لگی تھی۔
۶۔ پیر محمد
۷۔ شیخ ولی محمد پھلت (ضلع مظفر نگر)
۸۔ شیخ امجد علی غازی پور
۹۔ قاضی حمایت اللہ
۱۰۔ برہان الدین
۱۱۔ خدا بخش منجھاؤں
۱۲۔ حافظ عبدالوہاب لکھنوی، جو شیخ باقر علی کے بعد قاسم غلہ مقرر ہوئے۔
۱۳۔ حمزہ علی خاں لوہاری
۱۴۔ خدا بخش بنارسی
۱۵۔ حاجی عبداللہ

ان میں سے اکثر جنگ شیدو سے پیشتر تندرست ہو چکے تھے۔

سید صاحب کا مکتوب

''وقائع احمدی'' اور منظورۃ السعداء'' کے علاوہ جنگ اکوڑہ کے سرسری حالات سید

(۱) انہوں نے دوآبہ کے دورے میں بیعت کی تھی اور اس وقت عمر صرف پندرہ سولہ سال کی تھی۔

صاحب کے دو خطوں میں مرقوم ہوئے: اول وہ خط جو پہلے پہل احوالِ جہاد کے متعلق ہندوستان بھیجا گیا، اس میں پشاور سے چارسدہ، پھر خویشگی اور نوشہرہ پہنچنے کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ سکھ لشکر اکوڑہ میں تھا، جو نوشہرہ سے سات کوس ہے، بیچ میں دریائے لنڈے حائل ہے:

> مصلحتِ وقت چناں اقتضا کرد کہ جمعے از مجاہدین صادقین شباشب از دریائے مسطور عبور کنانیدہ ...... بہ طریق شبخون روانہ ساختہ، چنانچہ مجاہدین ممدوحین بہ شب بستم شہر جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ ہجری قدسی ......قریب صبح تاخت آورند...... در آخر ہماں شب بر سر غافلین دفعۃً رسیدند و توپ وتفنگ را معطل کنانیدہ کار وبار بہ سیوفِ قاطعہ رسانیدند...... بالجملہ با بے از ابواب فتوح برروئے مجاہدین مفتوح گردید۔(۱)

ترجمہ : مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ ہوا کہ مجاہدین کی ایک جماعت کو راتوں رات دریا سے گزار کر شبخون کیلئے بھیجا جائے، چنانچہ اس جماعت نے ۲۰؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۴۲ھ کو حملہ کیا اور رات کے آخری حصے میں غافلوں پر جا گرے، توپیں اور بندوقیں معطل ہوگئیں اور تلواروں کی لڑائی ہوئی، بالجملہ مجاہدین کے لئے فتح کا ایک دروازہ کھل گیا۔

پھر امیر دوست محمد خاں کو ایک خط میں یہی حالات رقم فرمائے۔(۲) مولانا عبدالحیٔ سید صاحب سے چند ماہ بعد سرحد گئے تھے، انہوں نے بھی اپنے پہلے خط میں جنگِ اکوڑہ کا حال لکھا ہے۔ میرزا عطا محمد خاں شکار پوری کے روزنامچے میں بھی سید صاحب کے مکتوب کی بنا پر اس جنگ کا ذکر آیا ہے۔

(۱) منظورہ ص:۳۱۵-۳۲۰

(۲) مکاتیب سید صاحب ص:۲۸۲۔ اس میں لکھتے ہیں کہ سکھوں میں سے ایک ہزار بلکہ زیادہ آدمی مارے گئے۔

جنگِ اکوڑہ کے نتائج

اکوڑہ کا حملہ محض شبخون تھا، اگر بعض غازی جوشِ جماعت میں شبخون کے حدود سے تجاوز نہ کرتے تو یقین ہے کہ ان کا نقصان بہت کم ہوتا۔(۱) سکھوں کے نقصان کی نسبت روایات مختلف تھیں، ابتدا میں یہ افواہ تھی کہ کم وبیش ایک ہزار مارے گئے، سید صاحب نے اپنے مکتوب میں یہی تعداد درج کی ۔ پھر امیر خاں خٹک نے اکوڑہ جا کر پوری تحقیقات کیں اور بتایا کہ مقتولین کی تعداد سات سو سے کم نہ ہوگی، مجروحین اس سے کہیں زیادہ تھے۔

بدھ سنگھ کے پائے ثبات میں سخت تزلزل پیدا ہوگیا، وہ اکوڑہ سے ہٹ کر شیدو پہنچ گیا، جو تین میل جنوب میں ہے۔اس کی خواہش تھی کہ دریائے اباسین کو عبور کر کے اٹک چلا جائے، لیکن قلعہ دار اٹک نے یہ کہہ کر روکا کہ اگر سرحدی علاقے سے فوجیں ہٹا لیں تو اٹک خطرے میں پڑ جائے گا، اور سید صاحب عام سرحدیوں کو لے کر یورش کر دیں گے تو مقابلہ مشکل ہو جائے گا۔سکھوں میں سے ہر شخص کی زبان پر یہ بات تھی کہ ہم نے سید صاحب کے غازیوں جیسے جوانمرد نہ دیکھے، نہ سنے۔(۲) اہل سرحد پر فوری اثر یہ ہوا کہ وہ جوق در جوق سید صاحب کے پاس پہنچ کر بیعتِ جہاد کرنے لگے اور ان کے جھنڈے تلے لڑنے کو باعثِ فخر سمجھنے لگے۔حق یہ ہے کہ اجنبی تسلط سے نجات حاصل کرنے کی یہ واحد امید گاہ تھی۔(۳)

(۱) مولانا عبدالحئیؒ بھی اپنے خط میں فرماتے ہیں: حکم یہ تھا کہ حملہ کر کے پلٹ آئیں، لیکن بعض برگزیدگانِ لشکر نے اس حکم کا پورا خیال نہ رکھا۔

(۲) یہ افواہ ان لفظوں میں بیان ہوئی کہ ''سکھاں ایں چنیں مقاتلان دیدہ وشنیدہ نہ شد۔

(۳) الفاظ یہ ہیں: بہ ظہور ایں واقعہ مسلمین ایں دیار فراہم شدن شروع کردند۔ یار محمد خاں نے سید صاحب کے بارے میں سکھ قلعہ دار اٹک کو مراسلہ بھیج دیا تھا کہ عام افغان اور زمینداران یوسف زئی ساتھ ہو گئے ہیں، اٹک اور خیر آباد کے تھانیدار بھی برابر عرضداشتیں بھیج رہے تھے، تا کہ مزید کمک پہنچے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے اپنے بیٹے کو حکم دے دیا کہ توپخانہ، لشکر اور سر کردہ اصحاب کو لے کر اٹک جائے اور اس علاقے کا بندوبست کرے۔

تینتیسواں باب:

واقعہ حضرو اور جنگِ بازار

خوانین و عوام کا رجوعِ عام

اہل سرحد نے سید صاحب کی تحریکِ جہاد کے خیر مقدم میں اگرچہ بہ ظاہر ولولہ انگیز جوش و خروش کا اظہار کیا تھا، لیکن عملی تعاون کیلئے بہت کم لوگوں نے قدم بڑھائے تھے۔ ان کے تامل کی بڑی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ سید صاحب کے پاس جمعیت بہت کم تھی اور ساز و سامان بھی برائے نام تھا۔ اہل سرحد سمجھتے ہوں گے کہ جس قوت کا مقابلہ کابل و پشاور کے دونوں سردار باوجود فراوانیٔ وسائل نہ کر سکے، اس کے سیلِ اقتدار کو سید صاحب کا مختصر سا بے سر و سامان قافلہ کیوں کر پیچھے ہٹا سکے گا؟ لیکن جنگِ اکوڑہ نے اکثر قلوب کو تذبذب اور بے یقینی کی آلائشوں سے پاک کر دیا اور چھوٹے بڑے سید صاحب کے ساتھ تعاون کے لئے تیار ہو گئے۔ ممتاز خوانین میں سے خادے خاں (۱) رئیس ہنڈ (۲) نے سبقت

---

(۱) یہ فارسی کے نام شادی خاں کی پشتو شکل ہے۔

(۲) ہنڈ بہت پرانا مقام ہے، اس کے مختلف تلفظ ہیں: ہِنڈ (بکسر اول) ہَنڈ (بفتح اول) ہُنڈ (بہ ضمہ اول) پرانے زمانے میں اسے "اوہنڈ" اور "وہینڈ" بھی کہتے تھے۔ پشکلاوئی (چارسدہ) کے بعد ہنڈ ہی گندھارا (یعنی سمہ، سوات باجوڑ، بونیر وغیرہ علاقے) کا اہم مقام تھا۔ اٹک کی آبادی سے پہلے لوگ حضرو سے آگے بڑھ کر ہنڈ پر دریا کو عبور کرتے تھے، چینی سیاح یوان چونگ (ہیون سانگ) بودھ مت کے قلمی نسخے لے کر واپس ہوا تھا، تو دریا کو عبور کرتے وقت کئی قیمتی نسخے ضائع ہو گئے تھے۔ ان کی نقلیں یوان چونگ نے ہنڈ ہی میں بیٹھ کر حاصل کی تھیں۔ سکندر نے بھی اسی جگہ سے دریا کو عبور کیا تھا، جلال الدین اکبر نے اس جگہ ایک مضبوط قلعہ بنوایا تھا جو اَب تک باقی ہے۔ اٹک کو عروج ہوا تو ہنڈ کی اہمیت کم ہو گئی، یہ اٹک سے سترہ میل مشرق میں دریائے سندھ کے اس کنارے پر ہے، جو سرحد کی جانب ہے۔

کی، وہ اُونچے درجے کا سردار تھا اور اہل سمہ میں سب سے باجبروت خان سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد اشرف خاں رئیس زیدہ نے بیعت کی جو خادے خاں کا قریبی رشتہ دار تھا۔

سید صاحب ہنڈ میں

خادے خاں نے بیعت کے ساتھ ہی اصرار کیا کہ سید صاحب ہنڈ تشریف لے چلیں، وہاں آسائش کے تمام سامان بہ آسانی فراہم ہوسکیں گے۔ اس وقت تک مجاہدین کے لئے کوئی مرکز تجویز نہیں ہوا تھا، سید صاحب پشاور سے چارسدہ پہنچے، وہاں دو ہفتے گزار کر نوشہرہ گئے۔ جنگ اکوڑہ کے بعد بھی وہیں مقیم تھے، ہنڈ اگرچہ موزوں مرکز نہ تھا، اس لئے کہ عین سرحد پر واقع تھا، لیکن وہاں ایک مضبوط قلعہ موجود تھا، اور جہاد کے ابتدائی دور میں اس سے اچھا کام لیا جاسکتا تھا، نیز خادے خاں بہ اصرار ساتھ لے جارہا تھا، کسی دوسرے مقام سے دعوت نہیں آئی تھی، اسلئے سید صاحب نے خادے خاں کی درخواست منظور فرمالی، تاکہ ایک جگہ بیٹھ کر تنظیم کا کام باقاعدہ شروع کردیں۔ زخمیوں کو آپ نے نوشہرہ سے اٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ مولوی عبدالقیوم اور سید امانت علی کو ان کی دیکھ بھال کے لئے مقرر فرمایا اور خود غازیوں سمیت نوشہرہ سے نکل کر مصری بانڈے میں ٹھہرے جو اکوڑہ کے عین سامنے دریائے لنڈے کے مشرقی کنارے پر ہے۔ وہاں سے نکلے تو تورڈھیر میں دو راتیں گزاریں، وہیں خادے خاں چالیس سواروں کے ساتھ پیشوائی کے لئے پہنچ گیا، ان کے ہمراہ سید صاحب ہنڈ پہنچے۔

اگرچہ ہندوستانی اور قندھاری غازیوں کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا، لیکن اہل سرحد کی جمعیت بہت بڑھ گئی تھی، ہنڈ پہنچے تو سید صاحب کے قیام کیلئے موضع بازار تجویز کیا، جو ہنڈ کے مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر لبِ دریا واقع تھا۔ وہیں رؤسا وخوانین اور عوام بیعت کے لئے آنے لگے۔

خادے خاں

خادے خاں نے جس طرح سید صاحب کے خیر مقدم میں پہل کی، اسی طرح مخالفت میں بھی سبقت اسی کی طرف سے ہوئی۔ سرداروں کے علاوہ جو اشخاص سید صاحب کیلئے مشکلات پیدا کرنے کے باعث ہوئے، ان میں خادے خاں سب سے پہلے آتا ہے۔ طبعاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید صاحب کی عقیدت میں ابتدائی جوش کی علت کیا تھی؟ آیا وہ واقعی مخلصانہ حاضر ہوا تھا اور جہاد فی سبیل اللہ میں سبقت کا درجہ حاصل کر کے عنداللہ ماجور ہونا چاہتا تھا؟ آیا وہ اس غرض سے سید صاحب کو ساتھ لے گیا تھا کہ سرحد پر سکھوں کی ترکتازوں کا پہلا اہم مقام ہنڈ تھا اور اسے امید تھی کہ سید صاحب ہنڈ میں رہیں گے تو سکھ حملہ کرتے ہوئے ہچکچائیں گے؟ آیا وہ سید کا مہمانداری بن کر سرحد کے رؤسا و خوانین میں درجۂ امتیاز حاصل کرنا چاہتا تھا؟ نیتوں کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں، قرائن یہی ہیں کہ خادے خاں ابتدا میں مخلص تھا، مگر اس نے طبیعت ایسی پائی تھی کہ کسی دوسرے شخص کے اعتماد و اعتبار کی افزائش اسے گوارا نہ تھی۔ فتح خاں رئیس پنجتار اور اشرف خاں رئیس زیدہ زیادہ نیک، نرم طبیعت اور مخلص تھے، انہیں سید صاحب کے نزدیک معزز دیکھا تو خادے خاں کے دل میں اک گونہ رنج پیدا ہوا، پھر شرعی حکومت کے قیام پر خادے خاں کو از روئے انصاف بعض تصرفات سے دست کش ہونا پڑا تو وہ سید صاحب کا دشمن بن گیا، یہ تفصیلات موقع پر پیش ہوں گی۔

حضرو پر چھاپے کی تجویز

سید صاحب بازار ہی میں مقیم تھے، جب حضرو پر چھاپے کا واقعہ پیش آیا۔ اس واقعے کو سید صاحب کے مجاہدات سے اصلاً کوئی تعلق نہ تھا(۱) لیکن اس کے ضمن میں

(۱) افسوس کہ عام سوانح نگار اس بے تعلقی کا پورا اندازہ نہ کر سکے، اگرچہ سب نے لکھا کہ سید صاحب نے حضرو کے چھاپے میں حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔

ایک چپقلش پیش آگئی، اس لئے حضرو کے چھاپے کا کچھ حال بیان کردینا ضروری ہے۔

اہل سرحد اگرچہ جہاد کیلئے فراہم ہونے لگے تھے تاہم انہیں سید صاحب کی تحریک کے مقاصدِ عالیہ یعنی جہاد کے شرعی اصول وضوابط سے قطعاً آگاہی نہ تھی۔ ان کے نزدیک جہاد کا مضمون محض یہ تھا کہ جہاں جی چاہا چھاپا مارا، روپیہ یا سامان لوٹا اور چلے آئے۔ حضرو(۱) آج بھی بڑا تجارتی قصبہ ہے، سید صاحب کے زمانے میں شمالی ہند کی تجارت کا ممتاز مرکز تھا، اور وہاں دولت مند تاجر رہتے تھے۔ سکھوں سے اہل سرحد کی محاربت مدت سے جاری تھی اور ان کے علاقے میں کسی مقام پر چھاپا مارنا شرع وقانون کے اعتبار سے ناجائز نہ تھا۔ خود سکھوں کی بھی یہی حالت تھی کہ جب موقع پاتے حملے کرتے اور جو چیز ہاتھ لگتی اٹھا کر لے جاتے۔ سید صاحب دشمن کی جنگی قوت یا امن ونظم کو نقصان پہنچانے کیلئے تو چھاپے مار سکتے تھے، صرف لوٹ مار کی غرض سے چھاپے مارنا انہیں پسند تھا، نہ ان میں شرکت فرما سکتے تھے، اور نہ یہ چھاپے ان مقاصد کیلئے مفید تھے، جو سید صاحب کے پیش نظر تھے۔

سرحدیوں نے خود حضرو پر چھاپے کی اسکیم تیار کی، جب یہ اسکیم سید صاحب کی خدمت میں پیش کی گئی تو آپ کے ارشاد کے مطابق اخوند ظہور اللہ نے پشتو میں اہل سرحد پر واضح کردیا کہ ہندوستانی غازی اس ملک میں نووارد ہیں اور یہاں کے رسم وراہ سے واقف نہیں، نیز ان کی خاصی تعداد جنگِ اکوڑہ میں شہید ومجروح ہوچکی تھی، لہٰذا وہ چھاپے میں شریک نہ ہوں گے۔ آپ لوگ تمام مراسم سے آگاہ ہیں، جو چاہیں کریں۔ چنانچہ ہندوستانی غازیوں میں سے ایک بھی اس چھاپے میں شریک نہ ہوا، قندھاریوں میں سے تیس چالیس آدمی تیار ہوگئے، سید صاحب نے اس شرط پر اجازت دی کہ کسی مسلمان کو

(۱) حضرو علاقہ چھچھ ضلع کیمبل پور کا مشہور مقام اور دریائے اباسین سے تقریباً چھ سات میل کے فاصلے پر ہے، تمباکو کی بہت بڑی منڈی ہے اور یہاں کی نسوار پاک وہند میں اول درجے کی مانی جاتی ہے۔

ان کے ہاتھ سے گزند نہ پہنچے۔

چھاپا

غرض رات کے ابتدائی حصے میں اہل سرحد کی ایک بڑی جماعت نے، جن میں قندھاری بھی شامل تھے، کشتیوں، جالوں اور شناسوں (۱) کے ذریعے سے دریا کو عبور کیا، پھر جمع ہو کر حضرو پر بڑھے۔ وہاں ایک گڑھی تھی، جس میں سکھ سپاہی رہتے تھے۔ ایک توپ بھی تھی، چھاپے کی تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں، صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ قندھاریوں نے جاتے ہی گڑھی پر قبضہ کر لیا۔ اہل سرحد منڈی لوٹنے میں مشغول ہو گئے، جن لوگوں نے مقابلہ کیا وہ مارے گئے۔ خود سید صاحب کے اندازے کے مطابق مقتولین چار سو سے کم نہ ہوں گے۔ (۲) طلوع سحر سے پہلے پہلے سب لوگ سامان اٹھا کر دریا کے کنارے پہنچ گئے۔

سید صاحب صبح کی نماز ادا فرما چکے تو ایک شخص نے نہایت عمدہ گھوڑا بطور نذر پیش کیا جو زیوروں سے مزین تھا، آپ نے گھوڑا اسی کو دے دیا، کچھ غازی بھی نماز سے فارغ ہو کر دریا کے کنارے جمع ہو گئے، انہوں نے دیکھا کہ دوسرے کنارے کے آس پاس اہل سرحد سامان کی گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے قطار در قطار چلے آ رہے ہیں۔ قندھاری سب کے پیچھے تھے اور ان کے پاس کوئی سامان نہ تھا، معلوم ہوتا ہے قندھاری ان کے پیچھے پیچھے چلے تا کہ عقب سے حملہ آوروں کی روک تھام کر سکیں۔

---

(۱) سرحد میں عبورِ دریا کے لئے کئی چیزیں استعمال ہوتی تھیں، جالا ایک بڑا ٹوکرا ہوتا تھا، جسے چمڑے سے منڈھ لیا جاتا تھا، تاکہ پانی اس میں نفوذ نہ کر سکے۔ شناس مشکیزے کو کہتے ہیں، جس میں ہوا بھری جاتی ہے، اور اسے بغل میں دبا کر تیرتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

(۲) مکاتیب سید صاحب ص: ۲۸۳

سکھ سواروں کی یورش

دفعۃً عقب سے پندرہ بیس سکھ نمودار ہوئے اور قندھاریوں پر بندوقیں سرکیں۔ قندھاری پاس کے خشک نالے میں مورچے پکڑ کر ٹھہر گئے اور گولیوں کا جواب گولیوں سے دینے لگے۔ سوار رُک گئے، اہل سرحد نے یہ حالت دیکھی تو یورشیوں کے مقابلے میں قندھاریوں کا ساتھ دینے کے بجائے سامان اٹھا کر سراسیمہ وار دریا کی طرف دوڑ پڑے تا کہ جلد سے جلد پہنچ جائیں۔ جو لوگ دریا پر پہنچ چکے تھے، انہوں نے کشتیوں یا جالوں کا انتظار بھی نہ کیا، سامان کے ساتھ پانی میں کود پڑے، ان میں سے خاصی تعداد غرق ہوگئی، قندھاری پورے اطمینان و تنظیم سے دشمن کے سواروں کا مقابلہ کرتے رہے، اس اثناء میں مزید پانسو سکھ سوار موقع پر آپہنچے۔

اہل سرحد کیلئے زیبا یہ تھا کہ مال واسباب کو چھوڑ کر پہلے دشمن کو بھگاتے، پھر دلجمعی سے کشتیوں یا جالوں میں بیٹھ کر دریا کو عبور کرتے۔ انہوں نے اس اہم مصلحت کو نظر انداز کر کے صرف سامان کو بچانے کا خیال رکھا، اس سراسیمگی میں بعض کی جانیں بھی گئیں اور سامان بھی گیا۔

سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو حکم دے دیا کہ تمام غازی ہتھیار باندھ کر کنارِ دریا پر پہنچ جائیں۔ خادے خاں سے کہا کہ اپنے آدمی قندھاریوں کی امداد کے لئے تیار کر دیجئے۔ سید انور شاہ امرتسری کو ان کا قائد مقرر کر کے ہدایت فرمادی کہ آپ فوراً دریا سے پار اُتر کر قندھاریوں کو کمک پہنچائیں۔

غازیوں کی پامردی

سید انور شاہ پچاس ساٹھ آدمیوں کو لے کر کشتی کے ذریعے سے دریا کے پار پہنچے اور قندھاریوں کے برابر مورچے جما کر لڑنے لگے۔ اگرچہ سید صاحب نے غازیوں کو ساتھ

جانے کا حکم نہیں دیا تھا، صرف یہ حکم تھا کہ وہ کنارِ دریا پر ٹھہرے رہیں، مگر بعض غازی جوشِ شجاعت میں اس خیال سے سید انور شاہ کے ساتھ ہو گئے کہ جب مقصود محض یہ تھا کہ قندھاریوں کو کمک پہنچانا ہے تو کیوں نہ اس سلسلے میں سبقت کا درجہ حاصل کریں۔ ان میں سے جن اصحاب کے اسمائے گرامی وقائع نگاروں نے محفوظ رکھے، وہ یہ تھے: حیات خاں بریلوی، شیخ فیض الدین بنگالی، شیخ برکت اللہ بنگالی، محمد صالح سندھی (۱) اور شیخ نظام الدین ''اولیاء'' اس گروہِ غزاۃ نے سکھوں پر زور زور سے باڑھیں ماریں اور تھوڑی ہی دیر میں انہیں بھگا دیا۔ غازیوں میں سے حیات خاں بریلوی اور شیخ برکت اللہ بنگالی شہید ہو گئے، شیخ فیض الدین بنگالی، محمد صالح سندھی اور شیخ نظام الدین ''اولیاء'' زخمی ہوئے۔

سکھ سوار بھاگ نکلے تو سید صاحب کے حکم سے غازیوں کیلئے کشتیاں بھجوا دی گئیں، وہ سوار ہو رہے تھے کہ سکھ سوار تھوڑی دور سے پلٹ آئے، اس مرتبہ شاہینیں بھی ان کے پاس موجود تھیں، جنکے گولے موضع بازار کی سمت کے کنارے پر آنے لگے۔ سید صاحب بھی دریا پر پہنچ گئے تھے، وہاں کوئی اوٹ نہ تھی، سکھوں کے گولے اور گولیاں پے بہ پے آ رہی تھیں، ہر غازی سید صاحب کیلئے فکرمند تھا، بعض نے بے تاب ہو کر عرض کیا کہ آپ پیچھے چلے جائیں، یا ہمیں آگے آنے دیں اور ہماری اوٹ میں قیام فرمائیں۔ سید صاحب نے اطمینان سے فرمایا: یہ نہیں ہو سکتا آپ سب بھائی میرے پیچھے ہو جائیں۔

غرض جب تک حملہ آور سکھ شکست کھا کر واپس نہ چلے گئے اور تمام غازی بازار نہ پہنچ گئے، سید صاحب دریا کے کنارے پر ٹھہرے رہے، اس کشمکش میں سارا دن گذر گیا، سید انور شاہ نے تمام غازیوں کے بعد دریا عبور کیا اور مغرب کے وقت بازار پہنچے۔

مالِ غنیمت کی تقسیم پر جھگڑا

اہل سرحد جو مالِ غنیمت لائے تھے، خادے خاں نے بطور خود حکم دے دیا کہ وہ

(۱) ''وقائع'' میں ان صاحب کا نام ''محمد صلاح'' مرقوم ہے۔

سب ایک جگہ جمع کر دیا جائے تا کہ اسے سید صاحب کے فرمان کے مطابق تقسیم کیا جائے۔ بعض لوگوں نے خان کا یہ حکم تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر گرم گفتاری بلکہ کشمکش کی صورت پیدا ہوگئی۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، وہ لوگ اصول و مقاصدِ جہاد سے بالکل بے خبر تھے، ان کے سامنے مال فراہم کرنے کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔ سید صاحب کیلئے اہل سرحد کے عادات و خصائل کا یہ دوسرا تلخ تجربہ تھا، پہلا تجربہ اکوڑہ کے شبخون میں ہو چکا تھا، اس طرح اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کو ایک نظام میں لانا اور مقاصدِ جہاد کی تعلیم دینا کتنا ضروری ہے۔ اس موقع پر ختمِ نزاع کیلئے یہی مناسب سمجھا گیا کہ جو کچھ جس کے پاس ہے، اُسی کے پاس رہنے دیا جائے۔ چنانچہ سید صاحب نے اخوند ظہور اللہ کی معرفت خادے خاں کو پیغام بھیجا کہ اپنا حکم واپس لے لیجئے اور مالِ غنیمت کی از سرِ نو تقسیم کا سوال نظر انداز کر دیجئے، اس طرح جھگڑا ختم ہوا۔

سکھوں کی دوسری یورش

مولوی الٰہی بخش رام پوری فرماتے ہیں کہ حضرو کے چھاپے سے دو تین روز بعد پھر دو تین ہزار سکھ دریا کے بائیں کنارے پر جمع ہو گئے۔ ان کے پاس چھ شاہینیں تھیں، جنہیں ابتداء میں مخفی رکھا۔ جب غازی مقابل کے کنارے پر جمع ہو گئے تو اچانک شاہینیں چلنی شروع ہوئیں۔ سید صاحب نے کشتیوں کی فراہمی کا حکم دے دیا تا کہ غازی دریا سے پار اُتر کر سکھوں سے جنگ کریں۔ اشرف خاں رئیس زیدہ نے عرض کیا کہ اس سکھ لشکر سے مقابلے کی اجازت مجھے دی جائے، البتہ تھوڑے سے ہندوستانی غازی بطور تیمن ساتھ کر دیجئے۔ سید صاحب نے پاسبانوں اور پہریداروں کے سوا سب غازیوں کو اشرف خاں کی معیت کا حکم دے دیا، اکثر سرحدی لوگ شاہینوں کے گولے دیکھتے ہی منتشر ہو گئے اور اشرف خاں کی کوئی سعی انہیں مجتمع نہ رکھ سکی۔ ایک گولہ سید متا سندھی کے

لگا اور وہ شہید ہو گئے۔

ملکیوں میں نیک دل اور بہادر آدمی بھی تھے، ایک ملکی کمال مردانگی سے تنہا آگے بڑھا اور مشک بغل میں دبا کر بے تکلف دریا میں کود پڑا۔ اکبر خاں غازی کو سید صاحب نے ایک دستار عطا کر رکھی تھی، جو بہت قیمتی تحفہ تھا۔ غازی نے یہ دستار اپنے سر سے اتار کر ملکی مجاہد کے سر پر رکھ دی اور کہا کہ آج سید صاحب کی دستار کا مستحق تجھ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ اس کا پٹکا لے کر اپنے سر پر لپیٹ لیا، پچاس ساٹھ اور ملکی اس کے پیچھے روانہ ہو گئے۔(۱) انہوں نے وسطِ دریا سے سکھوں پر گولیاں چلائیں، مقابلے کا جوش وخروش دیکھ کر سکھ تیزی سے واپس چلے گئے۔

مولانا عبدالحئیؒ اس وقت تک ہندوستان میں تھے، کئی مہینے بعد وہ سرحد پہنچے تو پہلی جنگوں کے حالات سنے۔ اپنے ایک مکتوب میں انہوں نے بھی جنگِ بازار کا ذکر اجمالاً کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرو پر چھاپا مارنے والوں کو واپسی میں نکبت پہنچی، ان پر سکھوں نے حملہ کر دیا، بعض دریا میں غرق ہو گئے۔ غازیوں نے یہ دیکھا تو سید صاحب سے عرض کیا کہ کلمہ گو گروہ تلف ہو رہا ہے، جو کشتیاں ہمارے قبضے میں ہیں وہ اس وقت تک دوسرے کنارے پر نہیں پہنچائی جا سکتیں جب تک ہم ان کی حفاظت کیلئے اس طرف نہ کھڑے ہو جائیں۔ سید صاحب نے یہ درخواست قبول فرمالی اور تیاری کے بغیر غازیوں کو لے کر کنارۂ دریا پر جا کھڑے ہوئے، یہ دیکھتے ہی دشمن بھاگ گئے۔

(۱) روایت میں ہے ''پنجاہ و شش خیک مولا''۔ خیک شناس کو کہتے ہیں یعنی ہوا بھرا مشکیزہ ں۔

چونتیسواں باب:

بیعتِ امامتِ جہاد

ضرورتِ نظم و مرکزیت

اکوڑہ اور بازار کی لڑائیوں سے یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ اہل سرحد میں نظم و جمعیت قطعاً موجود نہیں اور نہ اُن کے سامنے دینی مقاصد ہیں، وہ مال و اسباب کے والہ وشیفتہ تھے۔ سید صاحب کا ساتھ دیتے تو اس لئے نہیں کہ ان بلند اغراض کے لئے جانیں لڑائیں، جن کی خاطر آپ وطن عزیز سے نکل کر سرحد پہنچے تھے، محض مال کی غرض سے معیت اختیار کرتے، جب مال مل جاتا تو رزم و پیکار کی ہر مصلحت سے بے پروا ہو کر گھروں کی راہ لیتے، انہیں بھیڑ یا انبوہ تو کہا جا سکتا تھا "جماعت" نہیں کہا جا سکتا تھا، جس کے لئے مختلف افراد میں وحدتِ فکر و عمل اور وحدتِ مقاصد ضروری ہے۔ اس قسم کے حالات کسی بڑے نصب العین کی تکمیل کے لئے کیوں کر سازگار سمجھے جا سکتے تھے؟ ضروری تھا کہ ان لوگوں کی تنظیم و تربیت کا بندوبست کیا جاتا، یہ کام ایک مرکزِ اطاعت و انقیاد کی تاسیس کے بغیر شروع نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر وہاں مختلف خوانین ورؤسا تھے، جن میں باہم رقابتیں بھی تھیں، جب تک ان کی رضامندی سے ایک مرکزی نظام کا بندوبست نہ ہو جاتا، انہیں ایک جھنڈے کے نیچے کیوں کر جمع کیا جا سکتا تھا؟ وہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع نہ ہوتے تو علاقہ سرحد کی آزادی کے تحفظ اور مغصوبہ بلادِ اسلامیہ کی بازیافت کیلئے نتیجہ خیز جدوجہد کی کیا امید ہو سکتی تھی؟

فتح خاں پنجتاری کی بیعت

سید صاحب جنگِ بازار کے بعد، ہنڈ کے شمال میں ایک تالاب پر مقیم ہو گئے تھے، وہیں علماء وخوانین اور عوام ملاقات و بیعت کے لئے آتے تھے۔ اسی مقام پر خدوخیل کے رئیس فتح خاں پنجتاری نے بیعت کی اور عرض کیا کہ پنجتاری تشریف لے چلیں۔ سید صاحب تیار ہو گئے، وہ فتح خاں کے اخلاص سے بھی متاثر ہوئے ہوں گے، پنجتار کو موقعیت کے لحاظ سے بھی زیادہ موزوں مرکز سمجھا ہوگا، اس لئے کہ وہ پہاڑوں کے بیچ میں محفوظ مقام تھا اور سکھوں کی عام یورش گاہوں سے ہٹا ہوا تھا۔ ہنڈ میں رہنا سید صاحب کو اس وجہ سے بھی مناسب نظر نہیں آتا تھا کہ یہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہو گیا تھا کہ بعض خوانین سے خادے خاں کے تعلقات خوشگوار نہیں اور وہ ہنڈ میں آنے سے ہچکچاتے تھے۔ خادے خاں کو سید صاحب کے قصدِ پنجتار کا علم ہوا تو اس نے بے تابانہ عرض کیا کہ میں فرمانبردار ہوں، آپ ہنڈ ہی میں قیام فرمائیں، جس جس خان یا رئیس کو بلانا منظور ہوگا، میں یہیں بلالوں گا۔(۱)

فتح خاں پنجتاری اس وجہ سے خوانین سرحد میں ممتاز ہے کہ اس نے سید صاحب کے ساتھ جو عہدِ وفا باندھا تھا، اُسے نباہنے اور پورا کرنے میں سب پر فوقیت لے گیا، اگرچہ آخر میں ایک موقع پر اس کے قدم بھی ڈگمگا گئے، نیز اس کا مقام پنجتار برسوں سید صاحب کا مرکز بنا رہا اور آپ نے اپنی مجاہدانہ زندگی کے زیادہ تر اوقات اسی مرکز میں گزارے۔ اس کے بعد خوانین سرحد میں سے جس شخصیت نے سید صاحب کی اعانت و یاوری کا حق ادا کیا، وہ اشرف خاں رئیس زیدہ تھا۔ افسوس کہ اس کی عمر نے وفا نہ کی، اس کے بیٹوں میں سے فتح خاں اور ارسلان خاں برابر سید صاحب کے وفادار رہے۔

(۱) منظورہ ص:۳۱۵

فیصلہ امامتِ جہاد

علماء وخوانین کے ساتھ گفتگو برابر ہوتی رہتی تھی، کہ کاروبارِ جہاد کی تنظیم کے لئے کیا بندوبست کیا جائے۔ سید صاحب کی جماعت میں سے شاہ اسماعیل ان گفتگوؤں میں زیادہ تر حصہ لیتے رہے، اس مسئلے کے شرعی اور انتظامی پہلو خوب واضح ہو گئے تو علماء و خوانین سرحد نے یہ فیصلہ کیا کہ جہاد کیلئے ایک امیر یا امام کا انتخاب ضروری ہے، اور اس منصب جلیل کے لائق صرف سید صاحب ہیں۔ اس لئے بھی کہ ان میں امامت کی تمام شرطیں موجود ہیں، اور اس لئے بھی کہ وہی ہیں جن پر تمام رؤسا وخوانین اور علماء وعوام کے زیادہ سے زیادہ حصے کا اتفاق ہوسکتا ہے۔ چنانچہ ۱۲ر جمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۱ر جنوری ۱۸۲۷ء) کو جمعرات کے دن ہنڈ کے تالاب کے کنارے ''ساداتِ کرام'' علماءِ عظام، مشائخ ذوی الاحترام، امرائے عالی مقام وسائر خواص وعوام نے سید صاحب کے ہاتھ پر امامتِ جہاد کی بیعت کر لی۔ اس سے اگلے روز (جمعہ کے روز) جمعہ کے خطبے میں سید صاحب کا اسم گرامی شامل ہو گیا، ہندوستانی غازی پہلے سے آپ کو ''امیر المومنین'' کہتے تھے کہ اہل سرحد نے آپ کو ''سید بادشاہ'' کا لقب دیدیا۔ سکھ بول چال اور خط وکتابت میں آپ کیلئے ''خلیفہ صاحب'' کی اصطلاح استعمال کرتے تھے۔

بیعت کی حیثیت

میں سید صاحب کی امامت اور امارت کے تمام پہلو قبل ازیں واضح کر چکا ہوں، ان مطالب کو دہرانے کی ضرورت نہیں، تاہم یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ ٹھیک ٹھیک ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ امامت کے بعد سید صاحب کو صرف کاروبارِ جہاد کی تنظیم کے لئے مختار بنایا گیا تھا، رؤساء وخوانین کے عام امور ریاست وخانیت سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ دعوت کے ذریعے سے لوگوں میں جہاد کے جذبے کو ابھار سکتے تھے، انہیں دینی واجبات

سمجھا سکتے تھے، جن جن رئیسوں نے بیعت کی تھی، ضرورت کے مطابق ان سے امداد طلب فرما سکتے تھے۔ میدانِ جنگ میں سب لوگ ان کی تنظیمات قبول کرنے پر مجبور تھے، لیکن میدانِ جنگ سے باہر آتے ہی سب اپنے حلقوں میں بالکل آزاد تھے۔ موجودہ زمانے کی عام اصطلاح میں یوں سمجھ لینا چاہئے کہ جہاد کی غرض سے تمام عناصر کو یکجا رکھنے کے لئے یہ ایک نوع کی کنفڈریسی (یعنی عوام وخوانین ورؤسا کا وفاق واتحاد) بن گئی تھی، جس کے رئیس اعلیٰ سید صاحب تھے۔

بلاشبہ اس وفاق میں استحکام وپختگی کی وہ روح موجود نہ تھی جو ایک بلند پایہ نظام میں ہونی چاہئے، مگر یہ سروسامانِ جہاد کی ابتدا تھی، طوع ورغبت اور دعوت وارشاد پر انحصار کے سوا چارہ نہ تھا۔ اگر تمام خانیوں اور ریاستوں کو ختم کر کے سارے علاقوں کو ایک حکومت میں منضبط کرنے کا سوال اٹھایا جاتا تو فوراً باہمی رزم وپیکار کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور اصل مقصد کے لئے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے ہی پورے متاعِ عمل ختم ہو جاتی۔ سید صاحب فتح کی صورت میں مختلف رؤسا کے ساتھ عطائے ملک وجاگیر کے وعدے بھی فرماتے رہے، تالیف قلوب کا طریقہ یہی ہوسکتا تھا، لیکن آپ نے ہر وعدہ دو شرطوں سے مشروط رکھا: اول یہ کہ ملک وجاگیر پانے والے شخص کا نظامِ حکومت خالصۃً اسلامی ہوگا اور وہ اپنے حلقے میں شریعتِ حقہ کے احکام بالاہتمام رائج کرے گا۔ دوم یہ کہ مال وقوت کا ایک مناسب حصہ دواماً جہادِ عمومی کے لئے وقف رکھے گا۔

دعوتِ عام

اس انتظام کے بعد سید صاحب نے جہاد کیلئے دعوتِ عام کا انتظام کیا، تمام رؤسا واُمراء اور ملوک وسلاطین کو باقاعدہ خطوط ارسال کئے۔ بعض کے پاس سفارتیں بھیجیں، ہندوستان کے تمام دوستوں اور محبوں کو بھی خط لکھے، ایک خط میں فرماتے ہیں:

> کام کا وقت سر پر آ پہنچا...... پس ہر راسخ الاعتقاد مومن اور ہر اطاعت گزار مسلم کیلئے لازم ہے کہ جس طور بھی ممکن ہو، فقیر کے پاس پہنچ کر جماعتِ مجاہدین میں منسلک ہو جائے، اگر چہ حق جل وعلا اپنی قدرتِ کاملہ سے خود اس مقدمے کو منزلِ اتمام پر پہنچائے گا۔ اس کا اپنا ارشاد ہے: کـذا لك حـق عـليـنـا نصر المؤمنين اور دین محمدی کو اپنے دعوے کے مطابق تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے گا، لیکن جو شخص اپنی جان اس معرکے میں حاضر کرے گا، وہ سعادتِ جاودانی پائے گا، اور جو آج اس مقدمے میں سستی اختیار کرے گا، وہ قیامت کے دن افسوس وندامت میں مبتلا ہوگا۔

ایک اور خط میں فرماتے ہیں:

> یہ محمود زمانہ اور یہ مبارک وقت مخلصوں کے اخلاص اور مومنوں کے یقین کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو بہار کو گل وبلبل کے تعلق میں اور برسات کو درختوں یا دوسری نباتات کے تعلق میں حاصل ہوتی ہے۔ اہل اخلاص کا اخلاص اور اہل یقین کا یقین عمل میں نمایاں ہونا چاہئے، جو پھول موسم بہار میں نہ کھلا اسے کانٹے کے برابر سمجھنا چاہئے، جو فصل برسات میں نہ اُگی اس کے دِرو کی امید ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانی چاہئے، جو درخت فصلِ ربیع میں سبز نہ ہوا، اُسے ہیزم خشک کی طرح جڑ سے کاٹ ڈالنے کے سوا چارہ کیا ہے؟

امامت اور بورڈ

سید صاحب کی امامت پر ان کے زمانے میں جو اعتراضات ہوئے تھے، میں ان کی حقیقت پہلے بیان کر چکا ہوں۔ ہمارے عہد میں مولانا عبید اللہ مرحوم نے اعتراض کا بالکل نیا زاویۂ نگاہ ایجاد فرمایا اور وہ یہ کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی نے اپنے بعد ایک شخص میں امامت کی صلاحیت نہ پائی تو فرائض امامت کی بجا آوری کیلئے دو بورڈ مقرر فرما دیے۔ عسکری امور کے لئے سید احمد کو امیر، مولانا عبد الحیٔ اور شاہ اسماعیل کو مشیر بنایا،

تنظیمی امور کے لئے شاہ محمد اسحاق کو امیر اور شاہ محمد یعقوب کو ان کا شریک قرار دیا۔(۱)
اس بنیادی توضیح کے ساتھ ساتھ مولانا فرماتے ہیں۔

۱۔ ہنڈ میں سید صاحب کی امامت پر اجماع ہوا، وہی اختلاف کا سرچشمہ بن گیا۔(۲)

اگر معاملہ ہمارے ہاتھ میں ہوتا تو ہم افغانوں کا امیر افغان کو بناتے اور اسے امیر شہید (سید احمد) کے بورڈ کا ممبر بنا دیتے۔(۳)

۲۔ مولانا عبدالحئیؒ جب تک زندہ رہے کوئی فتنہ نہ اُٹھا، اس لئے کہ سید احمد اپنی ذاتی رائے پر عمل نہیں کر سکتے تھے بلکہ اجتماعی فیصلہ حکومت کر رہا تھا۔(۴) مولانا موصوف کی وفات کے بعد تحریک میں بنیادی تغیر پیدا ہو گیا، ماورائے سندھ کا مرکز (سید صاحب کا مرکز) مستقل بن گیا، دہلی کے مرکز سے اس نے سرکشی اختیار کر لی۔ حزب ولی اللہ کی حکومت کا طریقہ بورڈ کی حکومت سے شخصی امامت (ڈکٹیٹر شپ) میں تبدیل ہو گیا، اس طرح امیر شہید (سید صاحب) امیر المومنین اور دنیائے اسلام کے مصلح خلیفہ مانے گئے۔(۵)

آخر میں فرماتے ہیں کہ سید صاحب کو کشف و کرامات کا مالک بنا کر ساری جماعت کا امام تسلیم کرایا گیا، حالانکہ اصل امام شاہ عبدالعزیز تھے، سید صاحب جماعت کے ایک سپاہی تھے، ان کی بزرگی میں مولانا عبدالحئیؒ اور شاہ اسماعیل کا اشتراک ہے، شاہ اسحاق روپیہ بھیجتے تھے، یہ تمام اصحاب شاہ عبدالعزیز سے تربیت یافتہ تھے۔

یہ سارا کام امام عبدالعزیز کا تھا، انہوں نے آدمی تیار کئے، پروگرام بنایا اور کام

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص:۱۵۲-۱۵۳۔
(۲) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص:۱۶۵۔
(۳) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص:۱۶۵۔
(۴) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص:۱۵۶-۱۵۷۔
(۵) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص:۱۵۷-۱۵۹۔

شروع کیا۔ پھر غلطیاں اس قدر ہوئیں کہ ان کا لازمی نتیجہ شکست تھا۔(۱)

حقیقتِ حال

ان اعتراضات پر مفصل بحث کی ضرورت نہیں اور ان کا مدار سراسر قیاس ہے، یا خواہش کہ ایسا ہونا چاہئے تھا۔ شاہ ولی اللہ کے پورے خاندان اور خود سید صاحب کے متعلق جو مکتوب مطبوع ذخیرۂ معلومات اب تک میری نظر سے گذرا ہے، اس میں محولہ بالا قیاس آرائیوں کیلئے بعید سا اشارہ بھی موجود نہیں اور خود مولانائے مرحوم نے بھی کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا۔

ذرا غور کیا جائے تو ان دعاوی کی بے حقیقتی خود بخود آشکارا ہو جاتی ہے، مثلاً:

۱۔ مئی ۱۸۱۹ء کے بعد سید صاحب اور شاہ عبدالعزیز میں کوئی ملاقات نہ ہوئی یہاں تک کہ شاہ صاحب ۱۸۲۴ء میں واصل باللہ ہو گئے۔ اس سے دو برس بعد سید صاحب جہاد کیلئے نکلے، مجھے یقین ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی میں یہ فیصلہ بھی نہیں ہوا تھا، کہ جہاد کا آغاز کہاں سے ہو۔

۲۔ ۱۸۲۷ء میں بیعتِ امامت کا سارا انتظام شاہ اسماعیل نے کیا تھا، مولانا عبدالحیؒ چند ماہ بعد سرحد پہنچے تو انہوں نے بھی خوشی اور رضامندی سے اسے قبول کر لیا۔ گویا یہ ان کی آرزوؤں کے مطابق تھا، اگر یہ سب کچھ مولانا عبیداللہ کے قول کے مطابق شاہ عبدالعزیز کے مقررات کے مطابق نہ تھا تو شاہ صاحب کی ہدایت کو پس پشت ڈالنے کے ذمہ دار اُن کے گھر کے دو آدمی تھے، جنہیں مشیر بنایا گیا تھا، نہ کہ سید صاحب۔

۳۔ عجیب بات یہ ہے کہ نہ سید صاحب کی امامت کی حیثیت وہ تھی جو مولانا نے فرض فرمالی، نہ امامت کی وجہ سے کوئی جھگڑا پیدا ہوا، نہ سید صاحب نے کبھی کسی معاملے

(۱) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص: ۱۷۳-۱۷۴۔

میں خودرائی سے کام لیا۔ ان کے تمام کاموں کیلئے شروع ہی سے ایک مجلس شوریٰ موجود تھی، اس میں مولانا عبدالحیؒ، شاہ اسماعیل اور متعدد دوسرے ذی رائے اصحاب شامل رہے۔ ہر چھوٹی بڑی بات کے متعلق باہم مشورے ہوتے تھے۔

۴۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ روپیہ شاہ محمد اسحاق بھیجتے تھے، یوں کہئے کہ روپیہ جمع ہونے کے جو مرکز تھے، ان میں سے ایک مرکز دہلی میں تھا، جس کا ذمہ دار شاہ اسحاق کو بنایا گیا تھا۔ لیکن جگہ جگہ دوسرے مرکز بھی تھے، سید صاحب کے قاصد بھی وقتاً فوقتاً آتے رہتے تھے، جو روپیہ لے جاتے تھے۔ ہنڈیوں کے ذریعے سے بھی مختلف مرکزوں سے روپیہ بھیجا جاتا تھا۔(۱)

۵۔ بلاشبہ ایک ہنڈی کا روپیہ سید صاحب کو وصول نہ ہوا تو شاہ اسحاق نے دعویٰ کر کے ڈگری حاصل کرلی۔ اس بنا پر نکتہ پیدا کیا گیا کہ اگر روپیہ روانہ کرنے کا انتظام شاہ صاحب کے ہاتھ میں نہ ہوتا تو وہ نہ دعویٰ کر سکتے اور نہ ڈگری لے سکتے۔(۲) دعویٰ کی بنا یہ نہ تھی کہ شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسحاق کو روپیہ بھیجنے کا مختار بنادیا تھا، اور یہ مختار نامہ انگریزی عدالت میں پیش کر کے ڈگری حاصل کی گئی تھی۔ بناء یہ تھی کہ روپیہ بھیجنے والے شاہ اسحاق تھے، ہنڈی یا منی آرڈر کا روپیہ یا تو مرسل الیہ کو ملنا چاہئے تھا یا مرسل کو واپس ہونا چاہئے تھا۔ اگر دوسرے لوگوں کی بھیجی ہوئی ہنڈیوں کا روپیہ بھی سید صاحب کو نہ ملتا تو وہ بھی دعویٰ کر کے ڈگریاں لے لیتے۔

مسئلہ تربیت

بہر حال واقعہ یہ ہے کہ نہ شاہ عبدالعزیز نے بورڈ بنائے، نہ ان کی زندگی میں جہاد کی

(۱) مختلف مرکز ہی نہیں شہر اور قصبے بھی براہ راست روپے بھیجتے رہتے تھے۔ ''انوار العارفین'' میں مرقوم ہے: ۹ رصفر ۱۲۴۳ھ کو مراد آباد کے مسلمانوں نے تین ہزار تہتر روپے آٹھ آنے ہنڈی کے ذریعے سے بھیجے۔ (ص: ۸۱۸)

(۲) شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک ص: ۱۱۲

تنظیمات اس پیمانے پر پہنچی تھیں کہ وہ کوئی خاص مسلک تجویز فرمانا ضروری سمجھتے۔ مسئلہٗ تربیت کو زیر بحث لانے کی ضرورت نہیں، دنیا جب سے بنی ہے، علومِ ظاہر و باطن میں استادی اور شاگردی کا سلسلہ برابر چلا آتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحئی، شاہ اسحاق، شاہ یعقوب ہی نہیں، سیکڑوں اصحاب کی تربیت فرمائی۔ جو خاص صلاحیتوں کے مالک تھے، وہ بلند منزلت بن گئے۔ خود شاہ عبدالعزیز کی تربیت شاہ ولی اللہ نے فرمائی، شاہ ولی اللہ کی تربیت شاہ عبدالرحیم نے فرمائی، پھر کیا ہر تربیت یافتہ کے فضائل، تربیت کنندہ کے حوالے کر دینے چاہئیں؟ سید صاحب نے یقیناً شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر کے حسنِ تربیت سے فیض اٹھایا، لیکن خدا نے انہیں روحانی صلاحیت اور عزیمت کے جو جوہر عطا کئے تھے وہ ہر شخص کو نہ مل سکے، اس وجہ سے ہر شخص سید احمد نہ بن سکا۔

احکامِ دین کی تعلیم اور ان احکام کے نفاذ و اجرا کے لئے عملی اقدامات میں فرق ہے، ہوسکتا ہے کہ ایک شخص دواؤں کے خواص و اثرات کی تحقیق و معرفت میں درجہٗ کمال حاصل کر چکا ہو، مگر ان دواؤں سے موقع اور محل کے مطابق ٹھیک ٹھیک کام لینا اور خلقِ خدا کے لئے صحت و شفا کا بندوبست کرنا بالکل الگ کام ہے۔ شاہ صاحب زندگی بھر دین کی تعلیم دیتے رہے، اس دائرے میں ان کی فضیلت و رفعت کسی شرح کی محتاج نہیں، ان کے اکثر شاگرد محض تعلیم پا لینے یا تدریس کی مسندیں آراستہ کر لینے پر قانع رہے، سید صاحب نے علم دین حاصل کر لینے کے بعد اسے جا بجا نافذ کرنے اور بندگانِ خدا کو اس کا پابند بنانے کا بیڑا اٹھایا اور اس کارِ عزیمت میں اپنی ہر متاع بے دریغ قربان کر ڈالی۔ پھر ان کے فضائل کو کیوں دوسروں کے دامن میں ڈالنے کی سعی کی جائے؟

غیر ضروری اضطراب

مولانا عبیداللہ مرحوم دورِ حاضر کے ایک عظیم الشان مجاہد تھے، انہوں نے اپنی زندگی

ملک کی آزادی کیلئے وقف کردی۔ پچیس برس جلاوطنی میں گزارے، شاہ ولی اللہ کی تعلیمات سے عمل کا ایک مستقل پروگرام مدوّن فرمایا۔ ان فضیلتوں سے کسی کو بھی انکار کی گنجائش نہیں۔ مولانا کو شاہ صاحب اور ان کے خاندان سے جو گہری عقیدت پیدا ہوگئی تھی، وہ بھی ہر مسلمان کیلئے افتخار کا گراں بہا سرمایہ ہے، لیکن مولانا کا نقطۂ نگاہ کچھ اس قسم کا بن گیا تھا کہ شاہ ولی اللہ کے عہدِ مبارک سے اس وسیع سرزمین میں جو قابلِ ذکر علمی یا عملی کام ہوا وہ یا تو براہِ راست شاہ صاحب کے بلند منزلت خاندان نے کیا یا اس کی تجویز سے تکمیل تک سب سے بڑا حصہ اس خاندان کا تھا۔ اس نقطۂ نگاہ کی اندھا دھند توثیق کون کرسکتا ہے؟

یقیناً تعلیمِ دین میں شاہ صاحب کے خاندان کی حیثیت نظامِ شمسی کی تھی، جس سے آسمانِ ہند کے ہزاروں چاند تارے مستنیر ہوئے، بلکہ روشنی کی کرنیں ہندوستان سے باہر بھی پہنچیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں کو ہر فضیلت سے محروم کردیا جائے۔ خصوصاً سید احمد بریلوی نے فضائلِ عمل اور مکارمِ خدمتِ اسلام و مسلمین میں جو مقامِ عزیمت حاصل کیا، اس کے اعتراف میں تذبذب کس بنا پر مناسب ہے؟ ولی اللٰہی خاندان کیلئے اس کے اپنے فضائل بس کرتے ہیں، دوسروں کے فضائل اس خاندان کے دامن میں ڈالنے کا اضطراب بالکل غیر ضروری ہے۔(۱)

(۱) یہاں یہ بتادینا بھی ضروری ہے کہ بعض سوانح نگاروں نے بیعتِ امامت و جہاد اور بیعتِ اقامتِ شریعت کو خلط کردیا ہے، حالانکہ یہ دونوں بیعتیں الگ الگ موقعوں پر ہوئی تھیں، اور ان میں کم وبیش دو سال دو مہینے کا فصل ہے۔ بیعتِ اقامتِ شریعت کا ذکر موقع پر آئے گا۔

پینتیسواں باب:

اجتماعِ جیوشِ اسلامیہ

اہلِ سرحد کا جوش وخروش

بیعتِ امامت کے بعد سرحد کے خوانین، رؤسا اور عوام نے گروہ در گروہ اور فوج در فوج بیعتِ جہاد شروع کر دی۔ وہ سکھوں کی ترکتازوں سے تنگ آئے ہوئے تھے، انکے گاؤں وقتاً فوقتاً نذرِ آتش ہوتے رہتے تھے۔ خود انہیں آئے دن گھر بار چھوڑ کر بال بچوں کے ساتھ پہاڑوں میں پناہ لینی پڑتی تھی۔ اس حالتِ اضطراب کو ختم کرنے کی شکل یہی تھی کہ وہ جم کر سکھوں کا مقابلہ کرتے اور ثبات واستقامت سے ان کی قوت پر کاری ضرب لگاتے۔ اس غرض کیلئے ایک مرکز درکار تھا، سید صاحب کی ذات بابرکات سے یہ ضرورت پوری ہوگئی تو وہ اطراف واکناف سے آ آ کر بیعت کرنے لگے۔ میرزا عطا محمد خاں نے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے کہ بیعت کے بعد ہر شخص زبانِ حال سے یہ ترانہ گاتا تھا:

ماسبک رُوحاں بہ اُمیدِ شہادت زندہ ایم
پیش ما ذکرِ حیاتِ جاوداں باشد گراں

سردارانِ پشاور کی عرضیاں

سردارانِ پشاور میں سے سلطان محمد خاں اور سید محمد خاں پہلے سید صاحب کی بیعت کر چکے تھے، یار محمد خاں اور پیر محمد خاں کی بیعت کا ذکر میری نظر سے نہیں گذرا۔ ان کی طرف سے اب اطاعت وفرمانبرداری کی عرضیاں پہنچیں۔ اہل سرحد کو ان عرضیوں کا علم

ہوا تو اکثر نے سید صاحب سے عرض کیا کہ ان کا اظہارِ اطاعت مکر وفریب پر مبنی ہے، اور ان پر اعتماد نہ کرنا چاہئے۔ یہ اپنے سگے بھائیوں یعنی وزیر فتح خاں اور عظیم خاں سے بھی دغا کر چکے ہیں، کسی دوسرے کو ان سے وفا کی کیا امید ہو سکتی ہے؟(۱) خصوصاً یار محمد خاں کے بارے میں سب کی رائے بالاتفاق یہ تھی کہ غدر وخیانت اس کا عام شیوہ ہے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہادیٔ مطلق ہے، وہ ایک دم میں فاسق کو متقی بنا دیتا ہے، جب یہ شخص ہماری شرکت کا دم بھرتا ہے تو ہمیں اس پر بھروسا کرنا چاہیے۔

دل کا حال خدائے علیم کے سوا کسی کو معلوم نہیں، اگر وہ دغا کرے گا تو اپنے واسطے کرے گا، ہمارا کیا بگاڑے گا۔(۲)

سرداروں کے خصائل

یار محمد خاں کے متعلق اہل سرحد کی رائے میری معلومات کے مطابق بالکل درست تھی، سلطان محمد خاں یقیناً اس سے زیادہ مخلص تھا لیکن وہ عزم وہمت کا آدمی نہ تھا۔ جو لوگ اس سے ملے وہ لکھتے ہیں کہ خوش پوشی اور خوش نوشی سے اسے بہت محبت تھی، ایسے لوگوں میں ماحول اور گرد وپیش کے عام اثرات سے اوپر اُٹھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ جب سلطان محمد خاں ان اثرات سے دب گیا تو اس نے بھی سید صاحب کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس سے پیشتر یار محمد خاں کر چکا تھا۔ پیر محمد خاں کے بارے میں صرف اتنا معلوم ہوا ہے کہ اسے فوجی امور سے خاص دلچسپی تھی اور وہی عسکری صلاحیت کے اعتبار سے سب بھائیوں میں ممتاز تھا۔ سید محمد خاں کی حیثیت بالکل معمولی تھی۔

مختلف مؤرخوں کے بیانات

درانی سردار (خصوصاً یار محمد خاں) اگر دل سے سید صاحب کی معیت پر آمادہ نہ تھے

(۱) منظورہ ص:۳۲۱ (۲) وقائع ص:۸۵۸

تو وہ معیت سے الگ بھی نہیں رہ سکتے تھے، اس لئے کہ سرحد کے عام خوانین ورؤسا سید صاحب کے پاس پہنچ رہے تھے۔ دیوان امرناتھ نے لکھا ہے کہ یار محمد خاں نے جب دیکھا کہ لوگ پروانہ وار سید صاحب کی طرف دوڑے جا رہے ہیں اور ملک میں خرابی پیدا ہو رہی ہے تو مصلحتاً خود بھی مرید بن گیا۔ میسن (۱) کہتا ہے:

> یوسف زئیوں کو میدانِ کارزار میں لا کھڑا کرنے میں سید صاحب کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی، اس نے سردارانِ پشاور کو سید صاحب کے ساتھ مذاکرت ومکاتبت پر راغب کر دیا...... سید صاحب کا ساتھ دینے والے بے شمار گروہ تھے، ان کی فیروز مندی اگرچہ یقینی نہ تھی تاہم غیر اغلب بھی نظر نہیں آتی تھی۔ (۲)

سید صاحب کا طرزِ عمل

ان پر سید صاحب کا اعتماد بھی درست ثابت نہ ہوا، مگر آپ سوچیں خاص اس موقع پر اعتماد کے سوا چارہ کیا تھا؟ سید صاحب نفیر عام کے داعی تھے، جو لوگ اس دعوت پر لبیک کہہ رہے تھے، ان میں سے کسی کو رد کس بناء پر کر سکتے تھے؟ یہ کیونکر کہہ سکتے تھے کہ فلاں کا تعاون منظور ہے، فلاں کا منظور نہیں۔ خصوصاً ان بھائیوں میں تفرقہ غیر ممکن تھا، اگر یار محمد خاں کے تعاون کو قبول نہ کرتے تو دوسرے بھائیوں سے تعاون کی کیا امید ہو سکتی تھی؟ اگر ان سب کو چھوڑ دیتے تو کیا وہ اہل سرحد کے تعاون میں خلل انداز نہ ہوتے اور سکھوں کے ساتھ خفیہ ساز باز کر کے سید صاحب کیلئے دو جانب سے خطرات پیدا نہ کر دیتے؟ پھر انہیں سرداروں کے بھائی افغانستان کے بڑے حصے پر مسلط تھے، ان سے

(۱) ظفر نامہ دیوان امرناتھ ص: ۱۷۵۔ عمدۃ التواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یار محمد خاں خفیہ خفیہ سید صاحب کی سرگرمیوں کے متعلق دربار لاہور کو اطلاعیں پہنچا رہا تھا، مثال کے طور پر ملاحظہ ہو دفتر دوم ص: ۳۵۰

(۲) میسن جلد سوم ص: ۷۶

اعانت وامداد کی کیا امید ہو سکتی تھی؟ حالات ومصالح کے اعتبار سے وہی طرزِ عمل درست تھا، جو سید صاحب نے اختیار کیا۔ آگے چل کر غدر وخیانت کے جو واقعات پیش آئے ان کا اندازہ قبل از وقت کوئی نہیں کر سکتا تھا، اور غدر وخیانت کا ارتکاب تنہا ان سرداروں ہی کی طرف سے نہ ہوا، خادے خاں بھی اسی مسلک پر چلا، جس کے گھر میں بیعتِ امامت ہوئی تھی، اور جو سید صاحب کی مہمانداری میں پیش پیش تھا۔

درحقیقت سید صاحب جانتے تھے کہ اہل سرحد عموماً تذبذب اور بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہیں، یہ مرض سکھوں کے مقابلے میں احساسِ کمتری سے پیدا ہوا تھا اور احساسِ کمتری اسی صورت میں زائل ہو سکتا تھا کہ سرحدیوں کی قوت کو منظم کر کے سکھوں پر کاری ضربیں لگائی جاتیں۔ جہاد میں ابتدائی فیروزمندی کے بعد غدر وخیانت کے امکانات خود بخود کم ہو جاتے، لیکن اس موقع پر بعض کے رد اور بعض کے قبول سے تنظیم کا پورا سلسلہ مختل ہو جانے کا شدید خطرہ موجود تھا۔ سید صاحب نے اہون البلیتین کو قبول کیا، دانشمندی اور مصلحت اندیشی کا راستہ یہی تھا۔

ان بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ کم از کم یار محمد خاں سید صاحب کی معیت میں مخلص نہ تھا، گردوپیش کے حالات نے اسے مجبور کر دیا تھا، اگر وہ الگ تھلگ بیٹھا رہتا اور سید صاحب عوام اہل سرحد کی امداد سے سکھوں کو شکست دے کر پیچھے ہٹا دیتے تو درانیوں کی سرداری خود بخود ختم ہو جاتی۔

گدڑی شہزادہ

اس زمانے میں جو لوگ بیعت کیلئے آئے، ان میں ایک صاحب گدڑی شہزادہ کے لقب سے مشہور تھے۔ وقائع میں انہیں ایک ''جلیل القدر پیرزادہ'' بتایا گیا ہے۔(۱)

(۱) وقائع ص: ۸۵۵

سردار سید محمد خاں نے اپنے ایک مکتوب میں انہیں ''صاحبزادہ گودڑی'' کہا ہے۔(۱)
شہزادہ صاحب یا صاحبزادہ صاحب نے خلوص سے بیعت کی اور کہا:

''میں خالصۃً لوجہ اللہ حاضر ہوا ہوں، آج کے بعد آپ کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔''

یہ شہزادہ اہل سرحد کے ان مردانِ حق میں سے ہے جنہوں نے اپنا عہد جان کے ساتھ نباہا۔ وَمِنْهُم مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ.

اطاعت و رفاقت کا عہد کر لینے کے بعد سردارانِ پشاور نے لشکر اور توپ خانے کے ساتھ پشاور سے نوشہرہ کا رُخ کیا۔ جب ''سرمائی'' پہنچے، جہاں سے نوشہرہ پانچ کوس رہ جاتا ہے تو ہنڈ اطلاع بھیجی۔ سید صاحب نے پانسو آدمی ساتھ لیے اور سرداروں کی ملاقات کیلئے نوشہرہ پہنچ گئے۔ فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں رئیس زیدہ، خادے خاں رئیس ہنڈ اور گودڑی شہزادہ بھی ہم رکاب تھے۔ دو یا تین روز نوشہرہ میں باہم مشورے ہوتے رہے، پھر گودڑی شہزادے کو یار محمد خاں نے روک لیا، سید صاحب اور باقی اصحاب ہنڈ چلے آئے۔ اسی ملاقات میں فیصلہ ہوا کہ متحدہ قوت سے سکھوں پر یورش کی جائے، چنانچہ واپسی پر فتح خاں، اشرف خاں اور خادے خاں نے اپنے اپنے حلقوں میں جہاد کی دعوتِ عام کا انتظام کر دیا۔

سید صاحب کے لشکر کی معیشت

ان دنوں ہندوستانی غازیوں کے لشکر میں سامانِ معیشت کی بے حد قلت تھی، سید

(۱) مکاتیب شاہ اسماعیل ص: ۳۱۴۔ افسوس کہ ان کا نام اور حال کہیں سے معلوم نہ ہو سکا، بعض اصحاب نے بتایا کہ گودڑی یا گدڑی افغانستان کا ایک علاقہ ہے، جہاں کے یہ پیرزادے تھے۔ یا ایک قوم ہے، جس کے یہ معزز فرد تھے۔ کابل میں ایک مسجد گودڑی بھی ہے، جو گودڑی قوم نے بنائی۔ ایک بیان سے معلوم ہوا کہ یہ مجدد الف ثانیؒ کے خاندان سے تھے۔

صاحب نے چلتے وقت جو روپے ساتھ لیے تھے وہ غالباً ختم ہو چکے تھے۔ جن رقموں کا انتظار تھا وہ پہنچی نہیں تھیں، کسی پر بوجھ ڈالنا یا سوال کرنا سید صاحب کی عادت شریف، طبیعت اور شانِ تربیت کے خلاف تھا۔ کبھی کبھی ضرورت کے مطابق کھانا مل جاتا، اکثر فاقے کرنے پڑتے یا ساگ پات کھا کر گزارہ کر لیا جاتا۔(۱) یہ حالتِ عسرت کئی مہینے جاری رہی، لیکن سب بالکل مطمئن تھے، کسی کی زبان پر حرفِ شکایت نہ آیا۔ کچھ آدمی بیمار ہو گئے، سید صاحب نے انہیں پنجتار بھیج دیا۔ جو لوگ جنگ اکوڑہ میں زخمی ہوئے تھے اور انہیں نوشہرہ ہی میں چھوڑ دیا گیا تھا، وہ وہیں رہے۔ اہل نوشہرہ نے ان کی خدمت گزاری اس شان سے کی کہ راوی بتاتے ہیں، ان کے اقربا بھی پاس ہوتے تو اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکتے۔ سید صاحب نے اہل نوشہرہ کے لئے دعاء فرمائی۔

ہنڈ ہی سے احوالِ جہاد کے متعلق پہلا مکتوب ہندوستان بھیجا گیا، جس میں اکوڑہ، حضرو اور بازار کے واقعات بیان کیے گئے۔ یہیں سے بیعتِ امامت کی اطلاع کے ساتھ ساتھ جہاد کے دعوت نامے جابجا ارسال کیے گئے۔

بدھ سنگھ کا خط

سید صاحب ہنڈ ہی میں تھے کہ بدھ سنگھ کی طرف سے ایک خط ملا جس میں حضرو پر چھاپے کے متعلق طعن و تعریض سے کام لیا گیا تھا، مثلاً یہ کہ آپ دور سے شہادت کا شوق لے کر آئے تھے، میدان میں آ کر مقابلہ کرنا تھا، حضرو کے غریب بیوپاریوں پر چھاپا مارنا کہاں کی مردانگی تھی؟ سید ہو تو سامنے آ کر لڑو، چھپ چھپ کر تاخت و تاراج کیوں کرتے ہو۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سید صاحب کو حضرو کے چھاپے سے براہِ راست تعلق نہ تھا اور بدھ

(۱) منظورہ میں ہے: گاہے نوبت بہ سیری می رسد والا اکثر بہ فاقہ می گزشت یا بخوردن حشیشات ترہ قناعت میکردند۔

سنگھ کی تعریضات بالکل بے محل تھیں۔ حالتِ جنگ میں دشمن کی قوت کو ہر ممکن طریقے سے گزند پہنچانا اور اس کے نظامِ حکومت کو مختل کرنے کی تدبیریں عمل میں لانا قطعاً باعثِ اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ اس خط سے صاف ٹپکتا تھا کہ اکوڑہ اور حضرو کی تاختوں نے بدھ سنگھ کو سراسیمہ کر دیا تھا اور سراسیمگی نے طعن وتعریض کا جامہ پہن لیا۔

سید صاحب کا جواب

سید صاحب نے ۱۵ رجمادی الاخریٰ ۱۲۴۲ھ (۱۴ر جنوری ۱۸۲۷ء) کو ہنڈ سے اس خط کا جواب بھیجا، جس کے ضروری حصے اس خیال سے یہاں درج کئے جاتے ہیں کہ یہ جواب بھی سید صاحب کے مقاصد وعزائم کا ایک نہات عمدہ مرقع ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہلِ حکومت وریاست سے کشمکش کی کئی غرضیں ہوسکتی ہیں، مثلاً جاہ ومال کی محبت یا محض شجاعت وشہامت کی نمائش۔ میرا مقصود یہ ہے کہ:

> دینِ محمدی کی نصرت میں اپنے مولا کا حکم بجالاؤں، جو مالک مطلق اور بادشاہِ برحق ہے۔ خدائے عزوجل گواہ ہے کہ اس ہنگامہ آرائی سے میرا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں، نہ اس میں کوئی نفسانی غرض شامل ہے، ایسی غرض نہ کبھی زبان پر آئی ہے، نہ دل میں گذری ہے۔ دینِ محمدی کی نصرت کے لئے جو کوشش کسی صورت میں بھی ممکن ہوگی، ضرور بجالاؤں گا، اور جس تدبیر کو بھی مفید پاؤں گا، اُسے لازماً اختیار کروں گا۔ انشاء اللہ زندگی کے آخری سانس تک اسی سعی میں مشغول رہوں گا، پوری عمر اسی کام میں صرف کردوں گا، اور جب تک زندہ ہوں اس مقصد کے لئے تگ ودو جاری رکھوں گا، جب تک سر گردن پر سلامت ہے اس میں یہی سودا سمایا رہے گا، اور جب تک پاؤں تابِ رفتار سے محروم نہیں ہو جاتے اسی راستے پر چلتا جاؤں گا۔

شانِ عزیمت

آگے چل کر فرماتے ہیں:

مفلس بن جاؤں یا دولت مند، منصبِ سلطنت پر پہنچ جاؤں یا کسی کی رعیت بن جاؤں، بزدلی کی تہمت لگے یا شجاعت کی ستائش کی جائے، میدانِ جہاد سے کامیاب ہو کر زندہ لوٹوں یا شہید ہو جاؤں، اگر میں دیکھوں میرے مولا کی رضا اسی میں ہے کہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر تنہا میدانِ جنگ میں آؤں تو خدا کی قسم! دل و جان سے تنہا سینہ سپر ہو جاؤں گا، اور لشکروں کے ہجوم میں گھستے وقت دل میں ذرا سا بھی کھٹکا نہ ہوگا۔

مجھے نہ بہادری جتانا مقصود ہے، نہ ریاست حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا ثبوت یوں مل سکتا ہے کہ (سکھوں کے) بڑے بڑے سرداروں اور رئیسوں میں سے جو شخص دینِ محمدی کو قبول کر لے، میں سو زبان سے اس کی مردانگی کا اعتراف و اظہار کروں گا اور ہزار جان سے اس کی سلطنت کی ترقی چاہوں گا...... جب آپ اپنے حاکم کے احکام کی تعمیل میں کوئی عذر و حیلہ روا نہیں رکھتے، حالاں کہ وہ آپ جیسا انسان ہے بلکہ آپ کی برادری میں سے ہے تو میں احکم الحاکمین کے فرمانوں کی بجا آوری میں کیونکر عذر کر سکتا ہوں، حالانکہ وہ تمام انسانوں کا خالق ہے اور سارے جہاں اسی نے بنائے ہیں۔(۱)

لشکروں کی فراہمی

بیعتِ امامت کے بعد کم و بیش دو مہینوں میں اسی ہزار سرحدی عوام جہاد کے لئے فراہم ہو گئے، سردارانِ پشاور کا لشکر اس سے الگ تھا۔ اس کی تعداد بیس ہزار بتائی جاتی تھی، اور اس کے ساتھ آٹھ توپیں تھیں۔ اتنا بڑا لشکر سرحد میں پہلے کبھی جمع نہیں ہوا تھا،

(۱) منظورہ ص:۳۴۳ و مجموعہ مکاتیب

میسن نے کثرتِ تعداد ہی کی بنا پر لکھا ہے کہ سید صاحب کی کامیابی یقینی نہیں تو کم از کم غیر اغلب نہ تھی۔ بے شک ان لوگوں نے باقاعدہ فوجی تربیت نہیں پائی تھی، لیکن اس موقع پر جا بجا فوجی چھاؤنیاں بنا کر تربیت گاہیں کھولنے کا نہ وقت تھا، نہ سر و سامان تھا۔ سید صاحب اس وقت یہی کر سکتے تھے کہ خود ہر قربانی کے لئے تیار ہو جائیں اور سب کو اس مسلک پر کاربند ہونے کی دعوت دیں، موقع اور محل تدبیر آرائیوں کا نہ تھا، بلکہ شجاعت اور مردانگی کا تھا، شجاعت اور مردانگی ہی کے بل پر تدبیر آرائیوں کے وسائل پیدا ہو سکتے تھے۔ اسی ہزار کی فراہمی میں سب سے بڑا حصہ فتح خاں پنجتاری، اشرف خاں اور خادے خاں کا تھا، دوسرے خوانین ورؤسا نے بھی سعی فرمائی، جن میں سے امیر احمد خاں باجوڑی کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان میں ہر گروہ کا نشان الگ الگ تھا، اور بڑے بڑے نشان ایک ہزار سے کم نہ ہوں گے۔

سید صاحب نے اپنے ڈیروں کی نگرانی کیلئے چوکیدار مقرر کئے۔ مارچ کے پہلے ہفتے میں ہنڈ سے نکل کر ایک یا دو دن ''جلسئی'' میں ٹھہرے، ایک رات مصری بانڈہ میں گزاری، پھر نوشہرہ پہنچ گئے جہاں سے بدھ سنگھ پر یورش منظور تھی۔ وہ شیدو میں خیمہ زن تھا جو اکوڑہ سے چار میل جنوب میں ہے۔ بدھ سنگھ کی فوج تیس پینتیس ہزار سے کم نہ تھی، اس کے پاس ساز و سامان بہت زیادہ تھا، نیز سوہن لال کے بیان کے مطابق ''راجا سوچیت سنگھ، راجا گلاب سنگھ'' اور دوسرے سرکردگان عالیشان اس کے ساتھ تھے۔

۱۸۲۳ء کی جنگ نوشہرہ کے بعد یہ پہلی لڑائی تھی، جس میں اہل سرحد سکھوں کے مقابلے پر آئے اور سید صاحب کے غازیوں کی بھی سکھوں سے یہ پہلی رُو در رُو ٹکر تھی۔

چھتیسواں باب:

جنگِ شیدو

مقامِ جنگ

شیدو(۱) صوبہ سرحد کا مشہور گاؤں ہے، اتنا بڑا ہے کہ اسے گاؤں کے بجائے چھوٹا قصبہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اکوڑہ سے تقریباً چار میل جنوب میں ہے، یعنی اٹک کی سمت میں جو نیلی سڑک اس کے پاس مشرقی سمت میں ہے، اسی جانب تھوڑے فاصلے پر دریائے لنڈے بہتا ہے، ریل کی لائن مغربی سمت میں ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں یہ گاؤں موجود جگہ کے بجائے مشرق میں دریا کے قریب آباد تھا، دریا میں طغیانی آئی تو گاؤں کی جگہ بدلنی پڑی۔ ایک مرتبہ پھر طغیانی ہی کی وجہ سے نقلِ مقام کی ضرورت پیش آئی۔ گویا موجودہ گاؤں تیسری جگہ واقع ہے۔ جس لڑائی کا ذکر اس باب کا طرازِ عنوان ہے، وہ اس وقت ہوئی تھی جب گاؤں پہلی جگہ آباد تھا۔ اس کے بچے کھچے آثار یا پرانے قبرستان کے نشان اب تک دریا کے کنارے دکھائی دیتے ہیں۔

گاؤں کے مغرب میں میل ڈیڑھ میل پر خٹک کی پہاڑیاں ہیں، ان پہاڑوں کے دامن سے دریا تک زمین برابر ڈھالواں ہوتی چلی گئی ہے، جا بجا نالوں کے بہاؤ ملتے ہیں، جو پہاڑوں کی سمت سے آ کر دریا میں ملتے ہیں، برسات ہو جائے تو ان میں زور

(۱) میسن نے اس مقام کا نام ''سیدوالا'' لکھا ہے (مختلف سفروں کا بیان) جلد اول ص: ۱۳۳ (Narrative of varidus Journeys) ''منظورہ'' اور ''وقائع'' میں اسے ''سیدہ'' بتایا گیا ہے جو بہ ظاہر ''سیدہ والا'' کا مخفف ہے، لیکن میں نے وہ تلفظ اختیار کیا جو پٹھانوں میں متداول ہے۔ ''عمدۃ التواریخ'' میں اسے شیدو ہی لکھا گیا ہے۔

سے پانی بہنے لگتا ہے، لیکن جلد خشک ہو جاتا ہے۔

سکھوں کی لشکر گاہ میری تحقیق کے مطابق گاؤں کے جنوب مغرب میں تھی، شاید اس جگہ کے قریب ہو جہاں آج کل گاؤں آباد ہے۔ لشکر گاہ کے اردگرد حفاظت کے لئے خاردار جھاڑیوں سے سنگھر بنالی گئی تھی۔

نوشہرہ میں انتظامات

یقینی طور پر تو معلوم نہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ سید صاحب نوشہرہ میں بھی ایک دو دن ضرور ٹھہرے ہوں گے۔ جنگِ اکوڑہ کے زخمیوں میں سے بعض اس وقت تک بھی صحت یاب نہیں ہوئے تھے، مولوی عبد القیوم اور سید امانت علی ان کی تیمارداری پر مامور تھے، انہوں نے جنگِ اکوڑہ سے جنگِ شیدو تک ایک دن کیلئے بھی نوشہرہ نہیں چھوڑا تھا، سوءِ اتفاق سے شیخ امجد علی غازی پوری نوشہرہ پہنچ کر بیمار ہو گئے، سید صاحب نے ان کی تیمارداری کے لئے مولوی فتح علی کو مقرر کر دیا۔ مولوی عبد القیوم سے فرمایا کہ ہم تو اب دریا کے پار جائیں گے اور جب خدا لائے گا آئیں گے۔ آپ اونٹوں کے چار پانچ کجاوے جلد تیار کرا لینا، معلوم نہیں کیا سانحہ پیش آجائے، شاید معذوروں کو محفوظ تر مقام پر بھیجنے کی ضرورت پڑے۔

سردارانِ پشاور پہلے سے دریا کے مغربی کنارے پر تھے، اُدھر ہی سے سکھوں کی لشکر گاہ پر پیش قدمی کرنا منظور تھا۔ اہل سرحد کے لشکر بھی دریا کو عبور کر کے ادھر ہی پہنچ گئے. اور درانی لشکر کے قریب ڈیرا جمالیا۔ سید صاحب بھی اپنے غازیوں کے ساتھ دریا عبور کر کے دوسری طرف چلے گئے۔

لشکر و لشکر گاہ کی کیفیت

جس وقت سے سید صاحب نے دریا عبور کیا تھا، اسی وقت سے آپ کیلئے دونوں

وقت کا کھانا اور میوہ یار محمد خاں بھیجتا تھا۔ نذر محمد کشمیری اور اس کا بھائی ولی محمد، سردار کی طرف سے مہمانداری کے منتظم تھے، وہی کھانا خوانوں میں لگا کر لاتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نوشہرہ کے سامنے مغربی کنارے پر بھی ایک دو روز مقام ہوا، مختلف لوگ جاتے آتے تھے۔ مولوی فتح علی فرماتے ہیں۔

> ایک روز حاجی عبداللہ صاحب جو مولانا محمد اسماعیل صاحب کی جماعت میں تھے، اس پار لشکر میں حضرت کے پاس گئے، پھر جب وہاں سے نوشہرہ میں آئے، میں نے پوچھا کہ بھائی صاحب کہو لشکر کا کیا حال ہے؟ کہا: سب طرح سے خدا کا فضل ہے، مگر حضرت (علیہ الرحمۃ) کی طبیعت فیض طویت قدرے علیل سی ہے۔(۱)

لشکر کے کوچ کی کیفیت بیان کرتے ہوئے مولوی فتح علی کہتے ہیں کہ نوشہرہ بلند زمین پر واقع ہے اور جس طرف لشکر تھا وہ زمین نشیب میں ہے۔ صبح کے وقت شیدو کی طرف سے کوچ شروع ہوا:

> ہم لوگ اس پار (یعنی نوشہرہ کی جانب سے) اچھی طرح دیکھتے تھے، لشکر میں قریب ایک لاکھ کی جمعیت تھی اور کوئی آٹھ دس ہزار فقط نشان تھے۔ کیونکہ اس ملک کا دستور ہے کہ اگر دس بارہ آدمی کی جماعت ہے تو اس میں بھی ایک نشان ضرور ہوتا ہے، اور اگر پانچ سات آدمی کی جماعت ہے تو اس میں بھی ایک نشان ہوتا ہے۔ بڑی جماعتوں میں تو کئی کئی نشان ہوتے ہیں۔ الغرض ملکی لوگ دف بجاتے اور چار بیت گاتے، ننگی تلواریں ہلاتے اور اچھلتے کودتے جاتے تھے۔ جب جاتے جاتے موضع اکوڑہ کوس یا ڈیڑھ کوس رہا تو وہاں تمام لشکر نے ڈیرا کیا اور وہ تمام ڈیرے خیمے اپنے لشکر کے ہم لوگ نوشہرہ سے دیکھتے

(۱) وقائع ص: ۶۲-۴۶۳

تھے۔(۱)

سید صاحب کی علالت

پڑاؤ پر پہنچتے ہی باہم مشورہ کر کے فیصلہ کر لیا گیا کہ صبح کو لڑائی ہوگی۔ سید صاحب کی طبیعت تو اسی وقت سے ناساز ہو گئی تھی جب سے آپ یار محمد خاں کے اصرار پر اس کے ہاں کا کھانا کھانے لگے تھے۔ صبح جنگ سے پیشتر کی رات کو سردار کے ہاں سے کھچڑی اور گنڈ یریاں آئیں، آپ نے کھچڑی کھائی اور چند گنڈیریاں چوسیں، کچھ دیر بعد طبیعت بگڑ گئی، اچانک غشی طاری ہو جاتی، کسی وقت افاقہ معلوم ہوتا۔ رات میں تکلیف بڑھ گئی، قے اور استفراغ شروع ہو گئے دو تین گھڑی رات رہے لڑائی کی تیاری کا نقارہ بجا اور مولانا اسماعیل سید صاحب کے خیمے میں آئے تو آپ کو بے ہوش پایا۔ جب ذرا افاقہ ہوا تو عرض کیا کہ لڑائی کے لئے نکلنے کا وقت آ گیا، سردار یار محمد خاں نے آپ کی سواری کے لئے ہاتھی بھیجا ہے۔ فرمایا: ہمارا سفید گھوڑا جو فتح خاں پنجتاری نے ہم کو دیا ہے، شادل خاں گنج پوری سے کہو کہ اس پر سوار ہو کر فتح خاں کے پاس جائیں، باقی ہندوستانی سب کے سب ہمارے ساتھ رہیں۔

سید صاحب چونکہ بار بار بے ہوش ہو جاتے تھے، اس لئے سوار ہونے میں توقف ہوا۔ اس اثناء میں یار محمد خاں کی طرف سے پے درپے قاصد آتے رہے، تکلیف ہی کی حالت میں آپ ہاتھی پر سوار ہوئے۔ مولانا اسماعیل ساتھ ہودے میں بیٹھے، اس لئے کہ سید صاحب کی طبیعت بہت خراب تھی۔

---

(۱) وقائع ص: ۶۲-۲۶۲۔ نوشہرہ سے اکوڑہ اگرچہ آٹھ میل ہے اور لشکر کی قیام گاہ چھ میل سے کم نہ ہوگی، لیکن ظاہر ہے لشکر بہت بڑا تھا اور قیام کے لئے وسیع جگہ گھیری ہوگی۔ ممکن ہے بعض خیمے صرف تین چار میل کے فاصلے پر ہوں، علاقہ میدانی ہے، اس لئے مولوی فتح علی نے کہا کہ ڈیرے خیمے نوشہرہ سے نظر آتے تھے۔

لشکر کی صف آرائی

جس حد تک میں تحقیق کر سکا ہوں، اسلامی لشکر کی صف آرائی کا نقشہ یہ تھا:

۱۔ یار محمد خاں اپنے لشکریوں کو لے کر خٹک کی پہاڑیوں سے متصل پرا باندھ کر کھڑا ہو گیا، اس کا رخ سکھ لشکر گاہ کی طرف تھا، جو یار محمد خاں کی جائے قیام سے مشرق میں تھی۔(۱)

۲۔ یار محمد خاں کے بائیں ہاتھ سلطان محمد خاں کا لشکر تھا۔

۳۔ سلطان محمد خاں کے بائیں ہاتھ پیر محمد خاں فوج لئے کھڑا تھا۔

۴۔ پیر محمد خاں کے بائیں ہاتھ فتح خاں پنجتاری، خادے خاں ہنڈ، اشرف خاں زیدہ، امیر احمد خاں باجوڑی اور دوسرے خوانین سمہ کے لشکر تھے۔

۵۔ سید صاحب کے غازی خوانین سمہ کے لشکر کے پاس تھے۔

۶۔ گودڑی شہزادہ اپنے غازیوں کے ساتھ شید و گاؤں میں تھا۔

گویا یوں سمجھنا چاہئے کہ اسلامی لشکر خٹک کی پہاڑیوں سے دریائے لنڈے تک ہلالی شکل میں صف بستہ تھا، مختلف جیشوں کے درمیان تھوڑا تھوڑا فاصلہ بھی ہوگا اور ہر جیش کی کئی کئی صفیں تھیں۔

لڑائی کا آغاز

سکھ لشکر گاہ اور اسلامی جیوش کے درمیان ایک خشک نالہ تھا، سکھوں نے توپیں لشکر گاہ میں مناسب جگہ پر نصب کر رکھی تھیں اور ان کے چند جیشوں نے آگے بڑھ کر نالے میں چار مورچے بنا لئے تھے۔ لڑائی ہوتے ہی ان مورچوں سے اسلامی لشکر پر گولیاں برسنے

(۱) ایک روایت ہے: اس کنارہ گیری کو دیکھ کر بعض خوانین سمہ نے لڑائی سے پیشتر ہی سید صاحب سے عرض کر دیا تھا کہ یار محمد خاں کے دل میں کھوٹ ہے ورنہ اسے دامن کوہ میں کھڑا ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

لگیں اور لشکر گاہ سے توپوں کے گولے دنادن آنے شروع ہو گئے۔

سلطان محمد خاں، پیر محمد خاں، فتح محمد خاں پنجتاری اور دوسرے مجاہدوں نے جو گھوڑوں پر سوار تھے، باگیں اٹھائیں اور بجلی کی سرعت سے نالے والے مورچوں پر حملہ آور ہوئے۔ امیر احمد خاں باجوڑی سید صاحب سے بہت قریب تھے، اس نے پانسو سواروں اور پیادوں کو تیار کیا اور سید صاحب سے یورش کی اجازت چاہی، آپ نے فرمایا: ''فی امان اللہ''۔ غرض اس یورش سے نالے کے سارے مورچے فتح ہو گئے، زیادہ تر سکھ سپاہی مارے گئے، باقی جانیں لے کر فرار ہو گئے، اسلامی لشکر ایک بڑی آفت سے محفوظ ہو گیا۔ اس مدت میں یار محمد خاں اپنی سپاہ کے ساتھ بے حس و حرکت کھڑا رہا، نہ یورش میں شریک ہوا، نہ لڑائی میں کوئی حصہ لیا۔

جو سکھ نالے کے مورچے چھوڑ کر بھاگے تھے، وہ پیچھے ہٹ کر ایک اور جگہ اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ سمہ کے غازیوں نے اس اوٹ پر بھی ہلّہ بول دیا اور دشمن کو جاروب کی طرح صاف کرتے ہوئے سکھ لشکر گاہ کی سنگھر کے پاس پہنچ گئے۔ اس اثناء میں گودڑی شہزادہ اپنے مجاہدوں کو لے کر گاؤں سے نکلا اور ہر رکاوٹ بہ زور ہٹاتا ہوا سکھ لشکر گاہ میں گھس گیا۔ غازیانِ سمہ اور گودڑی شہزادے کی یورش نے سکھوں میں ہل چل مچادی اور ان کی توپیں بھی بند ہو گئیں۔ اب بہ ظاہر اسلامیوں کی فتح میں شبہ باقی نہیں رہا تھا، بلکہ ایک شخص نے سید صاحب کو فتح کی مبارک باد بھی دے دی۔ آپ کی کیفیت وہی تھی، کبھی ہوش آجاتا اکثر بے ہوش رہتے۔ مولانا اسماعیل آپ کی دیکھ بھال میں اس درجہ مصروف تھے کہ انہیں لڑائی کے دم بہ دم حالات کا بھی پورا علم نہ تھا۔

یار محمد خاں کی حرکت

مقدماتِ فتح نمایاں ہو چکے تھے کہ سردار یار محمد خاں کی ایک رنج افزا حرکت نے

اچانک فتح کو مصیبت خیز شکست میں بدل دیا۔ روایتوں میں اس کی تفصیل کے متعلق جزوی اختلاف ہے، لیکن اصل حرکت پر سب متفق ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ سکھ لشکر گاہ سے ایک گولہ یار محمد خاں کے لشکر کی طرف آیا، جس سے کئی سوار اڑ گئے اور وہ گھبرا کر بھاگ نکلا۔ دوسری حکایت یوں ہے کہ یار محمد خاں کے لشکر سے دو آدمی سکھوں کی طرف آئے، بات کر کے واپس گئے تو یار محمد خاں نے باگ اٹھائی اور چل دیا۔ ان میں سے کسی روایت کو صحیح سمجھ لیجئے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ یار محمد خاں نے لڑائی میں قطعاً حصہ نہ لیا، پھر جب سکھوں کی جمعیت ریزہ ریزہ ہو رہی تھی تو اس بے درد نے راہِ فرار اختیار کی، لشکری بھی ساتھ ہی کافور ہو گئے۔

محض یہی نہیں بلکہ ایک یا ایک سے زیادہ آدمیوں نے اس فرار کی خوب اشاعت کی، مختلف لشکروں میں پھر پھر کر اور پکار پکار کر اعلان کیا کہ یار محمد خاں بھاگ گیا۔ یہ سنتے ہی سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں بھی اپنے لشکروں کیساتھ بے تحاشا اٹھ دوڑے، غازیانِ سمہ نے یہ شور سنا تو سوچے سمجھے بغیر انہوں نے بھی راہِ گریز اختیار کی۔ پھر پریشانی اور بے ترتیبی کا یہ عالم تھا کہ جس نے فرار کا لفظ سنا اٹھ بھاگا، اور جس طرف رخ ہوا نکل گیا۔

گودڑی شہزادے کی شہادت

جو غازی یورش کر کے سکھ لشکر گاہ تک چلے گئے تھے یا خار بندی سے گذر کر لشکر گاہ کے اندر پہنچ گئے تھے، انہوں نے اپنے پیچھے فرار کا نقشہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ انہیں یقیناً معلوم نہ ہوگا کہ کیا صورت پیش آئی۔ میرا خیال ہے کہ اسی عالم حیرت میں وہ پیچھے ہٹے، سکھوں کے ایک جیش نے درانیوں کا تعاقب کیا، دوسرے نے سمہ والوں کا پیچھا کیا، باقی کوئی گروہ نہ ٹھہر سکا، صرف گودڑی شہزادے نے بھاگنا گوارا نہ کیا، سکھ لشکر گاہ سے پیچھے ہٹ کر شیدو گاؤں میں مورچہ قائم کر لیا۔ سکھوں نے پورا زور لگایا، لیکن بہادر شہزادے

نے مقابلہ نہ چھوڑا۔

جب شیدو پر سکھوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا تو شہزادہ لڑتا ہوا قدم بہ قدم گاؤں سے باہر نکلا۔ ایک ایک ساتھی شہید ہوتا رہا اور شہزادہ پیچھے کی طرف ہٹتا گیا، جب قبرستان میں پہنچا تو خود بھی خونِ شہادت میں تیرتا ہوا مالکِ حقیقی کے دربار میں پہنچ گیا۔ یاد ہوگا کہ ڈیڑھ دو مہینے پیشتر سید صاحب کی بیعت کی تھی تو کہا تھا آپ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ شیدو کے میدان میں اس صادق العہد نے اپنے اس پیمان پر خونِ شہادت سے مہر لگادی۔ ادائے فرض کی سرخروئی کا یہی درجہ علیا ہے، جو ہر مسلمان کا نصب العین ہونا چاہئے۔

''منظورہ'' میں ہے:

> شجاعتِ رستمانہ نمودہ تنہا بسیارے را بے سر ساخت ...... و با جماعت خود کانھم بنیان مرصوص قدم فشردہ دادِ شجاعت داد و ثمنِ جنت گرفتہ جاں بہ جان آفریں سپرد۔
>
> **ترجمہ**: رستمانہ شجاعت سے کام لیتے ہوئے بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا...... اپنی جماعت کے ساتھ جو استقامت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی حیثیت رکھتی تھی، قدم جما کر دادِ شجاعت دی اور جنت لے کر جان جاں آفریں کے حوالے کی۔

جنگ کی تاریخ

یقیناً شہزادہ اور اس کے ساتھی جنت میں مراتبِ عالیہ پر فائز ہوئے اور راہِ حق کے پاک نفس شہیدوں سے بڑھ کر جنت کا حقدار کون ہوسکتا تھا، لیکن مقصودِ حقیقی جنت سے کہیں بڑھ کر یہ تھا کہ خدائے پاک کی رضا و خوشنودی حاصل کریں۔

کسی سوانح نگار نے نہیں بتایا کہ شیدو کی جنگ کس تاریخ کو ہوئی ''عمدۃ التواریخ'' میں ۱۴ پھاگن درج ہے۔

سید صاحب ایک مقام پر اس جنگ کی اجمالی کیفیت بیان فرماتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مجاہدین اخیار ایک سے زیادہ مرتبہ سکھوں پر مظفر و منصور ہوئے، لیکن چند منافقوں کی مداخلت کے باعث انہیں گزند پہنچا۔ الحمد للہ کہ مومنوں کی ہمتِ عالیہ میں قصور و فتور کو راہ نہ ملی۔(۱)

سید صاحب کو زہر دینے کا معاملہ

اب سب سے پہلے ہمیں دو سوالوں پر غور کر لینا چاہئے:

۱۔ آیا یار محمد خاں نے واقعی سید صاحب کو زہر دیا؟

۲۔ آیا یار محمد خاں نے سکھوں سے خفیہ ساز باز کر لیا تھا؟ آیا ساز باز ہی کی وجہ سے وہ اچانک بھاگ نکلا اور اس طرح فتح شکست میں تبدیل ہو گئی؟

سید صاحب کو زہر دینے کی روایات تواتر تک پہنچ چکی ہیں، خود سید صاحب اور شاہ اسماعیل کے مکاتیب میں بھی اس واقعہ کا ذکر آیا ہے۔(۲) پھر اس حادثے کے بعد سید صاحب کے جسم پر ثبور نکل آئے۔ اطباء نے بالاتفاق انہیں زہر کا اثر قرار دیا اور معالجے کے سلسلے میں نکاح پر خاص زور دیا۔ چنانچہ بالآخر سید صاحب کو مجبور ہو کر تیسرا نکاح کرنا پڑا، جس کی کیفیت آگے چل کر بیان ہو گی۔

محض یہی نہیں بلکہ جنگ شیدو سے کچھ مدت بعد سید صاحب نے بونیر و سوات کا دورہ کیا تھا تو منگورہ میں نذر محمد اور ولی محمد مل گئے تھے، جو یار محمد خاں کے ہاں خانسامے رہ چکے تھے اور وہی سید صاحب کیلئے کھانا لاتے تھے۔ زہر دینے کا واقعہ اس درجہ عام ہو چکا

(۱) مکاتیب شاہ صاحب ص:۳

(۲) مثال کے طور پر ملاحظہ فرمایئے مکاتیب سید صاحب ص:۲۵۱ و مکاتیب شاہ اسماعیل ص:۱۹۶۔
نواب وزیر الدولہ کو لکھتے ہیں، :بنگ میں مومنوں کو گزند پہنچا، (ایں فقیر) درمرضے صعب کہ آں را از آثار سم تشخیص نمودند ،مبتلا گردید (اور یہ فقیر بھی ایک سخت مرض میں مبتلا ہو گیا جسے تشخیص کرنے والوں نے زہر کا نتیجہ قرار دیا)۔

تھا کہ لوگوں نے دونوں کو پہچان کر گرفتار کر لیا اور سزا دینے پر آمادہ ہو گئے۔ سید صاحب نے انہیں چھڑا کر روانہ کیا، راستے میں پھر پکڑے گئے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں ایک جھونپڑی میں ڈال دیا گیا۔ اتفاق سے سید صاحب کا گذر اُدھر سے ہوا، پہریدار نے عرض کیا کہ جن لوگوں نے آپ کو زہر دیا تھا، ہم نے انہیں پکڑ لیا ہے اور اپنے خان کو بلایا ہے تا کہ انہیں سزا دے۔ خان بھی پہنچ گیا اور سید صاحب سے عرض کیا کہ آپ تشریف لے جائیں، ہم انہیں قتل کریں گے۔ سید صاحب نے بہ مشکل انہیں چھڑا کر ساتھ لیا، جب اندھیرا ہو گیا تو فرمایا کہ زہر دینے کا راز کھل کر جگہ جگہ پھیل گیا ہے، بہتر یہ ہے کہ یہاں سے کسی دوسری سمت نکل جاؤ۔(۱)

گویا محض سید صاحب کے ساتھیوں ہی کو نہیں بلکہ سرحد کے عوام کو بھی اسی زمانے میں معلوم ہو چکا تھا کہ سید صاحب کو زہر دیا گیا، اور جن لوگوں نے زہر دیا، ان کے نام بھی معلوم تھے۔

''عمدۃ التواریخ'' کی شہادت

رنجیت سنگھ نے بھی سلاطین کی طرح اپنے دربار کا روزنامچہ مرتب کرنے کا حکم دے دیا تھا، یہی روزنامچہ بعد میں ''عمدۃ التواریخ'' کے نام سے چھپا۔ اس میں ہے:

> منقول السنۂ باشندگان آں روے آب اٹک است کہ عالی جاہ یار محمد خاں بہ پاس ارتباط و اتحاد سرکار دولتمدار (رنجیت سنگھ) درچنین اشتعال نوائر جدال وقتال احمد شاہ را شربت شیریں سم قاتل نوشانیدہ قرار بہ فرار دادند تمامی لشکریاں نیز بہ متابعت او پرداختند۔(۲)

ترجمہ: اٹک پار کے لوگوں کا بیان ہے کہ جب جنگ کی آگ بھڑکی تو یار محمد خاں نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ربط و اتحاد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے

(۱) یہ تمام حالات وقائع میں تفصیل سے مرقوم ہیں۔ (۲) ''عمدۃ التواریخ'' دفتر دوم ص: ۳۴۱

سید صاحب کو زہر دے دیا اور خود بھاگ نکلنے کی ٹھان لی، اس کا لشکر بھی ساتھ ہی فرار ہو گیا۔

زہر دینے کا واقعہ ثابت ہو جانے کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ سب کچھ سکھوں سے ساز باز کے بعد عمل میں آیا۔ میرا خیال ہے کہ ساز باز لڑائی شروع ہونے سے پیشتر پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اسی وجہ سے یار محمد خاں نے میدانِ جنگ میں ایسے مقام پر فوج کھڑی کی، جہاں سے وہ بسہولتِ تمام فرار ہو سکتا تھا، نیز جنگ میں اس نے کوئی حصہ نہ لیا۔ قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان محمد خاں اور پیر محمد خاں اس معاملے میں آخری وقت تک بے خبر رہے۔

انگریزوں کے بیانات

اب آخر میں اس جنگ کے متعلق انگریزوں کے بیانات سن لیجئے ''پشاور گزیٹر'' میں ہے: سید صاحب یہ غرض لے کر نوشہرہ پہنچے تھے کہ آگے بڑھ کر اٹک کا محاصرہ کر لیں، لیکن ہری سنگھ نے بدھ سنگھ کو بھاری فوج دے کر مجاہدین کے مقابلے کیلئے شیدو بھیج دیا اور خود بیس ہزار آدمیوں کے ساتھ دریائے اٹک پر موجود رہا۔

> سید نے بدھ سنگھ کی فوج کو گھیر کر سخت بدحال کر دیا، آخر وہ لڑنے کیلئے تیار ہو گیا، اس نے درانی سرداروں کو بتا دیا کہ اگر سید کی اعانت سے الگ تھلگ رہو گے تو تمہارے علاقوں پر قبضہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ بھی بتا دیا کہ رنجیت سنگھ خود آ رہا ہے، اگر سید کا ساتھ دیا اور لڑائی میں حصہ لیا تو تمہارا جو حشر ہو گا وہ کسی شرح کا محتاج نہیں۔
>
> سرداروں پر، جن کا سرخیل یار محمد خاں تھا، اس انتباہ کا خاطر خواہ اثر ہوا، وہ لڑائی کے شروع ہوتے ہی بھاگ نکلے۔ یار محمد خاں سب سے آگے تھا، اس غدر و خیانت نے مطلوب نتیجہ پیدا کر دیا، سکھ سپاہیوں نے مسلمانوں کو بھاری

نقصان پہنچا کر شکست دی۔(۱)

پیجٹ اور میسن کی کتاب میں بھی حرفاً حرفاً یہی مرقوم ہے، صرف اس اضافے کے ساتھ کہ:

> یار محمد خاں کو اس غداری سے کوئی فائدہ نہ پہنچا، رنجیت سنگھ نے خراج کی رقم دگنی کردی، مسجدوں کی بے حرمتی کی، ملک کو لوٹا اور آخرکار وہ یار محمد خاں کے بیٹے کو یرغمال میں لے کر واپس ہوا۔(۲)

میسن نے ''کلکتہ ریویو'' میں بھی ایک مضمون لکھا تھا جس کا مفاد یہ ہے کہ سید صاحب نے بدھ سنگھ کو سیدوالا میں گھیر لیا، وہ کئی روز تک تذبذب میں پڑا رہا، اس اثناء میں درانی سرداروں سے نامہ و پیام کا سلسلہ پیدا کیا، انہیں یقین دلایا کہ اگر لڑائی سے الگ رہو گے تو سرکار والا (رنجیت سنگھ) سے سفارش کروں گا اور سید کے ساتھ مل جانے کا جرم معاف کردیا جائے گا۔ لیکن اگر حصہ لیا اور مجھے تباہ بھی کردیا تو اس سے عام حالات پر کوئی اثر نہ پڑے گا، ہماری سرکار بڑی زور آور ہے، اور بہت بڑی فوج میری کمک کے لئے پہنچ رہی ہے۔ اس دھمکی نے سرداروں پر گہرا اثر ڈالا:

> ''لڑائی کے دن وہ اپنے رسالے اور توپ خانے کے ساتھ آگے کھڑے تھے، پھر اچانک پیچھے بھاگے۔ یار محمد بھاگنے میں پیش پیش تھا اور ساتھ ساتھ زور زور سے چلا رہا تھا، شکست، شکست۔''

برنز بھی بخارا جاتے ہوئے اس مقام سے گذرا تھا اور اس نے اپنی کتاب ''سیاحت بخارا'' میں جنگ شیدو کا ذکر کیا ہے۔(۳) لیکن جو حالات بیان کئے ہیں وہ غیر مستند ہیں

(۱) پشاور گزیٹر

(۲) ''پیجٹ اینڈ میسن'' ص:۸۰۔ عمدۃ التواریخ کا بیان ہے کہ یار محمد خاں نے اپنے بیٹے کو ایشر سنگھ، خوشحال سنگھ، دھنا سنگھ ملوئی اور دیوان بھوانی داس کے پاس بھیج دیا تھا، ساتھ چند گھوڑے بھی بطور نذر بھیجے تھے۔

(۳) جلد دوم ص:۷۳

مثلاً اس نے سکھوں کی فوج صرف آٹھ ہزار بتائی ہے اور اسلامی فوج کو ڈیڑھ لاکھ پر پہنچا دیا ہے۔

غداری کے اسباب

بہر حال ان لوگوں کے سامنے لڑائی کی واضح کیفیت نہ تھی، لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ سکھوں نے جنگ شروع ہونے سے پیشتر دُرانی سرداروں کو یا کم از کم یار محمد خاں کو ساتھ ملا لیا تھا، اور میدانِ جنگ میں فوج آراستہ کرنے سے پیشتر یار محمد دل میں پختہ ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ اسے بھاگنا ہے، نیز اپنے بھائیوں بلکہ تمام اہل سرحد کو بھی ساتھ لے جانا ہے۔ اگر وہ سید صاحب کے ساتھ شامل نہ ہوتا تو شاید سکھوں کے عتاب سے محفوظ رہتا، شامل ہونے کے بعد اپنے نامۂ اعمال سے دھبے کو دھونے کی شکل یہی تھی کہ اسلامی مقاصد کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر سکھوں کی خوشنودی حاصل کرتا۔ یہی اس نے کیا۔ سید صاحب کو زہر دیا، پھر جب فتح کے اسباب نمایاں ہو گئے تو اپنی سوچی سمجھی ہوئی اسکیم کے مطابق اسے شکست سے بدلا۔

ہم پہلے میسن کی زبان سے بتا چکے ہیں کہ اہل سرحد کو اپنے گرد جمع کر لینے میں سید صاحب کی غیر معمولی کامیابی نے اسے ارادت مندی پر آمادہ کر دیا تھا۔ میسن ہی نے لکھا ہے کہ جب یار محمد خاں نے دیکھا کہ سید صاحب نے حاکمانہ حیثیت حاصل کر لی ہے تو اسکے دل میں وسوسے پیدا ہو گئے، اور اس نے سکھوں کے ساتھ نامہ و پیام شروع کر دیا۔

لیکن سید صاحب نے قطعاً حاکمانہ حیثیت اختیار نہیں کی تھی، ہنڈ کی بیعتِ امامت جہاد کے لئے تھی، یار محمد خاں اس بیعت کے بعد سید صاحب کے ساتھ شامل ہوا تھا، شیدو میں بھی سید صاحب صرف امامِ جہاد تھے، حاکم نہ تھے۔ پھر یار محمد خاں کے دل میں وسوسے پیدا ہونے کی کونسی وجہ تھی؟ سید صاحب اگر حاکم بھی بن جاتے تو ان کی حکومت

یار محمد خاں کیلئے اس درجہ مذموم تو نہ ہونی چاہئے تھی کہ وہ رنجیت سنگھ کی تابعیت اور سرحد پر سکھوں کے تسلط کو ترجیح دینے کے لئے آمادہ ہو جاتا۔

سکھ دربار کا جشن

یہ فتح سکھ دربار کے نزدیک اتنی عظیم الشان تھی کہ اس کی خوشی میں توپیں سر کی گئیں اور شہر میں چراغاں کا حکم دیا گیا۔(۱)

دیوان امرناتھ لکھتے ہیں:

چراغاں در لاہور وتمامی ممالک محروسہ شد وسرکار والا ہزار ہا بر محتاجین وفقرا ایثار کردہ جشن شاہانہ فرمودند۔(۲)

ترجمہ : لاہور اور تمام سکھ مقبوضات میں چراغ جلائے گئے۔ رنجیت سنگھ نے شاہانہ جشن منایا۔ ہزاروں روپے محتاجوں اور فقیروں میں بانٹے گئے، اور شاہانہ جشن منایا گیا۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سید صاحب کی تحریک جہاد نے سکھوں پر کس درجہ سراسیمگی طاری کردی تھی، اور فتح کو انہوں نے کتنی اہمیت دی۔ یار محمد خاں سے پامردی کی امید تو شاید ہو ہی نہیں سکتی تھی، لیکن اگر وہ غدر وخیانت سے دور رہتا اور غازیوں میں ابتری پیدا نہ کرتا تو بدھ سنگھ شیدو میں شکست کھا جاتا۔ اس کی فوج کٹ جاتی، ساز وسامانِ جنگ غازیوں کے ہاتھ لگتا اور ان کا دوسرا قدم حصار اٹک پر پڑتا۔ افسوس کہ یار محمد خاں کی نالائقی نے ان تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ دُرّانی سردار اس وقت سے مستقل طور پر سکھوں کی تابعیت میں چلے گئے، اور سید صاحب کی مساعیٔ جہاد میں شدید رکاوٹیں پیدا کرنے لگے۔ اس سلسلے میں اہل سرحد کو جن ظلموں کا ہدف بننا پڑا، ان کے زخم

(۱) عمدۃ التواریخ دفتر دوم ص:۳۴۱

(۲) ظفر نامہ دیوان امرناتھ ص:۱۸۱

سوا سو سال گذر جانے کے بعد بھی کاملاً مندمل نہیں ہوئے۔

غازیوں کا نقصان

کسی نے یہ نہیں لکھا کہ لڑائی کتنی دیر جاری رہی اور غازیوں کا کس قدر نقصان ہوا۔ ہندوستانی غازیوں میں سے جو اصحاب نوشہرہ میں تھے، وہ بیان کرتے ہیں کہ پہر دن چڑھا ہوگا، جب توپوں اور شاہینوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پہر ڈیڑھ پہر تک جاری رہنے کے بعد یہ آوازیں موقوف ہو گئیں، ہم ظہر کی نماز پڑھ چکے تو کسی نے بتایا کہ پیادوں اور سواروں کا غول آیا۔

اس سے ظاہر ہے کہ گھمسان کی لڑائی ڈیڑھ پہر سے زیادہ نہ ہوئی، دیوان امرناتھ نے لکھا ہے کہ چھ ہزار غازی مقتول ہوئے۔(۱) یہ پاک اور قیمتی خون صرف یار محمد خاں کی خیانت کے باعث رائیگاں بہا۔

(۱) ظفر نامہ ص:۱۸۱

سینتیسواں باب:

سفرِ چنگلئی

شاہ اسماعیل کا انہماک

فتح و فیروز مندی کے آثار نمودار ہو جانے کے بعد یکا یک شکست کے اسباب پیدا ہو جانا بالکل غیر متوقع تھا۔ مولانا شاہ اسماعیل سید صاحب کی سواری کے ہاتھی کو غالباً ایسی جگہ لے گئے تھے، جہاں سے لشکروں کی آویزش گاہ اتنے فاصلے پر تھی کہ لڑائی کی لحظہ بہ لحظہ کیفیت معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ سید صاحب پر پے در پے بے ہوشی کے دورے پڑتے تھے، مولانا انہیں سنبھالنے کے تردد میں بھی بہت منہمک ہوں گے۔

راوی بیان کرتا ہے کہ درانیوں اور ان کے ساتھ اہل سمہ کے فرار کو دیکھ کر مہاوت نے مولانا سے عرض کیا، مسلمانوں کو شکست ہوئی، اب جلد سے جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچ جانا چاہئے۔ مولانا نے حیران ہو کر پوچھا چہ می گوئی؟ مسلمانان فتح یاب اند۔ (تو کیا کہتا ہے؟ مسلمان تو کامیاب ہیں) جب اس نے بتایا کہ درانی بھاگ گئے اور اہل سمہ نے ان کی پیروی میں میدان چھوڑ دیا تو مولانا کو پہلی مرتبہ حقیقتِ حال کا علم ہوا۔

شاہ صاحب کی شانِ ایثار

اس وقت سید صاحب بے ہوش تھے، ہاتھی کو تیز چلایا گیا۔ (۱) سارے لشکر اسلام

(۱) اس ہاتھی کے متعلق راویوں اور سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ لنگڑا تھا، چونکہ یار محمد خاں سکھوں سے ساز باز کر چکا تھا، اس لئے اس نے دانستہ لنگڑا ہاتھی سواری کے لئے پیش کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

میں چونکہ یہی ایک ہاتھی تھا، اس لئے بہت نمایاں ہوگا اور یار محمد خاں نے سکھوں کو بتا دیا ہوگا کہ سید صاحب ہاتھی پر سوار ہیں، اس لئے ایک سکھ جیش نے ہاتھی کے تعاقب کا خاص اہتمام کیا۔ مولانا نے یہ دیکھا تو سید صاحب کو ہاتھی سے اتار کر گھوڑے پر سوار کرا دیا، اور خود ہاتھی ہی پر رہے۔ مقصود یہ تھا کہ تعاقب کرنے والے سکھ اس خیال سے ہاتھی کے پیچھے لگے رہیں کہ سید صاحب اس پر سوار ہیں، اس اثناء میں سید صاحب کو خطرے کے مقام سے دور نکل جانے کا موقع مل جائے۔ (۱) مولانا کی یہ جاں نثاری اور فداکاری ان کے اعمالِ حسنہ کا ایک نہایت شاندار واقعہ ہے۔ جب اندازہ فرما لیا کہ سید صاحب دور نکل گئے تو مولانا بھی ہاتھی سے اُتر گئے، جو غازی آپ سے قریب تھے اُنہیں ساتھ لیا اور پیدل پشاور کی طرف روانہ ہو گئے۔ (۲)

فرار و انتشار کی حالت میں راہ و مقام کا کسے خیال ہو سکتا تھا۔ ہندوستانی غازی بھی

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... کہ راویوں کو اس بارے میں غلط فہمی ہوئی، اور سوانح نگاروں نے اس روایت کی اصلیت پر غور نہ فرمایا۔ اگر ہاتھی لنگڑا ہوتا تو مولانا شاہ اسماعیل جیسے بالغ نظر، دور اندیش اور دقیقہ سنج بزرگ سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی تھی، اور ہاتھی پر سوار ہونا لوازمِ جنگ میں سے نہ تھا کہ بدرجہ مجبوری لنگڑے ہاتھی ہی کی سواری قبول کر لی جاتی۔ میں جس حد تک اندازہ کر سکا ہوں، سید صاحب کو ہاتھی پر اس وجہ سے سوار کرنا پڑا کہ وہ سخت بیمار ہو گئے تھے، اور جنگ میں ان کا شامل ہونا ضروری تھا، اگر وہ کسی کی اعانت کے بغیر گھوڑے پر سوار رہ سکتے تو کبھی ہاتھی پر سوار نہ ہوتے۔ ممکن ہے جنگ میں ہاتھی کے پاؤں کو خفیف سا گزند پہنچا ہو یا اس کی سستیٔ رفتار سے بعض لوگوں کو لنگڑے پن کا دھوکا ہوا ہو، لیکن سید صاحب کی سواری کے وقت وہ قطعاً لنگڑا نہ ہوگا۔

(۱) وقائع میں ہے: فیل بان نے جب دیکھا کہ سکھوں کے سوار بندوقیں چلاتے ہوئے پیچھے آ رہے ہیں تو مولانا سے کہا کہ آپ کی خیر خواہی کے خیال سے عرض کرتا ہوں کہ حضرت کو گھوڑے پر سوار کر کے چند آدمیوں کے ہمراہ پہاڑ کی طرف جو ایک گاؤں ہے، ادھر کو روانہ کر دیجئے۔ آپ باقی جمعیت کے ہمراہ اسی ہاتھی پر سوار رہیے۔ (ص: ۴۶۶)

(۲) ایک روایت میں ہے کہ پہلے اونٹ پر سوار کرایا گیا، پھر گھوڑے پر۔ شیخ کریم بخش فرماتے ہیں کہ مولانا نے سید صاحب کو رخصت کرتے وقت ساتھیوں کو کہہ دیا تھا کہ آپ سید صاحب کو پہاڑ کی طرف لے چلیں، میں دوسرے راستے سے پہنچ جاؤں گا۔ ''منظورہ'' میں ہے کہ پانچ چھ آدمی سید صاحب کے ساتھ تھے، جن میں سے تین کے نام یہ ہیں: شیخ صلاح الدین پھلتی، مولوی امیر الدین ولایتی اور سید عبد الرؤف۔

مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ چند آدمی سید صاحب کے ساتھ تھے۔ ایک جماعت مولانا شاہ اسماعیل کی معیت میں تھی۔ ایک گروہ اکوڑہ پہنچ گیا، جہاں غازیوں کی لشکر گاہ تھی۔ ایک غازی کا بیان ہے کہ ہم وہاں پہنچے تو لوٹ کا منظر رونما تھا۔ جو اسباب اٹھانے کے قابل تھا ملکی لوگ سراسیمگی کی حالت میں اٹھا کر بھاگے جا رہے تھے۔

سید صاحب کا سفر

سید صاحب پہلے سر کے گھاٹ پر پہنچے۔ ہمراہیوں نے آپ کو گھوڑے سے اتارا اور زین پوش بچھا کر اس پر لٹا دیا۔ پھر پتھر پر پتھر مار کر شعلہ پیدا کیا اور آگ جلائی، تا کہ سردی زائل ہو جائے۔ سید عبدالرؤف شاہ نے گاؤں والوں کو جالا لانے کے لئے آواز دی۔ وہ لوگ یوں سکھوں کی ترکتاز کے خوف سے گاؤں چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے، جالا کون لاتا؟ ناچار سید صاحب کو سوار کر کے آگے بڑھے اور اس گھاٹ پر پہنچے جہاں دریائے ناگاں، دریائے سوات سے ملا ہے۔ وہاں صرف ایک کشتی تھی اور دریا کو عبور کرنے والے آدمی بہت زیادہ تھے۔ پھر ان لوگوں پر اس درجہ اضطراب طاری تھا کہ کشتی کنارے پر پہنچنے نہیں دیتے تھے، دریا میں گھس پڑتے اور سوار ہو ہو کر کنارے کی طرف لے جاتے۔

شیخ صلاح الدین پھلتی، سید صاحب کو گھوڑے ہی پر دریا میں لے گئے تا کہ پہلے سوار ہو جائیں۔ اتفاق سے گھوڑے کا پاؤں پھسلا اور سید صاحب پانی میں گر گئے۔ اس اثناء میں اشرف خاں رئیس زیدہ پہنچ گیا، وہ کشتی کے پاس نیزہ تان کر کھڑا ہو گیا، جو شخص قریب آتا اُسے نیزے سے پیچھے ہٹا دیتا۔ اس نے پہلے سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کو سوار کرایا اور دریا سے پار اُتارا، جو لوگ رہ گئے وہ دوسرے گھاٹ سے پار اُتر کر بابڑہ میں سید صاحب سے ملحق ہوئے۔ (۱)

(۱) وقائع میں ایک روایت ہے کہ تورو کے دو آدمی لڑائی سے اپنے گاؤں پہنچے تو ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

مولانا شاہ اسماعیل پشاور پہنچے۔ شہر سے باہر ٹھہر کر کھانا منگایا۔ سلطان محمد خاں کو ان کے آنے کا علم ہوا تو پیغام بھیجا کہ میرے بھائی یار محمد خاں کو آپ لوگوں سے سخت عداوت ہے۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ جلد چلے جائیں۔ چنانچہ شاہ صاحب زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور بابڑہ میں سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔

باقی منزلیں

دریا سے پار اترنے کے بعد کی منزلوں کے متعلق روایتیں مختلف ہیں۔ ''وقائع'' کا کہنا ہے کہ چارسدہ کے سادات سید صاحب کو لے گئے۔ اس وقت آپ کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی اور آپ اکثر بے ہوش رہتے تھے۔ جب ہوش آتا اور مولانا حال پوچھتے تو فرماتے: ''اللہ کا شکر ہے، اندیشہ نہ کیجیے، خدا مجھے بچالے گا'' پھر سادات نے آپ کو جلالہ اور مچنی کے راستے پلئی اور وہاں سے باغ پہنچادیا۔

''منظورہ'' کا بیان ہے کہ بابڑہ پہنچے تو سید صاحب پر زہر کا اتنا اثر ہو چکا تھا کہ گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتے تھے، لہٰذا چار پائی پر لٹا کر چار آدمیوں نے اٹھایا۔ ڈاگئی ہوتے ہوئے گوجر گڑھی گئے جہاں لوگوں نے بہ اصرار روک لیا۔ ان سے کہا گیا کہ درانی سید صاحب کے دشمن ہیں، مبادا اس مہمانداری کی پاداش میں تمہیں گزند پہنچائیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم درانیوں سے خود سمجھ لیں گے۔ گوجر گڑھی میں غالباً ایک رات

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... بہادر خاں رئیس تورو نے ان سے سید صاحب کا حال پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ آدمی سید صاحب کو چارپائی پر اٹھائے ہوئے گھاٹ پر پہنچے تو وہاں ملکیوں اور درانیوں کا ہجوم تھا اور وہ سید صاحب کی چارپائی کشتی پر نہیں رکھنے دیتے تھے۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ یار محمد خاں نے اس غرض سے درانیوں کو گھاٹ پر بھیجا ہے کہ سید صاحب کو پار نہ اترنے دیں۔ اس اثناء میں سکھ آ پہنچیں گے اور وہ سید صاحب کو گرفتار کرلیں گے۔ پھر شاہ اسماعیل گھاٹ پر آ پہنچے، انہوں نے چارپائی کشتی پر رکھوائی۔ اس طرح سید صاحب پار اُترے۔ میرے نزدیک وہی روایت صحیح ہے جسے متن میں نقل کر چکا ہوں۔

گزاری، وہاں سے نکلے تو موضع محب ہوتے ہوئے سرخ ڈھیری (۱) پہنچے، وہاں کے ملک فیض اللہ خاں نے سید صاحب کی چارپائی اٹھانے کیلئے بارہ قوی آدمی مہیا کردیے، یوں آپکو پہلے باغ پہنچایا گیا، جو درے کے عین دہانے پر واقع ہے، پھر چنگلئی لے گئے۔

میرے نزدیک ''منظورہ'' کا بیان زیادہ قرین صحت ہے، اس لئے کہ چارسدہ سے جلال اور مچئی جانے میں میری معلومات کے مطابق بڑا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ سید صاحب اس وقت سخت تکلیف میں تھے، نیز انہیں جلد سے جلد محفوظ مقام پر پہنچانا ضروری تھا، اس لئے میرا خیال ہے کہ زیادہ لمبا اور چکر والا راستہ اختیار نہ کیا ہوگا، تاہم دشمن کے تعاقب سے محفوظ رہنے کے لئے قریبی راستہ چھوڑ کر طویل راستہ اختیار کر لینا خارج از قیاس نہیں سمجھا جا سکتا۔

سید صاحب کے رفقاء

میں عرض کر چکا ہوں کہ سید صاحب کے رفقاء شیدو کے میدان ہی میں بکھر گئے تھے، چند اصحاب سید صاحب کے ساتھ رہے، ایک جماعت مولانا اسماعیل کے ساتھ تھی، جو میری معلومات کے مطابق بابڑہ میں سید صاحب سے مل گئے۔ کچھ لوگ شیدو سے نوشہرہ پہنچ گئے، وہاں پہلے سے زخمی اور بیمار غازیوں نیز ان کے تیمارداروں کی ایک جماعت موجود تھی، انہیں پیغام بھیج دیا ہوگا کہ نوشہرہ کو چھوڑ دو۔ تندرست غازیوں نے کجاوے اونٹوں پر باندھے، خچر اور ٹٹو بھی تیار کیے، سب سے پہلے ان لوگوں کو سوار کیا گیا جو چلنے پھرنے سے بالکل معذور تھے، انہیں تورو پہنچا کر سواریاں واپس آئیں تو باقی بیماروں کو سوار کیا گیا، تندرست لوگ پیدل تورو پہنچ گئے۔ زخمیوں اور بیماروں میں سے مندرجہ ذیل اصحاب کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

(۱) روایتوں میں اسے سرڈھیری لکھا گیا ہے ''سر'' اصل میں سور ہے (بروزن قمر) پشتوں میں بہ معنی ''سرخ'' آج کل اسے عام طور پر ''سرخ ڈھیری'' کہتے ہیں، اس لئے میں نے مروّج نام اختیار کیا۔

۱۔ شیخ ولی محمد پھلتی۔ ۲۔ شیخ امجد علی غازی پور۔ ۳۔ قاضی حمایت اللہ۔
۴۔ قاضی برہان الدین۔ ۵۔ ابراہیم خاں خیر آبادی۔ ۶۔ خدا بخش منجھانوی۔
۷۔ عبدالوہاب لکھنوی قاسم غلہ۔ ۸۔ حاجی حمزہ علی خاں ۹۔ سید رستم علی چل گاؤں
۱۰۔ خدا بخش چار نالی بندوق والے۔ ۱۱۔ حاجی عبداللہ (مولانا اسماعیل کی جماعت کے)۔

مولوی فتح علی فرماتے ہیں کہ دیر تک اناج کا ایک دانہ بھی میسر نہ آسکا، پھر جوار ملی جو خود بھی کھائی اور گھوڑوں کو بھی کھلائی۔ تورو پہنچے تو وہاں کے رئیس بہادر خاں نے مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، جانور بھوکے تھے، خان نے کہا کہ انہیں ہمارے گیہوں کے کھیتوں میں چھوڑ دیا جائے۔ سب لوگ سید صاحب کی بابت پوچھتے تھے، چونکہ تورو بھی خطرے میں تھا اور افواہ تھی کہ سکھ اس طرف پیش قدمی کرنے والے ہیں، اس لئے وہاں ٹھہرے رہنا خلاف مصلحت تھا، چنانچہ نکل پڑے۔(۱) ڈاگئی میں مولوی مظہر علی اور خیر اللہ سے ملاقات ہوئی وہ ضعف اور تکان کے باعث سید صاحب کے قافلے سے پیچھے رہ گئے تھے، ان سے سید صاحب کے چنگلئی جانے کا حال سنا تو سب کو اطمینان ہو گیا۔

ڈاگئی میں مصری بانڈہ، دوڈھیر، لہاور، جلسئی، کنڈوہ وغیرہ کے مہاجرین بھی موجود تھے، وہاں کے خان کو یہ خوف لاحق ہوا کہ سکھوں کو ان لوگوں کی موجودگی کا علم ہوگا تو ضرور یورش کریں گے۔ اس لئے سب سے کہا کہ جلد نکل جاؤ، لیکن شدید بارش ہو رہی تھی اور رات کی تاریکی میں ان لوگوں کیلئے سفر کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ راستے سے بالکل ناواقف تھے، مجبوراً بھوکے پیاسے رات گزاری اور علی الصباح بارش ہی میں روانہ ہو گئے۔ اڑھائی کوس گئے ہوں گے کہ مطلع صاف ہو گیا، نواکلئی ہوتے ہوئے شیخ جانا پہنچے۔ ایک رات وہاں گزاری، ایک رات دامنِ کوہ کے ایک گاؤں میں بسر کی، پھر بعض

(۱) ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ بعض غازی تورو ہی میں رہے، ان میں سے سید حمید الدین خواہرزادۂ سید صاحب نیز سید ابوالقاسم اور سید موسیٰ (صاحبزادگان سید احمد علی برادر سید حمید الدین) کے اسمائے گرامی بتصریح موجود ہیں۔

پنجتار میں ٹھہر گئے، بعض چنگلئ میں سید صاحب کے پاس چلے گئے۔ غازیوں کی متفرق ٹولیاں کئی روز تک آہستہ آہستہ پہنچتی رہیں۔

قیامِ چنگلئ

چنگلئ میں سید صاحب اور بعض دوسرے غازیوں کے لئے کچھ مکان خالی کرالئے گئے تھے، باقی غازی حجروں اور مسجدوں میں ٹھہر گئے اور آٹھ روز تک سید صاحب پر بے ہوشی کے دورے پڑتے رہے۔ جب طبیعت بحال ہوگئی تو جنگ اور بعد کی مصیبتوں کا پورا حال سنا، اس وقت آپ نے پنجتار اور تورو کے غازیوں کو بھی اپنے پاس بلالیا۔

راہِ اخلاص وایثار میں انسان کیلئے بعض اوقات امتحان کے نہایت کٹھن مرحلے پیش آجاتے ہیں، جن میں عزم وہمت کو تزلزل سے محفوظ رکھنا مشکل ہوجاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ سید صاحب نے کس طرح صرف اسلام ومسلمین کی بہتری کے لئے قربانی کی منزل میں جانبازانہ قدم رکھا تھا اور کس طرح ایک حق ناشناس فرد یا گروہ کی نالائقی کے باعث فتح شکست میں بدلی۔ ہزاروں مسلمانوں کا قیمتی خون لاحاصل بہا، سرحد کی مختلف آبادیوں کو اور خود سید صاحب نیز ان کی جماعت کو خوفناک آفتوں سے سابقہ پڑا۔ اس نازک امتحان سے وہی لوگ محفوظ ومامون گذر سکتے ہیں، جن کے ایمان پہاڑوں سے زیادہ مضبوط ومستحکم ہوں، سید صاحب نے سارے حالات سن کر فرمایا:

> یہ جو کچھ حال ہم پر اور سب بھائیوں پر گذرا، کچھ جنابِ الٰہی میں ہم لوگوں سے خطا اور بے ادبی ہوئی ہے، اسی کا یہ بدلا ہے، اور یہ بھی ایک امتحان تھا، وہ سبحانہ تعالیٰ ایسی ایسی آزمائشوں پر ہم کو اور ہمارے مجاہدین بھائیوں کو ثابت قدم رکھے اور ہماری تکلیفوں کو ساتھ راحت کے بدل دے اور ان لوگوں نے جو ہم کو زہر دیا سو یہ بھی حکمتِ الٰہی سے خالی نہیں، یہ بھی ایک سنت حضرت خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہم سے ادا ہوئی۔

بارگاہِ الٰہی میں دعاء

پھر ننگے سر ہو کر عجز و الحاح سے جناب باری میں دعاء کرنے لگے:

الٰہی! ہم سب تیرے بندے ذلیل و خاکسار اور عاجز و ناچار ہیں، سوا تیرے کوئی ہمارا حامی و مددگار نہیں۔ محض تیرے ہی فضل و کرم کے امیدوار ہیں، ہم تیرے امتحان و آزمائش کے قابل نہیں ہیں، ہماری خطاؤں کو نہ پکڑ، اپنی رحمت سے معاف کر اور ہم کو اپنے صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رکھ۔ جو لوگ تیری اس راہ کے مخالف ہیں، ان کو ہدایت کر۔

اس قسم کے الفاظ دیر تک آپ کی زبان پر جاری رہے، پھر آپ نے غازیوں کو تسلی دی اور فرمایا: بھائیو! گھبراؤ نہیں، اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا فضل و کرم کرے گا۔(۱)

مقامِ رضا میں عزیمت کا نقشہ

اسے کہتے ہیں للّٰہیت اور یہ ہے عزیمت و سبقت فی الخیرات کا حقیقی عملی نقشہ۔ صرف اللہ کی رضا کے لئے خاندان و وطن کے ہر محبوب پیوند کو بے تکلف قطع کیا، ہزاروں میل کا دشوار گزار راستہ طے کر کے ایک اجنبی سرزمین میں پہنچے۔ صرف اللہ کی رضا کے لئے جہاد کا علم بلند کیا اور دعوت وارشاد سے ایک لاکھ فرزندانِ توحید کو اس کے نیچے جمع کر دیا۔ صرف اللہ کی رضا کے لئے نہایت طاقتور دشمن کے مقابلے میں سربکف جا کھڑے ہوئے اپنوں نے جو بظاہر ارادت مندی کے ساتھ بیعتِ امامت کر چکے تھے، دشمن سے ساز باز کر کے زہر دے دیا۔

اپنوں کی خیانت کے باعث فتح شکست میں تبدیل ہوئی پھر صدہا نادیدہ و ناشنیدہ مصیبتیں برداشت کرتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچے جہاں قیام اور خور و نوش کے

(۱) وقائع ص: ۴۷۱، ۴۷۲

اسباب بھی بقدر کفایت میسر نہ تھے، لیکن پاک نفسی کا یہ رنگ ہے کہ ہر افتاد کو اپنے نفس کی خطا، اپنے عمل کی کوتاہی اور اپنی تدبیر کی درماندگی سے منسوب کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کے لئے صراطِ مستقیم پر چٹان کی طرح جمے کھڑے ہیں۔ قدم میں لرزش، حوصلے میں لغزش یا دل میں تذبذب کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔ اس ترازو میں ہم اپنے ایمان باللہ، اپنی حمیتِ دین اور اپنی شانِ اخلاص کو تولیں تو نتیجہ کیا نکلے گا؟

پھر اس سے بڑھ کر بدبختی اور حرماں نصیبی کیا ہو سکتی ہے کہ سیکڑوں مسند نشینانِ شریعت اور سیکڑوں سجادہ گسترانِ طریقت سوا سو برس تک اس بزرگ مجاہد اور اسکی قدوسی جماعت کو ایک دوسرے سے آگے بڑھ بڑھ کر گوناگوں ملام ومطاعن کا ہدف بناتے اور حبِ اسلام ہی نہیں بلکہ اسلام کو بھی محلِ نظر بتاتے رہے؟ ہم سب نے ان مطاعن کو اس شوق ولذت سے سنا گویا یہ حفظِ دین کیلئے نیکی اور پارسائی کا یگانہ کارنامہ تھا:

لِمِثْلِ ھٰذَا یذوبُ القلبُ مِنْ کَمَدٍ
اِنْ کانَ فِی القلبِ اِسْلامٌ وَاِیْمان

ابتلا پر ابتلا

ابتلا وآزمائش کا دور شیدو کی جنگ پر ختم نہ ہوا، بلکہ چنگلئی پہنچ جانے کے بعد بھی بدستور قائم رہا۔ سید صاحب تندرست ہو گئے، ایک طرف اکثر غازی ناسازگاریٔ آب وہوا کے باعث بیمار پڑ گئے، اور روزانہ ایک ایک، دو دو، تین تین فوت ہونے لگے، دوسری طرف معاش کی تنگی انتہا کو پہنچ گئی۔ مولوی فتح علی فرماتے ہیں کہ سیکڑوں میں سے چھ سات تندرست رہے ہوں گے، اور ان کی حالت یہ تھی کہ دن رات کا ایک ایک لمحہ بیماروں کی تیمارداری اور دوا دارو میں صرف ہونے لگا۔ سید رستم علی (ساکن چل گاؤں) اکوڑہ میں زخمی ہوئے تھے، دو اڑھائی مہینے نوشہرہ میں صاحب فراش رہے، چنگلئی پہنچنے پر

ان کی صحت پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی، تاہم تنہا چالیس بیماروں کی تیمارداری کا بوجھ اٹھالیا اور حتی المقدور کسی کو بھی ذرا سی تکلیف نہ ہونے دی۔

عسرت کا یہ حال کہ ہر شخص کو روزانہ مٹھی بھر جوار ملتی تھی، تندرست غازی اسے پیس کر روٹیاں پکاتے اور کھالیتے۔ بیماروں کے لئے پانی میں اُبال کر آش بنا دیتے۔ جب مٹھی بھر جوار بھی نہ ملتی تو یہ لوگ باہر جنگل میں نکل جاتے اور ایسی جڑی بوٹیاں تلاش کرتے یا درختوں کے ایسے پتے توڑ لاتے جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوتے اور پانی میں جوش دینے سے گل جاتے، انہیں چیزوں کو بڑی بڑی ہانڈیوں میں ابالتے اور نمک ڈال کر خود بھی کھاتے، مریضوں کو بھی کھلا دیتے۔ یہ تو غذا کی کیفیت تھی اور دوا؟ سرحد کے جنگلوں میں ایک بوٹی ہوتی ہے جسے پشتو میں ''ترکہ'' اُردو میں ''تپتیا'' اور فارسی ''سہ برگہ'' کہتے ہیں۔ ذائقے میں ذرا ترش ہوتی ہے، اسے پیس کر پانی میں پکاتے اور نمک ڈال کر مریضوں کو پلا دیتے، یہ ان خاصانِ بارگاہِ الٰہی کا ''کونین مکسچر'' تھا، جو اپنی جانیں اسلام و مسلمین کی سربلندی کے لئے قربان کر دینے کا حلف اٹھا چکے تھے۔

دل خوں شد و شرطِ جاں گدازی ایں است — در حضرت تو کمینہ بازی ایں است
بایں ہمہ ہیچ دم نمی آرم زد — شاید کہ ترا بندہ نوازی ایں است

رضا بہ قضا

لیکن سب اپنے مالک و مولا کی رضا پر دل سے صابر و شاکر تھے۔ سب کی آرزو یہ تھی کہ ''رضی اللہ عنهم و رضوا عنه'' کے مقامِ بلند سے نیچے نہ گریں۔ خدا ان سے یقیناً راضی تھا، اس لئے کہ ان کے تمام اعمال مسلکِ رضا کے عین مطابق تھے، لیکن وہ بھی خدا سے راضی تھے۔ جن حالات کو ہم تکلیف و مصیبت سے تعبیر کرتے ہیں، ان لوگوں کیلئے وہ بھی سراپا رحمت و آسودگی کا پیغام تھے، اسلئے کہ خدائے پاک نے اپنی حکمتِ بالغہ

سے ان کیلئے یہ حالات پسند فرمائے۔ رضا کا مضمون یہی ہے کہ خدا کی طرف سے جو کچھ پیش آئے اُسے خوش دلی سے قبول کیا جائے۔ حافظ نے اس مقام میں کیا خوب کہا ہے:

بہ دُرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطاف است

اہلِ صادق پور کی شانِ ایثار

اس زمانے میں جن اصحاب نے وفات پائی، ان سب کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ ان میں سے صرف دو کے نام مجھے مل سکے، ایک مولوی طالب علی، عرف طالب حسین، دوسرے عبداللہ بسم اللہ۔ مولوی طالب علی مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے چھوٹے بھائی تھے، صرف اٹھارہ انیس برس کے جوان، شیدو کی جنگ میں شریک تھے، ورمِ جگر وطحال میں مبتلا رہ کر چنگلئی میں فوت ہوئے۔ اللہ اکبر اہل صادق پور (عظیم آباد) کی شانِ ایثار فی اللہ کتنی بلند ہے، سرحد میں کہاں ان کے شہدا موجود نہیں؟ مولانا ولایت علی کے عم زاد بھائی مولوی باقر علی، سید صاحب کی جماعت کے پہلے شہید تھے، وہ اکوڑہ میں دفن ہوئے۔ ایک حقیقی بھائی مولوی طالب علی کو چنگلئی کی زمین پسند آئی، دوسرے حقیقی بھائی مولانا عنایت علی نارنجی اور منگل تھانہ میں لڑتے ہوئے ستھانہ سے اوپر چنئی کے پہاڑوں میں جا سوئے۔ خود مولانا ولایت علی ستھانہ کی مجاہد خیز خاک میں آسودۂ خواب ہیں، ان کے فرزندوں میں سے مولانا عبداللہ نگرئی میں دفن ہوئے اور مولانا عبدالکریم اسمست میں اور اخلاف واقربا خدا جانے کہاں کہاں بکھرے پڑے ہیں۔

پھر ان مردانِ حق نے علاقہ سرحد پر قناعت نہ کی بلکہ خلیج بنگال کے ان ٹاپوؤں میں بھی شہادت کے جھنڈے جا گاڑے، جنہیں عام طور پر ''کالے پانی'' کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مولانا احمد اللہ اور مولانا یحیٰی علی انڈیمان کے دو مختلف جزیروں میں سوئے

پڑے ہیں، گویا صادق پور والوں کے دل میں آرزو تھی کہ یوم النشور آئے تو حتی المقدور کوئی خطۂ ارضی ایسا نہ رہے، جہاں سے ان کے شہدا مالکِ حقیقی کی حمد و ثناء کے ترانے گاتے ہوئے نہ اٹھیں:

خیزند چوں زخاک شہیدانِ ما بہ حشر　　　در محشر آوریم دو عالم سپاہ را

عبداللہ بسم اللہ

عبداللہ بسم اللہ مخنثوں کے طائفے میں شامل تھے۔ سید صاحب کی زیارت نصیب ہوئی تو فطری سعادت کی برکت سے بیعتِ توبہ کر لی۔ پھر مرشد کا دامن ایسا تھاما کہ تا دمِ واپسیں الگ نہ ہوئے۔ شیدو کی جنگ میں شریک تھے، چنگلئی میں وفات پائی۔ راویوں کا بیان ہے کہ جوان ہی تھے:

باقلک گویم کہ آرام نگر　　　دیدۂ آغاز و انجام نگر

ضمیمہ

سید صاحب کے ساتھ جو غازی گئے تھے، ان کی تعداد میرے اندازے کے مطابق پانچ سو اور چھ سو کے درمیان تھی، ایک جماعت قندھاریوں کی راستے میں مل گئی تھی، ٹونک اور دوسرے مقامات سے بھی اِکاڈ کا غازی شامل ہو گئے تھے، ان سب کے نام معلوم نہ ہو سکے۔ دورانِ قیامِ چنگلئی میں جو غازی سید صاحب کے ساتھ تھے، ان میں سے جن جن اصحاب کے نام مولوی فتح علی عظیم آبادی کو یاد تھے، ان کی ایک فہرست انہوں نے بعد میں مرتب کر دی تھی، میں نے اُسے سامنے رکھ کر ترتیب کے ساتھ ایک نئی فہرست تیار کر دی ہے، جو ذیل میں درج ہے:

(۱) سید حمید الدین (خواہرزادہ سید صاحب)
(۲) سید حسن مثنیٰ عرف سید موسیٰ (سید احمد علی خواہرزادہ صاحب کا صاحبزادہ)
(۳) سید ابو القاسم (سید احمد علی خواہر زادہ صاحب کا صاحبزادہ)
(۴) سید ابو محمد نصیر آبادی
(۵) سید دادا ابو الحسن نصیر آبادی
(۶) سید اسماعیل رائے بریلی
(۷) شیخ عبد الرحمٰن رائے بریلی
(۸) شیخ احمد اللہ (۷ کے بھائی)
(۹) عبد الرحمٰن خاں رائے بریلی
(۱۰) محمد سعید خاں رائے بریلی
(۱۱) خدا بخش جنگی رائے بریلی
(۱۲) مہربان خاں رائے بریلی
(۱۳) دین محمد پلٹنی رائے بریلی
(۱۴) اکبر خاں رائے بریلی
(۱۵) نور داد خاں یکہ رائے بریلی
(۱۶) حافظ الٰہی بخش رائے بریلی
(۱۷) عنایت اللہ رائے بریلی
(۱۸) نور بخش جراح رائے بریلی

(۱۹) رحیم بخش رائے بریلی
(۲۰) حاجی جانی رائے بریلی
(۲۱) مولانا شاہ اسماعیل دہلوی
(۲۲) مولانا محمد یوسف پھلت
(۲۳) شیخ ولی محمد پھلت
(۲۴) میانجی محی الدین پھلت
(۲۵) سعد الدین پھلت
(۲۶) عماد الدین پھلت
(۲۷) ضیاء الدین پھلت
(۲۸) صلاح الدین پھلت
(۲۹) ناصر الدین پھلت
(۳۰) عبد الحکیم پھلت
(۳۱) عبد الواحد پھلت
(۳۲) محمد حسن پھلت
(۳۳) عبد الرؤف پھلت
(۳۴) عبد الرحمٰن پھلت
(۳۵) مولانا ولایت علی عظیم آباد
(۳۶) میر امام علی عظیم آباد
(۳۷) واجد علی عظیم آباد
(۳۸) محمدی عظیم آباد
(۳۹) سید کرامت اللہ عظیم آباد
(۴۰) حاجی ولی اللہ عظیم آباد
(۴۱) عبد الواحد عظیم آباد
(۴۲) نبی حسین عظیم آباد
(۴۳) طالب علی (برادر مولانا ولایت علی) عظیم آباد
(۴۴) مظہر علی عظیم آباد
(۴۵) عبد القادر عظیم آباد
(۴۶) عبد الرحیم عظیم آباد
(۴۷) فتح علی عظیم آباد
(۴۸) مولوی امام الدین بنگال
(۴۹) ظہور اللہ بنگال
(۵۰) لطف اللہ بنگال
(۵۱) طالب اللہ بنگال
(۵۲) فیض الدین بنگال
(۵۳) قاضی مدنی بنگال
(۵۴) مولوی محمدی انصاری (بردوانی) (میر منشی سید صاحب) بنگال
(۵۵) شکر اللہ لکھنؤ
(۵۶) امان اللہ لکھنؤ

(۵۷) قادر بخش ۱ لکھنؤ
(۵۸) قادر بخش ۲ لکھنؤ
(۵۹) عبدالکریم لکھنؤ
(۶۰) محمود خاں لکھنؤ
(۶۱) عبدالخالق غازی پور
(۶۲) کریم اللہ غازی پور
(۶۳) خدا بخش غازی پور
(۶۴) غازی خاں غازی پور
(۶۵) مظہر علی غازی پور
(۶۶) میاں گدڑی غازی پور
(۶۷) میاں لاہوری غازی پور
(۶۸) امجد علی (فرزند مولوی فرزند علی رئیس) غازی پور
(۶۹) شیخ درگاہی غازی پور
(۷۰) حاجی زین العابدین رام پور
(۷۱) نعیم خاں رام پور
(۷۲) حاجی عبداللہ رام پور
(۷۳) پیر خاں رام پور
(۷۴) میاں خدا بخش رام پور
(۷۵) میاں الٰہی بخش (برادر ۷۴) رام پور
(۷۶) رحمت خاں رام پور
(۷۷) پیر خاں مورائیں
(۷۸) عمر خاں مورائیں
(۷۹) منگل خاں مورائیں
(۸۰) عبدالجبار خاں مورائیں
(۸۱) خیریت خاں مورائیں
(۸۲) خدا بخش مورائیں
(۸۳) رمضانی خاں مورائیں
(۸۴) عبدالسبحان خاں مورائیں
(۸۵) فقیر اللہ مورائیں
(۸۶) شیخ رمضانی مورائیں
(۸۷) کریم بخش بنارس
(۸۸) احمد بنارس
(۸۹) عبدالمنان بنارس
(۹۰) خدا بخش بنارس
(۹۱) حافظ جانی پانی پت
(۹۲) حافظ مانی پانی پت
(۹۳) حافظ محب اللہ خاں پانی پت
(۹۴) دیناشاہ پانی پت
(۹۵) حافظ امام الدین پانی پت
(۹۶) پیر محمد پانی پت

(۹۷) حافظ عبدالکریم پانی پت	(۹۸) قاضی عنایت اللہ منجھاؤں
(۹۹) برہان الدین منجھاؤں	(۱۰۰) شیخ عبدالوہاب منجھاؤں
(۱۰۱) خدا بخش منجھاؤں	(۱۰۲) نور محمد فتح پور
(۱۰۳) احمد اللہ فتح پور	(۱۰۴) عبدالرحیم فتح پور
(۱۰۵) حمزہ علی خاں لوہاری	(۱۰۶) عبدالحکیم خاں لوہاری
(۱۰۷) کریم بخش گھاٹم پور	(۱۰۸) کریم بخش (وطن نامعلوم)
(۱۰۹) حاجی یوسف کشمیری	(۱۱۰) پیر خاں دکنی
(۱۱۱) شیخ منور قدوائی	(۱۱۲) مولوی امیر الدین ولایتی
(۱۱۳) سید انور شاہ امرتسری	(۱۱۴) عبداللہ احمد آبادی
(۱۱۵) فقیر اللہ احمد آبادی	(۱۱۶) شیخ عبدالرحمٰن خیر آبادی
(۱۱۷) امام الدین بمبئی	(۱۱۸) محمدی بمبئی
(۱۱۹) عبداللہ گجراتی	(۱۲۰) حاجی عبدالرحیم ولایتی
(۱۲۱) سید رستم علی چل گاؤں	(۱۲۲) کریم بخش خیاط فیض آباد
(۱۲۳) عبداللہ فیض آباد	(۱۲۴) الٰہ بخش فیض آباد
(۱۲۵) حافظ ولی محمد (وطن نامعلوم)	(۱۲۶) حافظ اللہ یار (وطن نامعلوم)
(۱۲۷) حافظ میر خاں (وطن نامعلوم)	(۱۲۸) مولوی سعد اللہ (وطن نامعلوم)
(۱۲۹) مولوی عباد اللہ (وطن نامعلوم)	(۱۳۰) عبدالرحمٰن مدراسی
(۱۳۱) بادل خاں (وطن نامعلوم)	(۱۳۲) واصل خاں (وطن نامعلوم)
(۱۳۳) ارادت خاں (وطن نامعلوم)	(۱۳۴) ابراہیم خاں (برادر ۱۳۳)
(۱۳۵) نہال خاں	(۱۳۶) مستقیم خاں
(۱۳۷) غازی الدین	(۱۳۸) شیخ امام علی

(۱۳۹) محمد حسن حنفی
(۱۴۰) لعل محمد
(۱۴۱) لکھمیر جگدیش پور
(۱۴۲) منصب خاں
(۱۴۳) شیخ رحم علی
(۱۴۴) مرزا امانت علی
(۱۴۵) عبداللہ والیا
(۱۴۶) عبدالرزاق نگرامی
(۱۴۷) نور احمد (مؤرخ اسلام) نگرامی
(۱۴۸) ابراہیم خاں
(۱۴۹) شادل خاں
(۱۵۰) میاں جی نظام الدین چشتی
(۱۵۱) ظہور اللہ (۱۵۰ کا بھائی)
(۱۵۲) نظام الدین اولیاء
(۱۵۳) حاجی رحیم بخش
(۱۵۴) شیخ حسن علی
(۱۵۵) عبدالقادر (برادر زادہ ۱۵۳)
(۱۵۶) امجد خاں گنتوی
(۱۵۷) دین محمد
(۱۵۸) عبدالقیوم
(۱۵۹) شیخ امیر اللہ تھانوی
(۱۶۰) شیخ کرامت اللہ
(۱۶۱) قنبر
(۱۶۲) نصیر الدین منگلوری
(۱۶۳) بخش اللہ خورد
(۱۶۴) سید جمعیت علی
(۱۶۵) فرجام (خادم سید صاحب)
(۱۶۶) عبدالرحیم حجام
(۱۶۷) فیض اللہ شیدی
(۱۶۸) میرزا امیر بیگ
(۱۶۹) نظام الدین خاں
(۱۷۰) سید صادق علی
(۱۷۱) شیخ بلند بخت دیوبندی
(۱۷۲) مراد خاں خورجوی
(۱۷۳) بخش اللہ خورجوی
(۱۷۴) شیخ نصر اللہ خورجوی
(۱۷۵) عبدالرحیم
(۱۷۶) مخدوم بخش
(۱۷۷) نور سندھی
(۱۷۸) رحمت خاں رام پوری
(۱۷۹) محمد حسین سہارن پوری
(۱۸۰) کریم بخش سہارن پوری

(۱۸۱) پیر محمد قاصد	(۱۸۲) لعل محمد قندھاری
(۱۸۳) ملا عزت	(۱۸۴) ملا قطب الدین ننگرہاری
(۱۸۵) ملا بازار	(۱۸۶) ملا جمعہ
(۱۸۷) خان بہادر خاں	(۱۸۸) خیر اللہ خاں غزنوی
(۱۸۹) ملا گلزار	(۱۹۰) اللہ بخش
(۱۹۱) خضر خاں	(۱۹۲) قلندر
(۱۹۳) نور محمد	(۱۹۴) محمد
(۱۹۵) ملا نور خاں	(۱۹۶) احمد
(۱۹۷) ملا علی خاں	(۱۹۸) مومن خاں
(۱۹۹) سید دین محمد	(۲۰۰) عبداللہ بسم اللہ

ان میں اکوڑہ نیز بازار وغیرہ کے شہدا شامل کر لئے جائیں تو میرے اندازے کے مطابق دو سو باون نام بنتے ہیں، باقی اصحاب کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ آگے چل کر بعض ایسے نام آئے ہیں جو اس فہرست میں نہیں ملتے اور اس وقت تک ہندوستان سے غازیوں کے قافلے نہیں آئے تھے، ممکن ہے ان لوگوں کے نام مولوی فتح علی کو یاد نہ رہے ہوں۔

اڑتیسواں باب:

بونیر وسوات کا دَورہ

دَورے کا آغاز

چنگلئی میں سید صاحب تقریباً ایک مہینا ٹھہرے رہے، پھر دعوتِ جہاد کی غرض سے بونیر وسوات کے دورے کا ارادہ فرمایا۔ بیمار غازیوں کی دیکھ بھال کا کام شیخ ولی محمد پھلتی کے حوالے کیا اور فرمایا کہ جو بھائی تندرست ہوتے جائیں، انہیں ہمارے پاس بھیجتے جائیں۔ خود غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ بونیر کی جانب روانہ ہوئے۔(۱) چنگلئی اور وادیٔ چملہ کے درمیان ایک بلند پہاڑ ہے، اس کی چوٹی پر پہنچے تو ننگے سر ہو کر دیر تک دعاء میں مشغول رہے، پھر فرمایا: امید ہے بارگاہِ باری تعالیٰ میں ہماری دعاء قبول ہو اور تکلیف دور ہو جائے۔

پہاڑ سے اُتر کر ظہر کے وقت کوگا پہنچے، جو درۂ امبیلہ کے قریب وادیٔ چملہ کا ایک مشہور گاؤں ہے، اور وادی کے جنوبی ومغربی گوشے میں واقع ہے۔ امبیلہ وادی کے شمالی ومغربی گوشے میں کوگا سے تین چار میل کے فاصلے پر ہوگا، اتنی ہی دور ناواگئی ہے، جو پہلے بھی ممتاز مقام تھا، آج کل چملہ تحصیل کا مستقر ہے۔

میرا خیال ہے کہ دورہ شروع کرنے سے پیشتر چملہ اور بونیر کے اکابر کو پیغامات بھیج دیئے گئے ہوں گے، اسلئے کہ ناواگئی سے سید حسن رسول ایک بڑی جماعت کے ساتھ سید صاحب کی زیارت کیلئے کوگا پہنچ گئے اور بیعت کا شرف حاصل کیا۔ رات وہیں ٹھہرے،

(۱) میرے اندازے کے مطابق یہ سفر اوائل اپریل میں شروع ہوا ہوگا، رمضان شریف کا مہینہ تھا۔

انہوں نے بیان کیا کہ ہماری بستی (ناواگئی) میں محب اللہ خاں نام ایک مجذوب رہتا ہے جس نے کبھی لباس نہیں پہنا، آج صبح لوگوں نے دیکھا کہ مسجد کا بوریا لے کر اس نے تہمد کے طور پر لپیٹ لیا، لوگوں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا: آج اس ضلع میں ایک ''آدمی'' آرہا ہے۔ مجھے اندیشہ ہوا مبادا وہ اچانک پہنچ جائے، مجھے برہنہ دیکھ لے تو بڑی ندامت ہوگی۔ لوگوں نے کہا: کیا ہم آدمی نہیں ہیں؟ جواب ملا: تم میں ویسا آدمی کوئی نہیں۔

کوگا میں سید صاحب چار روز ٹھہرے۔ گردونواح سے خوانین ورؤسا برابر ملنے کیلئے آتے رہے۔ کھانے کا یہ طور تھا کہ جو شخص سید صاحب کو دعوتِ طعام دیتا تو عرض کر دیتا کہ اتنے آدمی ساتھ لائیے، باقی غازیوں کو بستی کے لوگ چار چار پانچ پانچ کی تعداد میں اپنے ساتھ لیجاتے، مہمانوں کیلئے چارپائیاں اور بستر بھی میزبان ہی مہیا کرتے۔ (۱)

تختہ بند

کوگا سے بونیر جانے کا راستہ امبیلہ کے پاس سے ہے، وادیٔ چملہ کی شمالی حد گڑو پہاڑ ہے، اسے عبور کر لیا جائے تو بونیر شروع ہو جاتا ہے۔ بونیر میں پہلا مقام دامن کوہ کی ایک بستی میں ہوا، جس کا نام راوی کو یاد نہ رہا، وہیں سید میاں ساکن تختہ بند آگئے اور عرض کیا کہ ہمارے ہاں بستی بستی کی پتنہ داری ہے، اور کوئی شخص دوسری پتنہ داری میں جا نہیں سکتا، کوگا چونکہ میری پتنہ داری سے باہر ہے، اس لئے میں آنہ سکا۔

دوسرے روز سید میاں آپ کو تختہ بند لے گئے، وہاں بھی آپ چار روز ٹھہرے

(۱) سرحد میں اب بھی مہمانداری کا یہی دستور ہے، اکا دکا مہمانوں کی تواضع کے لئے باریاں مقرر ہیں، کوئی مہمان آجائے، باری والا شخص خود اس کے پاس پہنچ کر طعام وقیام کا بندوبست کرے گا۔ زیادہ مہمان آجائیں گے تو دعوت اجتماعی صورت اختیار کر لے گی۔ میں نے تو یہ دیکھا کہ کھانے کے وقت آپ کسی گاؤں میں پہنچ جائیں، غیر ممکن ہے کہ جو لوگ راستے میں ملیں وہ کھانے پر اصرار نہ کریں۔ چملہ، بونیر اور سوات میں یہ دستور دیکھا کہ صبح کی چائے کے ساتھ ہر مہمان کیلئے ایک بُھنا ہوا مرغ اور ایک پراٹھا ضرور آتا ہے، خواہ میزبان غریب ہو یا امیر، ممکن ہے سید صاحب کے زمانے میں بھی یہی دستور ہو۔

رہے، ملحقہ علاقے کے خوانین وعوام نے بیعت کی۔(۱) سب نے اقرار کیا کہ ہم جان ومال سے آپ کے فرمانبردار ہیں، جو آپ فرمائیں گے بسر وچشم اسے بجالائیں گے۔ مولوی فتح علی بیان کرتے ہیں کہ خوانین اور روسا کے آجانے سے کھانا کھانے والوں کی تعداد پانچ چھ سو پر پہنچ گئی تھی، سید میاں نے چاروں دن تنہا پوری جمعیت کی مہمانداری کی۔ سرحد آزاد کے دساتیر میں سے ایک عجیب وغریب دستور یہ بھی تھا کہ سادات کی بستی میں کوئی خان نہیں رہتا تھا اور کتنے ہی مہمان آجائیں، سادات کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص انہیں کھانا کھلانے کا مجاز نہ تھا۔

پتنہ داری یعنی گروہ بندی اس علاقے کی سب سے بڑی مصیبت تھی۔ سید صاحب نے اپنے دل میں یہ فیصلہ فرمالیا تھا کہ اس مصیبت کو ہر جگہ سے دور کریں گے، چنانچہ سید میاں سے کہا کہ جب ہم سوات کے دورے سے واپس آئیں گے تو انشاء اللہ سب گروہوں کے درمیان صلح کرادیں گے۔

الئی، تورسک اور جوڑ

مولانا شاہ اسماعیل اور شیخ سعد الدین پھلتی تختہ بند میں بیمار ہو گئے، سید صاحب نے انہیں بحالئ صحت کیلئے وہیں چھوڑ دیا اور خود علاقہ سوات کا رُخ کرلیا۔ تختہ بند سے نکل کر آپ نے ایک مقام الئی میں کیا، جو بالا بونیر میں سالارزئی قبیلے کا بڑا گاؤں ہے، یہاں اس زمانے میں تین مسجدیں تھیں اور ان کے ساتھ تین حجرے تھے۔ نواب امیر خاں والئ ٹونک کے اجداد اسی علاقے کے رہنے والے تھے، جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ نواب سید صاحب کے عقیدت مندوں میں ہے تو بہت خوش ہوئے، زیادہ گرمجوشی سے عقیدت کا اظہار کرنے لگے۔ الئی سے تورسک کے لوگ بہ اصرار لے گئے، ایک رات ان کے

(۱) ''وقائع'' میں ہے کہ سید میاں اور ان کی برادری والوں کے علاوہ دواڑھائی سو آدمیوں نے بیعت کی۔

ہاں ٹھہرے، اسی طرح ایک رات جوڑ میں قیام کیا۔(۱)

جوڑ سے نکلے تو کوہ کڑا کڑ آ گیا جو سوات اور بونیر کے درمیان حدِ فاصل ہے، اور بڑا دشوار گزار پہاڑ ہے۔ اس کی چوٹی پر پہنچ جائیں تو دونوں طرف بونیر و سوات کی بستیاں دور دور تک نظر آتی ہیں، کڑا کڑ سے سوات کی جانب اُترتے ہی ایک بستی ملتی ہے، جس کا نام ناوا گئی ہے۔ راویوں نے اسے ''شافعیوں کی بستی'' لکھا ہے، غالباً اس لئے کہ سوات یا سرحد میں یہی ایک بستی ہے، جس میں شافعی رہتے ہیں۔

بری کوٹ، تھانہ اور چکدرہ

سید صاحب نے ناوا گئی میں قیام نہ فرمایا اور سیدھے بری کوٹ (۲) تشریف لے گئے۔ معلوم نہیں وہاں ایک رات ٹھہرے یا زیادہ، اس مقام پر حاجی ولی اللہ رحیم بخش بیمار ہو گئے۔ سید صاحب نے انہیں خان بری کوٹ کے پاس چھوڑا اور خود تھانہ (۳) تشریف لے گئے، اس جگہ دو مقام کیے، پھر دریا سے سوات کو عبور کر کے چکدرہ (۴) چلے گئے جو تھانہ سے جنوب مشرق میں دریا کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ اس جگہ بھی دو ہی روز قیام کیا، ان تمام مقامات پر عوام و خواص میں سے کثیر تعداد نے بیعت کی، ہر شخص یہی اقرار کرتا کہ خدا کی راہ میں جہاد کیلئے ہمہ تن حاضر ہوں۔

سید صاحب چکدرہ ہی میں تھے کہ سید گل بادشاہ پشاوری نے ایک جھپان آپ کی

(۱) میں نے یہ مقام دیکھے ہیں۔ بڑے بڑے گاؤں ہیں۔ مکان سب مٹی کے ہیں۔ میں جس زمانے میں گیا، گرمی کا موسم تھا، فصلیں کٹ چکی تھیں اور کھیت خالی پڑے تھے۔ اس لئے منظر بے رونق سا تھا، لیکن کھیتوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ فصل خوب ہوتی ہے۔ جَـوڑ (جیم مفتوح، واؤ مشدد مضموم) کو وقائع میں جوہڑ لکھا ہے۔ صحیح تلفظ وہی ہے جو میں نے اختیار کیا۔

(۲) بری کوٹ آج کل سوات میں غلے کی بہت بڑی منڈی ہے (پرگنہ اما خیل سوات)۔

(۳) تھانہ پہلے علاقہ سوات میں شامل تھا (پرگنہ خان خیل) آج کل یاغستان میں ہے۔ بہت بڑا مقام ہے۔

(۴) منظورہ اور وقائع میں اسے ''چک دراز'' لکھا ہے، ممکن ہے اصل نام یہی ہو، کثرتِ استعمال سے چکدرہ رہ گیا ہو۔

سواری کے لئے بھیج دیا۔ سید گل بادشاہ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سید صاحب دورے پر نکل پڑے ہیں اور فلاں وقت تک سوات پہنچ جائیں گے۔ جھپان کے ساتھ چار کہار تھے، چاروں کو سید گل بادشاہ نے دو مہینے کی تنخواہ اپنے پاس سے دیکر تاکید کر دی تھی کہ دو وقت کے کھانے کے سوا سید صاحب پر کوئی بوجھ نہ ڈالا جائے، دورۂ سوات میں جھپان سید صاحب کے ساتھ رہا۔

نمازِ عید

چکدرہ سے سید صاحب اوچ (۱) تشریف لے گئے، اس لئے کہ وہاں کے سیدوں نے ایک وفد چکدرہ بھیج دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ سید صاحب کو ساتھ لے آئیں۔ سید عبدالقیوم نے بڑے اہتمام سے دعوت کی اور دوسرے ہدایا کے علاوہ ایک بھینسا سید صاحب کی نذر کیا، جو اتنے غیر معمولی ڈیل ڈول کا تھا اور اس درجہ موٹا تازہ تھا کہ ہاتھی کا بچہ معلوم ہوتا تھا۔ اسی مقام پر مولوی محمد یوسف پھلتی بیمار ہوئے، جو سید صاحب کے خزینہ دار، معتمد خاص اور لشکر اسلام کی رسد کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اونچ میں کوٹی گرام کے سادات کی طرف سے دعوت پہنچ چکی تھی، سید صاحب ادھر روانہ ہوئے تو مولوی محمد یوسف پھلتی کو جھپان پر سوار کر کے ساتھ لے لیا۔

کوٹی گرام میں چار روز قیام کیا، لیکن اس طرح کہ دن کے وقت آس پاس کی بستیوں میں تشریف لے جاتے، رات کوٹی گرام میں گزارتے۔ اسی جگہ عید الفطر ۱۲۴۲ھ (۲۷ اپریل ۱۸۲۷ء) کا چاند دیکھا اور نماز عید کوٹی گرام ہی میں ادا فرمائی۔ ہجرت کے بعد پہلی عید الفطر پالی اور اور عمر کوٹ کے درمیان ہوئی تھی، دوسری علاقہ سوات میں۔ ذرا

(۱) اوچ دو ہیں، جنہیں عام بول چال میں ''اوچوں'' یا ''وچوں'' (بہ حذف الف) (پرگنہ اون زئی) کہتے ہیں۔ دونوں پاس پاس ہیں، سید صاحب پہلے ایک بستی میں ٹھہرے تھے پھر کوٹی گرام ہوتے ہوئے بر سوات (سوات بالا) کی طرف گئے تو جاتے جاتے دوسری بستی میں ٹھہرے۔

نقشے پر ایک نظر ڈالئے کہ کہاں رائے بریلی ہے کہاں مارواڑ کے ریگ زار کا مغربی حصہ اور کہاں سوات۔ وطن و مرز بوم کی محبت سے کس انسان کا دل خالی ہوتا ہے؟ لیکن جن داعیانِ حق کو خدائے عز و جل اپنی خوشنودی و رضا کے مسلک پر قیام و ثبات کی توفیق عطا فرماتا ہے، ان کی نظروں میں دنیا کا ہر محبوب رشتہ مالکِ حقیقی کی رضا کے سامنے تنکے سے زیادہ بے حقیقت اور خاک کی چٹکی سے زیادہ بے وقعت رہ جاتا ہے۔ وطنیت کا رشتہ و محبت جب مالک الملک کی رضا کے تابع ہو جائے تو اسی وقت انسان کے سازِ وجود سے یہ دلکش ترانہ اٹھتا ہے کہ ؂

ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

کوٹی گرام ہی میں ہندوستان سے غازیوں کا پہلا قافلہ پہنچا، جس کے قافلہ سالار مولوی قلندر تھے۔ چونکہ ساتھیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی، اس لئے سید صاحب نے انہیں کئی جماعتوں میں تقسیم کر کے مختلف بستیوں میں بھیج دیا تھا، تاکہ ایک ہی مقام پر سب کی مہمانداری کا بوجھ نہ پڑے۔ اس وقت تک مولانا شاہ اسماعیل بھی تندرست ہو کر تختہ بند سے سوات پہنچ گئے تھے۔

عید کے بعد ایک روز سید صاحب کوٹی گرام میں ٹھہرے رہے تو تیسرے دن برسوات (سوات بالا) کے قصد سے نکلے اور پہلا مقام اوچ کی دوسری بستی میں کیا، پھر ایک اور موضع میں پہنچے جس کا نام معلوم نہ ہو سکا، وہاں قاضی احمد اللہ میرٹھی کا قافلہ سید صاحب سے آملا۔

مولوی محمد یوسف کی وفات

مولوی محمد یوسف پھلتی باوجود علالت ساتھ تھے، نہ ان کو سید صاحب سے مفارقت گوارا تھی اور نہ سید صاحب انہیں الگ رکھنا پسند فرماتے تھے۔ ان کی علالت روز بروز

بڑھتی گئی، سید صاحب جہاں جاتے وہاں دعوتِ جہاد اور اصلاحِ عقائد و اعمال کے علاوہ مختلف گروہوں کے اختلافات مٹانے کا خاص خیال رکھتے تھے۔ اوچ سے نکلے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک موضع کے لوگوں نے آپ کو روک لیا اور عرض کیا کہ ساتھ کے گاؤں والوں سے ہماری کشمکش چلی آ رہی ہے، آپ صلح کرا دیں۔

سید صاحب کے زیادہ تر ساتھی آگے کے ایک بڑے گاؤں میں پہنچ گئے، سید صاحب مسجد میں بیٹھ گئے اور اخوند ظہور اللہ کے ذریعے سے دوسرے گاؤں کے لوگوں کو بلا کر صلح کی بات چیت شروع کر دی، اسی حالت میں میاں دین محمد نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ مولوی محمد یوسف بڑی تکلیف میں ہیں۔ سید صاحب نے فرمایا: بھائی! بارگاہِ الٰہی میں دعاء کیجئے اور ان کی خدمت میں حاضر رہئے۔

مجمع میں پاس کے گاؤں کا ایک آدمی بھی موجود تھا، اس نے کہا کہ ہمارے ہاں دو تین آدمی طبابت کرتے ہیں، مولوی صاحب کو ان کے ہاں بھیج دیجئے۔ سید صاحب بولے: ''صحت و بیماری اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔'' لوگوں نے کہا کہ علاج کرانا ضروری ہے، اجازت دیجئے کہ مولوی صاحب کی چار پائی کو اٹھا کر اس گاؤں میں لے جائیں۔ سید صاحب نے اجازت دے دی، میاں عبدالقیوم بھی ساتھ گئے۔

راوی بیان کرتے ہیں کہ مولوی صاحب نے بیماری کی شدت کے عالم میں کہا کہ میرا دل نان پیاز کھانے کو چاہتا ہے اور تھوڑی سا دہی بھی لاؤ، تیمارداروں نے عرض کیا کہ کھچڑی تیار ہے اور آپ کو کھچڑی ہی کھانی چاہئے۔ مولوی صاحب بولے کہ میں تو صرف نان پیاز کھاؤں گا، چنانچہ یہ غذا دے دی گئی۔

جب ان کی چار پائی پاس کے گاؤں میں پہنچی تو طبیعت اس درجہ بگڑ گئی کہ بظاہر جانبری کی کوئی امید نہ رہی، اس حالت میں طبیب کیا کرتے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ اب جس طور بھی ممکن ہو، مجھے جلد سے جلد حضرت کی خدمت میں پہنچاؤ تا کہ جان دینے

سے پہلے ان کی زیارت کا شرف حاصل کرلوں۔ اس وقت چارپائی اٹھانے والے آدمیوں کی تلاش شروع ہوگئی، فصل کے درو کا موسم تھا، لوگ باہر کھیتوں میں تھے، ان کے آنے میں دیر ہوگئی، مولوی صاحب نزع کی حالت کو پہنچ گئے، فرمایا: مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ سہارا دے بٹھا دیا گیا، اسی حالت میں اس پاک نفس مجاہد کی رُوح عالمِ علوی میں پہنچ گئی۔

قطبِ لشکرِ اسلام

امجد خاں گنتوی کا بیان ہے کہ سید رستم علی چل گانوی گھوڑے پر سوار ہوکر یہ دردناک خبر سید صاحب کے پاس لائے، آپ اس وقت تک مسجد میں بیٹھے تھے۔ سنتے ہی اناللہ پڑھا، تھوری دیر خاموش رہے، پھر فرمایا:

> یہ دنیا بڑی سخت جگہ ہے، جو یہاں سے ثابت قدم گیا وہی خوش نصیب ہے۔

یہ اشارہ تھا کہ مولوی محمد یوسف صاحب اس دنیا سے ثابت قدم گئے۔ سید صاحب دیر تک مولوی صاحب کے اوصاف بیان فرماتے رہے، اہل پھلت میں سے شیخ ضیاء الدین، شیخ صلاح الدین، شیخ عبدالحکیم، شیخ ناصر الدین، حافظ ناصر الدین اور حافظ عبدالرحمٰن کو میت لانے کیلئے بھیجا گیا، اہل سرحد مردوں کو عموماً ان قبرستانوں میں دفن کرنا افضل سمجھتے تھے جہاں کسی مشہور بزرگ کی قبر ہوتی تھی۔ عرض کیا کہ مولوی صاحب کو یہیں دفن کرنے کی اجازت دیجئے، سید صاحب نے فرمایا کہ ہمارے مولوی صاحب خود ولی اللہ تھے، ان کی میت لے آیئے۔

میت آئی، قاضی احمد اللہ نے غسل وکفن کا انتظام کیا، سید صاحب نے جنازے کی نماز پڑھائی، پھر مولانا شاہ اسماعیل سے مخاطب ہوکر فرمایا:

> یوسف جی اس لشکر اسلام کے قطب تھے، آج لشکر قطب سے خالی ہوگیا۔ وہ بڑے قانع، زاہد، متوکل، مستقیم الحال اور مستقل مزاج تھے۔

یہ الفاظ زبان مبارک پر جاری تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سید صاحب اور شاہ اسماعیل نے لشکر اسلام کے اس مایۂ ناز وجود کی میت لحد میں اتاری۔(۱)

(۱) تمام سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ مولوی محمد یوسف کا انتقال کوٹی گرام میں ہوا، جو دیر و چترال والی سڑک پر ملاکنڈ سے پندرہ میل آگے ہے، یہ صحیح نہیں۔ مولوی صاحب ایک چھوٹے سے گاؤں میں فوت ہوئے (منظورہ میں ہے "درہ وخورد") اور دوسرے چھوٹے سے گاؤں میں دفن ہوئے، جو اوچ اور بھانڈہ کے درمیان ہوگا۔ کوٹی گرام کا نام اس سلسلے میں خدا جانے کس طرح مشہور ہو گیا؟

مولوی محمد یوسف حقیقتاً بڑے بلند پایہ بزرگ تھے، ان کے مفصل حالات بیان کرنے کا یہ محل نہیں۔(۲) مولانا عبدالحیؒ اور مولانا اسماعیل سے پیشتر بیعت کی تھی۔ "منظورہ" میں ہے کہ ان کا مرتبہ دونوں صاحبوں سے بلند تھا، دونوں کی آرزو تھی کہ ہمیں بھی مولوی محمد یوسف کا مقام نصیب ہو۔ رمضان میں ہر روز ایک مرتبہ قرآن شریف ضرور ختم کر لیتے۔ کچھ حصہ تراویح میں سناتے اور باقی تہجد میں پڑھتے، ویسے بھی قضائے حوائج بشریہ کے سوا قرآن ہر وقت ان کی زبان پر جاری رہتا تھا۔

برسوات کا دورہ

جس موضع میں مولوی محمد یوسف کو دفن کیا گیا، اسی میں عبدالحمید خاں، شیر خاں، رستم خاں، شیخ رمضان اور شیخ لکھو کا قافلہ سید صاحب کے پاس پہنچا۔ سید صاحب وہاں سے نکلے تو ایک رات بھانڈہ میں گزاری، وہاں منگورہ (۲) کے اخوند میر پہنچ گئے، سید صاحب کو منگورہ میں لے آئے، اور تین روز اپنے پاس رکھا۔ اسی جگہ نذر محمد اور ولی محمد کشمیری ملے، جو پہلے یار محمد خاں کے پاس ملازم تھے۔ سید صاحب کو انہیں کے ذریعہ سے زہر دیا گیا تھا۔ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ سید صاحب نے دو مرتبہ انہیں سزائے قتل سے بچایا،

(۱) یہ حالات آپ کو اس کتاب کے تیسرے حصے میں ملیں گے۔

(۲) بھانڈہ دریائے سوات کے مغربی کنارے پر پرگنہ نکپی خیل میں ہے، اور منگورہ مغربی کنارے پر پرگنہ بابوزئی میں۔ یہی مقام آج کل سوات کا مرکزی مقام ہے، اس سے قریب ہی سیدو میں والیٔ سوات رہتا ہے۔

رخصت کے وقت اخوند میر نے دو سیاہ لنگیاں ریشمی کنارے کی اور ایک سبز گھوڑا اور ہزار روپیہ بطور نذر پیش کیا۔ سید صاحب نے ایک لنگی اور گھوڑا قاضی مدنی کو دیدیا۔

منگورہ سے روانہ ہوئے تو ایک رات منگلور (پرگنہ بابوزئی) میں گزاری، دوسرے روز چار باغ (پرگنہ متوڑزئی) میں پہنچے۔ چار باغ آج کل بھی بڑا قصبہ ہے۔ سید صاحب کے زمانے میں بھی آبادی خاصی وسیع تھی۔ مسجدیں نہایت اچھی، سایہ دار درختوں کی قطاریں اور نہریں۔ اہل قصبہ نے نقاروں سے سید صاحب کا استقبال کیا۔ مجاہدین مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مختلف اصحاب نے ایک ایک گروہ کی میزبانی سنبھالی۔ چار باغ والے چاہتے تھے کہ سید صاحب ایک مہینہ ان کے ہاں گزاریں، لیکن سید صاحب تین دن سے زیادہ وقت نہ نکال سکے۔

چار باغ سے گلی باغ گئے۔ اس وقت لوگوں کے ذوقِ عقیدت کا یہ رنگ تھا کہ ایک ایک وقت میں کئی کئی مقامات سے دعوت نامے آجاتے تھے، بلکہ لے جانے کے لئے جماعتیں پہنچ جاتی تھیں۔ سید صاحب چار باغ ہی میں تھے کہ ایک بستی کے لوگ عہد لے گئے کہ آپ گلی باغ جائیں گے تو ان کے ہاں قدوم فرمائیں گے۔ سید صاحب خود تو نہ جاسکے، لیکن اپنے بھانجے سید حمید الدین، شیخ جلال الدین (برادر عم زاد مولانا عبدالحئیؒ اور مولوی عبدالقیوم، صاحبزادہ مولانا عبدالحئیؒ) کو بھیج دیا۔ چند آدمی ساتھ کردیے۔ گلی باغ والوں نے سوا کوس باہر نکل کر استقبال کیا اور اس شان سے گاؤں میں لے گئے کہ آپ کی سواری کے آگے آگے لوگ پشتو زبان میں مدحیہ اشعار گاتے جاتے تھے، یہاں دو راتیں بسر کیں۔ ایک روز نمازِ عشاء کے بعد آپ لیٹے ہوئے تھے، ساتھیوں نے علماءِ ہند کا ذکر شروع کردیا، سید صاحب نے فرمایا: ہمیں مولانا عبدالحئیؒ کی ملاقات کا بڑا اشتیاق ہے، خدا چاہے تو عنقریب ان سے اسی ملک میں ملاقات ہوگی۔

گلی باغ سے آپ نے خونہ کا قصد فرمایا۔ راستے میں خواجہ خیل کے لوگوں نے

باصرار روک لیا۔ اس بستی کے لوگوں نے آپ سے سلیمان شاہ والیٔ کاشکار (۱) کا ذکر کیا کہ وہ بڑا دیندار ہے، اور اس کے دل میں جہاد کا بے پناہ جذبہ موجود ہے۔ یہ بھی کہا کہ آپ اس کے پاس تشریف لے جائیں تو بہت اچھا ہو۔ خواجہ خیل سے خونہ گئے، وہاں کے پیرزادوں نے پر جوش استقبال کیا، سید صاحب کو اپنے مکان میں اُتارا، باقی سب غازی خانقاہ میں ٹھہرے۔ وہیں سے آپ نے غور و مشورہ کے بعد اخوند فیض محمد کو سفیر بنا کر سلیمان شاہ کے پاس بھیجا۔ ایک نہایت نفیس قلمی قرآن مجید، ایک جوڑی پستول اور ایک قیمتی پیش قبض بطور تحائف دیدیے۔

خونہ سے نکلے تو اشالہ (۲)، درشت خیل (۳) اور بھانڈہ ہوتے ہوئے چار باغ پہنچ گئے، اس سلسلے میں خنجرہ اور شکردرہ کے نام بھی ملتے ہیں۔

---

(۱) کاشکار سے مراد چترال ہے، اس لفظ کا املا مختلف ہے، مثلاً: کاشکار، کاشقار، قاشقار اور کاس گار۔ وجہ تسمیہ کے بارے میں مختلف روایتیں ہیں، مثلاً کاش، ایک دیو تھا جو اس جگہ رہتا تھا، چونکہ چترال کی حیثیت بلند پہاڑوں کے درمیان ایک غار کی سی ہے، اس لئے ملک کا نام کاش غار پڑ گیا۔ یا کاس بمعنی پیالہ، گار بمعنی برف، چونکہ یہاں برف زیادہ پڑتی ہے، اسلئے یہ نام مشہور ہوا۔ موجودہ چترال کے قریب اب تک کاشکار نام ایک بستی کا ذکر نقشوں میں ملتا ہے، چترال کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ اصل لفظ چترار ''تھا'' چتر چترالی زبان میں چمن کو کہتے ہیں۔ چترار بہ معنی چمن زار۔ چونکہ راویوں نے اس کا نام کاش غار سنا تھا، اس لئے بیان کرتے وقت کبھی کبھی کاشغر بھی بولتے رہے، عام لوگوں نے اسے معروف کاشغر سمجھ لیا، جو یارقند کے پاس ہے۔ غلط فہمی اس حد تک پہنچ گئی کہ مولانا سید ابوالحسن علی کے بیان کے مطابق سید صاحب کی چھوٹی بی بی کے اخلاف بھی اپنے مادری سلسلے کو معروف کاشغر ہی کی طرف منسوب کرتے رہے۔ بی بی صاحب نے بھی کبھی کاش غار اور کاشغر میں فرق واضح نہ فرمایا، ہوسکتا ہے انہیں علم ہی نہ ہو کہ یہ مختلف خطے ہیں۔

(۲) اشالہ، فتح پور اور خواجہ خیل کے درمیان ہے۔

(۳) درشت خیل یا درش خیل دو ہیں، ایک بالا (بر) دوسرا زیریں (کز)۔ اس علاقے میں غلے کی ارزانی کا یہ حال تھا کہ ایک روز امجد علی خاں نے ایک پیسے کا آٹا خریدا تو سوات کے اوزان کے مطابق سات سیر ملا، جو ہمارے اوزان کے مطابق ساڑھے تین سیر تھا۔ ایک روپے کے پیسے اڑتالیس ملتے تھے، یعنی ایک روپے کا آٹا خریدا جاتا تو ہمارے حساب سے چار من آٹھ سیر ملتا۔

سفرِ مراجعت

چار باغ میں پہنچے تو خبر ملی کہ مولانا عبدالحئی چکدرہ آگئے ہیں، سید صاحب نے اپنی سواری کا جھپان ان کیلئے بھیج دیا، پھر خود کنارِ دریا تک استقبال کیلئے آئے۔ معانقے کے بعد مولانا نے آپ کا ہاتھ چوما، چار باغ ہی میں ذی الحجہ کا چاند دیکھا، اس وقت ارادہ فرمالیا کہ عید کی نماز چنگلئی میں ادا کریں۔

چار باغ سے نکلے تو ایک رات منگورہ میں بسر کی، وہاں دو رئیسوں نے کھانا تیار کرالیا اور ہر ایک کو اصرار تھا کہ سید صاحب پہلے اس کے ہاں کھانا کھائیں، آپ نے دونوں کے مکانوں کے درمیان ایک جگہ تجویز کر کے دونوں کے ہاں سے کھانا منگالیا، اس طرح تقدم وتاخر کا جھگڑا ختم کیا۔ منگورہ سے آپ ہوڈی گرام (۱) پہنچے، اسی جگہ میں میاں مقیم رام پوری کا قافلہ ملا، بعد کی منزلیں یہ ہیں:

۱۔ ناواگئی یعنی شافعیوں کی بستی دامن کڑاکڑ میں۔

۲۔ جَوڑ.

۳۔ تورسک کے راستے باچا جہاں آپ نے سید علی ترمذی غوث بونیر کے مزار کی زیارت کی۔ اس کے اردگرد کمر سے اونچی سنگین دیوار تھی، صحن میں زیتون کے درخت تھے، سید صاحب نے بعد میں فرمایا کہ یہ بڑے رتبے والے بزرگ اور صاحب ہدایت تھے، ان کی روح سے ملاقات ہوئی، کمالِ محبت واخلاص سے میرا ہاتھ پکڑا اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا۔ (۲)

---

(۱) اصل نام غالباً اودے گرام تھا۔

(۲) سید علی ترمذی غوث بونیر بابر کے عزیزوں میں تھے۔ جنگ پانی پت کے بعد امیری چھوڑ کر فقیر ہو گئے، سرحد میں تبلیغ واشاعتِ اسلام کے لئے زندگی وقف فرمادی۔ انہیں کی کوششوں سے اہل سرحد میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ ہوئی۔ کنٹر (افغانستان) سے وادئ کاغان تک زیادہ تر سادات آپ ہی کے اخلاف ...... باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر

۴۔ باچا سے شل بانڈی گئے، جہاں سید عبدالوہاب عرف عبدل بابا(۱) کے مزار پر فاتحہ خوانی کی، اس روز ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ تھی (۲؍ جولائی ۱۸۲۷ء) رات وہاں نہ رہے، خان کے اصرار پر دوپہر کا کھانا کھایا۔

۵۔ برندوندی کو عبور کر کے تختہ بند پہنچے، یاد ہوگا کہ جاتے وقت مولانا اسماعیل اور شیخ سعد الدین کو بوجہ علالت تختہ بند میں چھوڑ گئے تھے۔ مولانا تو صحت یاب ہو کر سوات میں سید صاحب سے جا ملے، سعد الدین کی طبیعت بحال نہ ہوئی، انہوں نے سید صاحب کی غیر حاضری میں تختہ بند ہی میں وفات پائی۔

۸؍ ذی الحجہ کی رات کوگا میں گزاری، جہاں سید حسن رسول بھی پانچ سات آدمی لے کر ملاقات کے لئے آ گئے تھے۔

۹؍ کی صبح کو کوگا سے چلے، ظہر کی نماز پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر ادا کی اور دیر تک دعاء میں مشغول رہے۔ وہیں شیخ ولی محمد پھلتی، مولوی الٰہی بخش رام پوری، شیخ نظام الدین اولیاء اور چنگلئی کے بعض دوسرے غازیوں نے شرفِ زیارت حاصل کیا۔ فتح خاں استقبال کے لئے بستی سے سوا کوس باہر پہنچا ہوا تھا، شام تک آپ پنجتار پہنچ گئے۔

اس دورے کے نتائج و برکات کی سرسری کیفیت کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ سید صاحب جہاں جہاں گئے لوگوں کے دینی ذوق میں تازگی و بالیدگی پیدا ہوگئی۔ ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح و درستی کا بندوبست ہوگیا، ان میں اسلامی مقاصد کیلئے سعی وجہد کا جذبہ جاری وساری ہوگیا۔ نئی زندگی آ گئی جس میں اسلامیت سب سے بڑھ کر

گذشتہ صفحہ کا بقیہ حاشیہ...... میں سے ہیں۔ آپ کے صرف ایک فرزند تھے، ساداتِ ستھانہ انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔ سید جمال الدین افغانی بھی اسی خاندان میں سے تھے، مفصل حالات میری کتاب ''تاریخ ساداتِ ستھانہ'' میں ملیں گے۔ باچا بادشاہ کا پشتو تلفظ ہے، سید علی کا مزار جس جگہ ہے، اس کا نام ابتدا میں غالباً مزارِ سید بادشاہ ہوگا، بول چال میں باچارہ ہوگیا۔

(۱) سید عبدالوہاب عرف عبدل بابا سید علی ترمذی کے پوتے تھے۔

نمایاں تھی۔ وہ مختلف گروہوں میں منقسم اور پتنہ داریوں میں مبتلا تھے، سید صاحب نے ان کے لئے قومیتِ صالحہ کا سانچا تیار کر دیا، دشمنیاں مٹ گئیں اور وہ بھائی بھائی بن گئے۔ ان کی جو قوتیں باہمی رزم و پیکار میں صرف ہو رہی تھیں، ان میں ایک مرکز کے تابع ہو کر بلند اسلامی اغراض کیلئے کارکردگی کی صلاحیت اُبھر آئی۔ خود سید صاحب میاں یقین اللہ شاہ لکھنوی کو جنگِ شیدو کا مجمل حال سناتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اس حادثے کے بعد فقیر نے یوسف زئی کے مختلف اضلاع مثلاً چملہ، بونیر اور سوات کا دورہ کیا اور ان بستیوں کے مومنوں اور مسلمانوں کو بالمشافہ اقامتِ جہاد وازالۂ فساد کی ترغیب دی۔ افغانوں کے متعدد گروہوں مثلاً آفریدیوں، مہمندوں، خلیلوں وغیرہ کو تحریری دعوت نامے بھیج کر اس سعادت عظمٰی کے حصول اور اس عبادتِ کبریٰ کی بجا آوری پر متوجہ کیا۔ الحمدللہ مومنین صادقین نے اس دعوت کو قبول کر لیا............

پھر فرماتے ہیں کہ انشاء اللہ چند روز میں اہل کفر وضلال کے ساتھ قتال شروع ہوگا اور خدا کے فضل سے قوی امید ہے کہ دینِ حق تمام ادیانِ باطلہ پر غالب آئے گا۔ آپ منافقوں کی بے بنیاد باتوں کا اعتبار نہ کریں اور جمعیتِ خاطر سے دین کی نصرت کے لئے دعاء کرتے رہیں۔

> ہر چند ہر کام میں فاعل مختار صرف خدا کی ذات ہے، اور صحیح العقیدہ مومن پر لازم ہے کہ تمام کاموں میں رب العباد کی کارسازی پر دل وجان سے یقین رکھے، لیکن حکم شرع کی بناء پر جمع اسباب کیلئے بھی سعی ضروری ہے۔ پس اس حکم شرعی کے مطابق اسلامی لشکروں کی فراہمی کے لئے قدرے سعی کی گئی، الحمدللہ کہ یہ سعی اتمام کو پہنچی اور مومنین افاغنہ میں سے بہت سی قوموں نے جن میں ہر ایک کی تعداد ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی ہے، اس فقیر کا ساتھ دینے پر اتفاق کر لیا اور اس عاجز کی اطاعت مان لی۔

والیٔ چترال کا جواب

سید صاحب ابھی سوات ہی میں تھے کہ سلیمان شاہ والیٔ چترال کا جواب آ گیا، جس میں یقین دلایا تھا کہ میں ہر اعانت کیلئے تیار ہوں اور گلگت کے راستے آپ سے آملوں گا۔ اس زمانے میں بدخشاں سے آدینہ خاں نام ایک صاحب سید صاحب کی آمد کا شہرہ سن کر اشغالِ طریقت سیکھنے کیلئے آئے تھے، ان سے سلیمان شاہ کے مزید حالات معلوم ہوئے۔ آدینہ خاں واپس جانے لگے تو سید صاحب نے سلیمان شاہ کو اور ایک مکتوب بھیجا، اس مرتبہ شیخ نظام الدین کو سفارت کی خدمت سپرد کی، وہ آدینہ خاں کے ساتھ چترال گئے، اس طرح باقاعدہ خط و کتابت جاری ہوگئی۔ ہر خط کے ساتھ فریقین تحائف بھی بھیجتے تھے۔

اُنتالیسواں باب:

دعوتِ جہاد

مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوششیں

یوں تو سید صاحب کی پوری زندگی دعوتِ حق کے لئے وقف تھی، لیکن سرحد پہنچنے کے بعد انہوں نے جہاد کیلئے نفیر عام کی جو مساعی فرمائیں، ان کا جائزہ ذرا تفصیل سے لے لینا چاہئے۔ اس کے بغیر سید صاحب کے علوِ ہمت، جوشِ حمیتِ دین، شیفتگیٔ اسلامیت اور بے پناہ جذبۂ اعلاءِ کلمۃ اللہ کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کس طرح ڈیڑھ مہینے کی قلیل مدت میں انہوں نے یوسف زئی کے میدانی علاقے میں ایک ہمہ گیر حرارت پیدا کردی تھی، جس کی بناء پر ایک لاکھ آدمی شیدو کے میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔ افسوس کہ یہ اجتماع یار محمد خاں کی نالائقی کے باعث مطلوب نتیجہ پیدا نہ کرسکا۔ پھر سید صاحب نے ان تمام گروہوں، قوموں، جماعتوں، قبیلوں یا ان کے سلاطین وملوک وخوانین کو دعوت نامے بھیجے، جن کے نام انہیں معلوم ہوسکے اور جن تک رسائی ان کی حدود وسع میں تھی۔ جن کو خطوط بھیجنے کافی سمجھے، خطوط ارسال کئے، جن کے پاس سفیروں کا بھیجنا مناسب نظر آیا، ان کے پاس سفیر بھیجے۔ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے ساتھ سفر ہجرت میں روابط پیدا ہوچکے تھے، ایسے بھی تھے جن سے قطعاً شناسائی نہ تھی۔

سلاطین وفرماں روا

سید صاحب کے تمام مکاتیب اور دعوت نامے محفوظ نہیں رہے، صرف اُن کا ایک

حصہ باقی ہے۔ میں یہاں پہلے ان سلاطین اور فرمانرواؤں کی فہرست درج کرتا ہوں، جن کے ناموں کے مکاتیب محفوظ رہ گئے، اس کے بعد امرا و خوانین کی فہرست دوں گا، پھر یہ بتاؤں گا کہ تحریری دعوت ناموں کے علاوہ سید صاحب نے مسلمانوں کو جہاد کے لئے اُبھارنے اور منظم کرنے کے سلسلے میں کیا کیا کارنامے انجام دیے۔

سلاطین اور فرمانرواؤں کی فہرست یہ ہے:

۱۔ امیر دوست محمد بارک زئی فرمانروائے کابل۔

۲۔ یار محمد خاں والیٔ پشاور۔

۳۔ سلطان محمد خاں والی کوہاٹ و بنوں۔

۴۔ سید محمد خاں والی ہشت نگر۔

۵۔ شاہ محمود درّانی والی ہرات۔

۶۔ شہزادہ کامران ولی عہد ہرات۔

۷۔ زمان شاہ درانی۔ یہ بلند ہمت بادشاہ اگرچہ معزول و مکحول ہو کر لدھیانہ پہنچ گیا تھا، لیکن سرحدات میں اُسے بہت زیادہ اثر و رسوخ حاصل تھا، اس لئے سید صاحب نے اسے بھی نظر انداز نہ کیا۔

۸۔ نصر اللہ بادشاہ بخارا۔

۹۔ مراد بیگ حاکم قندز۔

۱۰۔ سلیمان شاہ والیٔ چترال۔

۱۱۔ سکندر جاہ فولاد جنگ، آصف جاہ ثالث، فرمانروائے دولتِ آصفیہ۔

۱۲۔ احمد علی فرمانروائے رام پور۔

۱۳۔ حافظ الملک رکن الدولہ محمد بہاول خاں عباسی نصرت جنگ فرمانروائے بہاول پور۔

امیرانِ سندھ، محراب خاں، حاکم بلوچستان اور حاکمانِ قندھار و غزنین کو سفرِ ہجرت میں کارِ حق کے ساتھ تعاون کی دعوت دے چکے تھے، مجھے یقین ہے کہ بعد میں بھی ان سب کو یا ان میں سے بعض کو ضرور مکاتیب بھیجے ہونگے، اگرچہ وہ خطوط محفوظ نہ رہ سکے۔

اُمرا وخوانین

امرا وخوانین کی فہرست بہت طویل ہے:

۱۔ حبیب اللہ خاں بارک زئی فرزند عظیم خاں۔
۲۔ احمد خاں بن لشکر خاں (رئیس ہوتی) معتمد یار محمد خاں۔
۳۔ یار محمد خاں کے لشکر کے درانی اور غلزئی سردار۔
۴۔ مولوی عبدالکریم مشیر سلطان محمد خاں۔
۵۔ شاہ پسند خاں وزیر شاہ محمود۔
۶۔ حاجی خان کاکڑ۔
۷۔ شہزادہ محمود بخت۔
۸۔ شہزادہ میر غلام حیدر خاں۔
۹۔ خانخاناں غلزئی نبیرہ شاہ حسین غلزئی۔
۱۰۔ یار محمد خاں غلزئی ساکن میدان۔
۱۱۔ طرہ باز خاں غلزئی ساکن میدان۔
۱۲۔ شیر محمد خاں غلزئی ساکن مرغہ۔
۱۳۔ نعمت اللہ خاں غلزئی ساکن مرغہ۔
۱۴۔ تاج خاں غلزئی ساکن کشنوار۔
۱۵۔ رحمت خاں غلزئی ساکن کشنوار۔

۱۶۔ بختیار خاں غلزئی ساکن غزنین۔

۱۷۔ سبحان خاں غلزئی ساکن غزنین۔

۱۸۔ لودی خاں ساکن کابل۔

۱۹۔ عبداللہ خاں غلزئی ساکن رزیلی۔

۲۰۔ سید گل شاہ ساکن سرودہ۔

۲۱۔ پائندہ خاں تنولی والیٔ امب ودربند۔

۲۲۔ سربلند خاں تنولی رئیس شنگڑی۔

۲۳۔ ناصر خاں رئیس بھٹ گرام۔

۲۴۔ حسن خاں رئیس پچوں۔

۲۵۔ راجا زبردست خاں رئیس مظفر آباد۔

۲۶۔ راجا نجف خاں رئیس خان پور۔

۲۷۔ عجب خاں۔

۲۸۔ فیض اللہ خاں مہمند ساکن ہزارخانی۔

۲۹۔ رؤسا بنوں وداماں (جن کی تعداد معلوم نہ ہوسکی)

۳۰۔ نور محمد خاں۔

۳۱۔ خان زماں خاں رئیس گنگر۔

۳۲۔ امیر عالم خاں رئیس باجوڑ۔

اس فہرست میں ایک ہندو بھی ہے، یعنی راجا ہندو راؤ مختار مہاراجا گوالیار، اسے سید صاحب سے جس درجہ عقیدت تھی اس کا اظہار پہلے ہو چکا ہے۔ سید صاحب نے اسے یہ ہدایت فرمائی تھی کہ جو اصحاب خدمتِ دین کے لئے یہاں آرہے ہیں، ان کے بچوں کی نگرانی اور گزارے کے بندوبست میں کوئی دقیقہ سعی اُٹھا نہ رکھا جائے۔

ہندوستان یا سرحد کے عام علماء واکابر کو جو دعوت نامے برابر آتے رہے، ان کا تفصیلی ذکر میں یہاں نہیں کروں گا۔ آپ ان فہرستوں کو سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ آیا مملکتِ سندھ سے سرحد کشمیر تک پورے علاقے کا ایک بھی قابل ذکر فرد تھا، جس کے کان تک سید صاحب نے دین کی پکار نہ پہنچائی ہو؟

داعیانِ دین کا تقرر

اس کے علاوہ سید صاحب نے اپنے خاص آدمی مختلف ہندوستانی علاقوں میں دعوتِ دین کیلئے مقرر فرمائے، جو عقائد واعمال کی اصلاح کے ساتھ ساتھ سید صاحب کی تحریکِ جہاد کیلئے روپے کی فراہمی کے علاوہ غازیوں کو تیار کرتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ مولانا سید محمد علی صاحب رام پوری کو حیدر آباد دکن بھیجا اور ان کے ساتھ تین آدمی مقرر کیے: عنایت اللہ خاں، عبداللہ اور نعیم خاں۔ ان کا ایک فرض یہ بھی قرار دیا تھا کہ غازیوں کے لئے ہندوستان سے سرحد پہنچنے کے مناسب راستے کا انتظام کردیں، جس میں کسی منزل پر کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ مولانا سید محمد علی نے خود کالا باغ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کا راستہ اختیار کیا، ڈیرہ کے نواب پر چونکہ اعتماد نہیں ہوسکتا تھا، اس لئے سید محمد علی نے ایک آدمی کو مناسب مقام پر بٹھا دیا، وہ غازیوں کو ڈیرہ سے اوپر اوپر جانے کی تاکید کرتا رہتا تھا۔

یہ انتظام کرکے مولانا سید محمد علی نے نواب کے لشکر میں جاکر وعظ کیا۔ کشتی میں بیٹھ کر ڈیرہ غازی خاں پہنچے، پھر خشکی کے راستے پیر کوٹ گئے، جہاں سید صاحب کے اہل وعیال مقیم تھے۔ بعدازاں کراچی سے جہاز پر بیٹھ کر بمبئی اور وہاں سے حیدر آباد تشریف لئے گئے۔ جب سید صاحب نے مولانا ولایت علی کو حیدر آباد بھیج دیا تو سید محمد علی حکم کے مطابق مدراس چلے گئے۔ مدراس میں ان کے تبلیغی اور اصلاحی کارنامے تفصیلاً بیان کرنے

کا یہ محل نہیں۔

۲۔ کچھ دن بعد مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو حیدر آباد کے لئے مقرر فرمایا۔ مولانا بھی کالا باغ اور ڈیرہ اسماعیل خاں کے راستے حیدر آباد سندھ پہنچے۔ وہاں مسئلہ امامت پر فارسی میں ایک رسالہ لکھا، جس کی نقلیں قندھار و کابل وغیرہ بھیجی گئیں۔ سندھی زبان میں اس کا ترجمہ کرا کے خوب پھیلایا، پھر حیدر آباد دکن چلے گئے، ان کے ساتھ بھی تین ہی آدمی تھے: عبدالقادر، عبدالواحد اور کرامت اللہ۔

۳۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو بنگال بھیجا گیا۔

۴۔ مولانا محمد قاسم پانی پتی بمبئی میں دعوت و تبلیغ پر مامور ہوئے۔

۵۔ مولانا سید اولاد حسن قنوجی (والد نواب صدیق حسن خاں) اور سید حمید الدین (خواہر زادہ سید صاحب) یوپی کے مختلف حصوں میں تبلیغ و تنظیم کے لئے بھیجے گئے۔

۶۔ میاں دین محمد اور میاں پیر محمد نیز متعدد دوسرے اصحاب کا کام صرف یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں خطوط پہنچاتے اور وہاں سے روپیہ لاتے رہیں۔

غازیوں کی حالت

میں بتا چکا ہوں کہ سید صاحب دورے پر روانہ ہوئے تھے تو بہت سے غازی بیمار تھے، معاش کی تنگی کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ جو غازی فوت ہوئے، ان کے کفن کے لئے بھی کپڑا میسر نہ تھا۔ شیخ ولی محمد یا تو انہیں کی چادریں اُڑھا دیتے یا جاجم کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اس کام میں لاتے۔ جب پریشانی بہت بڑھ گئی تو ایک سندھی بندوق بنئے کے پاس گروی رکھ کر جنس لینی چاہی، یہ بندوق ایک صاحب نے گیارہ سو روپے میں خرید کر سید صاحب کی نذر کی تھی، لیکن بنیا اسے لینے پر راضی نہ ہوا اور دو وقت فاقے میں گذر گئے۔ سید صاحب کے ذخیرۂ پارچہ جات میں کچھ پگڑیاں تھیں، ان میں سے ایک پگڑی سات

روپے میں فروخت کی اور اس رقم سے غلہ خرید کر دو تین دن گزارے، جب فتح خاں پنجتاری کو کسی ذریعے سے ان حالات کی اطلاع ملی تو اُس نے بقدر ضرورت غلے کا انتظام کر دیا۔(۱)

عیدِ اضحیٰ

سید صاحب عید سے ایک دن پہلے پنجتاری پہنچے تھے، ذی الحجہ کی گیارہویں تاریخ کو آپ نے دو اونٹوں کی قربانی دی اور وہ بھینسا بھی ذبح کیا جو سید عبد القیوم نے اوچ (سوات) میں سید صاحب کی نذر کیا تھا، اور جسے غازی اپنے ساتھ پنجتار لائے تھے۔ راوی لکھتے ہیں کہ اس میں سے اٹھارہ من گوشت نکلا، اس وقت قندھاریوں کے علاوہ سات سو ہندوستانی غازی سید صاحب کے پاس تھے، ان سب میں گوشت تقسیم ہوا، جو بچ رہا وہ ملکیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

جو قافلے ہندوستان سے آئے تھے وہ سب اپنے ساتھ نقد روپیہ بھی لائے ہوں گے، اس وجہ سے لشکر اسلام میں پھر کشایش پیدا ہوگئی اور معمول کے مطابق ہر غازی کو ایک ایک تاملوٹ گندم اور دو دو مٹھی دال بٹنے لگی۔ اس زمانے میں غلے کی خرید کا کام محمود خاں لکھنوی اور عبداللہ کے ذمے تھا، تقسیم پر مولوی عبدالوہاب اور امانت علی مامور تھے۔

اسلامی سادگی اور محنت

پنجتار میں پن چکیاں بھی تھیں، لیکن بارش نہ ہونے کے باعث نالے میں پانی خشک ہو گیا، اس لئے پن چکیاں بند ہوگئیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ جو بھائی چاہے اجرت

(۱) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انتہائی عسرت میں بھی غازیوں نے کبھی کسی سے درخواست نہ کی اور نہ اپنا حال کسی پر ظاہر کیا، البتہ اگر کسی نے بطوع و رغبت امداد کا انتظام کر دیا تو اُسے خوشی سے قبول کر لیا۔ یہ خصوصیت آپ کو ہر موقع پر نمایاں نظر آئے گی۔ یہ سید صاحب کی تربیت کا کرشمہ تھا۔

دے کر گاؤں میں کسی سے غلہ پسوالے، چاہے خود پیس لے۔ چنانچہ اس ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ چکیاں بھی خرید لی گئیں۔

ایک روز سید صاحب پھرتے پھراتے اپنی جماعت کی طرف نکل گئے، جس کے نائب سالار شیخ ولی محمد تھے۔ آپ نے دیکھا کہ مولوی الٰہی بخش رام پوری اپنے ہاتھ سے آٹا پیس رہے ہیں۔ سید صاحب بے تکلف ان کے سامنے بیٹھ گئے اور ساتھ ہتّا پکڑ کر ایک سیر آٹا پیس دیا۔

جو جگہ نماز کے لئے مخصوص کر لی تھی وہ محض ایک احاطہ تھا۔ نہ چھت تھی، نہ فرش، نماز پڑھتے وقت غازیوں کو کنکر چبھتے تھے۔ ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ درانتیاں لے کر چلو جنگل سے گھاس کاٹ لائیں، چنانچہ آپ سب کو لے کر گئے، خود بھی برابر گھاس کاٹتے رہے۔ اتنی گھاس آ گئی کہ مسجد کے فرش پر ایک فٹ موٹی تہ بچھا دی گئی، اسی طرح چند روز کے بعد چھپر بنا کر چھت کا انتظام کر لیا۔

''منظورہ'' میں ہے:

حضرت کی تعلیم کے مطابق کسی کو کسی کام میں عار نہ تھی، سب اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے، اپنے ہاتھ سے کھانا پکاتے، جنگل سے لکڑی لاتے، چکی پیستے، بیماروں اور معذوروں کی قے اور نجاست اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر باہر پھینکتے۔ جو لوگ بعد میں آئے انہوں نے پہلوں کو دیکھ کر سبق حاصل کیا، لشکر بھر کی زبان فحش و دشنام سے بالکل محفوظ تھی۔